

مارچ 2016

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شعاع

تاریخ کا مکمل ناول
پہلا جلد

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING
Section

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

سکھنا

باقی و میرا کئی

مجموعہ ریاضی

رخصیہ جمیل

اقدار ریاضی

امت الصبور

شاین رشید

اللہ جلالتی

فکرات کاپیہ

ماہنامہ

لاہور کراچی

MEMBER
APN
CP



Downloaded From
paksociety.com

READING
Section



تابلہ

124 سیاہ حاشیہ صائمہ اکرم



انٹرنیٹ

61 پتہ ہاسیلی، ائمہ العزیز شہزاد

117 کامیاب عورت، نانیہ صدیقیہ

56 آزمائش، شازبہ چال مازق

65 جیت ہماری ہے، سدرہ حیات

155 اہل جوؤں باقی ہیں، بنت سحر

111 میں ایک قاری ہوں، عائشہ تنویر



تفہیم قرآنی

260 قدیر وانا

261 محمد مشاق آثم

260 نعیم الصوابی

261 عجمہ مظہر نیازی

غزل

10 رضیہ جمیل

11 تنویر بھول

11 سیر کنجہاوی

12 ادارہ



انشواریہ

26 عشاق اور ملاقات، شاہین رشید

22 دستک، شاہین رشید

17 جب تجھ سے تانا، لہن

30 شعاع کے ساتھ، ادارہ



ناول

36 ایک تھی مثال، رخسار نگار عثمان

248 رقص بیل، تبیلہ عزیز



کھیل ناول

162 محبت ماں کا موسم، سائرہ رضا

76 محبت مانگتی ہے، فرزانه کھرل

214 دعائے خیر ہوں، ایمان قاضی

ذرا سا لکھنا ایک کھیل ناول
پاکستان (مالات) --- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 8000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

انتہا ۵: ماہنامہ شعاع 15 جھٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے منقوہ شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی کھیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



282	امت الصبور	پارچہ کے چھروکے	270	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	موسم کے پھول	262	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بننے کا	280	واصفہ سہیل	ایٹنیہ خالے میں
			264	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے کر
			267	خالہ جیلانی	کھلتا کسی پتے

سارچہ 2016
 7 مارچ 2016ء
 صفحہ 60 نمبر

مجلد و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شاعر، 37 - اردو بازار، کراچی

رضیہ جمیل فلور، حصہ پنجم، سنگ پریس، سچھو پھول شائع کیا - (مقالہ) انجی پی ای سی ایچ (پبلسٹی سائیکالوجی)
 Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32786872
 Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

READING
 Section

مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
 وقت، محبت اور موسم پر جس کو اختیار ہے۔ وقت ایک بار گزرتے تو پلٹنا نہیں۔ محبت کی واپسی کا امکان
 اور امید باقی رہتی ہے جبکہ موسموں میں یہ خوبی ہے کہ یہ بار بار پلٹ کر آتے ہیں۔
 سرباکی خشک فصول اور سردیوں کے بعد بہانے دستک دی ہے۔ درخت نئے لباس سے سج گئے ہیں۔
 زمیں نے ہریالی کی چادر اوڑھ لی ہے۔ ہواؤں میں کھلتے شگوفوں کی خوشبو ہے۔ لاکھ کہیں سارے موسم دل کھلنے اور
 مرحلے سے ہوتے ہیں لیکن خوبصورت موسم اندر کے موسم کو بھی خوش گوار کر دیتا ہے۔ اور قدرت کی جلوہ گری دیکھ
 کر دل بیاختیار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگتا ہے جس نے کائنات کو وہ رحمانی بخشش ہے جس کا کوئی مول ہے نہ مثال۔
 بہانے آمد خالق کائنات کی طرف سے امید کا، روشنی کا، راحت کا پیغام ہے کہ وقت اور حالات ہمیشہ ایک
 سے نہیں رہتے۔ اگر آج ہماری زندگی پر غزال کے سائے ہیں تو کہیں نہ کہیں بہار بھی ہے۔ امید اور یقین کا دریا بچھنے
 دیں۔ محروم وہی رہتے ہیں جو ناامید ہو جاتے ہیں۔ حوصلہ و ہمت بار دیتے ہیں۔
 یہی موسم تھا جب ہمیں قدرت کی طرف سے ایک بہار آفریں پیغام ملا تھا۔ 23 مارچ 1945ء وہ دن جب
 قرارداد پاکستان پیش کی گئی۔ بڑے صغیر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا خواب دیکھا گیا اور پاکستان کے قیام کی شکل
 میں اس خواب کو تعبیر ملی۔ پاکستان جو ہمارے لیے قدرت کا تحفہ اور انعام ہے۔
 اللہ تعالیٰ اسے سچی دنیا تک قائم رکھے۔ آمین۔

نیا ناول 'خواب شیشے کا'

رضانہ نگار عدنان کا ناول اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ اس ماہ اس ناول کی آخری قسط شائع کی جا رہی ہے۔ آئندہ
 ناول بہن محنت سحر طاہر کا ہوگا۔ محنت سحر طاہر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ہماری قارئین کو یہ
 ناول پسند آئے گا۔

اس شمارے میں،

- 1 ساثرہ رضا کا مکمل ناول - محبت مارچ کا موسم،
 - 2 فرزانہ کھرل کا مکمل ناول - محبت مانگتی ہے گواہی،
 - 3 آتم ایمان کا مکمل ناول - دعائے خیر ہوں میں،
 - 4 صائمہ اکرم کا ناولٹ - سیاہ حاشیہ،
 - 5 شازیہ جمال طارق، امتہ العزیز شہزاد، سدرہ حیات، نادیہ صدیقہ، بنت سحر اور عائشہ تنویر کے افسانے،
 - 6 رضانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
 - 7 جب تھج سے ناتا جوڑا ہے - قارئین کا سلسلہ،
 - 8 معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،
 - 9 باصلاحیت فنکارہ عشار نور سے ملاقات،
 - 10 پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں - احادیث کا سلسلہ،
 - 11 خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- آپ کے خطوط آپ کی دلے جانے کے ساتھ ساتھ آپ سے رابطے کا ذریعہ بھی ہیں۔ ہمیں خط لکھنا
 محبوب ہے۔

جہاں میں رسالت مآب آئے ہیں
خدا سے لیے الکتاب آئے ہیں

اے خالقِ دو عالم ہے التجا تجھی سے
ہم کو بچالے یارب! ہر گمراہی بُدی سے
وہ اِنَّا فَتَحْنَا كِي آئی نوید!
لیے مُزْدَهُ فَتَحْ يَاب آئے ہیں

تُوہی ہے سُننے والا، بندوں کی سُن عیاش
عیسوں کو تو چھپالے اور نَحْش دے خطائیں
شگفتہ ہوئی وادی جان و دل
کرم کا وہ بن کر سحاب آئے ہیں

ستار نام تیرا، غفار نام تیرا
عیسوں کی پردہ پوشی بے شک ہے کام تیرا
بتوں کے پجاری ہوئے حق شناس
دلوں میں عجب انقلاب آئے ہیں

آسان مشکلیں کر، عزت ہمیں عطا کر
رُسوانہ کر نہیں تو، توہی ہے اپنا یاد
ہم ہیں حقیر بندے، بندہ نواز تو ہے
سبب اُسوۂ خیر کا ترک ہے
مسلمان پہ جتنے عذاب آئے ہیں

ہم پر نظر کرم کی، آمرزگار تو ہے
مہ و انجم و آفتاب آئے ہیں
قدم چومتے سائر عرش کے

کہتا ہے پھولِ یارب! ہر شر سے تو بچالے
ہے کار ساز تو ہی، سب کچھ ترے حوالے
سوئے عرش یہ کون آیا زہیر
کہ جبریلؑ تھکے رکاب آئے ہیں

پروفیسرز ہیر کنجاہی

منویر ہموں

کسی اور کی طرف منسوب

کسی اور کی طرف منسوب ہونے کی حرمت
اولاد حق ابوت کس طرح ادا کرے گی۔
کبیرہ گناہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ
انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے
ہوئے سنا۔

”جس شخص نے بھی جانتے بوجھتے اپنے آپ کو
اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا تو اس
نے کفر کا ارتکاب کیا اور جس نے ایسی چیز (کی ملکیت)
کا دعویٰ کیا جو اس کی نہیں ہے، وہ ہم میں سے نہیں
ہے اور اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے اور
جس نے کسی شخص کو کافر کہہ کر پکارا یا کہا: اے
اللہ کے دشمن — حالانکہ وہ ایسا نہ ہو، تو وہ الزام
اسی پر لوٹ آئے گا۔“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم
کی روایت کے ہیں۔)

قائدہ: حدیث میں مذکورہ تمام باتیں سخت کبیرہ
گناہ ہیں، ہر مسلمان کو ان کاموں سے بچ کر رہنا
چاہیے۔ یہ اتنے بڑے جرم ہیں کہ ان کے ارتکاب
سے ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اعازنا اللہ منہا۔
اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی
منع کردہ باتوں کے ارتکاب سے ڈرانے کا
بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”جو اس کے رسول کے حکم کی
مخالفت کرتے ہیں، انہیں اس بات سے ڈر جانا چاہیے
کہ ان پر کوئی بڑی آفت آڑے یا انہیں دردناک
عذاب پہنچے۔“ (سورہ نور۔ 63)
نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے
روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس شخص نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ
کسی اور کی طرف منسوب کیا جب کہ وہ جانتا ہے کہ وہ
اس کا باپ نہیں ہے، تو اس پر جنت حرام ہے۔“
(بخاری و مسلم)

اعراض

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اپنے باپ دادا سے اعراض نہ کرو، چنانچہ جس
شخص نے اپنے باپ سے اعراض کیا تو یہ کفر ہے۔“
(بخاری و مسلم)

نوائد و مسائل: اعراض کا مفہوم بھی وہی ہے
جو اس سے ما قبل کی حدیث کے لفظ اوعی کا تھا یعنی
اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی اور کو غلط طور پر باپ ظاہر
کرنا۔ اگر وہ اس کی حرمت کو جانتے ہوئے اس سے
اعراض کرے گا تو یہ کفر ہے اور اگر وہ محض دنیوی
مفادات کے لالچ میں ایسا کرتا ہے اس کی حرمت سے
اعراض کرتے ہوئے نہیں، تو یہ کبیرہ گناہ ہو گا جس کا
مرتکب ابتدا میں جنت میں نہیں جائے گا، البتہ سزا
بھگتنے کے بعد جاسکے گا۔

اس کو اتنا بڑا جرم اس لیے قرار دیا گیا ہے تاکہ نسب
محفوظ رہے کیونکہ نسبی حفاظت ہی والدین کی خدمت
و اطاعت کا باعث ہے، اگر نسب ہی محفوظ نہ رہے تو

ذات سے ڈراتا ہے۔“ (آل عمران-30)
 اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”یقیناً تیرے رب کی گرفت
 بڑی سخت ہے۔“ (سورۃ البروج-12)
 اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اور اسی طرح ہے تیرے
 رب کی گرفت جب وہ بستیوں (والوں) کو پکڑتا ہے
 جب کہ وہ ظلم کا ارتکاب کرتی ہیں۔ بے شک اس کی
 پکڑ نہایت دردناک ہے۔“ (سورۃ ہود-102)

غیرت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”نبی
 کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 ”بے شک اللہ تعالیٰ کو غیرت آتی ہے۔ اور اللہ کی
 غیرت یہ ہے کہ آدمی وہ کام کرے جو اللہ نے اس کے
 لیے حرام کیا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس کی غیرت مخلوق کی سی غیرت نہیں
 بلکہ جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔ بعض کا کہنا ہے
 کہ یہاں اس کی غیرت سے مراد اس کا غضب ناک
 ہونا ہے، یعنی محرمات و فواحش کا ارتکاب، جن سے
 اس نے بندوں کو منع کیا ہے، اس کے غضب و عتاب
 کا باعث ہے۔ اس لیے غضب الہی کو دعوت دینے
 والے کاموں سے اجتناب ضروری ہے۔

جو شخص حرام کردہ چیز کا ارتکاب کر لے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اور اگر تمہیں شیطان کی چھیڑ
 چھاڑ (اللہ کی نافرمانی پر) ابھارے تو اللہ سے پناہ طلب
 کرو۔“ (فصلت-36)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ”بے شک جو لوگ اللہ
 سے ڈرنے والے ہیں، جب ان کو شیطان کی طرف
 سے وسوسہ پہنچتا ہے تو وہ ہوشیار ہو جاتے ہیں اور وہ
 (دل کی آنکھیں کھول کر) دیکھنے لگتے ہیں۔“ (الاعراف
 -201)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ”وہ لوگ جو کوئی برا کام
 کر بیٹھتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر لیتے ہیں تو (خوفاً)
 اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب

کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخش سکتا
 ہے۔ اور اپنے کیے پر وہ اصرار نہیں کرتے جب کہ وہ
 جانتے ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا بدلہ ان کے
 رب کی طرف سے مغفرت سے اور ایسے پلحات ہیں
 جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ
 رہیں گے۔ اور (تیک) کام کرنے والوں کا کیا ہی اچھا
 اجر ہے۔“ (آل عمران-135-136)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”تم سب کے سب اللہ کی
 طرف رجوع کرو، اے ایمان والوں! تاکہ تم فلاح
 پاؤ۔“ (النور-31)

فائدہ آیات : ان آیات سے واضح ہے کہ ایک
 مسلمان سے اگر اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب ہو جائے تو
 اس کا شیوہ اس پر اصرار کرنا نہیں ہے، بلکہ اس سے وہ
 فوراً توبہ کرتا ہے اور اللہ سے معافی کا طلب گار ہوتا

نیکیاں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”نبی
 کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جس شخص نے قسم اٹھائی اور اپنی قسم میں کہا :
 لات و عزیٰ کی قسم! تو اس کو چاہیے کہ وہ لا الہ الا اللہ
 پڑھ لے۔ اور جس نے اپنے ساتھی سے کہا : ”او“
 جو اٹھیلیں، تو اسے چاہیے کہ وہ صدقہ کرے۔“
 (بخاری و مسلم)

نوائد و مسائل : 1- لات اور عزیٰ مشرکین
 عرب کے بت تھے۔ ان کی یا کسی اور بت کی یا کسی بھی
 غیر اللہ کی قسم کھانا کفر و شرک ہے۔ اگر کوئی شخص غیر
 اللہ کی قسم کھالے تو لا الہ الا اللہ پڑھ کر ایمان کی تجدید
 کر لے۔

2- اسی طرح کسی اور گناہ کا ارتکاب کر لے تو اس کا
 کفارہ یہ ہے کہ توبہ کرے اور حسب توفیق صدقہ و
 خیرات کا اہتمام کرے، اس لیے کہ نیکیاں برائیوں کو
 دور کر دیتی ہیں۔

قبولیت

حضرت ابن عباس سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جہاں تک رکوع کا تعلق ہے تو اس میں اپنے رب کی عظمت بیان کرو اور سجدے میں پوری کوشش سے (خوب گڑگڑا کر) دعا کرو، تو زیادہ امید ہے کہ تمہاری دعائیں قبول کی جائیں۔“ (مسلم)

سب سے قریب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بڑھ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے، لہذا تم (سجدے میں) خوب دعا کیا کرو۔“ (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي كُلَّهُ دِقَّةَ وَجْهٍ
وَأُولَاهُ فَأَجْرَهُ، وَغَلَايِنَتَهُ وَسَوَّاهُ

”اللہ! میرے تمام چھوٹے اور بڑے، ہلکے اور پھلے، علانیہ اور پوشیدہ گناہ معاف فرما۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر تمام گناہوں سے پاک تھے، لیکن آپ پھر بھی اللہ کی عظمت و جلالت کے پیش نظر اس سے اپنی کوتاہیوں کی مغفرت طلب فرماتے رہتے تھے۔

اس میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے۔ وہ پاک ہونے کے باوجود اللہ کے عذاب سے خوف زدہ تھے اور ہم سر تک گناہوں میں غرق ہیں لیکن اللہ کے خوف اور اس کی گرفت سے بے خوف ہیں۔

صدقہ

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم میں سے ہر شخص کے ہر عضو پر صدقہ (واجب) ہے۔ چنانچہ ہر مرتبہ سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے۔ اور ہر مرتبہ الحمد للہ کہنا صدقہ ہے۔ ہر مرتبہ لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے۔ اور ہر مرتبہ اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے۔ نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے۔ اور برائی سے روکنا صدقہ ہے۔ اور ان سب سے وہ دور کعتیں کافی ہو جائیں گی جو کوئی شخص ان کو چاشت کے وقت ادا کرے گا۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل: اس حدیث سے چاشت (اشراق) کی دور کعتوں کی فضیلت واضح ہے کہ ان کے ذریعے سے انسان کے اندر تین سو ساٹھ جوڑوں کی سلامتی و عافیت کا شکر ادا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی تسبیح و تحمید اور تہلیل و تکبیر کے کلمات اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی اعضائے انسانی کا صدقہ بن جاتے ہیں۔

حضرت ام المومنین جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح سویرے ہی صبح کی نماز پڑھ کر ان کے پاس سے چلے گئے جب کہ ابھی وہ اپنی جائے نماز ہی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھر آپ چاشت کا وقت ہو جانے کے بعد واپس آئے تو وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم ابھی تک اسی حالت میں ہو جس پر میں تمہیں چھوڑ کر گیا تھا؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہاں۔“

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”میں نے تمہارے پاس سے جانے کے بعد چار کلمے تین مرتبہ کہے، اگر ان کا وزن ان کلمات سے کیا جائے جو تم شروع دن سے کہہ رہی ہو تو وہ ان پر وزن میں بھاری ہوں گے۔“ (اور وہ یہ ہیں):

سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ

وَرِضَى نَفْسِهِ وَزِنَةَ عَرْشِهِ وَمِثْقَالَ ذَرَّةٍ

سَلَامَاتِهِ

”ہم اللہ کی پاکیزگی اور حمد کرتے ہیں“ ان کی مخلوق کی تعداد کے برابر اور ان کے نفس کی رضامندی کے موافق اور اس کے عرش کے وزن کے برابر اور اس کے کلمات کی روشنائی یا کثرت کے برابر۔“ (بخاری)

زندہ اور مردہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس شخص کی مثال جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو یاد نہیں کرتا“ زندہ اور مردہ شخص کی مثال ہے۔“ (بخاری)

اور مسلم نے اسے اس طرح روایت کیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اس گھر کی مثال جس میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس گھر کی جس میں اللہ کا ذکر نہیں کیا جاتا“ زندہ اور مردہ کی مثال ہے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل : 1- اللہ کے ذکر کا ترک موت کی طرح ہے۔ جس طرح انسان پر موت طاری ہو جائے تو اس کے بعد وہ کوئی عمل نہیں کر سکتا، اسی طرح اللہ کی یاد سے غفلت برتنے والا اللہ سے اتنا دور

ہو جاتا ہے۔ وہ ایسا کوئی کام نہیں کر پاتا جس سے اسے نفع ہو اور اللہ اس سے خوش ہو جائے۔

1- گھروں میں بھی تلاوت قرآن اور ذکر الہی کا اہتمام کرنا ضروری ہے لیکن عصر حاضر میں محافل ذکر کا جو طریقہ رائج ہے وہ سراسر بدی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہما سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

اچھا گمان رکھنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث قدسی بیان فرمائی۔

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں جیسا وہ مجھ سے گمان رکھے اور جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ

اپنے جی میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ اور اگر وہ کسی مجلس میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں ایسی مجلس میں اس کا ذکر کرتا ہوں جو ان سے بہتر ہوتی ہے، یعنی فرشتوں کی مجلس۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1- اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بابت یہ یقین رکھا جائے کہ وہ توبہ قبول فرماتا، مغفرت فرماتا، پریشان حال لوگوں کی چارہ سازی فرماتا اور مصیبتوں سے نجات عطا فرماتا ہے۔ اس یقین کے ساتھ انسان ایسے کام بھی کرے جن سے اللہ خوش ہوتا ہے اور ان کاموں سے اجتناب کرے جن سے اس نے منع فرمایا ہے، اس کے بعد انسان اللہ سے حسن ظن اور اچھی امید رکھے۔ جس طرح ایک کاشت کار زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈالے اسے پانی دے اور اس کی نگہداشت کرے اور اس کے بعد اچھی فصل کی امید رکھے ایک شخص عالم قاضل بننا چاہے، ڈاکٹریا اچھینتر بننا چاہے تو اس کے لیے پہلے ضروری ہے کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق وہ کتابیں پڑھے جن سے انسان کو

علم حاصل ہوتا ہے، تو ڈاکٹری یا اچھینترنگ میں وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ القرض ہر کام کے لیے پہلے انسان کو ایک بنیاد اور پھر اس کے لوازمات مہیا کرنے پڑتے ہیں، اس کے بعد ہی اس کے بار آور ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اللہ کے ساتھ حسن ظن اور اچھی امید وابستہ کرنے کا مسئلہ ہے۔ انسان جب تک اس کے لیے بھی ایمان اور عمل صالح کی بنیاد فراہم نہیں کرے گا، اللہ سے محض حسن ظن ناواقف ہی کا مظہر ہوگا۔

1- ایک غلام جو اپنے آقا کی خدمت کرنے کے بجائے بھاگ جائے اور اسے ایذا پہنچائے اور پھر یہ امید رکھے کہ میرا آقا تو بہت مہربان قسم کا ہے، وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا، دنیا ایسے غلام کو بے وقوف ہی کہے گی۔ اسی طرح اللہ کا معاملہ ہے جو یقیناً ارحم

الراحمین ہے، بڑا بخشنے والا ہے، لیکن کن لوگوں کے لیے؟ اپنے بندوں کے لیے نہ کہ شیطان کے پیرو کاروں کے لیے۔ شیطان اور اس کے پیرو کاروں کے لیے تو اس کا فرمان ہے کہ میں تجھ سے اور تیرے پیرو کاروں سے جہنم کو بھروں گا!

سبقت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”مفسرون سبق لے گئے۔“

صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم مفسرون کون ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں۔“ (صحیح مسلم)

فائدہ: اس میں ایک تو کثرت سے اللہ کو یاد کرنے کی فضیلت کا بیان ہے کہ ایسے لوگ قیامت والے دن اجر و ثواب میں سب سے آگے ہوں گے۔ دوسرے اللہ کو یاد کرنے اور اس کی اطاعت کرنے والا مرد ہو یا عورت دونوں کو برابر کا اجر ملے گا۔ ذکر و اطاعت الہی کے ثواب میں جنس کی بنیاد پر کمی بیشی نہیں کی جائے گی۔

افضل ذکر

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔ ”سب سے افضل ذکر لا الہ الا اللہ ہے۔“ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ: یہ کلمہ توحید ہے چونکہ اس میں و مدار اسلام ہے اس لیے اس کا ذکر افضل ہے۔ بعض علما بطور ذکر صرف اسی کلمہ توحید کو افضل مانتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس کا دوسرا جملہ محمد رسول اللہ بھی اس میں شامل ہے اور یوں ان کے نزدیک بطور ذکر دونوں کو ملا کر

پڑھا جائے گا۔ لیکن حدیث کے ظاہر کا لحاظ رکھتے ہوئے بہتر ہے کہ صرف پہلے جملے پر اکتفا کیا جائے۔

ایسی بات

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول! اسلام کے احکام مجھ پر زیادہ ہو گئے (غالب آ گئے) ہیں۔ آپ مجھے ایسی بات بتلائیے جس کو میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہے۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل: 1۔ یعنی اللہ کی طرف سے مقررہ احکام جن میں بعض فرض ہیں بعض مستحب اور بعض کی حیثیت نوافل کی ہے۔ فرانس کی ادائیگی تو بہر صورت ضروری ہے اور رضائے الہی کے لیے مستحبات کی بھی بڑی اہمیت ہے، اسی طرح نوافل بھی قرب الہی کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ لیکن ان کی کثرت سے بعض دفعہ عام قسم کے لوگ گھبرا اٹھتے ہیں اور وہ صرف فرانس و سن کی پابندی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی خواہش کا اظہار اس حدیث میں ہے۔

2۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جواب دیا کہ تو ہمیشہ اپنی زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھا کر۔ زبان کو تر رکھنے کا مطلب ہے: مداومت (تعمیر) کرنا، یعنی اللہ کے ذکر کو اپنا مستقل دائمی معمول بنالے۔ اس طرح نوافل کی کثرت جس سے تو گھبرا گیا ہے، نہ بھی ہوگی تو ذکر الہی کی کثرت سے اس کا ازالہ ہو جائے گا۔



مڑتی ہوئی مگلیاں چھوڑی ہیں
 کھلتی ہوئی مگلیاں چھوڑی ہیں
 جھولے کی وہ مسکھیاں چھوڑی ہیں
 ہر طاق میں گزریاں چھوڑی ہیں
 جب تجھ سے نانا جوڑا ہے
 مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بائبل کا گھر چھوڑ کر پاپا بس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مر جاتا ہے۔
 غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ محکمہ گلوچ، لڑائی جھگڑا، مٹینے تشنے ہوں اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور سماں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی شرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے نانا جوڑا ہے

ز-ن

- س۔ شادی کب ہوئی؟
 ج۔ شادی 3 اپریل 1981ء کو ہوئی۔
 س۔ شادی سے پہلے کے مشاغل؟
 ج۔ شادی سے پہلے بس گھر رہنا اور چھپ کے اپنے چیز کی اشیاء تیار کرنا جیسے کہ گتلیوں کے غلاف بیڈ کورز وغیرہ کاڑھنا (اس زمانے میں یہ بات معیوب سمجھی جاتی تھی کہ لڑکی اپنا چیز خود تیار کرے، اسی لیے دروازے کی کنڈی لگا کر لڑکیاں چیز تیار کرتیں اور کسی ملنے والی کے آنے پر مائیں یوں ظاہر کرتیں گویا خود یہ کام کر رہی ہوں۔)
 س۔ رشتے میں مرضی؟
 ج۔ جی یہ سراسر بزرگوں کا فیصلہ تھا۔
 س۔ جیون ساھی کے حوالے سے کوئی تصویر؟
 ج۔ کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں۔
- ج۔ کوئی خاص نہیں بس ابا چاہتے تھے کہ دانا پڑھا لکھا ہو، مگر چونکہ میرے شوہر ابا ہر جا ب کرتے تھے سو یہی ان کی قابلیت ٹھہری، تعلیم کو اس قدر اہمیت نہ دی گئی۔
 س۔ منگنی کتنا عرصہ رہی؟
 ج۔ منگنی تقریباً دو سال رہی اس دوران کوئی رابطہ نہیں ہوا، حتیٰ کہ میرے گھر والوں سے بھی نہیں، بس رشتہ طے ہونے کے بعد ایک تصویر دکھادی گئی تھی۔ (پسند آئی)
 س۔ شادی کے لیے قربانی؟
 ج۔ نہیں کوئی خاص نہیں، پرائمری تک تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔
 س۔ رسموں کے لین دین پر کوئی جھگڑا ہوا؟
 ج۔ کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں۔

س۔ شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج۔ کوئی خاص بات نہیں۔

س۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج۔ شادی کے بعد کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔
س۔ ساس تمہیں گھر میں دیور تھے، شادی کے بعد میرے
میاں (دو ماہ بعد) کویت چلے گئے اور میں سررال میں
اکیلی رہ گئی۔ خیر اچھے دن گزرے، دن میں کام کاج کرنا
اور رات کو ساس کو کہانیاں سنانا۔

س۔ کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟

ج۔ تقریباً ایک ماہ بعد چونکہ گھر میں بھی کام کاج کی
عادی تھی اس لیے کوئی دقت نہیں ہوئی۔

س۔ میکے اور سررال کے ذائقے مختلف محسوس
ہوئے؟

ج۔ جی کافی فرق تھا۔ ہمارے ابا اماں انڈیا سے
ہائیکرٹ کر کے آئے تھے تو کھانوں میں ہندوستانی لٹچ
تھا۔ مثلاً "گوشت کے علاوہ بہت سے پکوان ہمیں
آتے تھے جو ہم سے سب نے سیکھے۔"

س۔ سررال میں کن باتوں پر تعریف و تنقید
ہوئی؟

ج۔ سررال میں زیادہ تر تعریف ہی ہوئی، سگھراپے
کی 'کھانے پکانے کی اور ہاں ایک بات یہ اب تک
تعریف ہوتی ہے کہ بھابھی کے بچے بہت پیارے
ہیں۔ ماشاء اللہ۔ ہندوستان کی بے شمار کہانیاں یاد ہیں
سو بچے بڑے سب گرویدہ تھے کہانیاں سننے کے شوق
میں بچے ہمارے کمرے میں جمع رہتے اور مجھے بھی
خوب مزہ آتا تھا کہانیاں سنانے میں۔ اب اپنے پوتے
پوتیوں، نواسے، نواسی کو سناتی ہوں۔ تنقید کم ہی
ہوئی۔ بس خیر ہی گزری مجموعی طور پر۔

س۔ سررال سے وابستہ توقعات کس حد تک
پوری ہوئیں؟

ج۔ کسی سے کوئی توقع نہیں رکھی یہ خیال ہی نہیں
آیا دل میں (جب امی سے میں نے پوچھا یہ سوال تو امی

کننے لگیں 'توقعات؟ وہ کیا ہوتا ہے، سو سوئیٹ (ہاں
میں خود سب کی خوشی رگمی میں شریک ہوئی۔ بچیوں کی
شادیوں کے لیے چیزیں بنا کر دینا، کسی کی بری کی تیاری،
روعاں کاڑھ کر دینا ہو یا تھیلیاں بنانی ہوں (یہ بڑے کی
طرح کی ہوتی ہیں جو سوئی دھاگہ رتھج رپے وغیرہ

رکھنے کے کام آتی ہیں) میں حاضر ہوں۔ خاندان میں
بچوں، بہنوں سب کی بھابھی مشہور ہوں۔

س۔ پہلے بچے کی پیدائش۔؟

ج۔ پہلے بچے کی پیدائش پر میرے میاں کویت تھے،
فون بھی نہیں ہوتا تھا، میری ساس نے حتی الوسع خیال
رکھا اور دیوروں نے بھائی بن کر دکھایا۔ جب میرے
میاں واپس آئے تو بیٹے کو دیکھ کر حیران ہوئے کہا۔
"یہ کون ہے؟"

یہ میری ننندوں اور دیوروں کے لیے ایک ذراق بن
گیا، بات بات پر کہتے "یہ کون ہے؟"

سب بہت خوش ہوئے ان کی حیرانی اور خوشی دیکھ
کر۔ یہ ایک سربراہن تھا ان کے لیے، اس کے بعد
میرے میاں مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ دو ڈھائی سال
ہم کویت میں رہے، واپس آئی تو میرے ساتھ دو بیٹے
تھے۔ بڑا تقریباً ڈھائی سال کا اور چھوٹا چھ ماہ کا، میری
ساس (اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے) نے
میرے چھوٹے بیٹے کو کبیل میں چھپا لیا، کسی کو دیکھنے
نہ دیتیں، نظر لگ جائے گی، چھوٹا بیٹا بہت خوب
صورت تھا اب بھی بہت پیارا ہے ماشاء اللہ۔

س۔ سررال میں مقام۔؟

ج۔ سررال میں سب ہم سے بہت پیار کرتے ہیں
اور ہم بھی سب سے، جب بھی دعا کے لیے ہاتھ
اٹھاتے ہیں، سب کے لیے دعا کرتے ہیں۔ تھوڑی
بہت اور سچ سچ تو ہر جگہ ہو جاتی ہے، مگر میرے دل میں
کسی کے لیے کوئی شکوہ نہیں سب خوش رہیں۔

س۔ میکے اور سررال میں فرق۔؟

ج۔ وہی فرق ہے جو سارا سال پڑھائی اور پڑچوں میں
ہے۔

س۔ جو انٹ فیملی سٹم پسند ہے یا علیحدہ؟
ج۔ دیکھیں جو انٹ فیملی سٹم پسند ہو یا علیحدہ رہنا ہو گا تو وہی جو قسمت میں لکھا ہے اسی لیے سب کے ساتھ پیار محبت سے رہیں یہ کھانا پینا سالان یہ سب عامیانه پن ہے ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ایک ماں کی اولاد مختلف مزاج مختلف عادتیں رکھتی ہے تو یہ تو پھر سسرال ہے اپنا دل اپنا طرف بڑا رکھیں سب کو محبت دیں چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اپنا دل جلا میں نہ اپنے بچوں کی زندگی خراب کریں۔

جہاں تک میری پسند کی بات ہے تو مجھے جو انٹ سٹم میں رہنا پسند ہے آپس میں لوگ جھونک ہو تو کیا گھر کے بڑے کسی ساتھیان کی طرح سر رہتے ہیں۔ دکھ سکھ میں ساتھ بھلتے ہیں بچوں کو دادا دادی کا پیار ملتا ہے۔ جب تک میری ساس حیات رہیں میرے لیے سایہ فگن درخت کی طرح رہیں۔ شادی کے دو سال بعد میں علیحدہ ہو گئی تھی کیونکہ گھر میں چھوٹے دیور تھے ان کی شادی کی تو جگہ کم پڑ گئی اس لیے میں اور میری جیٹھانی پاس والے ذالی گھر میں شفٹ ہو گئے مگر ایک ساتھ مل کر کھاتے پکاتے خاص کر تھو اورل پر۔

س۔ شوہر سے تعلقات؟

ج۔ یہ وہ سوال ہے جس پہ دل زخم زخم سے ضروری نہیں کہ آپ کو محبت کے بدلے محبت ملے سسرال والوں سے تو پیار ملا مگر شوہر سے کبھی وہ مقام نہ پاسکی جس کی میں حق دار تھی۔ میری شادی کو 35 سال ہو گئے ہیں۔ شادی کے ہیں سال بعد میرے شوہر نے مجھے سوکن کا تحفہ دیا۔

س۔ دو سری شادی کن وجوہات کی بنا پر کی؟

ج۔ میرے پانچ بچے ہیں ماشاء اللہ سے چار بیٹے اور ایک بیٹی پانچوں بچے بہت ہمارے اور ذہین ہیں۔ تب بچے اتنے بڑے بھی نہیں تھے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ میں جوان ہوتے بچوں کے سامنے اپنے میاں سے ہسی

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گروپوش

—————

قیمت

کتاب کا نام

450/-	سزنامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سزنامہ	دنیا گول ہے
450/-	سزنامہ	ابن بلوط کے عقاب میں
275/-	سزنامہ	چلتے ہو تو سن کو چلیے
225/-	سزنامہ	گمری گری پھر اسافر
225/-	طرز و مزاج	خوار گندم
225/-	طرز و مزاج	اُردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوپے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاندگر
225/-	مجموعہ کلام	دل وحشی
200/-	ایڈگر لین پوائن انشاء	اندھا کنواں
120/-	ادبیری انبن انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طرز و مزاج	باتیں انشاء جی کی
400/-	طرز و مزاج	آپ سے کیا پردہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

مذاق نہیں کرتی تھی، فیشن کرنا مجھے نہ آیا، سر پر دوپٹہ لوڑھتا (جو بلنگ ہونے پر لینا شروع کیا) وہی ہے بالوں میں چاندی آگئی، مگر اتر کے نہ دیا۔ ساہو رہی اور ساہوگی کو اپنا شعار بنایا بس یہی میرا تصور تھا۔

میرے میاں کا بہت بڑا کاروبار تھا سو اسی حساب سے لوگوں سے ملنا جلنا بھی، مگر مجھ میں اتنا کانفیڈنس نہیں تھا نہ ہے، لوگوں سے بات چیت کرنا، عورتوں

سے بھی، ڈرتی تھی، گھبرا جاتی تھی، بات کرنے کا ڈھنگ نہیں سکھایا میں نے (بقول شوہر) اسی لیے میں مزید دوہوتی چلی گئی اور میری قوت فیصلہ کہیں کھو گئی۔ جیسا انہوں نے کہا ویسے مانا، بس چالاکی نہ آئی۔ بقول ان کے پیسہ سنبھالنا نہ آیا۔

(مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ابونے دو سری شادی کی ای پانچ دن مسلسل روٹی رہی تھیں۔ خیر شادی کی دو سری ہوئی گھر لے آئے، میرا کہو اسے دے دیا میں بچوں کے کمرے میں شفٹ ہو گئی۔ بیٹی چھوٹی تھی اس نے کچھ دن الٹا سیدھا کمر کو سنبھالا پھر مجھے اٹھنا پڑا۔ اس۔ دو سری شادی کے بعد آپ نے کیا فیصلہ کیا؟

ج۔ میرا میکہ کمزور تھا، ابا کی وفات ہو چکی تھی۔ ایک بھائی، وہ بھی اپنا گزارا کرتا تھا اس کے بیوی بچے، ہاں بہنوں نے بہت بلایا، ان کے اپنے گھر اور اپنی مضبوط حیثیت، مگر میں نہ گئی، مجھے اپنے بچوں کا مستقبل بنانا تھا، انہیں کسی مقام پہ پہنچانا تھا، سو میں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔

میرے شوہر کے پاس دو بے پیسے کی کمی نہ تھی، ادھر ہی میں لن کا مستقبل بنا سکتی تھی، سو میں نے سوتن کے ساتھ سمجھوتا کر لیا، بلکہ مجھ کو گئی اس کے قدموں۔ سارے گھر کا کام میں کرتی، صبح کو ہلے اسے ناشتا بنا کر دیتی پھر اپنے بچوں کو اسکول بھیجتی، گھر کا کام کرتی، کھانا، کپڑے سب کچھ۔

میں نے چپ رہنا سیکھ لیا، یہ دکھ اپنے دل میں دفن کر لیا، اس تک کہ اسی کا چھلک کر لیا اس کے ہاں بچے

کی پیدائش ہوئی تو میں نے اسے سنبھالا اس کے بچے کو بھی ہاں میرے شوہر نے اتنا کیا کہ نوکرانی لگا دی، جھانڈ پر تن پہ، پھر بھی اپنی سوتن اور شوہر کے لیے کھانا بنا دیا، گروے کا کام ہے، مگر میں نے کیا وہ چاہ کرتی تھی، میرے شوہر نے ایک مرتبہ اس سے کہا کہ اپنی تنخواہ میں سے کپڑے بنالو، تو اس نے کہا کہ اسے بھی تو بنا کر دیتے ہو تو انہوں نے کہا۔ یہ کوئی چاہ کرتی ہے تو وہ کہنے لگی۔

”بڑھی لکھی تو ہے نہیں، اس سے نوکری اٹھواؤ اور کام گراؤ یہ بھی اپنی کمائی سے لے“ میں نے اپنے شوہر سے کپڑے بنوانے چھوڑ دیے۔

خیر کہاں تک نہیں گے کہاں تک سناں، بچے اس سے بحث کرتے، وہ میاں سے شکایتیں لگاتی، گھر کا ماحول خراب ہو گیا، میں بچوں کو سمجھاتی کہ مت کرو ایسا، بس اپنا ٹائم پاس کرو۔

مرضی ہوتی گھر کھانا کھاتے، نہ مرضی ہوتی اسے لے کر نکل جاتے، کبھی ایک، کبھی ڈیڑھ بجے واپس آتے۔

خیر میں نے اللہ سے لو لگائی، سب باتیں اسی سے کرنے لگی۔ میں نے یہ سب اپنے بچوں کی خاطر کیا، خیر گزری جو گزر گئی۔

ہر بات میں مقابلہ کرتی، مجھ سے بچوں سے بچوں کا خرچا کتنی، مگر میرے میاں نے اس کی ہر بات مالی پر خرچا بند نہ کیا ہمارا، میرے بچے اسی ماحول میں پڑھتے رہے۔

دو تین سال میں میں نے بیٹی کی شادی کر دی، اس کے زور، اس کے چیز پر بھی بہت لے دے ہوئی، مگر میں نے بس ایک ”چپ“ بیٹے بڑھنے کے لیے باہر چلے گئے، اب میں ہر دم اپنے بچوں کی خیر مانگتی اور چپ چاپ کام کیے جاتی، اس بات پہ بھی چپ ہو جاتی جب وہ کہتی۔

یہ تھا میرے صبر کا انعام۔ اللہ نے بہت دیا، سب کچھ دیا۔ اللہ میرے تمام بچوں کو اور ان کی اولادوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

کسی سے کوئی شکوہ نہیں، کوئی شکایت نہیں، بس اپنے جیون ساتھی سے اتنا کہتا ہے۔

وہ فاصلہ تھا دعا اور مستجابی میں کہ دھوپ مانگنے جاتے تو ابر آجاتا وہ مجھے چھوڑ کر جس شخص کے پاس گیا برابری کا بھی ہوتا تو صبر آجاتا



یہ جو سب کچھ امی نے سہا ہے اسے میں نے زبان دی ہے۔

میری امی اب بھی بہت خوب صورت ہیں اور جوانی میں تو اور بھی زیادہ تھیں، جب بھی کوئی تگنے والی ملتی ہیں تو یہ بات ضرور کرتی ہیں تمہاری امی بہت خوب صورت تھیں پٹھان تھیں بالکل اور میری دوسری امی ساتویں اور منہ بہ چچک کے داغ ہیں۔ (اللہ معاف کرے کسی کی شکل پہ ٹونٹ نہیں کرتے) پتا نہیں ابو نے کیا دکھا اس میں امی میری بہت سلیقہ مند ہیں، سلائی، کڑھائی، پٹائی، موٹی ٹانگنا، ہر ہنر میں یکساں گھریٹے کی طرح چمکتا ہوا، مجھ سے کبھی کوئی کام نہیں کروایا تھا، طرح طرح کے کھانے کیا پاکستانی، کیا ہندوستانی، نظمیں، لطیفہ کہانیاں سنانا، غرض میری امی جیسا کوئی نہیں، اللہ میری امی کو زندگی، صحت اور تندرستی عطا کرے۔ (آمین)۔

امی بہت ذہین ہیں بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود امی نے ہمیں پڑھایا، لکھایا اور ہر چیز کا مثبت پہلو دیکھنے کے قائل بنایا، اسی لیے آج ہم سب دنیا کے لیے ایک مثال ہیں اور بہت کامیاب بھی (اللہ کے فضل سے)۔ امی نے اپنا نام اور شہر کا نام بتانے سے منع کیا ہے کوئی بھی فرضی نام لکھ دیں۔ مجھ میں لکھنے کے جراثیم امی کی طرف سے ہی آئے ہیں۔



”میری کو لیکز کہتی ہیں، تمہاری ہمت ہے جو تم سوتن کے ساتھ گزارا کر رہی ہو۔“

بس میں دل میں کہتی ہو۔ ”اللہ! گزارا یہ کر رہی ہے کہ ہم۔“

کچھ سال اور آگے گزرے اور اللہ نے مجھے میری محنت کا اجر دے دیا۔ ماشاء اللہ سے میرے بیٹے ہر میدان میں کامیاب ہیں۔ میرا سب سے بڑا بیٹا یورپ میں رائل کلج آف فزیشن میں اسکالرشپ پہ پڑھ رہا ہے، F.C.P.S میڈیسن کے بعد اب وہاں جا رہا ہے،

کر رہا ہے، بہت اچھی تنخواہ اور سہولیات ہیں، اس کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے، ہر روز پلانٹھ ظہر کے وقت فون کرتا ہے۔ ”امی! میں اسپتال جا رہا ہوں، دعا کرنا۔“ بس اس سال ان شاء اللہ اپنی پڑھائی پوری کر کے واپس آجائے گا پاکستان، میرا یہ بیٹا اور سو بہت لائق ہیں، میری بہت خدمت کرتے ہیں۔ ان سے میں بہت خوش ہوں اور میرا اللہ بھی ہو گا۔

میرا دو سرا بیٹا لاہور میں جنرل سرجری کا انچارج ہے، وہ F.C.P.S سرجری مکمل کر چکا ہے اب وہاں جا رہا ہے، اس کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے، یہ بیٹا بہت ہنسوڑ ہے، بہت ہنسانا ہے اور لطیفے بھی بہت سنانا ہے، مریضوں کے ساتھ ایسے مکمل مل جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ہی رہتا آیا ہو۔

تیسرے نمبر پر بیٹی ہے جو اپنے دو بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں خوش اور آباد ہے، اللہ انہیں ہمیشہ ہنسا بنا رکھے (مابدولت آہم!!!)

چوتھا بیٹا اپنے ابو کے ساتھ ان کا کاروبار سنبھالتا ہے اور ہمیں ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔

پانچواں لاہور میں میڈیکل کے دوسرے سال میں ہے، وہ بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ جا رہا ہے۔ ان شاء اللہ۔

اب میرے بیٹے ہمارے شہر میں کلینک کھول رہے ہیں، اپنے بیٹوں اور بہوؤں کے نام بہت بڑے پور ڈیپ جگمگاتے دیکھتی ہوں تو بہت خوش محسوس ہوتی ہے۔

READING
Section

لوگ ہیں، ان کے کام آسکوں، انہیں فائدہ پہنچا سکوں۔۔۔
حالا تکہ انسان تو کسی کے کام نہیں آسکتا۔۔۔ یہ تو اللہ
کا بڑا کرم ہے کہ اللہ نے میرا انتخاب کیا کہ میں
دوسروں کے کام آسکوں۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں عام
زندگی میں بھی ایسا ہی ہوں۔“

”ڈرنا حقیقت سے قریب تھا؟“

”بالکل تھا۔ اس لیے یہ سیریل مقبول ہوا۔ روز
موز زندگی میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اس
لیے لوگوں نے اسے دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور ریٹنگ
میں بھی خاصا اوپر رہا۔“

”اگرچہ آپ کا رول مختصر تھا۔ مگر اہم تھا۔
انتخاب کیسے ہوا آپ کا؟“

”میں پہلے بھی کچھ ڈرامے کر چکا ہوں۔ تو سب
نے میرا کام دیکھا ہوا تھا۔ شاید اس لیے جب یہ
اسکرپٹ لکھا گیا تو اس رول کے لیے مجھ سے رابطہ کیا
گیا۔ میں نے رول پر رضامندی اچھا لگا۔ تو میں تیار ہو
گیا۔“

”آپ نے کہا کہ میں پہلے بھی ڈرامہ کر چکا ہوں تو
کچھ بتائیے ان کے بارے میں؟“

”میرے تقریباً پندرہ سولہ ڈرامے آن ایر ہو چکے
ہیں اور جن ڈراموں سے میری پہچان ہوئی ان میں
”مجھے کچھ کہنا ہے“ تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ ”جدائی“
”شواہاں“ ”لباس“ ”بکھرا میرا نصیب“ اور ”کیا نام
دیں“ ایسے ڈرامے تھے کہ جن سے میں رجسٹرڈ ہوا۔
اور ان سب میں میرے کردار سیکنڈ لیڈ تھے۔ اور ہاں
ایک سیریل ”بوجھ“ بھی تھا اس میں میں نے ڈاکٹر کا
رول کیا تھا۔ کاسٹ میں ایک بڑا نام نعمان اعجاز کا تھا۔
اور یہ میری خوش قسمتی رہی ہے کہ مجھے زیادہ بہت



محمد اکبر خان

”کسے ہیں اکبر صاحب؟“

”حمد للہ آپ کی رعنائیں ہیں۔“

”سیریل مجھے کچھ کہنا ہے“ میں آپ کی پرفارمنس

بہت اچھی رہی آپ کو کیا رسپانس ملا؟“

”شکریہ۔۔۔ رسپانس بہت اچھا ملا۔ میری

پرفارمنس کو لوگوں نے پسند کیا۔ میری حوصلہ افزائی

کی مجھے اچھا لگا۔“

”عام زندگی میں بھی ایسے ہی مخلص دوست ہیں

جیسے ڈرامے میں دکھائے گئے؟“

”اب اپنے منہ سے کچھ کہنا تو مناسب نہیں ہے۔۔۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری پوری کوشش ہوئی

ہے کہ اپنے دوست احباب اور مجھ سے منسلکہ جو بھی

مصروف لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اور میرے زیادہ تر کردار ”ڈاکٹر“ کسی کمپنی کا ”ایم ڈی“ یا کوئی ”بزکس مین“ کا ہوتا ہے۔ مطلب مجھے ہمیشہ اچھے کردار ملے۔“

”آپ کی شخصیت بھی ایسی ہے کہ آپ پر یہ کردار سوٹ کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ بارعب شخصیت ہے آپ کی۔ اداکاری کے علاوہ کیا کرتے ہیں آپ؟“

”میں جناب گورنمنٹ آفیسر ہوں اور اداکاری اور ماڈلنگ میں شوقیہ کرتا ہوں۔ اور اس فیلڈ میں دوستوں کے کہنے پر۔ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ مجھ میں اداکاری کی صلاحیت ہے۔ تو بس ان ہی کے کہنے پر آیا۔“

”انڈر پروڈکشن کیا ہے؟“

”دو تین سیریز پر بات چل رہی ہے۔ اسکرپٹ پہ کام ہو رہا ہے۔ تو بس یہی کچھ ہے۔“

”شوہر کو فل ٹائم اپنانے کا ارادہ ہے؟“

”فی الحال تو کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میری جانب بہت اچھی ہے اداکاری کو سائیڈ میں رکھا ہے۔ کیونکہ یہ میرا شوق ہے۔ اور اگر باطنین کی حوصلہ افزائی رہی اور محبت تو ان شاء اللہ کام کرتا رہوں گا۔“

”اور ان شاء اللہ آپ سے پھر بھی بات ہوتی رہے گی۔“

شبنم مانی

”کیسی ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”سیریل ”نور جہاں“ میں رائٹر کے طور پر آپ کا نام بڑھ کر اچھا بھی لگا اور حیرت بھی ہوئی۔ آپ کب سے لکھ رہی ہیں؟“

”میں 2000ء سے ڈرامہ رائٹر ہوں۔ کچھ لندن میں لکھا اور پھر پاکستان میں 2003ء میں لکھنا شروع کیا۔ طویل دورانیے کے کھیل بھی لکھے اور بطور اسکرپٹ ایڈیٹر ”گے اینڈ بی“ میں جاب بھی کی ”نور جہاں“ میرا سیریل ہے۔“

READING
Section



”لندن میں تھیں تو کس کے لیے لکھا اور پاکستان میں جو طویل دورانیے کے کھیل لکھے ان کے بارے میں بھی بتائیے؟“

”جب لندن میں تھی تو لوکل ”ارو جینل“ کے لیے اسکرپٹ لکھا کرتی تھی۔ پھر جب پاکستان آئی تو ایک لانگ ٹے ”ایک مہمان مہمان“ کے نام سے لکھا اور یہ ڈراما پی ٹی وی ورلڈ سے چلا۔ اور مجھے یاد ہے کہ سات آٹھ مرتبہ ریٹ ہو اور کیبل یہ بھی کئی بار دکھایا گیا۔ اسے سمجھ مانی نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ یہاں قریبی اور موٹالیز اس کے مرکزی کردار تھے۔ بقرعید کے موقع پر بھی ایک کھیل لکھا جو کہ ”دن ٹی وی“ سے چلا تھا۔“

”گٹ۔ ”نور جہاں“ سیریل سے کیا امیدیں ہیں؟“

”اچھی امیدیں ہیں۔ کیونکہ بہت دل سے لکھا ہے۔ اور ”نور جہاں“ کی کہانی سے ڈائریکٹر بھی بہت خوش ہے۔ ”جینل“ بھی خوش ہے۔ ”نور جہاں“ کی کہانی بھی میں نے لکھی ہے اور اسکرپٹ بھی میں نے ہی لکھا ہے۔“

”کاسٹ میں کون کون ہے؟“

”ناہید شبیر، فرحان علی، آغا ذہین طاہرہ، شہزاد رضا“

عمر، شہزاد سونیا راؤ اور حجاج کے علاوہ بھی کافی فنکار ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ہر کردار یا یوں کہیں کہ ہر فنکار اپنے کردار میں فٹ ہے۔ ازیکا ڈیٹیل نور جہاں کا رول کر رہی ہے۔

”آج کل عورت کو اور لڑکی کو بہت مظلوم دکھایا جاتا ہے، کیا نور جہاں بھی ایسا ہی کردار ہے؟“

”آپ دیکھیں گی تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ ہم کیا دکھانا چاہ رہے ہیں۔ ویسے نور جہاں کلنی مختلف کہانی ہے نہ کٹیو اور پوز ڈیوڈیوں کو ساتھ لے کر چلی ہوں اور اینڈ آپ کو بہت چیخ لگے گا۔ عام سوچ سے بالکل ہٹ کر سب کچھ اللہ نے بہت اچھا کر دیا۔“

”کتنے عرصے میں کھل ہو ایہ سیریل؟“

”چار ماہ میں۔۔۔ فیصل منظور نے بہت رہنمائی کی، حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ٹینشن دے کر جلدی جلدی لکھوایا بھی۔ (مسکراتے ہوئے) ڈرامہ لکھنا شروع کیا، پاکستان میں اور اختتام کیا، یو ایس اے میں۔“

”کیا مطلب؟ شوٹ کہاں ہوا؟“

”مطلب لکھنے کے دوران امریکہ گئی گھومنے پھرنے، اپنے کزنز کے پاس اور دوستوں کے پاس۔ وہاں زندگی کو انجوائے بھی کیا اور سیریل بھی لکھا۔ یعنی ”نور جہاں“ میرے ساتھ ساتھ گئی یو ایس اے میں بھی۔ اور شوٹ تو کراچی میں ہی ہوا ہے۔“

”چلیں جی۔۔۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے۔ آپ کے بچے اس فیلڈ میں کیوں نہیں ہیں؟“

”بچوں کو شوق تھا۔ مگر اس فیلڈ کا حال دیکھ کر اس طرف نہیں آئے۔ اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتی کہ وہ آ بھی سکتے ہیں۔“

صنم سعید

”کیا حال ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

پی ایس ایل کی افتتاحی تقریب میں دکھا آپ کو۔

مگر آپ بہت سادہ لباس میں تھیں جبکہ آپ کی ساتھی تو۔۔۔؟“

”جی۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہمارے والدین نے ہماری تربیت ہی اس انداز میں کی ہے کہ گھر کی محفل ہو یا باہر کی، ہم اپنی وضع قطع نہیں بھولتے۔ کیونکہ ہمیں دیکھنے والے ہزاروں لاکھوں لوگ ہوتے ہیں اور لباس سے ہی انسان کے گھر کا ماحول اور تربیت معلوم ہوتی ہے، اس لیے میں اپنے لباس کا بہت خیال رکھتی ہوں۔“

”کردار میں بھی آپ ان باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟“

”جی بالکل۔۔۔ ہر کردار کے لیے بہت خیال رکھتی ہوں۔ اگر میرا کردار اور میک اپ کی ڈیٹیل نہیں کر رہا تو میں کبھی بھی غیر ضروری میک اپ نہیں کروں گی۔ اگر ایک غریب یا متوسط گھر کی لڑکی بھرپور میک اپ کرے گی تو ایسا کردار کب حقیقت کے قریب لگے گا۔ میں نے ٹی وی پہ کام کرنے کے لیے کبھی بھی میک اپ کو اہمیت نہیں دی بلکہ ہمیشہ رول کو سامنے رکھا ہے۔ پرفارمنس اور حقیقت نگاری میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔“

”شہرت کا باعث کون سا ڈراما یا سیریل بنا؟“

”مجھے فخر ہے اس بات پر کہ میرے سارے ہی سیریل بے حد مقبول ہوئے لیکن ”دام“ اور ”زندگی گزار ہے“ نے بے حد عروج دیا۔ اور آج تک میری پہچان یہی دو سیریلز ہیں حالانکہ ان کے بعد میں نے کافی کام کیا ہے۔“

”ایک سال میں ایک یا پھر دو سیریل کرتی ہیں۔ وجہ؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں۔ مجھے کم اور اچھا کام کرنے

کی عادت ہے۔ آپ یقین کریں۔ بہت آفرز آتی ہیں سب کو لیں نہیں کرتی۔ ٹیم دیکھتی ہوں۔ اسکرپٹ دیکھتی ہوں اور اپنا رول دیکھتی ہوں۔ کیونکہ اپنے آپ کو ہمیشہ ”کن“ رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔



ہر وقت اسکرین پر رہتا مجھے پسند نہیں ہے۔
 ”رات دیر تک گھر سے باہر رہنا کیسا لگتا ہے؟“
 ”بہت برا۔ ہماری تربیت اس انداز میں ہوئی ہے
 کہ ہمیں گھر سے باہر دیر تک رہنے کی اجازت ہی
 نہیں تھی۔ اس لیے وہی عادت ابھی تک ہے۔
 ڈرائے کی شوٹ کے لیے بھی میں پہلے ہی کہہ دیتی
 ہوں کہ اتنے بجے تک کام کروں گی۔“

”صنم۔ آپ کا ”گدورت“ بہت ہٹ گیا تھا۔
 اس میں آپ کا نگینو رول تھا۔ اس کے بعد آپ
 نگینو رول میں نظر نہیں آئیں۔ کیوں؟“
 ”اس لیے کہ میں اپنے آپ پر کسی کردار کی ہر
 نہیں لگوانا چاہتی۔ بے شک نگینو رول کو بہت
 مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور پر فارم کرنے میں بھی مزہ
 آتا ہے لیکن میں ہر طرح کے رول کرنا چاہتی ہوں۔
 اور آپ نے دیکھا ہو گا کہ میرا کوئی کردار میرے لیے
 گئے دو سرے رول سے مچ نہیں کرتا۔ ہر سیریل میں
 میرا ایک مختلف کردار ہوتا ہے اور یہی میری کامیابی
 ہے۔“

”بھارت میں ریکارڈنگ ہوئی ہے؟“
 ”نہیں ساری ریکارڈنگ ”مارشیس“ میں ہوئی
 ہے۔ مارشیس بہت خوب صورت جگہ ہے اس
 فلم کے ڈائریکٹر ”تامر خان“ ہیں اور ان کا کام کرانے کا
 انداز بہت عمدہ ہے۔ وہ فنکاروں کو شیڈن نہیں دیتے۔
 محب مرزا اور عدیل ہاشمی کے ساتھ کام کر کے بہت
 اچھا لگا۔“

”کیا امیدیں ہیں اس فلم سے؟“
 ”بہت پر امید ہوں۔ یقیناً یہ فلم بہت کامیابی
 حاصل کرے گی۔“
 ”ہماری بھی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“

”عقربیب آپ کی فلم ”پچانا“ ریلیز ہونے والی
 ہے۔ کچھ کہیں گی اس کے بارے میں؟“
 ”پچانا“ میں میں ایک بھارتی لڑکی کا یعنی ہندو
 لڑکی کا رول لدا کر رہی ہوں۔ جبکہ میرے مقابلے میں
 محب مرزا ہیں جو ایک پاکستانی مسلمان لڑکے کا رول لدا
 کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک ڈرامیٹک فلم ہے جو کہ
 یقیناً سب کو پسند آئے گی۔“

سانحہ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ سیدیہ حمید چوہدری کی والدہ محترمہ اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئیں۔
 ان اللہ وانا الیہ راجعون

ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑی محرومی اور جاں گسل صدمہ ہے۔ ہم سیدیہ حمید چوہدری کے غم میں برابر
 کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر
 کرے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

”کیا حال ہیں عیشا! ایسی ہو؟“
 ”جی اللہ کا شکر ہے، بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“
 ”تمہارا اصلی نام ”سحرش“ ہے اور تمہاری پہچان
 عیشا ہے، یہ کیا چکر ہے؟“

”میرے دونوں ہی نام اصلی ہیں کیونکہ دونوں پہ ہی
 میرا NIC بنا ہوا ہے۔ سحرش احتشام اور عیشا احتشام
 نو۔۔۔“

”سحرش کس نے رکھا اور عیشا کس نے رکھا؟“
 ”میں تمہیال اور دوھیال میں سب سے بڑی ہوں
 تو دوھیال والوں نے عیشا نام رکھا جبکہ تمہیال والوں
 نے سحرش رکھ دیا۔“

”اور پیار کا تیسرا نام کیا ہے؟“
 ”تقبہ۔۔۔ سب عیشا پہ متفق ہیں کہ عیشا ہی
 رکھنا ہے۔ یعنی بولنا ہے۔“
 ”کچھ اپنے بارے میں بتاؤ پھر آگے چلتے ہیں؟“



راہِ جُرتی ہوئی فتکارہ

عشائر و سگے مُلاقات

شاہین رشید

”جی 16 جون 1989ء میں کراچی میں پیدا ہوئی۔
 میڈیا میں صرف میں ہی ہوں، والدہ ہاؤس وائف ہیں
 جبکہ والد صاحب کا اپنا بزنس ہے اور جلب بھی ہے“
 کے الیکٹرک ”میں۔“
 ”اچھا۔ پھر لائٹ تو نہیں جاتی ہوگی تمہاری؟“
 ”بے ساختہ ہتے ہوئے۔ نہیں جی ایسی کوئی کہانی
 نہیں ہے۔ لائٹ ہماری بھی جاتی ہے۔ پہلے تو کچھ
 ”پونٹ“ بھی فری ملے ہوئے تھے جب سے ”کے
 الیکٹرک پرائیویٹائز ہوئی ہے یہ سہولت بھی لے لی گئی
 ہے تو اچھا خاصا مل آتا ہے اور ہاں جی میں اپنے بارے
 میں آپ کو بتا رہی تھی کہ میرا ستارہ جہمنگلی ہے اور
 میں جیسا کہ آپ کو بتایا، خاندان میں سب سے بڑی

کچھ چرے ایسے ہوتے ہیں جو کبھی بلاؤن رول میں
 نہیں اچھے لگ سکتے خواہ وہ کتنا ہی بناؤ سنگھار کیوں نہ
 کر لیں۔ عیشا نور بھی ایک ایسی ہی آرٹسٹ ہے کہ
 جس کے نقوش اتنے سادہ ہیں کہ وہ بھولی بھالی لڑکی کے
 روپ میں ہی اچھی لگ سکتی ہے۔ آج کے دور میں
 بھولا بھالا ہونا اور ایسے نقوش کا مالک ہونا بھی بڑی بات
 ہوتی ہے۔ عیشا نور کو اس فیلڈ میں آئے ہوئے کچھ
 ہی سال ہوئے ہیں۔ بہت زیادہ کام بھی نہیں کیا اور
 ابھی تک کوئی لیڈنگ رول بھی نہیں کیا، مگر پھر بھی
 جس سیریل میں بھی کام کیا ناظرین کو متاثر ضرور کیا
 ہے۔ آج کل آپ انہیں ”صحرا میں سفر“ اور ”بہو
 رانیال“ میں دیکھ رہے ہیں۔



ہوں اور پورے خاندان کی آپنی مشہور ہوں۔ میرے بعد میری سبین بہنیں اور ایک بھائی ہے اور چونکہ بڑی ہوں تو پورے خاندان میں میرا رعب ہے اور آج کل ایم پی اے کی تیاریوں میں ہوں۔ بس بیڈ لک یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی سیریل مل جاتا ہے تو پھر تیاری بیچ میں ہی رہ جاتی ہے۔

”شوہر میں کیسے آتا ہوا جبکہ خاندان میں کوئی نہیں ہے اس فیئلڈ میں؟“

”مجھے اس فیئلڈ میں آنے کا کوئی شوق نہیں تھا تو ایک دن اپنی دوست کے ساتھ کمرشل شوٹ دیکھنے گئی تو مجھے بھی سلیکٹ کر لیا گیا۔ اور کمرشل تھا ایک موبائل کمپنی کا۔ جو کہ کافی مشہور ہوا اور بس اس کے بعد مزید آفرز آنی شروع ہو گئیں۔ اور بس۔“

”گفتگو مگر یہ کیسا اتفاق ہے کہ شوٹ دیکھنے گئیں اور منتخب ہو گئیں۔ کچھ تو اظہار کیا ہو گا آپ نے؟“

”ہاں۔ میں بتاتی ہوں۔ جب میں شوٹ دیکھنے گئی تو جس ماڈل کو بک کیا گیا تھا اسے اپنے ڈائلاگ یاد نہیں ہو رہے تھے اور میں بار بار اسے سمجھا رہی تھی۔“

”جاری تھی کہ یہ ڈائلاگ اس طرح ہیں۔ کیونکہ میں یاد کرنے کے معاملے میں بہت اچھی ہوں۔ تو جب ماڈل کو زیادہ مشکل ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ یہ کمرشل کر لیں اور میں نے کر لیا جو کہ باپور بھی ہو گیا اور مزید آفرز بھی آئیں۔ شاید مجھے اسی طرح اس فیئلڈ میں آتا تھا۔“

”گھروالے تو حیران ہی رہ گئے ہوں گے۔ کچھ کہا انہوں نے تم سے؟“

”بے شک گھروالے حیران تو ہوئے مگر یہ بھی کہا کہ آئندہ مت کرنا بس ایک ہی کافی ہے اور پھر جب مزید آفرز آئیں تو میری امی نے میرے لیے بہت

کوشش کی والد صاحب کو منانے میں اور وہ بڑی مشکل سے مانے۔“

”تو پہلا کمرشل موبائل کمپنی کا پہلا ڈراما کون سا تھا اور کمرشل کرنے پر معاوضہ کتنا ملا تھا؟“

”شہرت پا کر کیسا لگ رہا ہے۔ اور اس فیئلڈ میں ان رہنے کے لیے فٹ بھی رہنا ہوتا ہے۔ تو کیا کرتی ہو؟“

”پہلا ڈراما تو ایڈس ڈیزین سے کیا تھا اس چینل پر ایک ڈراما سیریز چل رہی تھی ”عورت کہانی“ اس کے ایک پلے میں کام کیا تھا۔ اور شہرت تو مجھے ملی کمرشل سے اور ایک سوپ جلا تھا ”خوشبو کا گھر“ اس سے سوپ بہت زیادہ ہٹ گیا تھا اور آپ نے پوچھا کہ کمرشل میں کیا ملا تھا تو آپ کو بتاؤں کہ اس معاوضے کو دیکھ کر ہی تو مجھے لالچ آیا کہ اس فیئلڈ میں اپنی جگہ بنانی چاہیے۔“

”پھر تو تمہیں یہ فیئلڈ بہت اچھی لگتی ہو گی؟“

”جی اس لحاظ سے فیئلڈ بہت اچھی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہاں جس کی ”پی آر“ جتنی اچھی ہو گی اسے اتنا ہی زیادہ کام ملے گا۔ یہاں ٹیلنٹ کم اور پی آر زیادہ دیکھی جاتی ہے۔ جبکہ ہمارے ملک میں ٹیلنٹ بہت ہے۔“

”شہرت پا کر کیسا لگ رہا ہے۔ اور اس فیئلڈ میں ان رہنے کے لیے فٹ بھی رہنا ہوتا ہے۔ تو کیا کرتی ہو؟“

”جی پہلے تو میں آپ کو فٹ رہنے والی بات کا جواب
 دوں گی میں صبح اٹھ کر ایک سرسبز ضرور کرنی ہوں۔ پھر
 ناشتہ اور ناشتہ امی کے ہاتھ کافی پسند ہے اکثر امی کہتی
 ہیں کہ میرے ہاتھ کی عادت ہو گئی ہے تو سرال جا کر
 گیا کرو گی تو یہی کہتی ہوں کہ اللہ مالک ہے۔ اور ری
 شہرت کی بات تو میری دور کی نظر تھوڑی کمزور ہے تو
 میں ہر وقت تو لینس نہیں لگا سکتی تو کلاسز لگا کر باہر نکلتی
 ہوں تو کوئی پہچان ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی پہچان لے تو
 تھوڑا حیران بھی ہوتے ہیں کہ اچھا آپ وہی ہیں۔“

”یہ فیم اور سب کچھ وقت سے پہلے نہیں مل گیا؟“
 ”جی جی۔ یہ تو ملتا ہی ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ
 مجھے گھر کی ذمہ داری وقت سے پہلے مل گئی ہے۔ شاید
 میں گھر کی بڑی ہوں اس لیے مجھ پر ذمہ داریاں وقت
 سے پہلے پڑ گئیں اور میری یہ عادت ہے کہ میں تنہی
 بہت کرتی ہوں۔“

”اچھا۔ کس طرح کی؟ اور اپنے لو پر تنہی
 برداشت ہو جاتی ہے؟“

”اگر کوئی بے کام کر رہا ہوتا ہے تو میں اس کو سمجھاتی
 ہوں کہ یہاں اسے ایسے نہیں ایسا کرنا چاہیے تھا“
 مطلب اپنے ارد گرد کے پھولے بہن بھائیوں پر۔
 اور اپنے لو پر بھی تنہی برداشت ہے شرطیکہ جائز ہو لو
 ہاں آپ کو بتاؤں کہ میری بہت خواہش ہے کہ میں
 لیجنڈا سٹار ”منیم بیگ“ کے ساتھ کام کروں۔“
 ”کس قسم کے کردار کرنے کا شوق ہے؟“

”پرنس والے مشنریوں والے ملکہ والے جیسے کہ
 آج کل ”تریش“ ڈراموں میں ہوتے ہیں۔ اس طرح
 کے کردار کرنے کا بہت شوق ہے مگر ہمارے یہاں یہ
 بہت بری روایت سی پڑ گئی ہے کہ کسی ایک کردار میں
 مشہور ہو جاؤ تو پھر اسی کردار کی چھاپ پڑ جاتی ہے۔
 پروڈیوسر اور ڈائریکٹرز نے کردار دینے کا رسک ہی نہیں
 لیتے مجھے یاد ہے کہ ایک سوپ ”ماسی اور ملکہ“ کیا تھا
 اور اس میں میں نے ماسی کی بیٹی کا کردار کیا تھا بس اس
 کے بعد مجھے اسی طرح کے رولز آفر ہونے لگے کہ

نو کرانی کا رول کر لو۔ یہ کر لو۔ غریبوں والے
 ہی رولز آفر ہوتے تھے تو مجھے بہت چڑ آتی تھی اور پھر
 میں نے صاف کہہ دیا کہ نہیں۔ بھئی میں اس طرح کے
 رول نہیں کروں گی۔ تب پھر مجھے کچھ اچھے کردار ملنے
 لگے اور مجھے ایک بات لوگوں کی بہت بری لگتی ہے کہ
 جو کام میں کر رہی ہوتی ہوں اس کام کی فصاحت شروع
 کر دیتے ہیں۔“

”وقت کی پابندی کرتی ہیں؟“
 ”نہیں۔۔۔ ہمیشہ دیر کر دیتی ہوں۔ بہت کوشش
 کرتی ہوں کہ دیر نہ ہو مگر پھر بھی دیر ہو ہی جاتی ہے۔“
 ”کس کردار میں تمہیں اپنی شخصیت کا عکس نظر
 آیا؟“

”ابھی تک تو ایسا کوئی کردار ملا نہیں۔ کیونکہ کسی
 کردار میں مجھے بہت مظلوم دکھایا جاتا ہے کسی میں
 بہت زیادہ شارب۔ تو ایسا کردار نہیں ملا کہ جو میری
 شخصیت کا عکس ہو۔“

”اس فیلڈ کو جاری رکھنا ہے کیا۔ آگے تک
 جانے کی خواہش ہے؟“

”اس فیلڈ میں بہت آگے تک جانے کا ارادہ ہے۔
 مگر اس کے ساتھ ساتھ میرا سائڈ بزنس کرنے کا بھی
 ارادہ ہے۔ بوتھک کھولنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ کیونکہ
 فیشن ڈیزائننگ سے مجھے لگاؤ ہے تو میرے لیے یہی
 بزنس بہتر ہے گا۔“

”لوگوں نے بلکہ آپ جیسی لڑکیوں نے ٹوکنگ کو
 بھی اپنا پروفیشن بنایا ہوا ہے۔ تمہیں لگاؤ ہے ٹوکنگ
 سے؟“

”ہاں۔۔۔ ٹوکنگ سے لگاؤ ہے مگر اتنا نہیں کہ اسے
 پروفیشن بنایا جائے۔ چونکہ ڈیزائننگ سے لگاؤ ہے تو
 بوتھک کا ہی ارادہ ہے۔ ویسے بھی آج کل تو اس
 پروفیشن میں مو حضرات زیادہ ان ہیں۔ یہ لوہا بات ہے
 کہ گھر کے مرد ٹوکنگ نہیں کرتے مگر مو حضرات ہم
 خواتین سے زیادہ اچھی ٹوکنگ کر لیتے ہیں۔ کیونکہ
 خواتین کی ٹوکنگ میں سنجوسی کا عنصر آ جاتا ہے کہ یہاں

سے بھی بچالوں وہاں سے بھی بچالوں۔۔۔ جبکہ مردک
ایسا نہیں کرتے۔

”کوکنگ چینل سے فائدہ اٹھاتی ہو؟“
”دیکھتی تو بہت شوق سے ہوں۔ فائدہ بھی اٹھالیتی
ہوں۔ مگر بہت زیادہ نہیں۔ کیونکہ کھانا پکانے سے
زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔ ضرورت کے وقت پکالیتی ہوں،
امی کے ہاتھ کا پکا ہوانہ کھاؤں تو لگتا ہے جیسے پیٹ ہی
نہیں بھرا۔“

”پھر سسرال جا کر کیا کرو گی؟“

”امی بھی یہی کہتی رہتی ہیں ہر وقت کہ سسرال جا
کر کیا کرو گی۔ تو میں کہتی ہوں کہ جب گھر پر ذمہ
داریاں پڑیں گی تو سب کچھ کر لوں گی۔ تب انہیں
تھوڑی تسلی ہوتی ہے کہ ہاں یہ کر لے گی۔“

”میڈیا سے کچھ شکایت؟“

”جی۔ مجھے میڈیا سے ایک شکایت ہے کہ میڈیا
کے لوگ ہر ایک کو غلط سمجھتے ہیں، خاص طور پر لڑکیوں
کو کہ یہ تو ہر طرح کے کام کر لے گی جبکہ ایسا نہیں
ہوتا۔ ہر لڑکی کی کام کے معاملے میں اپنی چوائس ہوتی
ہے۔“

”پرائس ٹیک پہ اعتبار کرتی ہیں یا بار کیننگ کرتی
ہیں؟“

”جہاں صرف پرائس ٹیک چلتا ہے وہاں تو کچھ
نہیں بولتی مگر کچھ جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں پر
بار کیننگ کرنی پڑتی ہے۔ مگر ہمیں اس کا فائدہ اس
لیے نہیں ہوتا کہ دکن دار ہم فنکاروں کو بہت امیر کہیں
سمجھتے ہیں اس لیے پہلے ہی وہ اتنا بتا دیتے ہیں کہ کم ہو
کر بھی وہ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔“

”جھوٹ تو بولتی ہی ہوگی، کبھی جھوٹ پکڑا بھی گیا؟“

”جی جی۔ بالکل بولتی ہوں۔ دوستوں کے
درمیان تو جھوٹ چلتا ہی رہتا ہے۔ کوشش تو کرتی
ہوں کہ جھوٹ نہ پکڑا جائے۔ مگر جب ماما کسی دوست
کو فون کر کے پوچھتی ہیں تو اکثر جھوٹ کھل جاتا
ہے۔“

”ہلی ووڈ کالی ووڈ یا ہالی ووڈ کہاں کام کرنے کی شدت
سے خواہش ہے؟“

”ہلی ووڈ۔۔۔ میں کام کرنے کی بہت خواہش ہے،
لنچ لینا، جوبلی مجھے بہت پسند ہیں۔ ان ہی کے ساتھ کام
کرنا چاہوں گی۔“

”کوئی ایسا کردار کرنے کو ملا جس کے لیے آپ کو
مشاہدہ کرنا پڑا ہو؟“

”جی۔ ایک سیریل میں ایٹار مل لڑکی کا کردار کر رہی
ہوں۔ تو اس کے لیے ایسی فلمیں دیکھیں جس میں
ایسے کردار ہیں۔ ویسے بھی جب بھی کوئی کردار آفر ہوتا
ہے تو ضرور اس کے بارے میں اوہرا دھر سے معلومات
لیتی ہوں۔“

”تو گول کونج کرنے کا ہنر آتا ہے؟“

”تھوڑا بہت ہی آتا ہے۔ ویسے یہ مشکل کام ہے
کیونکہ اب انسان کا کوئی ایک چہرہ نہیں ہوتا اس لیے
پرکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”کوئی دیرینہ خواہش؟“

”ساری دنیا گھومنے کی خواہش ہے۔ دیکھیں کب
پوری ہوتی ہے۔“

”راہ چلتے فقیروں کی امداد کرتی ہیں؟“

”عموماً تو دس بیس روپے دے دیتی ہوں اور مجھے
یاد ہے کہ ایک بار ایک فقیر نے اپنے گھر کا بہت ہی برا
نقشہ کھینچا تو میں نے ہزار کا نوٹ دے دیا۔ تو وہ پھیل
ہی گیا کہ اور دیں۔۔۔ بڑا غصہ آیا کہ ہزار بھی اسے کم
لگ رہا ہے۔“

”ملک کے کس شہر میں شاپنگ کرنے کی خواہش
ہے؟“

”ملک میں نہیں، بلکہ بنگال میں شاپنگ کرنے کی
خواہش ہے، سنا ہے وہاں چیزیں بہت سستی ملتی
ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے عیشاء لور سے اجازت
چاہی۔

شُعاع کے ساتھ

رکارڈ

عائشہ جمیل..... لاہور

(1) شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ گزرا اس حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ ہو تو لکھیں۔

شعاع سے تعلق کتنا پرانا ہے یہ تو پتا نہیں کیونکہ جب سے ہوش سنبھالا اپنے ارد گرد شعاع، خواتین، تاریخی ناولز نسیم حجازی کے، طارق اسماعیل ساگر، اس کے علاوہ اسلامی کتابیں اور پیارے ”پھول“ کو پایا تھا۔ عمران سیریز بہت آیا کرتی تھیں۔ بڑے بہن بھائی امی، ابو سمیت سب مطالعے کے شوقین ہیں۔ ان سب کا شوق مل کر مجھ میں بہت ہی زیادہ منتقل ہو گیا ہے۔

جب چھوٹی تھی تو ”پھول“ پڑھتی تھی۔ اس کے علاوہ امی سے چھپ کر عمران سیریز پڑھتی تھی اور

”داستان ایمان فروشوں کی“ یوسف بن ماشعین شہاب نامہ اللہ کے سپاہی، یہ کتابیں میں نے دوسری تیسری

کلاس میں تھی جب پڑھیں۔ چاہے سمجھ آئے نہ آئے۔ بعد میں جب ان کو دوبارہ پڑھا تو اصل سمجھ

آئی۔ امی رسالے پڑھنے سے منع کرتی تھیں۔ باجی صبا بھی جب فرسٹ ایئر میں آئیں تب پڑھنے شروع

کیے تھے۔ باجی اسماء نے میٹرک میں ہی شروع کر دیے اور میں نے آٹھویں کے بعد ہی ہی امی اگر پوچھتیں۔

”عائشہ کیا پڑھ رہی ہو۔“ امی لطیفے یا احادیث پڑھ رہی ہوں۔ ان کو پڑھتے پڑھتے کب افسانے پڑھنے

شروع کیے پتا ہی نہ چلا۔ پہلا ناول میں نے ہنری رابرٹ اور جان رابرٹ والا پڑھا تھا۔ ناول کا اور رائٹر کا

نام یاد نہیں۔ اس کے علاوہ ”باہر کا آدمی“ پڑھا۔ پھر میں نے اور حبیب بھائی نے چھت پڑھ کر ”شب

کے شگفتہ زینوں سے“ پڑھا۔ ہم ایک دوسرے کا راز رکھتے تھے کہ امی کو نہ بتانا۔ پھر جب آٹھویں کے

پرچوں سے فارغ ہوئی تو بہت رسالے پڑھے ان دنوں ”محبت خواب سفر“ اور ”دیوار شب“ اور ”زرر موسم“ چل رہے تھے۔ سب گھروالے چھت پر سوتے تھے اور میں رات کو جاگ کر رسالے پڑھتی۔ اب تو رات کو جاگا ہی نہیں جاتا۔ دسمبر 2009ء کا

شعاع جس کے ٹائٹل پر عذر اصدیقی کی تصویر تھی وہ پہلا رسالہ تھا جو میں نے پورا پڑھا امی کے سامنے بھی۔ امی پھر بھی کہتی تھیں کم پڑھا کرو۔ باجی اسماء اور صبا سیکنڈ ہینڈ لاتی تھیں۔ اور ابو کے سامنے بالکل نہیں پڑھتی تھیں۔ حالانکہ ابو خود بھی پڑھتے ہیں۔ بھائی بھی پڑھتے ہیں اسماء کے علاوہ اور نوہیب بھائی بہت کم پڑھتے ہیں۔

2012ء میں زیادہ تر رسالے میٹ سے پڑھے۔ آدھے خریدے۔ بس پھر میں نے ہر مہینے نئے لانا

شروع کر دیے اور 2013ء میں ابو سے کہہ کر لگوا لیے۔

09، 2008ء میں تو رضائی میں چھپ کر فون کی روشنی میں بھی رسالے پڑھے ہیں۔ اس معاملے میں

امی باجی صبا اور نوہیب بھائی سے ڈرتی تھی۔ ایک مرتبہ نیا رسالہ آیا۔ میں روٹیاں بنا رہی تھی۔ روٹی

سینکتے ہوئے رسالہ بھی پکڑ لیا۔ کچھ دیر بعد غور کیا تو رسالہ کونے سے جل چکا تھا۔ اہاہا۔

صبح سے رات تک کتنے کام نمٹاتی ہیں؟ اور ان مصروفیات میں مطالعے کے لیے وقت کیسے نکالتی ہیں؟

(2) شب و روز کے معمولات؟ ارے کوئی خاص معمول نہیں ہے۔ M.B.B.S کی فرسٹ ایئر کی طالبہ

ہوں امیر الدین کالج میں۔ جب کالج جاتی ہوں تو ظاہر ہے صبح سویرے کالج۔ تین ساڑھے تین چار بجے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

(5) بارش پسند ہے؟

مجھے بارش بہت پسند ہے۔ بچپن میں تو خوب نہاتے تھے کشتیاں بناتے تھے۔ امی سے گلگلے بنا کر کھاتے تھے جب بارش آتی تھی۔ اب کبھی کبھار ہی نہاتی ہوں بارش میں۔ لیکن ہاتھ ضرور باہر نکالتی ہوں۔

6۔ اپنا پسندیدہ شعر، پسندیدہ اقتباس، پسندیدہ کتاب لکھیے۔

پسندیدہ کتابیں ”کلام پاک“ سرفہرست۔ یہ کلام الٹی ہے۔ اگر کوئی سمجھ کر پڑھ لے تو دین بھی سنور جائے دنیا بھی اور آخرت بھی۔ کوشش سب کو کرنی چاہیے۔ نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔
”داستان ایمان فروشوں کی“ یوسف من ماضی

”اور“ اللہ کے سپاہی“ میری بہت پسندیدہ کتابیں ہیں۔ ”شہاب نامہ“ پڑھنے کو بہت دل کرتا ہے۔ بچپن کا پڑھا اب کچھ کچھ ہی یاد ہے۔ ”پیر کامل“، ”جنت کے پے“ اور ”عکس“ ایسے ناول ہیں جنہیں میں شاید ہی کبھی بھولوں۔ انشاء جی کی جتنی بھی شرکی کتابیں ہیں۔ سب بہت پسند ہیں۔ فیض کا ”نسخہ ہائے وفا“ علامہ اقبال کی ”بانگ درا“ بہت پسند ہیں۔ جاوید چوہدری کی ”زیرو پوائنٹ“

پسندیدہ اقتباس

”کبھی کبھی تقدیر ہمیں مٹی کے پیالے میں امرت پیش کرتی ہے۔ مگر ہم مٹی کے پیالے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے ٹھکرا دیتے ہیں۔ قصور کس کا ہے؟
تقدیر کا یا ہماری کم نگاہی کا؟ (امرت اور پیالہ : از راحت جبین)

اب میرا مختصر سا تعارف۔ میرا نام عائشہ جمیل ہے۔ ایم بی بی ایس فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوں۔ میری دو بہنیں (اسماء اور صبا) ہیں۔ پانچ بھائی (حبیب، صہیب، ندوہیب، حبیب اور اسماء) ہیں۔ امی ہاؤس وانف ہیں۔ ان کا نام حینہ ہے۔ ابو کا نام محمد جمیل ہے۔ سب سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں

واپسی۔ نماز پڑھ کر کھانا کھایا۔ کبھی سو گئی۔ کبھی پڑھ لیا۔ مغرب کے بعد باقاعدہ پڑھنا۔ عشاء کے بعد سو جانا۔ کبھی کبھار باجی کے ساتھ پارک چلی جاتی ہوں۔
اصل میں مجھے نیند بہت آتی ہے۔ رسالہ بھی پڑھ لیتی ہوں یا کوئی اسلامی کتاب۔ میں گھر میں چھوٹی ہوں۔ (بس اسماء مجھ سے چھوٹا ہے) اس لیے کوئی زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ مزے ہیں۔

(3) شعاع کی وہ کون سی تحریریں ہیں جو دل پر نقش ہو گئیں۔ وہ تحریر جسے پڑھ کر دل ابھلا۔ کسی کردار میں اپنی جھلک نظر آئی؟
پسندیدہ تحریریں اور ان کو تحریر کرنے والی بہت ساری ہیں۔

(4) آپ کو اپنی شخصیت کا اور اک ہے؟ اپنی خوبیاں، خامیاں لکھیں۔ وہ تعریفی جملہ جسے سن کر خوشی ہوئی؟
جناب مکمل تو کوئی انسان بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ خوبیاں اور خامیاں ہر ایک کی ذات میں ہوتی ہیں۔ میرے اندر بھی ہیں۔ حساس بہت ہوں مگر ظاہر نہیں کرتی۔ ویسے میں بہت ضدی منہ پھٹ اور بد تمیز ہو جاتی ہوں۔ کبھی کبھار۔ اب قابو کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ سخی بھی بہت ہے میرے اندر۔ میری سوچ بہت مثبت ہے جو اندر کی سخی کو زائل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ خود اپنا احتساب کرتی رہتی ہوں۔ اچھی ہمزاز ہوں۔ ویسے غصہ نہیں کرتی مگر جب کرتی ہوں تو بہت زیادہ کرتی ہوں۔ امی ابو کی ہزینات ماننے کی کوشش کرتی ہوں۔ اللہ کی رضا میں راضی رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ جھوٹ نہیں بولتی۔ مگر ان جانے میں اکثر منہ سے پھسل جاتا ہے۔ میرے خیال میں میں ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوں۔ مگر باجی اسماء اور میری دوستوں کا کہنا ہے کہ میں بہت سڑی ہوئی ہوں۔ اتنی ہی کافی ہیں۔ میں نے کسی سے پوچھنے کی زحمت نہیں کی اور ہاں لوگوں کی باتیں بھول جانے کی کوشش کرتی ہوں۔

READING
Section

ایک اچھی مسلمان اور ایک اچھی ڈاکٹر بننے کے لیے
سعدی گل نگو

(1) چھوٹے تھے تب اپنی بڑی بہن اور کزنز کو گرمیوں کی لمبی دوسروں اور سردیوں کی لمبی راتوں میں شعاع پڑھتے دیکھ کر ہم اپنی حسرتوں پر آنسو ہی بہاتے تھے اور چپکے سے جب بھی موقع ملتا شعر و شاعری انٹرویوز، باتوں سے خوشبو آئے اور دیگر سلسلے پڑھ لیتے تھے۔ وقت گزرا ہم بڑے ہو گئے اور شعاع پڑھنے کی عادت بھی ہمارے ساتھ ہی بڑی ہوتی گئی۔ جب بھی بچا کے گھر جاتے وہاں سے کزن کے سارے رسالے اٹھا کے لے آتے، نئے پرانے اور پھر مزے سے پڑھتے رہتے۔ اب کچھ عرصے سے اپنا رسالہ خرید کر پڑھنا شروع کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم نے ادھر ادھر سے رسالے اٹھا کے لانے چھوڑ دیے ہیں۔

(2) سویرے معمول کے کام پھر اسکول کی تیاری، مین بچے واپسی۔ پسندیدہ رائٹرز میں تنزیلہ ریاض، فرحت اشتیاق، راحت جبین سرفہرست ہیں۔ ویسے مجھے کہانی اور مصنفین کے نام یاد نہیں رہتے اور نہ ہی میں بڑا نام دیکھ کر متاثر ہوتی ہوں۔ مجھے بس لکھنے کا انداز بیان کرنے کی صلاحیت متاثر کرتی ہے، موضوع چاہے نیا ہو یا پرانا۔ تنزیلہ ریاض ”یہی تیرا حوالہ ہے“ اور ”سورج کب رکھے“ مجھے کویاروں کے نام کے یاد ہیں حالانکہ کافی عرصہ پہلے بڑھی تھیں۔ افسانوں کی دنیا میں واقعی سب جھوٹ نہیں ہوتا لیکن بعض دفعہ حقیقت افسانے سے بھی زیادہ عجیب ہوتی ہے اور آپ کو ایسی الجھن میں ڈال دیتی ہے جس کا علاج بھی نہیں ہوتا اور دوا ابھی۔

(3) خوبیاں چند ایک ہی بتائیں گے۔ سنگھڑ، سیانی اور دیوانی (ہاہا) خامیوں میں یہ کہ Introvert ہوں feelings کو express نہیں کراتی۔ حساس حد سے زیادہ ہوں، کسی سے اعتبار نہیں کر سکتی۔ تنہائی پسند ہوں۔ بچپن سے لے کر آج تک جس بھی مقام پر پہنچے تعریف ہی سمیٹی۔ لہذا کوئی ایک آدھ جملہ یاد رکھنا نا

ممکن ہے۔ آج کل اسکول میں آفیسرز وغیرہ آئیں تو تعریف کرتے ہیں بہت اچھا لگتا ہے، تنہا کس کہتے ہیں۔ (میں گاؤں کے ایک اسکول میں رضا کارانہ طور پر پڑھا رہی ہوں) انسانیت کی خدمت سے بڑھ کر کچھ نہیں سوزیادہ تو نہیں لیکن تھوڑا سا ہم بھی اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(4)

لاکھ دوری ہو مگر عہد نبھاتے رہنا جب بھی بارش ہو میرا سوگ مناتے رہنا چمکتی دھوپ میں افق کے کسی کونے سے اچانک سے کالی گھٹائیں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے فلک پر چھا جائیں۔ چمچمچم مہو بر سے اور اچانک جل تھل ہو جائے۔ بارش کی یہ ادا بہت بھاتی ہے۔ دنوں ہفتوں تک سلسلہ چلتا رہے اچھا نہیں لگتا۔

(5) آج کل کا پسندیدہ شعر۔!

ہمیں جانے کہاں لے جائے گی آوارگی اس کی
ہوا کی راہ پاؤں کا سفر درپیش ہے دل کو
ہر موڑ ہر حال کا پسندیدہ شعر۔

تمہارے ساتھ دیکھی تھی وگرنہ زندگی ہم کو نہ تب محسوس ہوتی تھی نہ اب محسوس ہوتی ہے اس تب اور اب کے درمیان کی زندگی ہی اصل زندگی ہوتی ہے چاہے کچھ لکھوں کی ہی کیوں نہ ہو۔ کتاب سے مجھے محبت ہے اس لیے کسی ایک کا نام لکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ آج کل فرید احمد پراچہ کا سفر نامہ ”یہ فاصلے یہ رابطے“ اور مائیکل ہارٹ کی The Hunderd پڑھ رہی ہوں۔ دونوں اپنی نوعیت کی منفرد اور دلچسپ ہیں اور معلوماتی بھی۔ پسندیدہ اقتباس آج کل یہی ہے ”محبت وہ کمال ہے جو عرش کو فرش کرتا ہے اور فرش کو عرش تک لے جاتا ہے۔ زمین پر وہی چیزیں ہیں جن کے لیے جان دی جا سکتی ہے۔ محبت اور پھر محبت۔“

کتنا آساں تھا تیرے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے



اس کائنات میں اور بھی تو اتنے لوگ ہیں ہر وقت میرے ساتھ ہی برا کیوں ہوتا ہے۔ جن لوگوں پر میں جان چھڑکتی ہوں مجھے یہی دھوکا کیوں دیتے ہیں۔ بس جس کردار کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے ”میں“ ہوں یعنی یوں لگتا ہے رائٹر نے مجھے سوچ کر لکھا ہے نا خوش قسمتی!

بہت سی تحریریں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر میں فریض ہو گئی۔ عمودہ احمد کی تو ہر تحریر خاص طور پر ”پیر کامل“، ”ایمان امید محبت“ اور ”من و سلوی“ تینوں ناول میرے پاس ہیں اور جب جب ان کو پڑھتی ہوں پھر سو نہیں پاتی خاص کر ”من و سلوی“ کے ڈائلاگ تو دل پر اثر کرتے ہیں۔ نمروہ احمد کی ”بخت کے پتے“ ”اف نموہ“ کی کیا دہلیاں غیبی ہے آپ نے۔

صفت سحر ظاہر، فرحت اشتیاق کی کہانیاں پڑھ کر مجھے اپنے اندر ایک توانائی محسوس ہوتی ہے۔ پائی بھی کافی فیورٹ ہیں مگر ان کا مقابلہ نہیں۔ ان کی کوئی تحریر نہیں چھوڑی۔

(5) بارش تو پسند ہے مگر بارش کے بعد جو کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے وہ نہیں اتنے پٹنگے اور پتا نہیں کیا کچھ آجاتا ہے اور رات میں جو جس ہو جاتا ہے اوپر سے لائٹ کا نہ ہونا آف ایسا بارش جب بھی ہو میں پکوڑے بہت انجوائے کرتی ہوں بارش کھول نہ کھول انجوائے۔ کوئی خاص واقعہ تو یاد نہیں ہاں لاسٹ (Year) بارش میں بھائی کی شادی کی شاپنگ کرنا یاد ہے جو میرے اور میری فرینڈ ٹوشین کے لیے عذاب بن گئی تھی بازار کی کچڑ اور ہم دونوں کا حشر ہو گیا تھا۔ گلیوں میں بھی پانی ہی پانی تھا۔ وہ ننھے تالاب ہم نے چھپا رکھے (آخ)۔

سورق کی شخصیت

ماڈل _____ حمیرا مغل
 میک اپ _____ روز بیوٹی پارلر
 فوٹو گرافی _____ موسیٰ رضا

(6) پسندیدہ اقتباس تو دل چاہتا ہے اپنی سب فیورٹ رائٹر کے لکھ دوں مگر پھر رسالے میں اور کچھ نہیں میرے فیورٹ اقتباس ہی ہوں گے۔

”من و سلوی“ کا یہ اقتباس بہت فیورٹ ہے ”دکھ انسان کو یا تو ریت کی طرح ڈھا دیتے ہیں یا پھر چٹان کی طرح کھردرا بنا دیتے ہیں۔ زینبی پہلے ڈھے گئی تھی اور اب چٹان کی طرح کھردری بن گئی ہے۔“ اور ”یارم“ کا اقتباس۔

”بانو قد یہ کہتی ہیں ”محبت مرگ سے پہلے جنم کا نام ہے“ اور مجھے ایسا لگتا ہے ”محبت جنم سے پہلے مرگ کا نام بھی ہے“

پسندیدہ شعر تو بہت ہی ہیں مگر سب لکھ نہیں سکتی تو ایک پر گزارا کر رہی ہوں۔

ستارے مشعلیں لے کر مجھ کو ڈھونڈنے نکلیں میں رستہ بھول جاؤں جنگلوں میں شام ہو جائے اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے ہم اس سے ہٹ کر چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے جاتے جاتے ایک چھوٹی سی بات آپ سب سے کہتی جاؤں۔

”ایک ایسا شخص جس سے ملنے کے بعد تم ضبط کی آخری حدوں کو چھونے لگو تمہارے اندر زہر اور کڑواہٹ دوڑ رہی ہو جو کبھی تمہاری پسند اور سوچ کے مطابق یعنی سوچ کے معیار پر پورا نہ اترے وہ شخص کبھی بھی دوست کہلانے کے قابل نہیں اس سے تنہائی ہزار درجے بہتر ہے۔“

”اور جب دل بھر آئے تو خوب رو لینا چاہیے کہ آسمان پر چھائے بادل کبھی کبھار خوب گرج چمک کر برستے ہیں اور نتیجہ ایک چمکتا دکھتا سورج ہوتا ہے۔“ اور کسی نے کیا خوب کہا کہ ”زندگی ہمیں ہمارے منصوبوں کے مطابق جینے کا حق نہیں دیتی۔“



یکٹی مشال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مشال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو" سے لگاؤ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سائچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا بالا خراک ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہرہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈیکوری کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زہیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زہیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

سنا یہ سول اور آخری قیظہ

Downloaded From
Paksociety.com



Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section



وہ ایک بڑا دلن تھا۔

مثال کے لیے شاید بہت برا۔ سینیفی اس کی زندگی تباہ کرنے کا پورا منصوبہ بنائے ہوئے تھا۔ اس کا پہلا فون میسج مثال کو خوف زدہ کر گیا۔

”میں جانتا ہوں تم مجھے مس کرتی ہو۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں ابھی تمہارے حسن کے سحر میں گرفتار ہوں اور اتنی دور سے صرف تمہیں دیکھنے نہیں آیا بلکہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں اور میرا دل کتا ہے تم چند ہی دنوں میں واثق کو چھوڑ کر میرے ساتھ جا رہی ہوگی۔ میرے ساتھ۔“

وہ دل کر رہ گئی تھی اس کا یہ میسج پڑھ کر۔ اور یہ آخری اور کاری ضرب ہوگی میری تباہ شدہ زندگی کو فنا کرنے کے لیے۔ اس نے ایک دم سے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ پہلے والی ڈوری سہمی مثال بن گئی تھی۔

واثق کب اس کے پاس آکر کھڑا ہوا اسے کچھ بتا نہیں چلا تھا۔

”یہ میری شرٹ پر لیس ہونے والی ہے۔“ اس کی قریب سے آئی آواز نے اسے بے اختیار چونکا دیا تھا۔

بیل فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کارپٹ پر گر گیا تھا۔

اس نے تیزی سے چھوٹ کر فون اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے شرٹ لے کر جانے لگی۔

”کس کا فون تھا؟“ واثق نے پوچھا۔

”کسی کا نہیں۔“ وہ مڑے بغیر جواب دے کر باہر چلی گئی۔

دونوں کے درمیان پچھلے کچھ دنوں سے عجیب سی سرد مہری آگئی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے بات کرنے سے گریزاں تھے۔

اسے لگتا تھا کہ واثق اس سے بے زار ہو گیا ہے، دل اکتا گیا ہے اس کا مثال سے۔ یہ سوچ اسے رلا دیتی تھی۔

آنسو ضبط کیے بے دھیان سی یوں ہی پھرتی رہتی اور واثق کو لگتا تھا کہ مثال کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ وہ اسے خوش بھی نہیں کر سکا۔ وہ ساری خوشیاں جو اس نے مثال کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ان میں سے کچھ بھی نہیں دے سکا۔

پری کچھ دنوں سے خاموش تھی۔ پردہ اسکرین سے عائب واثق کو لگنے لگا تھا شاید وہ مدھم گئی ہے۔ اگرچہ اس کا امکان کم ہی تھا۔ وہ تیار ہوتے ہوئے یہی کچھ سوچے جا رہا تھا۔

مثال کمرے کی چیرس ٹھکانے پر رکھتے ہوئے باہر جانے لگی تو واثق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ کچھ پریشان سی اسے دیکھنے لگی۔

”بیٹھو یہاں میرے پاس۔ بات کرو مجھ سے۔ تمہارے دل میں کیا ہے؟ کیوں تمہارا رویہ میرے ساتھ اتنا تکلیف دہ ہو رہا ہے۔“ وہ جیسے برداشت کی سب حدوں سے گزر رہا تھا۔

”میرا رویہ تکلیف دہ ہے؟“ وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں کئی بار تو تمہیں بلانے کی کوشش کر چکا ہوں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”کیا میں نے کوشش نہیں کی؟“ وہ رندھے گلے کے ساتھ بولی۔

وہ اسے دیکھا رہ گیا۔

”ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ غلط کر رہے ہیں یہ خواہ مخواہ کی غلط فہمیاں۔“ وہ رک گیا۔

”مثال! میں نے صرف تم سے محبت کی ہے۔ صرف تمہیں چاہا ہے۔ تمہیں ہی سوچا ہے۔ کم از کم تمہیں مجھ پر میری محبت پر یوں شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس لڑکی کی وجہ سے۔“ وہ رک رک کر بات کر رہا تھا۔ جو بات کبھی نہ کرنے کا اس نے اعلان کیا تھا۔

”تم تو اسے مجھ سے بہتر جانتی ہو وہ کبھی نہیں چاہے گی کہ تم ایک خوش حال اچھی زندگی گزارو۔“
 ”لیکن وہ سب کچھ جو اس نے کہا۔۔۔ واٹن۔۔۔ مثال کے بغیر رہ نہ سکی۔ واٹن اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ پھر فیصلہ کن انداز میں سر جھٹک کر رہ گیا۔

”وہ ورہ کی دوست تھی اور ایک دو بار ہمارے گھر آچکی تھی اور بہت گھٹیا انداز میں وہ مجھے ٹریپ بھی کرنا چاہتی تھی مگر مجھے تو وہ کبھی بھی اچھی نہیں لگی۔۔۔ کچھ لوگ جن سے آپ پہلی بار ملیں یا ہر روز اگر ایک بار آب کا دل ان کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کر چکا ہے تو پھر وہ کبھی اچھے نہیں لگتے۔ لگ ہی نہیں سکتے۔ مجھے پری کبھی بھی اچھی نہیں لگی، جبکہ میں اس سے ملنے سے ہی پہلے تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اسے کیسے پسند کر سکتا تھا۔“ وہ رک رک کرتا رہا تھا۔

”اور آپ نے پہلے مجھے یہ سب کچھ نہیں بتایا۔“ مثال تلخی سے جتا کر بولی۔

”میرے نزدیک یہ اتنا اہم نہیں تھا کہ میں۔۔۔ تمہیں بتاؤں۔۔۔“ وہ اسی لہجے میں بولا تو مثال اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”کیا اب بھی تمہیں میرا یقین نہیں؟“ وہ کچھ خائف ہو کر پوچھ رہا تھا۔

”ایک آپ پر ہی تو مجھے یقین ہے اس پوری دنیا میں واٹن! آپ ناراض تھے مجھے لگ رہا تھا۔ ساری دنیا مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس سے میں اپنا درد کہہ سکتی۔ اتنے دن مجھے اس واٹن کی کمی شدت سے محسوس ہوئی جس کے مجھ سے دوستی کے دعوے تھے اور اس سے میں اپنی ہر مشکل کہہ دیتی تھی۔“ وہ آنکھوں میں آنسو لیے شکایتی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”وہ تو اب بھی تمہارا دوست ہے۔ دیکھو۔۔۔ میں پکڑ لایا ہوں اسے تمہارے پاس۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا اور وہ اس کے سینے سے لگی روئے ہوئے مسکرا رہی تھی۔



”ورہ!“ وہ بک شاپ سے نکل رہی تھی جب پچھلے سے کسی نے اسے پکارا۔ اس کے پیچھے شہزاد کھڑا تھا۔

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ پاس آکر قدرے اپنائیت سے بولا۔

”قائن!“ وہ نارمل انداز میں کہہ کر جانا چاہتی تھی۔

”کیا ہم کچھ دیر کے لیے بات کر سکتے ہیں۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”کون سی بات۔۔۔؟“ وہ چونکی۔

”اگر آپ کچھ ٹائم دیں تو۔۔۔؟“ وہ کچھ جھجکا۔

”مجھے گھر جانا ہے۔ میں لیٹ ہو جاؤں گی۔“ وہ گھڑی دیکھ کر متذبذب لہجے میں بولی۔

”میں آپ کو ڈراپ کروں گا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔“ اس نے فوراً انکار کیا۔ وہ شہزاد کی نظروں سے الجھ رہی تھی۔

”پلینز۔۔۔ میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا۔“ وہ ہلکی لہجے میں بولا۔

وہ جیسے کچھ سوچنے لگی۔

”آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے کیا؟“ وہ کچھ شکایتی لہجے میں بولا۔

”نہیں! اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔“

”چلیں۔۔۔ میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔ ہم راستے میں بات کر لیں گے۔ اس میں آپ کو دیر بھی نہیں ہوگی۔“ اس نے وردہ کا تذبذب بھرا انداز دیکھ کر آفری۔
 ”ٹھیک ہے۔ چلیں۔۔۔ وہ انکار نہیں کر سکی، دونوں پارکنگ میں کھڑی شہزادی کی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔



”کیا مطلب۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔“ پری نے الجھن بھری نظروں سے سامنے بیٹھے سیفی کو دیکھا۔
 سیفی پری کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنس پڑا۔

وہ بلیک سیولیس آؤٹ فٹ میں بھرپور دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ حالانکہ عفت نے اسے گھر سے اس ڈریس میں نکلتے ہوئے ٹوکا بھی تھا۔ عفت کے سامنے اس نے ہلکا سا دوپٹا لے لیا تھا۔ جواب اس کے پیٹڈ بیگ میں پڑا تھا۔
 ”ہنسے کیوں۔۔۔؟“ وہ کچھ سمٹ کر خفگی سے بولی۔

”ہاں تو یار محبت کرتا ہوں تو اس کے پیچھے لندن سے دوڑا یہاں تک آیا ہوں۔“
 ”پھر تم اب کیا کرنے والے ہو؟“ وہ کچھ بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔
 ”تمہیں جلدی کیوں ہے؟“ وہ جیسے اسے سامنے دیکھ کر انجوائے کر رہا تھا۔

”جلدی نہیں۔ میں جاننا چاہتی ہوں تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔“ وہ بات بدل کر بولی۔
 ”مگر میں کہوں اس وقت تو میرے دل و دماغ میں صرف تم چل رہی ہو تو۔۔۔؟“ وہ معنی خیزی سے بولا۔
 ”تو ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔ اگر تم نے صرف مذاق کرنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے تو۔۔۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر اٹھنے لگی۔

”او نہوں بیٹھو۔ سوری نا۔ یوں ہی اچھا لگ رہا ہے تم سے یوں فرینڈلی ہو کر بات کرنا۔ تمہاری پرستاشی میں بہت چارم ہے۔“ وہ الٹا اسے سراہنے لگا تو پری بیٹھ گئی۔
 ”کیا تم واٹن کو پسند کرتی ہو؟“ سیفی نے پری کے قریب ہی دھماکا کیا۔ ”اسی لیے چاہتی ہوں نا کہ ان دونوں میں سپریشن ہو جائے۔“ وہ ماک ماک کر نشانے لگا رہا تھا۔

”ہرگز نہیں۔ میں کیوں ایسا چاہوں گی۔“ وہ چہرے کا رخ دوسری طرف کر کے بولی۔
 ”دیکھو۔ کسی بھی ڈیل کا پہلا اصول لیسر نہیں ہوتی ہے، جب تک مجھے نہیں معلوم ہوگا کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو اور تمہیں پتا نہیں ہوگا کہ میں کیوں انٹرسٹڈ ہوں اس سارے معاملے میں، تو کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے ہم۔“ وہ اسے بچوں کی طرح سمجھا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے ہمیں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مجھے واٹن پسند ہے اسی لیے چاہتی ہوں کہ۔۔۔“
 ”ان دونوں میں علیحدگی ہو اور واٹن تمہیں مل جائے، مثال مجھے ہے نا؟“ وہ اس کی بات درمیان سے اچک کر بولا۔ وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔

”او کے نائٹس۔ میں مثال سے ملنے کے لیے جا رہا ہوں، ابھی کچھ دیر میں۔ تم کسی طرح واٹن کو یہ بتا دو، اگر وہ وہاں اچانک سے آجائے تو میرے خیال میں ہمارا کام بن جائے گا۔ آج ہی۔۔۔“ وہ جوش بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”بھی شام ہو رہی ہے۔ موسم بھی کچھ بارش والا ہو رہا ہے۔ واٹن تو میرے خیال میں آفس سے اٹھنے والا ہوگا۔“ وہ سوچ کر بولی۔

”او نہوں۔ سنو۔“ وہ اسے کچھ بتانے لگا۔



”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ورنہ کچھ پریشان ہو گئی۔
 ”کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟“ وہ الٹا پوچھ رہا تھا۔
 ”P تھیک بھی نہیں ہے۔“ وہ برسرِ ملائی۔

”کسی کو پسند کرنا جرم نہیں ہے۔ ورنہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ کا پروپونزل لے کر آپ کی ماما اور واثق کے پاس آنا چاہتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں وہ دونوں صاف انکار کریں گے۔ مجھے اس جرم کی سزا ضرور ملے گی جو میں نے کیا ہی نہیں۔“ وہ کچھ نخئی سے بولا۔

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ وہ کچھ الجھ کر بولی۔
 ”اگر میں اپنا پروپونزل لے کر آؤں، آپ سے پوچھا جائے تو۔“ وہ بولتے ہوئے رک گیا۔
 ”آپ انکار تو تمہیں کریں گی ورنہ؟“

”میں صرف وہ کروں گی جو میری ماما اور بھائی چاہیں گے۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔
 وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”واثق بزنس سے پارٹنرشپ الگ کرنا چاہتا ہے۔ یقین کرو ورنہ! میں نے واثق کو اپنا بھائی ہی سمجھ لیا تھا، بہت اپنائیت محسوس کرنے لگا تھا میں آپ کی فیملی کے لیے۔ پاپا سے بات کر کے آپ کے لیے پروپونزل بھیجنے والا تھا لیکن پھر سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔“ ورنہ اسے دلتی رہ گئی۔



دانی پوری رات گھر نہیں آیا تھا اور اس بات کا علم عفت کو بہت دیر میں ہوا تھا۔ اس کا سبب بھی آف جا رہا تھا۔
 وہ بار بار دانی کا نمبر ملائی اور اس کی پریشانی ایک ہی ٹیپ کو چلتے سن کر بڑھتی جا رہی تھی۔
 ”اومانی گاڈ! مجھے یہ خیال تو آیا نہیں۔“ مسلسل گمرے میں ٹھکتے ہوئے وہ ایک خیال سے ٹھکی تھی۔ تیزی سے لا کر کی چابی نکال کر اس نے الماری کالا کر کھولا۔

”عدیل نے جو رقم کالفاہ دیا تھا۔ وہ کہاں ہے؟“ وہ لا کر میں تلاش کر رہی تھی۔ ایسا کوئی بھی لفاہ صرف لا کر ہی نہیں اس کے پرس میں موجود تھوڑی بہت رقم میں سے کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ سخت ہراساں سی بیٹھی رہ گئی۔

”تو کیا یہ ساری رقم دانی لے گیا۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ دانیال ایسا تو کبھی نہیں کر سکتا۔ اتنی بڑی رقم وہ نہیں لے جاسکتا۔“ اس کا دل کسی بھی طور اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔
 ”میرری جیولری پری کاز یور۔“ بیکلی کے کوندے کی طرح خیال اس کے دماغ میں لپکا تھا۔ اس نے جلدی سے جیولری باکس کھولے۔ اس کی چھٹی حس نے ٹھیک الارم کیا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ خالی لا کر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

”میرے اللہ! یہ کیا ہو گیا میرے ساتھ۔ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، برا نہیں چاہا، پھر میرا بیٹا ایسا کیوں نکلا۔ وہ کس شاطر کے جال میں پھنس گیا۔ میں اب عدیل کو کیا بتاؤں گی۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے ساکت بیٹھی رہ گئی۔



مثال آج بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔
 شادی کے تین مہینے بعد آج پہلی بار جیسے وہ خود کو بہت مضبوط محسوس کر رہی تھی۔ واثق نے جس طرح اپنے
 دل کی ہریات اس سے کھول کر رکھی تھی۔ اس کی محبت اور شدت نے مثال کو کچھ شرمندہ کر دیا تھا۔
 پری کی فطرت کا اندازہ ہوتے ہوئے بھی واثق اور پری کے درمیان تعلق کو ایسا رنگ و بنا بہت ہی گھٹیا بات
 تھی۔ جسے واثق سے کرتے ہوئے اسے پری کے نہیں اپنے شوہر کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔
 ”اور یہ پری تو چاہتی یہی ہے کہ کسی بھی طرح میری زندگی میں صرف مشکلات اور مصائب آئیں۔ ماما ٹھیک
 کہتی ہیں کہ مجھے صرف واثق کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرنا چاہیے، صرف اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“
 وہ خود کو سجانے سنوارنے کے بعد آئینے میں دیکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں خوشی۔ سچی خوشی کی چمک تھی۔ وہ خود کو دیکھتی جا رہی تھی۔ مجھے چاہیے تھا۔ میں واثق
 سے کہتی وہ آج جلدی گھر آجاتے ہم کہیں اونٹنگ پر جاتے خیال آیا تو فون اٹھا کر واثق کا نمبر ملانے لگی۔
 ”مثال بیٹا! تمہارے پیپا آئے ہیں تم سے ملنے کے لیے۔“ اسی وقت عاصمہ اندر آکر بولی تو اسے خوش گوار
 سی حیرت ہوئی۔

”پیپا آئے ہیں۔“ وہ بے یقینی سے جیسے پوچھ رہی تھی۔
 ”ہاں آ جاؤ جلدی۔ اور سنو مجھے اپنی ایک دوست کی عیادت کے لیے اسپتال جانا ہے۔ اس کا آپریشن ہوا
 ہے۔ واثق تو لیٹ ہے۔ میری ابھی اس سے بات ہوئی ہے۔ ورنہ آتی ہے تو میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ تم
 بعد میں سب دیکھ لو گی نا۔“ وہ بہت محبت سے کہہ رہی تھی۔
 ”میں دیکھ لوں گی آئی! آپ پریشان نہ ہوں واثق آجائے تو آپ ان کے ساتھ چلی جائیں۔“
 ”بیٹا! دو دن سے ٹال رہی ہوں۔ اب فون بھی کر دیا ہے کہ میں آرہی ہوں پھر موسم بھی خراب ہو رہا ہے۔ اگر
 کچھ دیر اور انتظار کرتی رہی تو ایسا نہ ہو کہ پارش شروع ہو جائے۔ میں جلدی واپس آ جاؤں گی۔“
 دونوں باتیں کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔



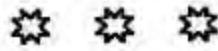
عدیل کی آمد مثال کو جیسے کوئی خزانہ دے گئی۔ بہت سے پھل مٹھائیاں، تھلے اور ہتیا نہیں کیا کیا۔
 ”بھائی صاحب! آپ یہ سب اتنا کچھ کیا اٹھا کر لے آئے۔ کیا ضرورت تھی اس سارے تکلف کی آپ کا اپنا
 گھر ہے۔“ عاصمہ نے سب کچھ دیکھ کر کچھ حنفی سے کہا۔
 ”پنا گھر ہے تو اسی لیے لے کر آیا ہوں نا، آدمی اپنے گھر میں ہی اتنا کچھ خوشی سے لاتا ہے نا۔“ عدیل بہت
 اپنائیت بھرے انداز میں سچی سنوری مثال کو دیکھ کر دل میں شکر کرتے ہوئے بولا۔
 ”آپ نے تو لاجواب کر دیا عدیل بھائی! اگرچہ اس سب کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نے ہمیں اتنی پیاری بیٹی
 جو دے دی ہے۔ ہمیں اس سے بڑھ کر اور کچھ چاہیے بھی نہیں۔“
 عاصمہ مثال کو اپنے ساتھ لگا کر پار سے بولی۔ عدیل کا دل گہرے جذبات سے بو جھل سا ہو گیا۔
 دل چاہ رہا تھا ابھی سجدے میں گر کر اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کرے کم ہے کہ بالآخر اس کی مثال کی سختی کے دن کٹ
 ہی گئے۔ خوشیاں اسے مل ہی گئیں۔

عاصمہ دو چار باتیں کرنے کے بعد معذرت کر کے چلی گئی تھی۔
 ”فوزیہ پھوپھو! مثال ششدر سی باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔“

”ہاں۔ ابھی کچھ دیر میں نکلوں گا۔ ایئر پورٹ کے لیے سات بجے فلائٹ ہے اس کی۔ سوچا جانے سے پہلے تم سے مل جاؤں اتنے دنوں سے میں نے اپنی بیٹی کو دیکھا نہیں۔“ عدیل محبت سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔

”میں بھی آپ کو بہت مس کر رہی تھی بابا۔ اینڈ تھینکس یہ سب کچھ جو آپ لے کر آئے ہیں۔“ وہ باپ سے لپٹ گئی۔

”وہ نموں۔ تو تھینکس۔“ وہ اس کا سر تھپک کر محبت سے بولا تھا۔



”یہ کیا کہہ رہی ہو تم وردہ!“ پری کچھ بے یقینی سے بولی۔

”ہاں نایا ر! بالکل سچ!“ وردہ دبے دبے جوش سے بولی۔

”اتنا پنڈ سم ہے اتنا گڈ لکنگ اور بے حد سمجھ دار اتنی بڑی پراپرٹی کا اکلوتا وارث۔ یار! آئی ایم کنفیوژنٹ۔“ اس کے لہجے سے صاف لگا وہ بری کو جلانا چاہ رہی ہے۔

”سہیلی۔ ویسے باکی داوے اسے کیا تم اتنی حسین لگیں؟“ پری بھی چونکنے والی نہیں تھی۔ طنز سے بولی۔

”تو کیا نہیں ہوں میں۔؟“ وہ بھی کچھ اترا کر بولی۔ ”چھایا ر! ہتاؤں نا۔ اس نے مجھ سے جواب مانگا ہے اگر وہ میرے گھر پر پوزل بھیجتا ہے تو میرا جواب کیا ہو گا؟“ وہ اصرار بھرے لہجے میں بولی۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“ پری کچھ اکتا کر بولی۔ اسے واثق سے ملنے جانا تھا اور وردہ فضول بکواس میں اس کا ٹائم خراب کر رہی تھی۔

”یار! تم بتاؤ نا میں کیا کروں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ وہ بھی منحنی بچی کی طرح کچھ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

”میں ہوتی نا تمہاری جگہ تو اس پر پوزل کے چکر میں ہی نہیں پڑتی۔“ پری نے اپنے میک اپ کو آخری ہلکا سا

لہجہ دیا۔

”کیا مطلب۔؟“ وردہ نا سمجھی سے بولی۔

”اس سے کہتی ۴ بجے میرے ساتھ کورٹ میرج کر لو سب معاملہ سمٹل ہو جاتا ایک دم سے۔“ وہ اچانک سے بولی تو وردہ دھک سے رہ گئی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

اسے پری سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔

”وہی جو میرا جواب ہونا چاہیے تھا۔ سچ کہوں یار! ایسا گولڈن چانس کبھی مس نہیں کرتی تم بھی بہادر بنو۔“ وہ اسے اکسار ہی تھی۔ باہر سے عفت کی چیخ سی سنائی دی۔

”وہ ما۔۔۔ مجھے بلارہی ہیں۔ میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔“

”یار! اس کی ماں آئے کی ابھی۔“ وردہ پریشان سی بولتی رہ گئی۔ دوسری طرف سے فون رینگا ہوا تھا۔ وردہ کچھ سوچنے لگی۔



”میں نہیں جانتا پاپا نے آپ لوگوں کے ساتھ کتنا برا کیا ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں واثق! انہیں میں نے پوری زندگی میں کبھی خوش نہیں دیکھا۔ آخری وقت تک وہ عاصمہ آنٹی سے معافی مانگنا چاہتے تھے۔“

شہزاد آہستہ آہستہ ہم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ کافی دنوں بعد دونوں یوں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کر رہے تھے۔

”اب ان باتوں سے کچھ فرق نہیں پڑتا شہزاد! وہ کڑا وقت جو ہم نے جھٹلا، میری ماں چار بچوں کے ساتھ بے آسرا بے سہارا اور جس کی ساری متاع کوئی لوٹ کر لے جائے، میں اور تم گنہگار بھی اس کی بے کسی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔“ واثق سختی سے بولا۔ ”معاف کرو، آسان لگتا ہے مجھے اور تمہیں۔ لیکن ایسا ہے نہیں۔“ وہ جتانے والے انداز میں بولا۔

”میں جانتا ہوں۔“ شہزاد آہستگی سے بولا۔

”میں صرف یہ چاہتا ہوں جب تک ہم دونوں میں پارٹنرشپ ہے تم اپنے لہنگے ایڈوائزر سے مشورہ کر چکے ہو اور بزنس کی کنڈیشن بھی تمہارے سامنے ہے۔ ایک دم سے تم اپنا شیئر نہیں نکال سکتے۔“ وہ بولتے ہوئے رکا۔ واثق کے چہرے پر کچھ سختی تھی۔

”لیکن میں تمہیں پارٹنرشپ کے لیے فورس بھی نہیں کروں گا۔ چھ سات ماہ میں جیسے ہی حالات بہتر ہوتے ہیں تم الگ ہونا چاہو گے تو میں بخوشی وہ سب کروں گا جو تم چاہو گے۔“

”لیکن اس طرح ساتھ کام کرنا بھی مشکل ہے۔“ واثق جتا کر بولا۔

”سب کچھ بھولنا ناممکن ہے لیکن ہم کوشش تو کر سکتے ہیں جتنا بھی وقت ہمیں ساتھ گزارنا ہے۔ ہم اچھے طریقے سے گزاریں۔“

”میں کوشش کروں گا۔“ واثق یوں ہی سر ہلا کر بولا۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”کیا یہ ممکن ہے واثق۔ میں عاصمہ آئی کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ کچھ دیر بعد جھجک کر بولا۔

”بھی نہیں۔ ابھی ماما اس بات کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔“

”میں بات کر لوں گا پلیز۔ اگر تم منع نہیں کرو تو۔ میں کسی دن۔“

”ٹھیک ہے۔ دیکھ لیتا۔“ واثق صاف منع بھی نہیں کر سکا۔ شہزاد کے چہرے پر خوشی تھی۔



”ماما پلیز۔ پانچ منٹ صرف رکنا ہے مجھے پری سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز، صرف پانچ منٹ کے لیے۔“

وردہ عاصمہ کے ساتھ آگئی تھی اور پری کے گھر کی طرف گاڑی مڑواتے وہ ماں سے منت بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

”وردہ! تم جانتی ہو ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ ابھی اسپتال کے راستے میں بھی بہت رش ہو گا۔ موسم بھی ٹھیک نہیں ہے، تمہیں سمجھنا چاہیے۔“

عاصمہ ڈرائیور کا لحاظ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کچھ سختی سے بولی۔

”پلیز ماما! صرف پانچ منٹ میں آ جاؤں گی۔ پراس۔۔۔۔۔ مجھے اس سے ایک بہت اہم بات پوچھنی ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

وردہ عاصمہ کا جواب سنے بغیر تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ عاصمہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

”پانچ بجنے والے ہیں۔ یہ لڑکی مجھے اور دیر کروائے گی۔ مجھے اس کو ساتھ لے کر ہی نہیں آنا چاہیے تھا۔“

عاصم محل میں پچھتا رہی تھی۔ ورنہ کو ساتھ لانے پر۔ اسی وقت واٹن کا فون آگیا۔
 ”ہاں بیٹا! ہم لوگ گھر سے تو چل پڑے ہیں۔“

”ورنہ ہے میرے ساتھ۔ تم گھر آ رہے ہونا؟“

”نہیں امی! مجھے آفس میں کچھ وقت لگ جائے گا لیکن پھر بھی میں کوشش کروں گا۔ آپ جلدی آجائے گا۔“
 ”میں تو آ ہی جاؤں گی تم بھی دیر نہیں کرنا۔“ اسے یہ کہہ کر اور فون بند کر کے وہ ورنہ کا انتظار کرنے لگی۔



”وانی کے بارے میں۔ میں آپ کو بہت پہلے سے خبردار کرتی آرہی تھی۔ وہ کسی بہت بری کمپنی میں پھنس گیا ہے۔“ پری کچھ جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں ماں سے کہہ رہی تھی۔ عفت وقفے وقفے سے رو رہی تھی۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ عدیل کو فون کرے تو کیا بتائے وہ تو پہلے ہی اس سے بہت نالاں تھا۔
 ”مگر اس کا کچھ پتا تو چلے۔ وہ خیریت سے ہے۔ اتنی زیادہ رقم زیور لے کر وہ کہاں گیا ہے۔ پری! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ عفت بے تحاشا روتے ہوئے تڑپ رہی تھی۔

”اس کے فرینڈز کو کال کی آپ نے؟“ وہ کچھ سوچ کر بولی۔

”جتنے نمبر میرے پاس تھے سب سے بات کر چکی ہوں۔ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“
 عفت غم سے تڑھال تھی۔

”نہ جانے میرے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔ کس کی بددعا کھا گئی میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا۔ اس مثال منحوس کی نحوست میرے گھر کی خوشیوں کو کھا گئی۔ وہی تھی ایک بلا سب کچھ تباہ و برباد کرنے والی، میرا دل کھتا ہے۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اس کو تو آپ دیکھیے گا اس کی تباہی کا میں نے کیا بندوبست کیا ہے۔ ساری زندگی سر پکڑ کر روتی رہے گی۔“
 یہ پری کی آواز تھی جو باہر سے تیزی سے آئی ورنہ نے سنی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہو اس منحوس کو کیا ہونے والا ہے کچھ بھی نہیں۔ شوہر اور دم بھرنے والی ساس کے ساتھ عیش بھری زندگی گزار رہی ہے۔“ عفت جل بھن کر کہہ رہی تھی۔
 ”ختم ہونے والا ہے ماما جانی! آپ دیکھیے گا۔ واٹن اسے طلاق دینے والا ہے۔ میری بات لکھ لیجیے۔“ وہ نفرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ باہر کھڑی ورنہ دھک سے رہ گئی۔

”کیا اول فعل بک رہی ہو دیوانہ ہے وہ اس کا۔۔۔ وہ کیوں اسے چھوڑے گا۔“ عفت جیسے کراہی۔
 ”سینیٹی۔ اس کی بشری ماما کا سوتیلا بیٹا۔ ابھی کچھ دیر میں مثال کی زندگی تباہ کرنے جا رہا ہے۔ کچھ نہیں بچے گا اس کے پاس ساری زندگی منہ چھپاتی پھرے گی۔ لوگ تمہو تمہو کریں گے اس پر اور اس کے ماں کے کروار پر۔ ماما ہمارے سارے بدلے پورے ہو جائیں گے۔“

”اور وہ واٹن۔ اس نے جتنا مجھے دھتکارا ہے وہ بھی ساری زندگی پچھتائے گا، آگ میں جلے گا، جب اس کی بہن کو میں گھر سے بھاگنے پر اکساؤں گی۔ صرف چند دن کی بات ہے۔ اس کا بزنس پارٹنر واٹن صاحب کی بہن کو لے کر اٹن چھو ہو جائے گا۔ ساری عزت خاک میں ملنے والی ہے ان لوگوں کی۔ واٹن مجھے ملے یا نہ ملے مگر میں اسے مثال کا بھی نہیں رہنے دوں گی۔ پیاپا۔۔۔ جو جان دیتے ہیں اپنی اس مثال پر۔ کبھی اس کی شکل نہیں دیکھیں گے۔ عبرت کی مثال بننے والی ہے وہ۔“ وہ نفرت، جوش اور جلن میں بولے جلے جا رہی تھی۔
 ورنہ سے اس سے زیادہ سنا نہیں گیا۔ وہ پتھر ہوتے قدموں کے ساتھ باہر نکل گئی۔



عدیل، فوزیہ کو اتنے سالوں بعد اپنے سامنے دیکھ کر بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ وہ بھی اس سے لپٹ کر روئے جا رہی تھی۔

”بہت تڑپتی ہوں عدیل تمہارے لیے۔ تم سے ملنے کے لیے اپنے گھر و وطن کے لیے اتنی دور مجھے کیوں بھیج دیا تھا۔“ وہ اس کے گلے سے لگی تڑپ رہی تھی۔

”تقدیر کے لکھے کو پورا کرنا ہی پڑتا ہے پگلی! تم ٹھیک ہونا۔ اتنے سالوں بعد سہی ہم مل تو لیے۔“ عدیل نے اس کی آنکھیں صاف کیں۔

”ہاں بیس میں دن رات دعا کرتی تھی کہ ایک بار میں اپنے بھائی سے مل لوں۔ اسے دیکھ لوں، کچھ قرض ہے، وہ ادا کروں، پھر بھلے وہ مجھے بلا لے اپنے پاس۔“ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

”شش۔ کیسی باتیں کر رہی ہو، اللہ نہ کرے تمہیں کچھ ہو اور قرض کون سا ہے بھلا تم پر۔“ عدیل اس کی طرف کا گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے محبت سے کہہ رہا تھا۔

”اور تم خالد کو ساتھ نہیں لائیں۔ اتنے سال ہو گئے اس سے ملے ہوئے۔ میری تو فون پر بھی اس سے بات ہوئے شاید تین سال سے زیادہ کا وقت بیت گیا ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ فوزیہ باہر دیکھتے ہوئے مختصرًا بولی۔
عدیل کچھ اور پوچھنے لگا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔



”اس وقت۔“ پری نے کچھ چونک کر کہا۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ ”مشکل ہے۔“ وہ محتاط لہجے میں بولی۔

”جانتی ہوں میں، کتنا ضروری ہے۔“ وہ زبردست بولی۔
”اوکے۔ میں دیکھتی ہوں۔“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

عفت دانی کے کچھ اور دوستوں کے نمبروں پر کوشش کر رہی تھی۔
”ماما! میں جا کر معلوم کروں اس کا جو فاسٹ فریڈ عامم ہے۔ اس کے گھر جا کر۔“ وہ پاس آ کر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”تم جاؤ گی اس وقت۔ اور پھر وہ صاف کہہ چکا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں ہے دانی کے بارے میں۔“ عفت کچھ تشویش سے بولی۔

”ماما! فون پر بات کرنے سے زیادہ سامنے بات کرنا موثر ہوتا ہے۔ میں اس سے کچھ نہ کچھ اگلوالوں گی، اس کا گھر بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے میں پاپا کے آنے سے پہلے واپس آ جاؤں گی۔“

وہ سب کچھ سوچ چکی تھی کہ اسے کس بہانے سے گھر سے نکلنا ہے۔
”پری! یہ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ عفت متذبذب کجے میں کہہ رہی تھی۔

”تو کیا کریں گی۔ پاپا کو بتادیں گی کہ دانی رات سے گھر سے غائب ہے۔ نہ صرف غائب ہے بلکہ تین لاکھ کی رقم اور گھر میں موجود سارا زیور بھی لے جا چکا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ عدیل کی زوردار آواز ان دونوں کے لیے دھماکے سے کم نہیں تھی۔



عدیل سر پکڑے بیٹھا تھا۔ فوزیہ اور عفت اس کے پاس بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔
 ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس حد تک بھی جاسکتا ہے۔“ عدیل بے حد تھکی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔
 ”میں نے ہر ممکن کوشش کی عدیل! کہ میں اسے راہ راست پر لاسکوں۔“ عفت صفائی دینے والے انداز میں
 کہہ رہی تھی۔

”تم تو چپ ہی کر جاؤ عفت! یا تمہارے پاس ابھی بھی کچھ کہنے کے لیے ہے۔“ عدیل کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ عفت
 دوبارہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”مجھے تو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ دانی کو یہ جنون اتنا زیادہ ہے۔ میں تو اس لیے منع کر رہی تھی کہ ابھی اس کی ایج
 کم ہے۔ وہ کچھ تو اپنی اسٹڈیز مکمل کر لے تو ایک دو سالوں میں اسے بلا لوں گی پھر سیشنل ہونے میں زیادہ مسئلہ نہیں
 ہوگا۔“ فوزیہ دکھی سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ عفت نے اسے تیز نظروں سے دیکھا اور یوں ہی سر کو جھٹکا۔

”سب طرف معلوم کر آیا ہوں اس کے سب دوستوں کی طرف۔ کہیں بھی نہیں ہے وہ کسی کو بھی نہیں
 معلوم اس کے بارے میں کچھ۔ کیا کروں میں کہاں جاؤں۔ رات سر رہے۔ موسم خراب ہو رہا ہے۔ کہاں
 تلاش کروں اسے جا کر۔ دانی! یہ تم نے کیا کیا۔“ عدیل عدھال سا کرسی کی بیک سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔
 فوزیہ ترس بھری نظروں سے عدیل کو دیکھتی رہی۔

”پری کہاں ہے؟“ عدیل کو خیال آیا تھا۔
 ”اپنے کمرے میں ہی ہے۔ بہت پریشان ہے وہ بھی۔“ عفت کچھ نظریں چرا کر بولی۔

”پولیس اسٹیشن جاؤں۔ اب رپٹ کراؤں۔“ عدیل تھکی ہوئی آواز میں بولا تو عفت مزید پریشان ہو گئی۔
 ”عدیل۔ ابھی۔ پولیس کو انوالوٹونہ کریں۔“ وہ کچھ رک کر بولی۔

”پھر کس بات کا انتظار کروں اور کیا ہو جائے جس کے بعد پولیس کو انوالو کیا جائے۔“ وہ طنز بھرے لہجے میں
 ہنکارا۔ عفت کا سر جھک گیا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے عدیل! وہ غلط ہاتھوں میں چلا جائے۔ کچھ ایسا ویسا قدم اٹھالے جس میں خدا نخواستہ اس کو
 کوئی بڑا نقصان ہو جائے۔“ فوزیہ دونوں کو دیکھ کر بولی۔

”اب اس سے بڑا قدم وہ کیا اٹھائے گا جو وہ کر چکا ہے۔“ عدیل منہ میں بڑبڑایا۔
 کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”اس سے پہلے بارش شروع ہو جائے میں جا کر دیکھتا ہوں اسے کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے۔“ عدیل اپنے
 محکن ذہن وجود کو جھشکل اٹھا کر بولا ہی تھا کہ اس کا فون بجا۔

”جی بات کر رہا ہوں عدیل۔“ فون سنتے ہوئے بولا۔
 ”واٹ! اس کی آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔“



واثق سامنے کھڑی پری کو دیکھ کر لمحہ بھر کو شاکڈرہ گیا۔
 وہ گھر جانے کے لیے آٹس سے نکلنے لگا تھا جب وہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔

”سوری! کبھی آپ کو زحمت نہ دیتی مگر بتائیں کیا اتفاق ہے کہ ہر بار مجھے آپ سے ایسا لگتی پڑتی ہے۔“ وہ
 بظاہر بے ضرر لہجے میں کچھ معذرت خواہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اب کیا ہے؟“ وہ کوفت بھرے لہجے میں بولا۔
 READING
 Section

”میں اپنی ہر تیز کے ساتھ ادھر پاس میں ایک بک اسٹور میں تھی۔ اس کی گاڑی خراب ہو گئی۔ سونہ وہی مجھے ڈراپ کرتی وہ تو چاہ رہی تھی میں رگ جاؤں گاڑی ٹھیک ہونے تک لیکن پیپا گھر آنے والے ہوں گے۔ آپ کے آفس کا خیال آیا تو یہی سوچ کر آگئی کہ شاید آپ ابھی گھر کے لیے نہیں نکلے ہوں۔ دوسرے مجھے آپ کو ایک اہم بات بھی بتانی تھی۔“ وہ آخر میں کچھ عجیب سے لہجے میں بولی۔

”کون سی بات؟“ واثق ناگواری سے پوچھ رہا تھا۔
 ”راتے میں بتا دوں گی ابھی ہم لیٹ ہو رہے ہیں پلیز۔“ واثق اپنی چیزیں اور چابیاں اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔
 پری چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لیے اس کے پیچھے باہر نکل گئی۔



”وانی اسپتال میں ہے۔“ عدیل فون بند کر کے تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔
 ”وہ مانی گاڈ! اسپتال میں؟“ فوزیہ ایک دم سے بولی۔

”کب کیا ہوا ہے اسے عدیل۔؟ کیوں ہے اسپتال میں وہ۔ ٹھیک تو ہے نا؟ پلیز کچھ تو بتائیں۔ اس سے بات ہوئی تھی آپ کی؟“ عفت تڑپ کر بے قراری سے بولی۔
 ”ابھی کچھ بتا نہیں۔ اسے زخمی حالت میں کوئی راہ گیر اسپتال چھوڑ گیا ہے۔“ وہ سخت پریشان تھا۔
 ”معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے۔“ وہ بولتے ہوئے کچھ وحشت زدہ سا اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر جانے لگا۔

”میں بھی آئی ہوں عدیل تمہارے ساتھ۔“ فوزیہ اس کے پیچھے گئی۔
 ”فوزیہ! تم اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہو۔ آتے ہی یہ مشکل پڑ گئی تم ریسٹ کرو، میں اسپتال جا کر فون کروں گا تمہیں۔“ عدیل نے اسے نرمی سے روکا۔
 ”نہیں عدیل! گھر میں چین نہیں ملے گا۔ کسی بھی طرح ایک نظر اسے دیکھ لوں تو تسلی ہو جائے گی پلیز۔ چلیں عفت بھا بھی!“
 ”میں نہیں رکوں گی کسی بھی صورت۔ مجھے اپنے وانی کو دیکھنا ہے۔“ عفت روتے ہوئے ان دونوں سے پہلے باہر نکل گئی۔



”کیا بکواس ہے یہ؟“ واثق نے ایک دم غصے میں گاڑی کو بریک لگائی تھی۔ اس کا چہرہ غصے میں سرخ ہو گیا تھا۔
 ”یقین کریں واثق! میں خود سے یہ سب نہیں کہہ رہی۔ یہ سب تو وہ سیٹی اس دن جب ہمارے گھر آیا تو وہ بتا کر گیا کہ مثال بھی اس کے ساتھ۔“
 ”پرری! میں تمہیں چلتی گاڑی سے دھکا دے دوں گا اب اگر تم نے ایک لفظ بھی بولا تو۔“ وہ ضبط کھو کر زور سے دھاڑا تھا۔ پری نے اسے سم کروا دیا۔
 کچھ لمحے خاموشی میں گزرے۔

”میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا۔ وہ سیٹی۔ ان لہجے میں مثال کے ساتھ۔ ابھی بھی دونوں کا سیل فون پر رابطہ ہے۔“ وہ رگ رگ کر کچھ ڈرے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
 ”یہ ساری باتیں کیوں کرتا ہے۔ پوچھ سکتا ہوں میں تم سے۔“ وہ طنز سے ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

”شاید وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں مثال تک اس کی لپٹنگز زیادہ بہتر طریقے سے پہنچا سکتی ہوں۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تو اپنے گھر چلیں۔ وہ دونوں ابھی بھی ملاقات کر رہے ہوں گے وہاں مثال نے سیفی کو بلا دیا ہے۔“ وہاں۔

ابھی کچھ دیر پہلے مثال کی کال آئی ہوگی کہ آپ آفس سے لیٹ آئیں گے تو اس نے سیفی کو فون کر کے بلایا ہے۔ میری بات کی چاہ ہے تو ابھی جا کر تصدیق کر لیں۔“

واثق ابھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ مزید سوال کرنا ہی بھول گیا کہ سیفی نے اسے یہ سب کیوں بتایا۔ اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ گاڑی اب ہواؤں سے باتیں کرتی ہوئی جا رہی تھی۔ پری کچھ بے خوف سی بیٹھی ہر پھولیشن کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔



دانی آئی سی یو میں تھا۔ گولی اس کی پسلیوں سے گزر گئی تھی۔

خون بہت بہہ گیا تھا کیونکہ وہ کافی دیر یوں ہی سڑک پر پڑا رہا تھا۔ عفت مسلسل روئے جا رہی تھی۔

”نوزیہ اسے چپ کراتے عدیل کی پریشان شکل دیکھتے ہوئے خود بھی بہت دکھی ہو رہی تھی۔“

وہ کم از کم یہ سب کچھ سوچ کر پاکستان نہیں آئی تھی۔

”پری کو فون کر کے بلا لیں، ہم اسے آتے ہوئے بتا کر بھی نہیں آئے۔ وہ پریشان ہوگی عدیل؟“ نوزیہ ہی کو یہ خیال آیا تھا۔

عفت نے چونک کر عدیل کو دیکھا۔

”اگر عدیل کو بتا چل گیا کہ پری بھی گھر پر نہیں ہے تو۔“ وہ فون لے کر ایک طرف چلی گئی۔

”میں پری کو بتا کر آئی ہوں۔ وہ کہیں زیادہ پریشان نہ ہو جائے۔“ عفت کو جاتے دیکھ کر عدیل نے کچھ بھی نہیں کہا۔

”عدیل زیادہ پریشان نہ ہو ان شاء اللہ دانی ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ نوزیہ نے اٹھ کر بھاگی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

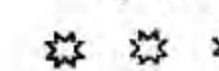
”جو کچھ ہو رہا ہے کم بیش ایسا ہی کچھ ہونے کا میں منتظر تھا۔ یہ عفت اس نے مجھے اولاد تو دی مگر اولاد کا سکھ، اس کی خوشیاں کیا ہوتی ہیں مجھے پتا ہی نہیں۔“ وہ بے حد رنجیدہ تھا۔

”پتا نہیں نوزیہ! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ معلوم نہیں کس کی بددعا کی زد میں آیا ہوں۔ کبھی مجھے چند دن بھی سکون اور خوشی کے نہیں مل سکے۔ حالانکہ میں نے کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کی۔“

وہ دکھی لہجے میں جیسے خود سے حساب کتاب کر رہا تھا۔

”میں بھی تو اسی لیے یہاں آئی تھی عدیل اور یہ ہمیں لگتا ہے کہ ہم نے کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا۔ کسی کا حق نہیں مارا اور نہ کہیں نہ کہیں کچھ ایسا ہم سے ضرور سرزد ہوا ہوتا ہے جو ہمارے لیے مسلسل ایک سزا بن جاتا ہے اور میں پاکستان آئی ہی بشریٰ سے معافی مانگنے کے لیے تھی کہ شاید اس طرح میری سزا میں قدرت کی طرف سے کچھ کمی ہو سکے۔“

وہ افسردہ سی کہہ رہی تھی اور عدیل چونک کر اسے دیکھ رہا تھا۔



ڈور بیل بچتے پر مثال نے آخری بار اپنا سجا سورا سخ اور سیاہ امتزاج سے کڑھائی کیے ہوئے سوٹ کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا۔ لپ اسٹک کا شیڈ کچھ اور گہرا کیا۔

”آج میں واثق سے اپنے دل کی ہر بات کہہ دوں گی۔“ وہ لبوں پر دل فریب مسکراہٹ لیے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ اور سامنے کھڑے سیفی نے اسے لمحہ بھر کو ہلا ہی دیا۔ وہ کسی بھی طرح اس کی یہاں موجودگی کی امید نہیں کر رہی تھی۔

”تو تم میری ہی منتظر تھیں۔ تو میری محبت کا جنون تمہارے دل پر بھی اثر کر گیا۔ یہ پھولوں کا خوشبو دار مہکتا تحفہ تمہارے لیے۔ اگرچہ یہ خوشبو تمہارے حسن کی خوشبو اور چمک کے سامنے بہت مدہم بے معنی ہے پھر بھی تمہارے حسن کا صدقہ۔ یہ میرا حقیر تحفہ۔“

وہ سخ پھولوں کا خوب صورت بکے اور اس میں ایک چھوٹا سا گفٹ پیک رکھے اس کے سامنے ذرا سا جھکا پیش کر رہا تھا۔ وہ دم بخود تھی۔

”تم یہاں کیسے آئے۔ یہاں کا ایڈریس۔ میرے گھر میں تمہیں آنے کی۔ تم نے ہمت کیسے کی۔“ وہ اتنی حواس باختہ ہو رہی تھی کہ کوئی بھی جملہ مکمل نہیں بول پارہی تھی۔

”میری جان! محبت تو خوشبو کی طرح ہوتی ہے اس کو تلاش نہیں پڑتا اور رہا محبوب کا پتا تو دل کی دھڑکنیں اور دل میں دوڑتا ہوا سب ہی رہنما بن جاتے ہیں تو تمہیں کھوجنا کیا مشکل تھا۔“ وہ غیر محسوس انداز میں اس کے قریب ہوا۔

مثال بے حرکت سی کھڑی تھی۔

جانتی ہو مثال! میں تمہارے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اتنے مہینے تمہیں بھلانے کی جتنی کوشش کرتا تھا تم اور بھی دل کے پاس آئی جاتی تھیں۔ میں ہار گیا مثال میں اس محبت کے سامنے اس شدت کے سامنے ہار گیا۔ تمہاری کشش مجھے تم تک پہنچ کر لے آئی۔ مثال! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم صرف میری ہو۔ صرف میری۔ پلیز چلو ابھی میرے ساتھ۔ میں تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں۔ چلو۔“ وہ اسے کندھوں سے پکڑے اس کے گرد بازو حائل کیے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

”چھو۔ چھوٹو۔ چھوٹو مجھے خدا کے لیے ایسا نہیں کرو میرے ساتھ مجھے چھوڑ دو۔ میں نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ۔“ مثال کے حلق میں کانٹے بڑھتے تھے اس کا گلا گھٹ رہا تھا۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس سے کچھ بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ مزاحمت بھی نہیں کر پارہی تھی۔

اپنی گردن اور کندھوں کے گرد حائل سیفی کے بازوؤں کو وہ چاہتے ہوئے بھی جھٹک نہیں رہی تھی۔ اسے خود سے دور بھی نہیں کر پارہی تھی۔ وہ لحوں میں بے دم ہوئی تھی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی اور آواز کہیں اندر ہی دم توڑ رہی تھی۔

”میں اب تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تم سے بچھڑ کر میں جی نہیں پاؤں گا۔ تمہاری محبت تمہاری کشش میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔“ وہ بول رہا تھا۔

مثال پھٹی پھٹی آنکھوں سے فق چہرے کے ساتھ سامنے یک ٹک دیکھتی جا رہی تھی۔ سیفی کی پیچھے دروازے کی طرف پشت تھی۔

واثق اور پری کب اندر آئے اسے پتا نہیں چلا۔ سیفی کو پیچھے گردن سے پکڑ کر واثق نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تھا۔

”تم تمہیں انسان گھنیا کتے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس حد تک بھی

جاسکتے ہو۔ تم آج یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاؤ گے۔“

وہ غصے، بیٹھوس اور جذبات میں جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ اندھا دھند سیفی کو نیچے لٹائے پیٹے جا رہا تھا۔ پری کافون بج رہا تھا۔

اور وائٹ کایو وحشی روپ دیکھ کر وہ خود بھی بے حد ڈر گئی تھی۔ وہ فون مٹھی میں دبائے باہر رستی بارش میں بھاگ گئی تھی۔

سیفی نے کچھ مزاحمت کرنے کی کوشش کی اور پھر اپنا دفاع کرتے ہوئے اسے پرے دھکا دے کر وہ چیزوں کو ٹھوکر س مارا اندھا دھند باہر کی طرف بھاگا۔

وائٹ کچھ دور اس کے پیچھے گیا پھر اپنا ہاتھ اوڑھ لیا۔ مثال اسی طرح بت کی مانند ساکت کھڑی تھی۔

”تو تم یہ کھیل کھیل رہی تھیں میرے ساتھ بھی اور اس کے ساتھ بھی۔“ وائٹ دھاڑا۔

”نہن۔ نہیں وائٹ۔ میں تو۔“ وہ پھر بولنے سے قاصر تھی۔

”وہ تمہیں اپنے ساتھ جس طرح لپٹائے کھڑا تھا تم کس بات سے مکروگی، کس بات سے انکار کروگی، مجھے جھٹلا نہیں سکتیں تمہیں نے بہت دھوکا کھالیا۔“

وہ حلق کے بل زور سے چیخا۔

”میں غلط تھا۔ میں نے غلط لڑکی پر اپنے جذبے لٹائے۔ تم اس قابل نہیں تھیں۔“ وہ کچھ بھی سننے اور سمجھنے بغیر جی رہا تھا۔

”وائٹ۔ میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ کسی کو بھی نہیں۔ محبت کی ہے آپ سے۔ میں قسم کھاتی ہوں۔“ وہ پوری طاقت کے ساتھ چیخی تھی۔

”ختم ہو گیا سب کچھ۔ سب ختم ہو گیا۔ کچھ نہیں بچا اب ہم دونوں کے درمیان۔ کچھ مت بولو۔ میں تمہیں۔“

”وائٹ۔ نہیں۔“ وہ زور سے چیخی اور دوسرے لمحے تیور کر گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔



عفت کی کال سننے کے بعد وہ برستی بارش میں اندھا دھند بھاگ رہی تھی کہ پیچھے سے آتی گاڑی اس کے برابر میں آکر رک گئی۔

”اگے میں تمہیں ڈراپ کر آؤں۔“ سیفی نے اسے آفر کی۔

پری شام والے سیاہ لباس میں بیٹھی کھڑی تھی۔ سیفی کی نظریں ایک منی تھیں۔

”نہن۔ نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ مجھے گھر ہی تو جانا ہے۔ یہ قریب میں۔“ وائی میرا بھائی اسپتال میں ہے مجھے اس کی ٹینشن ہو رہی ہے۔“ وہ بارش سے بچنے کے لیے ماتھے پر ہاتھ کا شیفٹ بنائے جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔

وائٹ اور سیفی کے درمیان کیا ہوا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سیفی کا سو جا ہوا منہ اور پھٹا ہوا کوٹ ساری کہانی سنا رہا تھا۔

”تو میں تمہیں اسپتال ڈراپ کر دیتا ہوں۔ آجاؤ۔“

”اس حلیے میں نہیں۔ مجھے چیخ کرنا ہوگا۔“ وہ اپنے لیے سراپے پر نظر ڈال کر بولی۔

”تم آؤ تو تمہیں گڈ نیوز سنانی ہے۔ وائٹ نے مثال کو چھوڑ دیا ہے۔ تمہارے لیے میدان صاف ہو چکا ہے۔“ وہ اسے آخری ”لایف“ دیتے ہوئے بولا تو پری بے یقین سی کچھ بھی مزید پوچھے بغیر گاڑی میں بیٹھ گئی۔



رات گزر گئی تھی۔

وانی کا آپریشن کامیاب رہا تھا۔ اسے ہوش بھی آ گیا تھا۔

وہ لڑکے اس سے سب کچھ چھیننا چاہتے تھے۔ مزاحمت پر انہوں نے اسے گولی مار دی اور وہ بیات جو اس کو باپ کے سمجھانے پر مائل کی منت سماجت پر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ اس ایک گولی نے سمجھا دی تھی۔

وہ ہوش میں آتے ہی رو رو کر سب سے معافیاں مانگ رہا تھا۔

”پاپا۔۔۔ بانی گاڈ میں اب آپ کو کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں جانے کا اب سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں آپ کے پاس رہوں گا۔ پلیز پاپا مجھے معاف کریں۔ میں نے آپ کے ساتھ بہت برا کیا ماما! پلیز فارگیو می۔“

اس کے آنسو کسی بھی طرح سے تھم نہیں رہے تھے۔ نہ جذباتی پن کم ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کو اسے انجکشن لگا کر سلا بنا دیا۔

تھوڑی تکلیف سہنی پڑی اور کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑا لیکن بالآخر ان کا بیٹا انہیں مل گیا تھا۔

عدیل اور عفت نے ایک عرصے کے بعد ماں باپ وانی وہ طمانیت اور سکون محسوس کیا تھی جو سعادت مند اولاد کے والدین محسوس کرتے ہیں۔

”یہ پری کہاں ہے۔ اس کا فون بھی بند ہے۔ مجھے اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے جا کر عفت کو دوسری پریشانی نے آکھیرا۔ پہلی فون کال کے بعد دونوں میں رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔

ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ وہ وانی کی حالت کا سن کر گھر میں پڑی سوتی رہے۔ عفت اب ہر اس ماں ہو رہی تھی۔

”بہت تیز بخار تھا پری کو۔ مجھے اب اس کی فکر ہو رہی ہے عدیل! میں گھر جا کر اسے دیکھ آؤں۔“ وہ وانی کے سوتے ہی بولی۔

”ہاں چلی جاؤ اور فوزیہ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ یہ بے چاری بھی رات بھر جاگتی رہی ہے۔ ستر کے بعد اسے آرام بھی نہیں مل سکا۔“ عدیل کو فوزیہ کی بے آرامی کی فکر تھی۔

”میں ٹھیک ہوں عدیل! میری فکر نہ کرو۔“ فوزیہ کے جواب نے عفت کو کچھ آسرا دیا۔

”لیکن اب وانی ٹھیک ہے۔ کوئی پریشانی والی بات نہیں۔ میں اس کے پاس ہوں۔ تم پلیز عفت کے ساتھ گھر جا کر تھوڑا ریسٹ کر لو۔“ عدیل اسے ٹوک کر بولا۔

”ریسٹ کی ضرورت تو تمہیں بھی ہے عدیل۔!“ فوزیہ ہمدردی سے بولی۔

”فوزیہ! تم جاؤ عفت کے ساتھ میں ٹھیک ہوں بالکل۔ یہیں بیٹھا ہوں تم دونوں جاؤ۔“ عدیل کے کہنے پر فوزیہ نے مزید بحث نہیں کی۔ عفت کو بھی مجبوراً اسے ساتھ لے جانا پڑا۔



پوری رات گزر گئی تھی۔ واثق کو اسپتال کے کورڈور میں مسلسل شہلتے ہوئے۔۔۔

”واثق بیٹا! اللہ کے لیے بیٹھ جاؤ۔ تھک جاؤ گے تم۔ تھوڑی دیر کے لیے تو بیٹھ جاؤ۔“ عاصمہ ہاتھی لہجے میں بولی۔

وہ خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔

پوری رات گزر گئی مثال کو ہوش نہیں آ سکا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور وہ بے ہوش تھی۔

۴۰ اگر آئندہ جو بیس گھنٹوں میں انہیں ہوش نہیں آیا تو یہ کوڑے میں بھی جاسکتی ہیں۔ ۴۱ بھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر مایوس لہجے میں انہیں بتا کر گیا تھا۔

اور واثق کو لگا کہ اگر مثال کو ہوش نہیں آیا، وہ کوڑے میں چلی گئی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا تو۔ اس کا دل بند ہو جائے گا۔

وہ جس جذباتی پن کا شکار ہو کر اس پر چلا آیا تھا، وہ تو اس کے بے ہوش ہوتے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ سیفی کی خصلت اس کی بلیک میلنگ کو جاننے بوجھتے بھی وہ مثال پر چلا آیا تھا۔ اسے لعن طعن کیا اس کے کردار پر شک کیا اور جیسے ہی وہ بے ہوش ہوئی۔ اسے ہوش آ گیا۔ وہ اس کی بے ہوشی کو معمولی سمجھا تھا لیکن۔

جب وروہ نے گھر آ کر روتے ہوئے پری کی حقیقت ماں اور بھائی کو بتاتے ہوئے جس طرح معافی مانگی۔ مثال کی معصومیت تو پہلے بھی عاصمہ اور واثق کو معلوم تھی مگر وہ جو شک کی دھند کچھ دیر کے لیے چھائی تھی۔ واثق کو لگا جیسے وہ اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہو۔

اگر مثال ہوش میں آ کر۔ اس نے واثق سے نفرت کا اظہار کر دیا تو وہ کیا کرے گا۔ وہ کچھ بھی کرے۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا اس کو منالوں گا۔ یہ آنکھیں تو کھولے وہ خود میں کھویا خود سے باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ عدیل جس طرح اسپتال میں آیا اور دیوانہ وار مثال کی طرف بھاگا تھا۔ واثق کچھ اور بھی نادوم ہو گیا۔ عاصمہ نے ہی عدیل کو کال کی تھی۔ اسے دانی کے بارے میں تو بتا ہی نہیں تھا۔ اور عدیل مثال کا سنتے ہی دو سراسر کوئی سوال کیے بغیر اسپتال پہنچا تھا اور اب اسے یوں بے حس و حرکت دیکھ کر خود بھی ساکت سا ہو گیا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ تو کل شام کو بالکل ٹھیک تھی ہنستی کھیاتی مجھ سے باتیں کرتی۔“ وہ گنگ سا اسے دیکھا رہ گیا۔



عفت نے سارا گھر چھان مارا تھا، پری کہیں بھی نہیں تھی۔ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ فوزیہ کو اس نے بمشکل کمرے میں بھیجا۔ ”چوکیدار بتا رہا ہے وہ ٹیکسی کروا کے اسپتال چلی گئی ہے۔ اس کی طبیعت بھی اچھی نہیں تھی۔ میں نے منع بھی کیا تھا کہ اکیلی گھر سے نہیں نکلے مگر بھائی کی محبت میں وہ کہاں پر کسکی ہوگی۔ بہت پیار ہے اسے دانی سے۔“ فوزیہ کو گیٹ روم میں لاتے ہوئے نظریں چرا کے وہ بولتی جا رہی تھی۔ اس کا دماغ غاؤف ہو گیا تھا۔ پہلے دانی کی حرکتیں اور اب پری۔ اگر پری نہیں ملی تو۔؟

”نہیں۔۔۔ نہیں۔ عدیل کو یہ بات معلوم ہو اس سے پہلے میں خود کو ختم کر لوں گی مگر عدیل کا سامنا نہیں کر سکوں گی۔“ اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ پری کا فون بند تھا۔

وہ تھک کر بیرونی گیٹ کے سامنے بیٹھیوں پر ہی دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کے پاس فخر کرنے کے لیے اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس کا سارا غور ساری اگر خود پسندی، سب کچھ جس جس ہو کر رہ گیا تھا۔ پری اور دانی اس کا فخر اس کا غور۔

ان دونوں نے ہی اس کا گھنڈا اپنے پیروں کے نیچے روندنا تھا۔

”ہمیشہ میں نے مثال کے لیے برا چاہا، برا سوچا اور آج نتیجہ کیا نکلا، میرے اپنے دونوں بچے۔“
 ”میرے اللہ! مجھے معاف کر دے۔ معاف کر دے مجھے۔“ وہ ہاتھ منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
 باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی۔

”عدیل! عدیل گھر آ گیا ہے۔“ اس کا سینے میں سما ہوا دل جیسے دھڑکنے لگا ہوا بھول گیا۔
 اور گیٹ کھلنے کے بعد اندر آنے والے کو دیکھ کر اس کی تو سانسیں ہی رک گئیں۔
 پری اجڑے حلیے اور لٹے شے حال میں بٹھرے بالوں، دریدہ لباس کے ساتھ۔ ایک کھلی داستان عبرت بنی
 اپنے قدموں پر گرتی ڈولتی آرہی تھی۔
 اس سے پہلے کہ عفت اسے جا کر تھامتھی، وہ اس کے پاس بیٹھیوں پر آکر گری اور بے ہوش ہو گئی۔



سیفی نے ایئر پورٹ پر جا کر ہوٹل کی گاڑی کو فارغ کیا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور اطمینان تھا۔
 ”مثال نہ سہی پری سہی۔ مثال سے زیادہ بہترین انتخاب۔“ وہ خود ہی ہنسا۔
 اسی وقت اس کا فون بجا۔

”وہی پری ہوگی، مجھے بد دعائیں دے رہی ہوگی۔“ اس نے فون جیب سے نکالتے ہوئے جیسے مزالے کر خود سے
 کہا۔

”جی بشری! فرمائیے۔ آج اتنے مہینوں بعد آپ کو میری یاد کیسے ستائی۔ آپ کو بھی مجھے کال کرنا یاد آیا۔“
 وہ کال ریسیو کرتے ہوئے شوخی سے طنز بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
 دوسری طرف بشری نے جو کچھ اسے بتایا۔ وہ اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ گنگ سا فون کان سے
 لگائے ساکت کھڑا تھا۔

”جھوٹ بول رہی ہیں آپ۔ مجھے ٹیز کرنے کے لیے آپ ایسی بری بات کریں گی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا
 تھا۔“ اسے بہت دیر بعد ہوش آیا تو وہ ارد گرد کا خیال کیے بغیر زور سے چیخا تھا مگر دوسری طرف سے فون بند ہو چکا
 تھا۔

”پاپا۔ میرے پاپا۔ اب اس دنیا میں نہیں رہے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ بے یقین سا کھڑا رہا۔



نوزیہ ساکت سی بے ہوش پڑی مثال کو دیکھے جا رہی تھی۔ بھروسہ بیڈ کی ٹی پکڑ کر جھکی۔ وہ رو رہی تھی۔
 ”مثال! میری گڑیا! میری جان! میں تو تم سے معافی مانگنے کے لیے آئی تھی۔ تمہاری زندگی کی بہت ساری
 مصیبتوں کی ذمہ دار میں بھی ہوں۔ میری جلن، میرے حسد اور بے جا اتانے تمہارے ماں باپ کی زندگی میں زہر
 گھولا اور تم سے اتنے پیار کرنے والے ماں باپ، ایک کھل گھر چھین لیا۔ جب بھی مجھے یہ سب یاد آتا تھا۔ میں
 ساری ساری رات سو نہیں پاتی تھی۔ اسی لیے آئی تھی تمہارے سامنے دل کھول سکوں۔ معافی مانگ سکوں۔“ وہ
 پٹی پر سر رکھے روئے جا رہی تھی۔

عدیل نے اسے کندھوں سے پکڑا اور زبردستی باہر لے آیا۔

”نوزیہ! سنبھالو خود کو جو کچھ ہوا، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ سب اسی طرح ہوتا تھا۔“ وہ اسے ساتھ
 لگائے تسلی دے رہا تھا۔

”نہیں عدیل! میں جانتی ہوں کہاں کہاں میری غلطی، میرا قصور تھا اور مجھے سزا بھی ملی۔ خالد ایک شکی مزاج،

بے رحم، تجوس شخص تھا۔ زندگی کے اتنے سارے سال میں نے ایک قفس میں گزارے، جب اس کو مجھ پر کچھ یقین آیا ہمارے حالات بہتر ہوئے تو ایک ایک سیڈنٹ نے خالد کی ٹانگیں چھین لیں اور عمر بھر کی محتاجی مل گئی۔ عدیل میں نے کبھی تمہیں یہ سب نہیں بتایا، کیسے بتاتی، مجھے میرے اعمال کی سزا ملی تھی، قدرت کی طرف سے۔" وہ روئے جا رہی تھی۔ عدیل گم صم تھا۔



تین ماہ گزر گئے تھے۔

مثال کو ہوش نہیں آسکا تھا۔

ڈاکٹر زکچہ کچھ ناامید ہو چکے تھے۔ لیکن واثق کی امیدیں اسی طرح روشن تھیں، وہ چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے مثال کے پاس گزارتا اس کا دل کہتا تھا مثال کو ہوش ضرور آئے گا۔

وہ ابھی بھی اس کے پاس بیٹھا ایک ٹک اس کو دیکھتا جا رہا تھا۔ جس کے چہرے پر اتنا گہرا سکون اور اطمینان تھا جیسے برسوں بعد وہ اپنی بیٹی بر سکون نیند سوئی ہو۔

"مجھے معاف کرو مثال پلیز۔ یوں نہیں کرو میرے ساتھ۔ آنکھیں کھولو دو۔ پلیز، مثال۔" اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہ رہے تھے۔

شہزاد نے ان مشکل ترین دنوں میں ایک بھائی کی طرح اس کا ساتھ دیا تھا۔ عاصمہ، کاکر، اور وہ کانسب کا خیال رکھ رہا تھا۔

وہ گھر کے ایک فرد کی طرح ہو چکا تھا۔ ورہ بہت بدل گئی تھی۔ گھنٹوں مثال کے پاس بیٹھی رو، رو کر اس کی صحت یابی کی دعائیں مانگتی رہتی۔

"واثق۔!" کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا تھا۔ وہ چونک کر مڑا اور چند لمحے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"یہ بشری ہے، مثال کی ماما۔ مثال سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔" عدیل اس سے کہہ رہا تھا۔



بشری، مثال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے روئے جا رہی تھی۔

"میں تمہیں اس لیے تو چھوڑ کر نہیں گئی تھی مثال کہ تم یوں خاموش ہو کر لیٹ جاؤ۔ مجھ سے یوں ناراض ہو جاؤ کہ کبھی بات ہی نہ کرو۔ مجھے دیکھو مثال! میں آئی ہوں تمہارے پاس۔ اپنی بیٹی کے پاس۔ زندگی کی تمام مجبوریوں کی زنجیریں توڑ کر سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ تم یہی چاہتی تھیں نا ہم دونوں تمہارے پاس ہوں تمہارے پایا اور میں۔ دیکھو ہم تمہارے پاس ہیں۔ میری جان آنکھیں کھولو مثال۔ مثال۔"

مثال۔!" وہ اسے پکارتی جا رہی تھی۔ جب واثق اور عدیل نے دیکھا۔

مثال کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔ اس کے لب ہولے سے کھلے۔

"مثال۔ مثال۔ بیٹا میری جان! آنکھیں کھولو تمہاری ماما آئی ہے۔" عدیل تیزی سے جھکا اس پر کہہ رہا تھا۔

مثال نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔

"ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔ واثق! ڈاکٹر کو بلاؤ۔ مثال کو ہوش آ گیا ہے۔ مثال۔ تم ٹھیک ہونا۔ بیٹا تم سن رہی ہونا ہیں۔" عدیل روتے ہوئے کہے جا رہا تھا۔ وہ ایک ٹک بشری کو دیکھتی جا رہی تھی۔

"ماما! اس نے بہت مدد ہم آواز میں پکارا تھا۔ بشری اسے دیکھتی رہ گئی۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety



دانی ٹھیک ہو چکا تھا۔

باقاعدگی سے کالج بھی جانے لگا تھا اور باقی کا سارا وقت عدیل کے ساتھ گزارتا تھا۔

مثال کو آج اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔

پری بالکل بدل چکی تھی۔ اس کی شوخی، خود پسندی، غرور، تکبر سب ختم ہو چکا تھا۔ اپنے آپ میں گم آرد گرو سے باخبر ایک ڈری سہمی لڑکی تھی، جو اب کسی سے نہیں ملتی تھی۔ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ بشری، احسن کمال کی موت کے بعد ابھی پاکستان میں تھی۔

”کچھ عرصہ عمران کے پاس رکوں گی۔ اگر آئندہ ولید کے ساتھ پاکستان سیٹ نہیں ہوئی تو پھر میں بھی اس کے پاس چلی جاؤں گی۔“ بشری نے عدیل کو بتایا تھا اور وہ جواب میں کچھ بول ہی نہیں سکا۔

چند لمحوں کی جذباتیت نے ان کی زندگی کی بساط پلٹ کر رکھ دی تھی۔ اب بولنے کو کچھ بچا بھی نہیں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ چند لمحوں بعد ہمیشہ کے لیے چھڑنے والے دونوں کے دلوں میں بہت کچھ تھا مگر لڑنے کا حکم نہیں تھا۔

”میں چلتی ہوں۔ عمران آگیا ہے مجھے لینے کے لیے۔“ بشری بہت دیر بعد اٹھتے ہوئے بولی۔ عدیل اسے چھوڑنے گیا اور عفت دونوں کو جاتا دیکھتی رہی۔



مثال کو لگا جیسے وہ تین مہینوں بعد نہیں تین صدیوں بعد اپنے کمرے میں آئی ہے۔ پہلوؤں سے سجائے حد خوب صورت کمرہ جس میں اس کی اور واثق کی تصویریں لگی تھیں۔ شادی کی وہ ایک ننگ ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے بہت کچھ یاد کر رہی تھی۔

چھپلی بہت ساری چیزوں کو یاد کرتے ہوئے اس کا دماغ تھکنے لگا تھا۔ وہ بہت کچھ بھول جاتی۔

چیزیں گنڈھ ہو جاتی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھتی۔

”میری جان! کوئی جلدی نہیں۔ کچھ بھی یاد کرنے کی تمہاری چھپلی زندگی میں کیا ہوا تھا۔ اچھایا برا سب بھول جاؤ۔ کچھ بھی یاد رکھنے کی ضرورت نہیں، صرف یہ یاد رکھو۔ اس دنیا میں تمہیں سب سے زیادہ چاہئے والا تمہارا شوہر ہے۔ تم جو تین مہینے مزے کی نیند سوئی ہو وہ ان تین مہینوں میں ایک پل سکون سے سو نہیں سکا۔ تم میری بات سن رہی ہو نا مثال۔“

وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامے گرم جوشی سے کہہ رہا تھا۔

مثال نے آہستگی سے مسکرا کر سر ہلایا۔

”کچھ کوگی نہیں مثال!“ وہ اس کے ہاتھوں پر ہار کی مہر ثبت کرتے ہوئے بولا۔

اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا اور واثق کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

محبت کی اس یقین دہانی کے بعد واثق کو مثال سے کچھ اور چاہیے بھی نہیں تھا۔ اس نے بھی سکون سے آنکھیں موند لیں۔



”آلی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں ان کی طلاق لینے کے پیچھے کیا وجہ تھی۔ سفیر نے محض اپنے والدین کے دباؤ میں آکر انتہائی بددلی سے ان سے شادی کی تھی۔ جب وہ آلی کو ان کا اصل مقام دینے پر آمادہ نہیں تھے تو وہ کب تک بوجھ کی طرح ان کے سر پر مسلط رہیں؟ آپ کیوں ان کی طلاق کو طعنہ بنا کر بار بار میرے منہ پر دے مارتی ہیں۔ ان کا وہ گناہ کیوں بار بار دہرائی ہیں جو انہوں نے نہیں کیا؟“

رمل کی آواز دکھ کے مارے پھٹ سی گئی۔ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں چہرہ سرخ پڑ رہا تھا، لیکن ماجدہ بیگم مطلق اثر نہ ہوا۔ نخوت سے ہاتھ ہلاتے بولیں۔
”مے رہنے دو۔ ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ تمہاری اماں کو ہی شوق ہو رہا تھا بیٹی کا بسا بسایا گھر اجاڑ کر اپنے گھر بٹھانے کا۔“ ان کا لہجہ شفرزہ تھا کسی قسم کے احساس سے عاری۔

اسجد نے ہاتھ میں پکڑا اچھے کوفت سے پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ خاموش تنبیہ بھی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا اور پھر ایک بے بسی بھری نظر ماں پر ڈالی۔
چار سالہ ارتج بھی کھانا روکے منہ کھولے ماں اور دادی کو دیکھے گئی۔ آنکھیں جھپکتی وہ ان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ماں اپنی بیٹیوں کو اس لیے گھر سے رخصت نہیں کرتیں کہ وہ اجڑ کر پھر سے ان کی وہلیز پر آ بیٹھیں۔ وہ تو ہمیشہ دعا گو رہتی ہیں ان کی بیٹیاں اپنے گھروں میں شاد رہیں، آباد رہیں۔“

”مے بس کرو بی بی! ہٹ دھرم تو تم بھی کم نہیں ہو۔ میں کہے دیتی ہوں اس ہٹ دھری کی وجہ سے ایک دن تم بھی بڑی بہن کی طرح ماں کے سینے پر مونگ دگنے میکے کی وہلیز پر جا بیٹھو گی۔“

اور رمل کی رہی سہی برداشت کی حد بھی ختم ہو گئی۔ اسجد کے چہرے پر سرخی نمودار ہونے لگی تھی۔ ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی بات برائے بات سے بات کا بظاہر سہا پتی تھی۔



شازینہ جمال طارق

کھانا

”بس!“ اس نے سالن کی پلیٹ اٹھا کر پوری قوت سے سامنے والی دیوار پر دے ماری۔ چکنی پیسٹ شدہ دیوار پر سالن کے چھینٹے لکیروں کی صورت دیوار سے پھسلتے فرش تک آگئے تھے۔ ”تنگ آگیا ہوں میں آپ لوگوں کی ہر وقت کی اس تو تکار سے۔ کوئی حد ہے اس لالچنی بحث کی؟ گھر ہے یا جہنم جہاں ایک پل سکون

کاملتا محال ہے۔ پورا مہینہ جان توڑ مشقت کے بعد بمشکل چند دنوں کی چھٹی مل پاتی ہے، لیکن یہ چند دن بھی آپ دنوں کے آئے روز کے تماشوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ وہ کرسی پیچھے کی طرف دھکیلتا ہٹے سے بھرا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

الٹا چور کو تو ال کو ڈانٹنے کے مصداق ماجدہ بیگم مزید رمل کے لئے لگیں۔
”ارج! کھانا کھاؤ بیٹا!“

جب ماجدہ بیگم اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال کر چلی گئیں تو وہ آسو پتی اپنی بیٹی کی طرف متوجہ ہوئی۔ جس کے مصوم چہرے پر سراسیمگی سی پھیلی تھی۔ رمل نے چھوٹا سا نوالہ بنا کر اس کے منہ میں ڈالنا چاہا، لیکن اس نے نفی میں سر ہلاتے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

رمل کا بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہا تھا۔



”سہا! آپ اچھی طرح جانتے ہیں آئی اکثر میرے ساتھ زیادتی کر جاتی ہیں۔“
رات کو وہ کمرے میں آئی تو اسجد بیڈ پر درازہ سہری جانب پٹت۔ کیے لیٹا تھا۔ یہ اس کی خفگی کا واضح اظہار تھا۔

”موم کون سا کم ہو؟“ خفگی سے جتایا گیا۔
”پہل ہمیشہ وہ ہی کرتی ہیں اگر انہیں مجھ سے کوئی شکایت ہوتی بھی ہے تو وہ ڈائریکٹ مجھے برا بھلا کہیں۔ آئی اور اسی لوگوں کو بیچ میں کیوں گھسیٹ لیتی ہیں۔ ان کا کیا تصور ہے بھلا؟“

آنروں کا گولہ ساحلق میں اٹک گیا تھا۔ اسجد نے رخ اس کی طرف کر لیا تھا۔ ماں کو وہ سمجھا نہیں سکتا تھا بیوی کی سمجھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن وہ بیوی تھی سوختہ دل کی۔ رات کے کسی پہر شوہر کا بڑا موڈ ٹھیک کر سکتی تھی سو اس نے کر لیا تھا۔

لیکن ذہن ماجدہ آئی کے منتہانہ مزاج کی گتھی میں



الچھ کر رہ گیا۔ نجانے ان کی اس نفسیاتی گمراہی کے پیچھے کون سا گورکھ دھندہ تھا۔

وہ اسجد کی پسند تھی شاید یہ بات انہیں ناپسند آئی تھی۔ انہیں خوف تھا اس کی صلاحیتوں، خوبیوں سے متاثر ہو کر کہیں عمار بھی اس کی بہن عنایتیہ سے شادی کرنے کی خواہش دل میں نہ پال بیٹھے۔

اسی خوف کے پیش نظر انہوں نے حفظہ ماتقدم کے طور پر اس کی خوبیوں کو اس کی خامیاں بنا کر اچھا مانا شروع کر دیا تھا۔

رمل اکثر سوچتی کوئی کسی کے لیے اتنا باعث آزار کیسے ہو سکتا ہے کہ سامنے والا اپنی خوشیاں اس کی موت سے مشروط کرنے لگے۔



موسم بدل رہا تھا۔ اس نے کمروں کی سپیننگ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچا ساتھ ہی خیال آیا عنایتیہ کو مدد کے لیے بلا لے۔ مدد بھی ہو جائے گی اور ساتھ میں گپ شب بھی۔ عنایتیہ اس کی پرہیزگار قسم کی بہن! اپنی پرہیزگاری کے بارے میں بہت سنجیدہ تھی۔ اسی پرہیزگاری کی وجہ سے اکثر شادی وغیرہ کی تقریبات میں بھی جانے سے حتی الامکان پہلو بچا جاتی۔

رمل کو یاد نہیں آ رہا تھا عنایتیہ آخری بار اس کے گھر کب آئی تھی۔ کمال بات یہ ہوئی اس بار عنایتیہ نے بھی آنے کی ہامی بھرنی۔

”عنایتیہ کو چاول بہت پسند ہیں تو دن میں چکن پلاؤ بناتی ہوں۔ ساتھ میں سلاد رائتہ اور اس کی فیورٹ کولڈ ڈرنک۔“

وہ پر جوش ہوتی کچن میں آگئی۔ گویا عنایتیہ کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلکہ دعوت کے لیے بلایا ہوا۔

وہ کام نپٹا کر باہر نکلی تو عنایتیہ کو ماجدہ آئی کے روبرو کھڑے پایا۔ بے ساختہ اس کا دل سکڑ کر پھیلا تھا۔ عنایتیہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ رمل کا سارا جوش اس دھویں میں تحلیل ہونے لگا۔ ماجدہ آئی اس پر ایک نگاہ ڈالتی، طنزیہ ہنکارہ بھرتی وہاں سے چلی گئیں۔

ہونا؟

”آجاؤ عنایتیہ!“ وہ اس کا سرد ہاتھ تھامتی اپنے کمرے میں آئی۔
”رمل! کیا تم نے بھی آنٹی سے میرے اور عمار کے رشتے کے بارے میں اپنا انٹرسٹ ظاہر کیا؟“ سرد صرف ہاتھ نہیں تھا۔

”انہوں نے کچھ کہا تم سے؟“ کچھ سوال بے معنی ہوتے ہیں۔ رمل جانتی تھی۔

”اگر میں ان سے کہوں امی آپ کو سلام دے رہی تھیں اور وہ آگے سے کہیں بخیریت کے سلام ہوں تمہاری امی کو ویسے تو مجھ پر بھی سلامتی بھیجنے کا خیال نہیں آیا۔ خیر ان سے کہنا اگر ان کے دل میں کوئی اور خیال ہے تو جھٹک دیں کیونکہ میں ان کی ہم خیال نہیں ہوں اس بار۔ تو اس کا کیا مطلب ہوا؟“

رمل کو ایک دم شدید تانسف نے گھیر لیا۔ اس کی وجہ سے عنایتیہ کو خواستواہ اتنی فضول بات سننا پڑی۔
آنٹی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اس نے پشیمانی سے عنایتیہ کا چہرہ دیکھا جو سر جھٹکتی جا رہی تھی۔ اس نے کو شرمندگی کے حصار سے نکالنے کے لیے خود کو سنبھال چکی تھی۔

اسجد چھٹیاں ختم ہونے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ وہ ارج کو لے کر امی کے گھر آئی۔ عنایتیہ کتابیں سمیٹ کر ارج کو گود میں لیے اس کے پاس جھولنے پر آ بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے امی انہیں چائے کے کپ تھما گئی تھیں۔ امی کا محبت بھرا لمس پا کر بے ساختہ اس کا دل بھر آیا تھا۔ آنکھوں میں نمی سی چکی تھی۔

”امی! دنیا کا کتنا عجیب دستور ہے نا جن کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے انہیں چھوڑ کر ان کی جوتیاں

سیدھی کرنی پڑتی ہیں جو اپنی جوتی کی دھول برابر بھی نہیں جھٹکتے۔“

انہی جھولی میں رکھا اس کا سر سہلائی امی کی انگلیاں تھمی تھیں۔ بہت نرمی سے بولیں۔

”یہ جنت کہیں نہیں جائے گی بیٹا! تم تو میری بہت صبر والی بہت برداشت والی اور گزر کرنے والی بیٹی

یہ سوال گندم جواب چنا نہیں تھا۔ خاموشی کے چند لمحوں بہت نایاب تھے۔ دونوں نے بن کے ایک دوسرے کی سن لی تھی، سمجھ لی تھی۔

گو کہ تھڑا اتنی زور کا نہیں تھا، لیکن رخسار سے اندر تک سب دکھنا چلا گیا۔ اس نے پتھرائی آنکھوں سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھا تھا اور پھر اس کی ماں کا۔ محض اپنی جھولی انا کی تسکین اور غیر ضروری محفوظات کی خاطر کوئی کیسے اتنی آسانی سے دوسروں کی خوشی کا چراغ گل کر دیتا ہے؟

وہ خوش تھی بہت خوش۔ اسجد کی غیر متوقع اچانک آمد اسے یونہی بے طرح خوشی سے ہمکنار کر دیتی۔ دیواروں پر خوب صورت سنہری سج اترتی تھی۔

اس کا دل پھولوں کے گرد منڈلاتی تھلیوں کی مانند محو رقص تھا، لیکن بے جا ضد، نیچا دکھانے کی تندو تیز آمد تھی۔ پھول چلاؤ الے۔ قتلیاں سم کر رہ پھیلائی اڑ گئیں۔ اس کا رقص کرتا دل ٹھم گیا تھا۔ ڈھلتی سر پہرنے دیواروں پر اپنا ادا اس سرسئی آچل لہرا دیا تھا۔

وہ آپی کے سامنے بری طرح رو دی۔

”ہمارے معاشرے کا یہ کیسا ناسور ہے لوگ کسی ایک بہن، بیٹی کے ماتھے پر لگے طلاق کے کلک کو دوسری بہن، بیٹیوں کے لیے طعنہ بنا کر ان کے منہ پر دے مارتے ہیں۔ خواہ طلاق لینے کے پیچھے وجہ کوئی بھی ہو۔“

اور وہ بے قصور بہن بیٹیاں ”دنیا“ کے اس طعنے سے بچنے کے لیے ان کی ہر جائز ناجائز بات پر خاموشی سے آنسو اندر اتارتی چپ سلاہ لیتی ہیں۔ ”آپی کا دل دکھ سے بھرنے لگا تھا۔“

رمل کے چہرے پر مثبت انگلیوں کے نشان ساری کہانی سنار ہے تھے۔

”جانتی ہو رمل! شادی کے بعد ہر عورت کو کسی نہ کسی آناش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو عاشی!“ اس نے یقیناً ”میری آنکھوں سے مترشح ان لفظوں کو پڑھ لیا تھا۔ تب ہی نگاہیں چراتے ہوئے بولی تھی۔

”یہ تم نے ابھی کیا کہا مریم۔ میرے لیے یقین کرنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔“ بولتے ہوئے مجھے احساس نہیں ہوا کہ میری آواز بھیگ رہی ہے۔ مریم کی آنکھوں کی طرح۔

”یقین کر لو عاشی۔ بعض اوقات بہت سے فیصلے انسان خود نہیں کرتا اسے اس کی تقدیر اس سبب پر لے آتی ہے۔“

”مگر تم تو۔۔۔ ایسے کیسے تم مریم۔ تم ہو کیا؟“ میں نے اسے عجیب۔۔۔ بہت اجنبی نظروں سے دیکھا تھا۔ ہاں اس وقت مجھے اس کا جانا پچانا چہرہ بہت اجنبی ہی دکھائی دے رہا تھا۔

وہ پھینکی سی ہنسی ہنس دی اور مجھے اس کی مسکراہٹ بھی ٹانوس لگی۔ آپ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ وگرنہ آپ کو بھی لگتی۔

یہ مریم کیا کہہ رہی تھی۔ یہ میری مریم تو نہ تھی۔ میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جہاں پہچان کے رنگ مدھم پڑتے جا رہے تھے۔



مریم۔

میری چھوٹی بہن نہیں۔ ایک شعلے۔ ایک شرارے کا نام تھا۔ ہاں۔ وہ لپکتے۔ بھڑکتے شراروں ہی کی طرح روشن، تاباں اور بے صبر تھی۔ ہاں بے صبر۔ کبھی آپ نے بھڑکتی آگ کو صبر کرتے دیکھا ہے؟ اسے جو جب جس وقت درکار ہوتا، وہ اسی وقت

حاصل کر کے رہتی۔ چاہے رات کے دو ہی بجے ہوں اور اس کا من اگر کچھ کھانے کو چل گیا۔ وہ چیز اسی وقت ہنائی یا آرڈر کر کے منگوائی جائے گی۔

اس کا کہنا تھا۔ ”لو یا۔۔۔ دل ابھی چاہ رہا ہے۔ صبح تک کا انتظار کون کرے گا۔“

یا چلپلاتی دھوپ میں اسے شاپنگ کی سوجھ جائے۔ آپ لاکھ سمجھائیں۔ ”شام تک صبر کر لو۔“ مگر یہ صبر ہی تو اس سے نہیں ہوتا تھا۔

جھٹ کہتی۔ ”شام تک صبر کس سے ہو گا۔ بس ابھی ہی چلے چلتے ہیں۔“

اماں کو اس کا بے صبر پن ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ کہتی۔

”مریم اپنے اندر برداشت اور صبر پیدا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بے صبری تمہیں کسی مصیبت سے دوچار کر دے۔“ مگر وہ اپنے اذلی لاپرواہ انداز میں مسکرا کر کہتی۔

”رہنے دیں اماں۔ مشکلات کا سامنا صابر لوگوں کو کرنا پڑتا ہے۔ بے صبروں کے سامنے مصیبتیں ٹک ہی نہیں سکتیں۔ کیونکہ وہ انہیں برداشت ہی نہیں کرتے، آگے بڑھ کر ان کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتے ہیں۔“

یہ اس کا بچکانہ فلسفہ تھا۔ ایک مرتبہ پیاز کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ اچھا خاصا کاٹ گیا۔ اس نے وہ واویلا مچایا کہ اماں نے تو آئندہ اس سے پیاز کٹوانے سے توبہ کر لی۔ بتایا نا کہ اس میں برداشت نام کونہ تھی۔ اسی لیے کسی کی جیکھی بات پر قطعی ادھار نہ رکھتی، اگلے کی طبیعت ایسی صاف کرتی کہ اللہ ان۔۔۔ اور یہ بعض صورتوں میں کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ اکثر لوگ اس سے نالاں ہشامی اور بدظن رہتے۔ جن میں اماں بھی شامل تھیں۔ وہ اکثر اسے سمجھاتیں۔ مجھے بھی اسے سمجھانے کو کہتیں۔ میں بھی سمجھاتی کبھی پیار سے، کبھی سسرال کے حوالے سے مخصوص ڈراوے دے کر کہ۔

”سسرال میں لڑکیوں کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔“

اور اس کا وہی جواب کہ۔۔۔ ”وہ کوئی اور لڑکیاں ہوں گی جو سسرال والوں کی بری بھلی چپ رہ کر رہتی ہیں۔ مجھے کوئی سنا کر تو دیکھے۔ وہ حال گروں کی کہ دیکھ

ہمایوں کے گھر پہ اب مریم کا راج تھا مگر اس کے دل پہ۔؟



مرد کو اگر دریافت کا پرندہ کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔ وہ ایک کے بعد دوسرا عشق بھی بڑی آسانی سے کر لیتا ہے۔ مگر الزام ہمیشہ عورت ہی کے سر رکھتا ہے۔

ہمایوں جانے کب اپنی کسی کو لیک کی زلفوں کا اسیر ہوا، مریم کو پتا ہی نہ چلا۔ پتا تو تب چلا جب علی (ہمارے تایا زاونے اپنی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں میاں بیوی کی حیثیت سے ہمایوں اور سونیا کو رہائش پذیر دیکھا۔ معاملہ جب خاندان تک پہنچا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہمایوں واقعی سونیا سے نکاح کر چکا تھا۔ ہمایوں کی بے تابیوں کا سارا خاندان گواہ تھا۔ سو ہر ایک کو جاننے میں دلچسپی تھی کہ آخر ایسا کیا ہوا جو معاملہ دوسری شادی تک جا پہنچا تھا۔ اس دوسری شادی کے محرکات چاہے جو بھی رہے ہوں مگر وہ سبھی تھی اور مجھے فکر اپنی بہن کی تھی کہ زندگی جس کی برواشت کا بہت کڑا امتحان لینے چلی تھی۔



”برداشت نام کو نہیں ہے تم میں۔ چھوٹی سی بات کو ایسا شونہا کر مجھ سے بے وجہ زبان درازی کرتی ہو، قصہ تمہاری ناک بردھرا رہتا ہے۔ مجھ سے تو تکار کرتی ہو، میری عزت نہیں کرتیں۔ سونیا سے مل کر میں نے جانا کہ ایک نرم مزاج عورت مرد کے لیے کتنی بڑی نعمت ہے۔“

ہمایوں نے یہ وجہ بتائی تھی مریم کو اپنی دوسری شادی کی۔

”مجھ پر بے وجہ الزام تراشی کر کے خود کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش مت کرو ہمایوں۔ میں بیوی ہوں تمہاری، جانتی ہوں تمہیں اچھی طرح۔ کوئی وجہ نہ بھی ہوتی تب بھی تمہیں یہ شادی کرنی ہی تھی۔“

سسرال والوں کو عبرت حاصل ہوگی۔ میں اس کی لن ترانیوں پر محض مسکرا کر اور کبھی اسے گھور کر رہ جاتی۔



پھر اس کی زندگی میں وہ وقت بھی چلا آیا کہ جس کے خواب ہر لڑکی بچپن سے سچانے لگتی ہے۔ ہمایوں خان نام تھا اس کے طلب گار کا۔

مریم کو اس نے اس کی سہیلی کی شادی پر دیکھا تھا۔ من کو بھاگئی۔ اظہار محبت کیا، پھر دیوانوں کی طرح اس کا پیچھا ہی لے لیا۔

ہمایوں کا انداز دیکھ کر مجھے مریم پر رشک آتا کہ جس کے تباہ چہرے کی رونق آج کل دیدنی تھی۔

ہمایوں کے گھر والے آئے اور جلد شادی پر زور دینے لگے۔ اماں روایتی فکروں میں پڑ گئیں کہ بڑی بچی ہے، چھوٹی کی کیسے کروں وغیرہ وغیرہ۔ ہمایوں کا اتنا دل اپن دیکھ کر مجھے ہنسی آتی کہ اللہ ملائی جوڑی ہے۔ بہت سے مراحل سے گزر کر بالآخر دونوں ایک ہو گئے اور مریم کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔



ہمایوں بہت اچھا شوہر ثابت ہوا۔ مریم بہت شاداں و فرحاں تھی۔ سسرال میں محض ایک ساس ہی تو تھیں۔ وہ تو بے ضرر ثابت ہوئیں مگر شادی شدہ زندگی سے اس کی روایتی چپقلش شروع ہو گئی۔ مریم نے اپنے مزاج کے عین مطابق اپنی زندگی کو ”ہینڈل“ کیا تھا۔ زندگی سے اور وہ زندگی سے بے تعلق رہنے لگی۔ ساس غیر جانب دار تھیں۔ دونوں کو گھر کا کرتیں۔ کبھی کبھار اپنی بیٹی کی طرف داری بھی کر جاتیں۔ البتہ ہمایوں کو ان خالص گھریلو قسم کے ”عمورتانہ“ مشاغل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

مجموعی طور پر مریم ایک خوش حال ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ کچھ وقت اور گزرا۔ اور مریم کی جھولی

دو پھولوں سے مہکنے لگی۔ ساس اللہ کو پیاری لادیں۔ یہ سارا وہ بھی اب بستر تھا۔

کیونکہ تم ہو ہی دل پھینک۔ عاشق مزاج۔“
مریم حسب عادت چلا چلا کر اس کے التزامت کا
دوبلو جواب دے کر رمشا اور ریشا کو لیے امی کے گھر چلی
آئی۔

”آگے کا کیا سوچا ہے مریم۔ اب کیا کرو گی؟“
اسے امی کے ہاں رہتے بیسرا ہفتہ تھا۔ معاملات
مزید پیچیدگی اختیار کرتے جا رہے تھے اور زندگی ایسے تو
نہیں گزارا جاسکتی تھی۔ اسے اپنے لیے کوئی فیصلہ
بہر حال کرنا ہی تھا اور میں اس کا دکھ پوری شدت سے
محسوس کرتے ہوئے اس کا وہی فیصلہ جاننے کی خاطر
اس کے مقابلہ بر اجماع تھی۔ وہ ٹوٹی بکھری سی
میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی پھول سی پیشیاں اس
کے ساتھ ہی سوئی ہوئی تھیں۔

”سوچنا کیا ہے عاشری۔ میں اس دوسری عورت کا
وجود کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔ میں لعنت بھیجتی ہوں
ہمایوں اور اس کی جھوٹی محبت پر۔“ میں جانتی تھی کہ
وہ بھی سب کے گی۔ مگر

”تمہیں میری کلج فرینڈ ناچیہ یاد ہے؟“ اس نے
بھگی آنکھوں سے میری جانب دیکھا۔

”ہاں۔ مگر وہ اس وقت نہیں کیوں یاد آئی؟“
میں تعجب سے بولی۔ وہ نہ جانے کس کیفیت کے زیر
اثر میری حیرانی پر دھیان دے رہے بغیر بولتی گئی۔

”وہ ایک عدم تحفظ کا شکار اعتماد سے قطعی عاری
شخصیت تھی۔ ہمہ وقت انجانے خوف سے لرزاں
رہتی۔ محرومی گویا اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئی
تھی۔ اس کی افسردہ آنکھیں بہت کم مسکراتی تھیں۔
اس کی کتنی ہی معصوم سی خواہشات کو میں نے اس کی
حسرت خٹے دیکھا تھا اور کیا تم جانتی ہو عاشری کہ وہ ایسی
کیوں تھی؟“ اس نے بولتے بولتے یک دم مجھ سے
پوچھا۔

بے اختیار میرا سر نفی میں ہل گیا۔

”اس کی والدہ کو بھی زندگی اسی مقام پر لے آئی

تھی، جس پر آج میں کھڑی ہوں اور انہوں نے ٹھیک
وہی فیصلہ کیا تھا جو کہ ایسے حالات میں ایک عورت
کر سکتی ہے، جو میں کرنا چاہتی ہوں، مگر عاشری۔
نہ جانے کیوں میرے ذہن سے ناچیہ محو نہیں ہو پیا
رہی۔ مجھے اس کا چہرہ اس کی باتیں نہ چاہتے ہوئے
بھی یاد آ رہے ہیں عاشری۔

اسے وقت اور حالات نے بہت باشعور بنا دیا تھا۔ وہ
اکثر آنسو بہاتے ہوئے مجھ سے کہتی۔

”یہ دنیا بہت بے رحم ہے مریم۔ مجھے ہر قدم پر اس
کی سفاکی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کاش میری ماما پھاسے
علیحدہ ہوتے وقت خود غرض بن کر نہ سوچتیں۔ صرف
ایک بار۔ ایک بار تو میرے بارے میں سوچ لیتیں۔“
سچ کہوں عاشری، تو اس وقت تو اس کی باتیں میری سمجھ
میں نہیں آتی تھیں، میں اسے روٹے کر لاتے دیکھ کر
اسے دلاسا دے دیا کرتی تھی مگر آج جب زندگی مجھے
اسی دور لے رہے آئی ہے جس پر کسی اس کی والدہ
کھڑی تھیں تو میں بھی وہی موڑ مڑنا چاہتی ہوں، جو وہ
مڑی تھیں۔ مگر۔

انتا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

”مگر کیا۔ کیا مریم؟“ میں نے بے چینی میں گھر کر

پوچھا۔
”کل رات ہماریں کا فون آیا تھا۔ وہ اپنی بچیوں کو
مس کر رہا ہے، ہمیں گھر واپس بلا رہا ہے۔ اپنے کے
پر شرمندگی کا اظہار بھی کر رہا تھا۔ میں جانتی ہوں عاشری
مگر وہ اعتبار کھو چکا ہے۔ بے وقاف شوہر ہے مگر میں یہ
بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ بلاشبہ وہ ایک بہت اچھا
باپ ہے۔“

اس نے لرزتی آواز میں بدقت تمام اپنی بات مکمل
کی۔ اس کی بے خواب ویران آنکھوں سے آنسو بہ
رہے تھے مگر اس کا چہرہ مطمئن تھا۔ اس نے جھک کر
اپنی بیٹیوں کا چہرہ چوما۔ گویا وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ میں
نے کرب ناکی سے اپنی دھندلی آنکھیں اٹھا کر اس کی
جانب دیکھا۔ وہاں مریم گم ہو چکی تھی۔

فقط ایک ”ہاں“ موجود تھی۔

☆

حیات سہ ماہی

اس ہجوم کے پیچھے جو براؤن رنگ کا گیت نظر آ رہا ہے جس کی دیوار پر خوب صورت پھولوں کی نیل ہے تختی پر بڑے حروف میں احمد جلال لکھا ہے۔۔۔ جی! یہ مومن اور مجاہد کا گھر ہے۔ گھر کا اندرونی دروازہ کھولتے ہی سامنے لاؤنج ہے۔ ٹی وی کے سامنے

”چھہ کا۔ ہم جیت گئے۔“ گلی کے بیچ چھ لڑکوں کا گروپ اپنے جیتنے کی خوشی میں بھنگڑا ڈال رہا ہے۔ ان کے سامنے جو منہ کے زاویے بگاڑے کھڑے ہیں یہ آج کے کرکٹ میچ کے ہارے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ اب ذرا جیتی ہوئی ٹیم کا تعارف ہو جائے۔ یہ موصوف جو بیٹ ہاتھ میں پکڑے بھرپور انداز سے بھنگڑا ڈالتے نظر آ رہے ہیں ان کا نام مومن احمد ہے۔ ان کے بائیں طرف موجود موصوف جو بھنگڑا ڈالنے میں ”فیصل قریشی“ اور ”دفعہ مصطفیٰ“ کو بھی بات دیتے نظر آ رہے ہیں یہ مومن احمد سے دو سال چھوٹے مجاہد احمد ہیں۔ مومن احمد کے دائیں طرف موجود دونوں حضرات ”ساحر لودھی“ کے جانشین معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھنگڑا کم اور لڈی زیادہ ڈال رہے ہیں۔

Downloaded From
Paksociety.com

اپنی ٹیم میں شامل تو نہیں کر لیا۔ ”عائلہ نے حیرت سے
 رسالے پر سے نظریں ہٹا کر دونوں کی طرف دیکھا۔
 ”بڑے افسوس کی بات ہے آپنی۔ آپ کو ہماری
 صلاحیتوں پر شک ہے۔ ”مومن ہماری ٹیم کا شاہد
 آفریدی ہے۔ ”مجاہد نے گویا عائلہ کی معلومات میں
 اضافہ کیا۔ مومن نے غر سے کالر جھاڑا۔
 ”اس خبر کو اپنے تک ہی رکھنا پبلک کرنے کی غلطی
 مت کرنا۔“

آپنی کو تب یقین آئے گا جب ہم قومی ٹیم میں
 کھیلیں گے۔ ”مومن نے ریموٹ اٹھاتے ہوئے
 اپنے مستقبل کے خوابوں سے آگاہ کیا۔
 ”مجھے تو رہنے ہی دو۔ میرا یقین تب بحال ہو گا
 جب پاکستانی ٹیم ورلڈ کپ کے فائنل میں انڈین ٹیم
 سے جیتے گی۔ ”عائلہ نے بے نیازی سے کہتے ہوئے
 رسالے سمیٹے۔

”انشاء اللہ وہ دن بھی ضرور آئے گا۔ ”مجاہد نے
 پر امید لہجے میں کہا۔

”اب دونوں بیوی نہ دیکھنے لگ جانا۔ کتابیں کھولو،
 نکل تم دونوں کا ٹیسٹ ہے۔ ورنہ ابھی امی کو بتاتی
 ہوں۔ ”عائلہ نے جانے سے پہلے دونوں کو دھمکانا
 ضروری سمجھا۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ دونوں نے
 کمرے کا رخ کیا۔ امی کا اتنا ڈر نہیں تھا البتہ لہجی کا
 رعب بہت تھا جن سے یقیناً ”امی۔ شکایت لگا
 دیتیں۔“



یہ خوشبو میں احمد جلال صاحب کے گھر کے کچن
 سے آرہی ہیں جو کہ سفینہ احمد کی سلطنت میں شامل
 ہے۔ ارے یہ کیا؟ یہاں خلاف معمول عائلہ احمد
 موجود ہیں۔ اسی لیے کچن کی حالت مخدوش ہے۔ کافی
 سارے برتن اب تک گندے کر چکی ہیں، جس کا
 مطلب ہے ان کی والدہ کہیں دورے پر نکلی ہیں جو
 عائلہ کسی کو گنگ شوکی ہوسٹ کی طرح خراب کاریاں
 کرتی پائی جا رہی ہیں۔ جس کو خود تو کچھ آتا نہیں ہوتا

والے صوفے پر ایک موصوفہ براجمان ہیں۔ ارے
 ارے۔۔ گھبرائیے مت یہ صاحبہ تو چہرے سے ہی
 بہت نرم مزاج اور خوش اخلاق معلوم ہوتی ہیں۔
 زیادہ نہیں تو کچھ خوش اخلاق تو ضرور واقع ہوتی ہیں۔
 اب چہرے اتنا بھی جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ عائلہ احمد
 ہیں اس گھر کی اکلوتی صاحبزادی۔ غلط فہمی میں مت
 پڑیے گا یہ اتنی پڑھا کو ہرگز نہیں جتنا آپ سمجھ رہے
 ہیں۔ عائلہ احمد بڑے انماک سے گود میں رکھے
 رسالے میں موجود ماڈلز کے خوب صورت کپڑوں کو
 لپٹاتی نظروں سے دیکھنے میں مصروف ہیں۔ آج کل
 اپنی عنقریب ہونے والی شادی کے باعث ہر اچھے
 جوڑے پر ان کی نظر رہتی ہے۔

”عائلہ باہر اتنا شور کیوں ہے؟“ صحیح پہچانا۔ یہ احمد
 جلال کی لہجہ سفینہ بیگم ہیں جو اس وقت باورچی خانے
 میں اپنے معمول کے کام انجام دے رہی ہیں۔ سنان کے
 کانوں تک بھی شور رنگے کی آوازیں پہنچ گئی ہیں۔

”فکر نہ کریں امی! یقیناً یہ صحیح جیتنے کی خوشی میں
 ہونے والا ہنگامہ ہے۔ آج فائنل میچ تھا۔ ”عائلہ نے
 میز پر سے دوسرا رسالہ اٹھاتے ہوئے والدہ صاحبہ کو
 مطمئن کیا۔ اسی وقت لاؤنج کا دروازہ کھول کر مومن
 اور مجاہد چمکتے چہرے لیے اندر آئے۔
 ”آپنی! آپ ان رسالوں کو کوئی پچاس مرتبہ دیکھ
 چکی ہیں۔ آج تو چھوڑ دیں۔ ”مومن نے مزے سے
 کہتے ہوئے عائلہ کے ساتھ والے صوفے پر گرتے
 ہوئے اس کے شوق پر تبصرو کیا۔

”کیوں آج کیا خاص بات ہے۔ کہیں میچ تو نہیں
 ہار گئے۔ ”عائلہ نے جوڑے کے رنگوں کو ذہن نشین
 کیا اور دل میں بالکل ایسا ہی جوڑا بنوانے کا مقصد ارادہ
 کیا۔

”آپنی! اتنے بہترین کھلاڑی ہوتے ہوئے ہم میچ
 کیسے ہار سکتے ہیں۔ ”و کٹری ہماری ہے۔ ”مجاہد نے فلور
 کٹن پر بیٹھتے ہوئے ہوا میں و کٹری کا نشان بنایا۔
 ”کیسے شاہد آفریدی کو کیسٹ آؤٹ نہیں کے طور پر

لیکن باتوں میں کوکنگ ایکسپرٹ کو بھی مات دیتی نظر آتی ہے۔

”کتنے دنوں سے میرا دل پکوڑے کھانے کا کر رہا تھا۔“ عائکہ نے آلو اور پالک کے پکوڑے پلیٹ میں نکالتے ہوئے سوچا۔

”موسم کتنا خوشگوار ہے۔“ عائکہ نے کھڑکی سے باہر دیکھ کر لمبی سانس اندر کھینچی۔ عائکہ پکوڑوں کی پلیٹ اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ لاؤنج کا ماحول خاصا ٹینس تھا۔ عائکہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے مومن اور مجاہد کی پریشان صورتوں کو دیکھا جوٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ عائکہ رسالہ پڑھنے اور پکوڑے کھانے میں مصروف ہو گئی۔

”آؤٹ کیوں نہیں ہو رہے یہ انڈینز۔“ مومن نے عائکہ کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دو پکوڑے اٹھائے۔

”ٹینشن نہ لو۔ ابھی شاہد آفریدی میدان میں آئے گا۔ اسے تو آؤٹ کر کے ہی دم لے گا۔“ مجاہد نے مومن کو تسلی دی۔

”یہ تو چوکے پر جو کا لگا رہے ہیں۔“ عائکہ نے رسالے پر سے نظریں اٹھا کر مومن کو دیکھا ٹینشن میں بھی اس کی پکوڑے کھانے کی رفتار قابل دید تھی۔

”ٹینشن میں لوگ کھانا پینا بھول جاتے ہیں۔ تمہاری طرح دوسروں کے کھانے پر نہیں ٹوٹ پڑتے۔ شرم کرو یہ ساتھ دے رہے ہو قومی ٹیم کل۔“ عائکہ نے شرم دلانا چاہی۔

”جان ہے تو جہان ہے۔“ مومن نے دونوں شغل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”آبی صحت بنائیں گے تو قومی ٹیم کا ساتھ دے سکیں گے۔“ مجاہد نے بھی ساتھ دیتے ہوئے تین پکوڑے اٹھائے۔

”ساتھ کیا خاک دو گے۔ یہی ٹیم جیت گئی تو پھول برسائے اور اگر ہار گئی تو انڈے اور ٹماٹر۔ اتنے ہی جذباتی ہو تم سب کرکٹ کے معاملے میں۔“

”آبی! اس وقت ہارنے کی باتیں نہ کریں۔“ مومن کو اس تقریر میں ایک ہی بات قابل غور لگی۔

”دعا کریں آبی! پاکستان جیت جائے۔ لوگوں کی بہنوں کو اتنا شوق ہوتا ہے کرکٹ کا پر آپ کو ذرا بھی نہیں ہے۔“ مجاہد نے دکھی لہجے میں افسوس کا اظہار کیا۔ عائکہ نے مجاہد کی ساحر لودھی جیسی ایکٹنگ پر منہ بناتے ہوئے پلیٹ میں پڑے آخری پکوڑے کو حسرت سے دیکھا۔ ابھی اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مومن پکوڑا منہ میں ڈال چکا تھا۔

”مستقبل میں ہم آفریدی بھائی کے ساتھ کرکٹ کھیلیں گے۔“ مجاہد پر جوش ہوا۔ عائکہ نے پکوڑے کا افسوس بھول کر حیرت سے مجاہد کو دیکھا۔

”شاہد آفریدی کے ساتھ کھیلو گے۔“

”وہ دن بھی دور نہیں جب ہم دونوں شاہد آفریدی کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے ہوں گے۔“ مومن نے تصور میں اپنا من پسند منظر دیکھا۔

”مگر عنقریب آفریدی اسرار یعنی اپنے دلہن بھائی کے ساتھ میچ کھیلیں گے۔“ مومن کی بات مکمل

ہوتے ہی عائکہ کو اپنا ایک اور غم یاد آ گیا۔ اس رشتے میں عائکہ احمد کو صرف لڑکے کا نام ہی غیر مناسب لگا تھا۔ اس کے خیال میں ”آفریدی“ نام کرکٹ کی فیلڈ سے مماثلت رکھتا ہے۔ یقیناً ”موصوف“ خود بھی کرکٹ کے فین ہوں گے۔ عائکہ نے اپنی سوچوں سے نکل کر لاؤنج میں ہونے والی خاموشی کا جائزہ لیا۔ مومن اور مجاہد دونوں کے منہ کے زاویے بگڑے ہوئے تھے۔ پھر نظر ٹی وی پر گئی جہاں اینڈرین ٹیم اچھل کود رہی تھی یعنی جیت چکی تھی۔ یہ دیکھ کر اسے بھی افسوس نے گھیر لیا کہ آخر دل تو پاکستانی ہے۔ اسی وقت ڈاکٹر تیمور کا پیشازین بھاگتا ہوا اندر آیا۔

”مومن! میرے ابو کو فون کرو جلدی گھر آئیں۔ ہمارا فون خراب ہے۔“

”کیوں خیر تو ہے؟“

”امی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔“

”اللہ خیر کرے کیا ہوا ہے۔“ سفینہ بیگم اسی وقت کمرے میں آئیں۔ عائکہ نے مہنگے نظروں سے زین کو دیکھا۔

”امی کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا ہے۔۔۔ انڈیا میچ جو جیت گیا ہے اسی لیے۔“ زین کی بات سنتے ہی عائکہ اور سفینہ نے بے زار منہ بنایا۔

”اب اتنی بھی کیا ٹینشن لیتی اس موئے کرکٹ کی“ سفینہ بیگم بڑبڑاتی ہیں۔

”یہ زینہ آئی بھی پوری ڈرامہ کو مین ہیں۔“ عائکہ نے خالی پلیٹ اٹھائی اور چکن کا بیچ کیا۔ مومن ڈاکٹر تیمور کو فون کرنے میں اور مجاہد موبائل پر گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔ احمد جلال کا گھرانہ اتنا جذباتی بھی نہیں تھا کہ گفتگوں میں ہارنے کا غم منایا جاتا۔ اس بار نہ سسی اگلی بار سہی کیونکہ ان کے خیال میں ”زندگی گلزار ہے“

”چھٹکا۔“ مجاہد خوشی سے صوفے پر اچھل پڑا۔
”ان شاء اللہ آج ہم یہ میچ جیت کر رہیں گے۔“

مومن نے آلو بخارہ منہ میں رکھتے ہوئے دعا یہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ اسی وقت پکوٹوں کی پلیٹ ہاتھ میں لیے سفینہ بیگم کی اشری ہوئی۔

”جس وقت دیکھوئی وی سے چکے ہوتے ہو۔“
”امی یہی تو دن ہیں لی وی دیکھنے کے میچ شروع ہو چکے ہیں۔“

”واہ امی! پکوٹے۔۔۔ آپ نے تو آپنی کی یاد دلا دی۔ مومن نے خوش ہوتے ہوئے پکوٹوں کی طرف پیش قدمی کی۔

”بیٹا دو مینے ہو گئے ہیں عائکہ کی شادی کو۔ چکر ہی لگا لو بہن کی طرف ساتھ لیتے آنا۔ دونوں رہ لے۔ اس کے ابو بھی یاد کر رہے تھے۔“

”جی امی ہم کل چلے جائیں گے۔“ مومن نے ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے سعادت مندی سے سر

آئے اب عائکہ احمد کے سرال یعنی اسرار ہاوس چلتے ہیں۔ عائکہ احمد اپنے خوب صورتی سے بچے بیڈ روم میں آئینے کے سامنے اسٹول پر بیٹھی آنکھوں میں کاجل لگانے میں مشغول ہیں۔ عائکہ نے کاجل کی ڈبی رکھتے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہ اس وقت گہرے سبز رنگ کی کلیوں والی فرائڈ میں ملبوس تھی جس پر سلور رنگ سے ہلکی سی کڑھائی ہوئی تھی۔ فرحت اشتیاق کے ٹیوٹر کی ہیرو مین کی طرح نہیں تو صاف مگر کے جیسی خوب صورت تو یقیناً ”لگ رہی ہوں۔“ عائکہ نے مسکراتے ہوئے خود کو ہر زاویے سے آئینے میں دیکھا۔ آج اسرار صاحب کے پوتے قہد کی سالگرہ تھی۔ اسی لیے عائکہ اپنے تیار ہونے کا شوق پورا کر رہی تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی خوب صورت ڈیزائن والی جوڑیاں پہننے کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلی۔

پہلے چکن میں جھانکا مگر دیاں کی ویرانی دیکھ کر حیران ہوئی۔ شہنا بھائی کی موجودگی میں چکن شیفٹ گلزار کے چکن کی طرح مہکا اور بھرا رہتا تھا۔ مایوس ہو کر لاؤنج کی

راہ لی جہاں سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ عائکہ نے رک کر جائزہ لیا۔ اس کی سانس صوفے پر بیٹھی تسبیح بڑھنے میں مشغول تھیں۔ تسبیح کے دانے تیزی سے گزر رہے تھے مگر نظریں لی وی پر لگے میچ پر تھیں۔ دوسرے صوفے پر غم زدہ سی شہنا بھائی بیٹھی تھیں۔ ساتھ ہی شاہد بھائی بیٹھے تھے جنہوں نے آنے کے بعد کوٹ اتارنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ فاطمہ اور فہد کارپٹ پر بیٹھے لی وی کی طرف متوجہ تھے۔

”شاہد بھائی! آپ آج جلدی آگئے۔“ عائکہ نے فہد اور فاطمہ کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنے سوال کی آڑ میں فہد کی سالگرہ کی طرف توجہ دلانا چاہی۔
”آں ہاں۔۔۔ وہ میچ تھا اس لیے میں دو گھنٹے پہلے ہی آ گیا۔ آفریدی بھی آنے والا ہوگا۔“

”آئے ہائے۔ کوئی اس موئے کالے کو تو آوٹ کرے۔“ ساس صاحبہ نے انڈین کھلاڑی کو کھاجا جانے

والی نظروں سے گھورا۔

”دادو۔۔۔ فکر نہ کریں ابھی آفریدی بھائی آکر اسے آوٹ کریں گے۔“ فمد نے لسل وی جس پر عائلمہ نے خفگی سے فمد کو دیکھا۔

”آفریدی بھائی ضرور کہنا ہے۔۔۔ شاہد بھائی کہہ لے۔“

”چو کا۔۔۔“ چار سال کی فاطمہ کو یقیناً ”غلط قسمی ہوئی تھی۔“

”چھکا مارا ہے۔“ ساس صاحبہ نے عینک سیدھی کی۔

”نہیں اماں! ابھی کہاں۔“ شاہد بھائی نے افسوس سے سر ہلایا۔

”فمد آج تمہاری سالگرہ ہے۔“ عائلمہ نے اکتا کر فمد کو یاد دلایا۔

”چاچی! دعا کریں پاکستان جیت جائے۔“ فمد کی فکریں زالی تھیں۔ اس سے مایوس ہو کر عائلمہ نے شہنا بھالی کی طرف دیکھا۔

”بھائی کھانا لگا دوں۔ لہاجی اور آفریدی آنے والے ہوں گے۔“

”لہاجی کی میٹنگ ہے۔ وہ دیر سے آئیں گے۔ اور تم کیوں بناؤ گی۔ ابھی تو کھیر میں ہاتھ ڈالتا ہے۔“

”بہو ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ ساس صاحبہ نے بھی شہنا بھالی سے اتفاق کیا۔

”میں تو لگانے کا کہہ رہی تھی۔“ عائلمہ نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

”کیا لگاؤ گی؟“

”کھانا تو ابھی بنا ہی نہیں۔“ شہنا بھالی کی بات پر عائلمہ نے حیرت سے کھڑی دیکھی جو سوانو بجا رہی تھی۔

”ہماری تو بھوک پیاس ہی اڑ گئی۔۔۔ جب تک ان موئے کالوں سے جیتیں گے نہیں تو والہ خلق سے نہیں اترے گا۔“ ساس صاحبہ کی بات سن کر عائلمہ کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ دوپہر کو اس نے تھوڑا سا سناٹا کھوں میں آئے آنسو چھپانے کے لیے وہ

اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ مومن اور مجاہد پر بھی پیار آ رہا تھا جو کم از کم کھانا نہیں چھوڑتے تھے۔

”اگر پاکستان ہار گیا تو۔۔۔“ یہ سوچتے ہی آنسوؤں میں روانی آگئی۔ پھر تو کھانا ملنے کا امکان بالکل نہیں تھا۔ کیوں نہ کیا زبیرہ سے ان گھر والوں کی جذباتیت کا توڑ پوچھوں۔ ایک نئے خیال نے عائلمہ کے ذہن پر دستک دی۔ آفریدی اسرار کمرے میں داخل ہوئے تو ان کا موڈ آف تھا۔

”کیس پاکستان۔۔۔“ عائلمہ کو ٹینشن ہونے لگی۔ اسی ٹینشن میں سلام کرنا بھی بھول گئی۔

”آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ آفریدی کی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔“ فکر نہ کریں۔ ابھی پاکستان میچ ہارا نہیں ہے۔“ آفریدی نے کوفت سے کہتے ہوئے کوٹ اتارا۔

”نہیں۔۔۔ میں اس لیے تو نہیں رو رہی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔“ عائلمہ نے شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔

”اس میں رونے کی کیا بات ہے۔“ آفریدی نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ پھر جھٹنے والے انداز میں سر ہلایا۔

”ہوں۔۔۔ گھر میں کھانا نہیں بنا ہو گا۔ ویسے بھی میچ کے فیصلے تک امید نہ ہی رکھیں۔ میں خود بھی گھر والوں کی اس غیر ضروری جذباتیت سے تنگ ہوں۔۔۔ میچ جیتنا لازمی نہیں۔ نہ ہی ہارنے پر کھانا پینا چھوڑنا عقل مندی ہے۔ چلیں آپ منہ دھو لیں تیار تو آپ ویسے بھی ہیں۔ کھانا باہر کھاتے ہیں۔“ آفریدی نے کوٹ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر عائلمہ کو دیکھا جو حیرت سے منہ کھولے کھڑی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اب حیران ہونے کی باری آفریدی کی تھی۔ کیونکہ عائلمہ کی شکل پر اس وقت خوشی اور حیرت دونوں کا تاثر تھا۔

”کچھ نہیں۔ آپ گاڑی نکالیں میں آ رہی

ہوں۔“ عائکہ نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے واش روم کی طرف دوڑ لگائی۔ آفریدی حیران سے کمرے سے نکل گئے۔ عائکہ نے جلدی سے آنکھوں کو کاجل میں ڈبوایا۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو عائشہ خان کی آنکھوں سے تشبیہ دی۔ مومن اور مجاہد صحیح کہتے ہیں وکٹری ہماری ہے۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اس نے مسکرا کر سوچا۔

”بچوں جیسی حرکتیں کرتے ہو تم سب۔ یہ سب سکھانا چاہتے ہو اپنی تسلوں کو۔ حد ہے بے وقوفی کی، فہم اور فاطمہ کے ذہنوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے اس بات کا اندازہ ہے۔“ اسرار صاحب کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ کمرے کا منظر کچھ یوں تھا کہ بیگم اسرار بستر لیٹی تھیں۔ ساتھ ہی اسرار صاحب غصیلے تاثرات کے ساتھ براجمان تھے۔ سامنے ہی صوفے پر شاید اور شہنا بھالی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کمرے میں رکھی گئی دو کرسیوں پر اس وقت آفریدی اور عائکہ بیٹھے تھے جن کے سر جھکے ہوئے نہیں تھے۔ آفریدی کے چہرے پر افسردگی رقم تھی جبکہ عائکہ ابھی تک بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ گھر آنے پر انہیں معلوم ہوا کہ پاکستان میچ توجیت کیا تھا مگر گھر میں کسی خوشی کا احساس نہ تھا جس کا ذکر آفریدی عائکہ سے کر چکے تھے کیونکہ ساس صاحبہ بھوک کے باعث بے ہوش ہو گئی تھیں۔ فہم اور فاطمہ کالی پی لو ہو گیا تھا اور اب اسرار صاحب سب پر برس رہے تھے۔

”بس بھی کریں۔“ بیگم اسرار کے لہجے میں شرمندگی کی جھلک تھی۔
 ”کیا بس کروں۔ کھانا پینا چھوڑنا کہاں کی عقل مندی ہے۔“

”ہم کون سا کھانا چھوڑ رہے تھے۔ ذرا سی دیر ہی تو ہوئی تھی ویسے بھی میں نے آج گولیاں نہیں لی تھیں۔“
 بہت رات ہو گئی ہے۔ جاؤ تم سب اپنے کمروں میں اور آرام کرو۔“ اسرار صاحب نے افسوس سے سر ہلایا۔

”یہ نہیں بدلنے کے۔“ اور واش روم کا رخ کیا۔ باقی سب بھی اٹھ گئے۔ آخر محفل جو برخواست ہو چکی تھی۔

”بہت ہو گئی۔ کب تک چلے گا ایسے۔“ عائکہ نے نیند سے بند ہوتی آنکھوں سے آفریدی کا فکر مند چہرہ دیکھا۔

”ہمیشہ۔“ عائکہ نے جملائی روکتے ہوئے کہا پھر آفریدی کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اپنی بے اختیاری کا احساس ہوا۔

”میرا مطلب ہے آپ کیا کر لیں گے۔“ عائکہ نے وضاحت کی۔

”کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ورنہ یہ جذباتیت فہم اور فاطمہ کو بھی لے ڈوبے گی۔“ آفریدی کے لہجے سے لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ کرنے کی ٹھان چکے ہیں۔

”ہائے۔ رات کے اس پر کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ان گھر والوں کے کام بھی نرالے ہی ہیں۔ یہ کوئی وقت ہے ہیرو بننے کا۔“ عائکہ کا اپنی بے بسی پر رونے کو دل چاہا۔ آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں۔

”کل دیکھیں گے۔ آپ کو بھی نیند آرہی ہے۔ مجھے بھی صبح دفتر جانا ہے۔“ آفریدی نے کہا۔ جس پر شکر ادا کرتے ہوئے عائکہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔

”آج کا میچ بہت اہم ہے۔“ آفریدی نے عین ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ریموٹ فہم کے ہاتھ سے لیا۔ شہنا بھالی نے حیرت سے اپنے دیور کو ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا جو کلتی عرصہ ہوا ان کے ساتھ بیٹھ کر میچ دیکھنا چھوڑ چکا تھا۔

”آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔ خیر تو ہے، سورج کہاں سے نکلا ہے آج۔“ شہنا بھالی نے شرارتی انداز میں آفریدی کو دیکھا۔

”آج سب کے ساتھ بیٹھ کر میچ دیکھنے کو دل کر رہا ہے۔“ آفریدی نے نظریں ٹی وی پر سے ایک لمحے کے

آواز سنی جو خیزرقاری سے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ پیچھے عائکہ بھی تھی جو ناشتہ کرنے پر اصرار کر رہی تھی۔

”مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ۔“

”کہا تو ہے نہیں دل چاہ رہا۔ نہیں کرنا ہشتہ۔“

”وہ آپ نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا اس لیے میں۔“ عائکہ منمنائی۔

”مہربانی آپ کی میرا جب دل چاہے گا میں کھا لوں گا۔“

خدا حافظ۔ ”آفریدی کو جاتے دیکھ کر عائکہ مڑی۔

شہنا بھالی پر نظر پڑتے ہی سلام کیا۔

”یہ آفریدی کو کیا ہوا ہے۔ ایسے تو کبھی نہیں کیا

اس نے۔ کم از کم میچ ہارنے پر۔“

”پتا نہیں بھالی میں نے تو ایسے ہی رکھا ہے۔“

عائکہ نے براٹھا آلیٹ اپنی طرف کرتے ہوئے لاروا

انداز میں کہا شہنا بھالی اسے فوق و شوق سے ناشتہ

کرتے دیکھ کر خود بھی ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

شہنا بھالی سبزی اور چھری لیے لاؤنچ کے صوفے پر

آ بیٹھیں جہاں عائکہ اخبار ہاتھ میں لیے ساس صاحبہ کو

خبریں سنارہی تھی۔

”کل کا میچ ہارنے پر ایک دس سالہ بچے کی حرکت

قلب بند ہو گئی۔ ماں باپ غم سے بڑھال۔“

”ہائے اللہ۔“ ساس صاحبہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

عائکہ نے پڑھنا جاری رکھا۔ شہنا بھالی بھی متوجہ

تھیں۔

”ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ گھر کا ماحول بچوں پر گہرا

اثر ڈالتا ہے۔ ہر چھوٹی بات پر جذباتیت ان کے لیے

نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ جو پختگی ان کے ذہنوں کو

درکار ہوتی ہے وہ نہیں مل پاتی جس پر ان کے عصاب

کنزور ہو جاتے ہیں اور حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت

نہیں رہتی۔“ عائکہ نے خبر مکمل کر کے دونوں خواتین

کی طرف دیکھا۔

”بس بیٹا رہنے دو اور خبروں کو۔“ ساس صاحبہ نے

لے بھی نہیں پٹائی تھیں۔ بیگم اسرار ہمیشہ کی طرح

تسلیج لیے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اس کے آنے کا کوئی

نوش نہ لیا۔ عائکہ نے لاؤنچ سے گزرتے ہوئے سب

پر نظر ڈالی ہر کوئی مگن انداز میں ٹی وی کی طرف متوجہ

تھا۔ عائکہ نے سیب کھاتے ہوئے فون کا رخ کیا۔

اسرار ہاؤس کے مکین کھانے کی میز کے گرد جمع

تھے۔

”آفریدی نہیں آیا؟“ شہنا بھالی نے عائکہ کو کرسی

پر بیٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں بھالی! وہ کہہ رہے ہیں مصباح نے کھانا

نہیں کھایا تو وہ کیسے کھا سکتے ہیں۔ بہت موڈ خراب ہے

لن کا۔“

”یہ مصباح کون ہے؟“ شاہد بھالی نے حیران

نظروں سے عائکہ کو دیکھا۔

”مصباح الحق کی بہت کر رہے ہیں۔ میچ جو ہار گئے

ہیں۔ غصے میں بیٹھے ہیں اور سچی سے منع کیا ہے کہ

لن سے کوئی کھانے کا نہ پوچھے۔“

”ماشاء اللہ۔ یہ بے آپ کی اولاد۔“ اسرار

صاحبہ نے طنزیہ انداز میں بیگم کو مخاطب کیا۔

”بیٹا ہمارا کون سا جی چاہ رہا ہے کھانے کو۔ بس دو

لوالے زہر مار کر رہے ہیں۔ دو دوہ کا گلاس ہی دے آؤ

اسے۔“ بیگم اسرار نے شوہر کے طنز کو نظر انداز کرتے

ہوئے عائکہ سے کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اس تلاق کے پیچھے اپنی

بھوک خراب کرنے کی۔ کھانا کھاؤ بیٹھ کر۔ ہوش کی

دنیا میں آئیں گے تو خود ہی نعمتوں کی قدر آئے گی۔“

اسرار صاحبہ کی تیز آواز پر کرسی سے اٹھتی ہوئی عائکہ

واپس بیٹھ گئی۔ شاہد بھالی نے حیرت سے ساری گفتگو

سنی۔ بھلا آفریدی اتنا جذباتی کب سے ہو گیا تھا۔ پھر سر

بھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

شہنا بھالی نے میز پر ناشتہ رکھتے ہوئے آفریدی کی

READING
Sector

”یہاں میچ کا کیا ذکر۔ بس کریں آپ بھی۔ میں سمجھاؤں گی سچے کو۔ کیا خبر دفتر کی پریشانی ہو۔“ بیگم اسرار کی بات پر شہنا بھالی نے دل ہی دل میں اتفاق کیا اور اسرار صاحب منہ مٹائے کمرے میں چلے گئے۔



”لہاں! شہنا کا فون آیا تھا میٹنگ ہے۔ لیٹ ہو جائیں گے۔“ شہنا بھالی نے ساس کو مطلع کیا۔ بیگم اسرار نے سر ہلایا۔ اسی وقت آفریدی سلام کرتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا اور پریشان سا صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہے بیٹا پریشان ہو؟“ بیگم اسرار کو اپنے لاڈلے کی فکر ہوئی۔

”جی امی! بہت بری خبر سن کر آ رہا ہوں اپنے دوست سے۔“ آفریدی کی بات سن کر بلاورچی خانے کا رخ کرتی شہنا بھالی وہیں رک گئیں۔ فمد اور فاطمہ جو کھلونا ٹھیک کرنے میں مصروف تھے آفریدی کو دیکھنے لگے۔

”اللہ خیر کرے کیا خبر سن لی۔“ بیگم اسرار کا حلق تک خشک ہو گیا۔ ”مصباح الحق کا پاؤں فرہنگ چور ہو گیا ہے پریکٹس کے دوران۔“

”میں نے کہا تھا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ بیٹا اللہ اس سچے کو صحت دے تم کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو۔“ بیگم اسرار نے سکون کا سانس لیا اور بیٹے کی صورت دیکھی۔

”پریشانی کی ہی تو بات ہے امی۔ دو دن بعد میچ ہے نوزی لینڈ کے ساتھ۔ مصباح کے ساتھ دو اور بھی تھے جن کا فرہنگ چور ہوا ہے۔ نام ابھی پتا نہیں چل سکا۔“ عائکہ نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے فمد کا کھلونا اٹھالیا۔

”چاچو اب کیا ہو گا۔ کیا ہم ہار جائیں گے۔“ فمد نے آفریدی کی ٹانگ ہلاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔ ”اچھا بس چھوڑو اس ذکر کو۔ جاؤ آفریدی! کپڑے بدلو۔ کھانا کھاتے ہیں۔ اچھا ہوا تم جلدی آ گئے۔ تمہاری پسند کے کوتے بنے ہیں۔“ بیگم اسرار نے دونوں کا دھیان مٹانا چاہا۔

عائکہ کو روکا جو نئی خبر شروع کر رہی تھی۔

”جاؤ بیٹا! آفریدی کو فون کرو۔ رات کو کھانا نہیں کھایا۔ صبح ناشتہ نہیں کر کے گیا بھوکا پیاسا کلام کر رہا ہو گا میرا بچہ۔“

”جی۔“ عائکہ سر ہلاتی ہوئی فون کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے فون اٹھانے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون سن کر وہ بدحواس سی بھاگتی ہوئی شہنا بھالی اور بیگم اسرار تک پہنچی۔

”دیکھا ہوا عائکہ کس کا فون تھا؟“ شہنا بھالی اس کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہوئیں۔

”آفریدی کے دفتر سے فون تھا۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔“

”اللہ خیر ہوا کیا ہے؟“ بیگم اسرار نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

”وہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔“ ساس صاحبہ کو بندھال ہوئے دیکھ کر عائکہ پانی لینے کے لیے بھاگی۔ شہنا بھالی تسلی دینے کی کوشش کرنے لگیں۔ انہیں تو حیرت سے کچھ بھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔



”بیٹا عرق کر دیا ہے آپ نے اپنی اولاد کا۔ ایسی بھی کیا آفت پڑی تھی جو موصوف نے کھانے کا پیکٹ کر دیا۔ یہ کیا باطل پن ہے۔“ اسرار صاحب غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔

”بچہ ہے ہو گئی غلطی اب معاف بھی کر دیں۔“ سو رہا ہے۔ آپ کی آواز سے جاگ جائے گا۔“ بیگم اسرار نے بے چارگی سے اپنے فرزند کی حمایت کی۔ قریبی صوفے پر شاہد بھائی ہونٹ چہرہ لیے بیٹھے تھے جیسے ابھی بھی انہیں یقین نہ آیا ہو۔

”پتا نہیں کچھ ملے بھی پڑ رہا ہے یا نہیں۔“ عائکہ نے ان کی کیفیت دیکھ کر سوچا۔

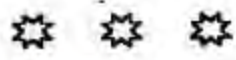
”بچہ ہے۔ سو رہا ہے۔ ہماری نیندیں اڑا کر سو رہا ہے نالائق۔ یہی ماجول رہا گھر کا تو سوچا ہے آپ نے کتنا برا اثر بڑے گانہ اور فاطمہ کے معصوم ذہنوں پر۔۔۔“

”سروار جو کسی نے میچ کا ذکر بھی کیا گھر میں۔“

بات شہنا بھالی اور امی کو پتا چل ہی چکی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ کے ان ڈراموں سے سب بدل جائیں گے۔ عائکہ نے اپنا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے آفریدی کو دکھا جو موبائل پر مصروف تھے۔

”احساس تو ہو ہی جائے گا کہ ان کی جذباتیت نقصان دہ ہے۔ کسی چیز کو حواسوں پر سوار کر لینا کہاں کی دانشمندی ہے۔“

”اللہ کرے جو آپ سوچ رہے ہیں وہی ہو۔“ عائکہ نے پر امید لہجے میں کہا۔



”یہ کیا میچ شروع ہونے والا ہے اور کسی نے ٹی وی نہیں لگایا۔“ آفریدی نے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سب پر ایک نظر ڈالی۔ فہم نے بیگم اسرار کو دیکھا اور ہلکی آواز میں آفریدی سے مخاطب ہوا۔

”منع کیا ہے واؤ نے۔“

”امی ٹی وی لگا لوں۔ ریہوٹ دے دیں۔“ آفریدی نے ان کے قریب پڑے ریہوٹ کو دیکھا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ تم دفتر سے اتنی جلدی کیوں آگئے ہو۔ دفتر کے اوقات پورے ہونے پر ہی گھر آیا کرو۔“ آفریدی نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے ان کے غصیلے تاثرات دیکھے۔

”جی امی۔۔۔ ریہوٹ تو دے دیں۔ میچ شروع ہو گیا ہے۔“

”کوئی میچ نہیں دیکھے گا۔۔۔ جتنا شرمندہ تم مجھے اپنے باپ کے سامنے کروا چکے ہو وہ کافی ہے۔ مزید کی ضرورت نہیں ہے۔“ امی کے طنز کو آفریدی نے پوری طرح محسوس کیا۔

”امی! یہ باتیں بعد میں کر لیں گے میچ تو دیکھنے دیں۔“

”بس بہت ہو گیا ہے آفریدی۔ پچھلے دنوں جو ڈرامے تم نے لگائے ہیں۔ سب سمجھتی ہوں میں۔ ماں ہوں تمہاری۔ ماں کو سبق پڑھانے چلے تھے۔“ عائکہ کے ہاتھ سے ٹرے گرتے گرتے بچی۔ آفریدی

”آپ لوگ کھائیں امی! میرا دل نہیں چاہ رہا۔ میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔“

”ارے۔۔۔ یہ کیا آفریدی بیٹا! کچھ تو کھاؤ۔“ بیگم اسرار بوکھلا گئیں۔

”آپ لوگ کھائیں۔“ آفریدی مزید کچھ سے بغیر کمرے میں چلا گیا۔

”عائکہ جاؤ۔ کھانا کمرے میں ہی لے جاؤ۔“ بیگم اسرار کی حیرت زدہ آواز پر عائکہ نے سر اٹھلایا۔ ”امی! ناراض ہوں گے۔ منع کر کے گئے ہیں۔“

”نہیں ہوتا ناراض۔ تم لے جاؤ اس کے سامنے بیٹھ کر کھاؤ گی تو خود ہی دیکھ کر کھالے گا۔“ عائکہ مزید کچھ کہے بغیر باورچی خانے کی جانب چل وی تاکہ کھانا کمرے میں لے جاسکے۔

”کھانا کھالیا آفریدی نے“ عائکہ جو ٹرے لیے باورچی خانے کا رخ کر رہی تھی بیگم اسرار کی آواز پر رگ گئی۔ ”نہیں امی میں ان کے سامنے ڈھائی روٹی کھا گئی۔ انہوں نے مائی ہی نہیں۔“

”بیٹا! اصرار ہی کر لیتیں۔“ انہوں نے افسوس سے اپنی معصوم ہو کو دیکھا۔

”ناراض ہوتے ہیں اصرار کرنے پر بھالی سے پوچھیں۔ اس دن ناشتے والی بات پر کس قدر منگمہ چلایا تھا۔“ عائکہ اپنی بات کھل کر کے مڑی۔ بیگم اسرار اور شہنا بھالی پر سوچ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔



”کتنا شرمندہ کرواتے ہیں آپ۔ کیا سوچتی ہوں گی امی اور بھالی ڈھائی روٹی کھا گئی میں۔“ آفریدی نے مسکراتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی۔

”کوئی بات نہیں اچھے مقصد کے لیے شرمندہ ہونا بڑے تو ہو جانا چاہیے اور ویسے بھی اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ بھوک لگے تو اتنا تو بندہ کھا ہی سکتا ہے۔“

”یہی روٹی کھاتی ہوں میں۔ اتنے دنوں میں یہ

نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”اسرار روز طعنے دیتے ہیں۔ تمہاری وجہ سے شرمندہ کرتے ہیں۔ اب میں انہیں کیا بتاؤں کہ یہ ڈرامے ان کی اولاد کے ہیں۔ یقین تھوڑی کریں گے وہ۔ دل تو چاہتا ہے تمہارے خوب کان کھینچوں۔۔۔ خوب سبق دیا ہے ناں کو۔“ آفریدی اٹھ کر ان کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

”کان کھینچ لیں مگر ناراض نہ ہوں امی۔ ابو کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اس ڈرامے میں شامل تھے۔“

”اس لیے انہوں نے اس پجوشن سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔۔۔ آنے دو ڈرامے کرائی ہوں ان سے بھی۔“ بیگم اسرار پر سکون ہوئیں۔

”سوری امی۔۔۔ میرا مقصد آپ کو تکلیف دینا نہیں تھا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ غیر ضروری جذباتیت

سے باز آجائیں آپ سب۔ اس دن کھانا نہ کھانے سے آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ فمد اور فاطمہ کا پی پی لو ہو گیا تھا۔ میں پریشان ہو گیا تھا یہ سب دیکھ کر۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا اور پھر بچے تو بہوں سے ہی سیکھتے ہیں۔“

”سچ شروع ہوئے آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے۔ اب پی پی وی لگائیں امی۔“ شہنا بھالی نے چائے سامنے رکھتے ہوئے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”اب کسی قسم کی فضول حرکت نہیں ہوگی میری طرف سے۔“ آفریدی نے یقین دلایا۔

”دادو پلینز“ فمد اور فاطمہ اکٹھے بولے تو بیگم اسرار نے مسکراتے ہوئے پی پی وی لگایا۔



اسرار ہاؤس کا پاورچی خانہ خوشبوؤں سے منک رہا ہے۔ عائکہ احمد پکوٹوں سے بھری پلیٹ ٹرے میں رکھ

رہی ہیں۔

”تنتی دیر ہے بھالی؟“

”سب کچھ تیار ہے۔“ شہنا بھالی نے چنا چٹ اور چپس کی پلیٹ ٹرے میں رکھی۔

”تم ٹرے لے جاؤ میں چائے لاتی ہوں۔“ عائکہ سر ہلاتی ہوئی ٹرے اٹھا کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ لاؤنج میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ آج اتوار کا دن ہے اور تمام گھروا لے میچ انجوائے کر رہے ہیں۔ اسرار صاحب بھی آج گھر پر نظر آرہے ہیں۔

”شکر ہے کچھ کھانے کے لیے بھی آیا۔“ آفریدی نے ٹرے لے کر آتی عائکہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیٹا چائے کا بھی انتظام کرو۔“ اسرار صاحب نے بھی پی پی وی پر سے نظر ہٹائی۔

”جی ابو آ بھالی لا رہی ہیں۔“

”اگر ہم میچ جیت گئے تو میری طرف سے ڈنر ہو گا۔“ شاہد بھالی نے پکوٹا کھاتے ہوئے آفریدی کو

”ہار گئے تو ڈنر میری طرف سے۔“ آفریدی نے بھی فیاضی دکھائی۔

”چاچو۔ آس کریم بھی۔“ فاطمہ نے بھی فرمائش نوٹ کروائی۔

”دونوں صورتوں میں آس کریم میری طرف سے ہوگی۔“ اسرار صاحب نے حصہ لیا۔

”ویسے مجھے تو اپنے پرموشن کی ٹریٹ دینی تھی تم کس کھاتے میں اتنی فیاضی دکھا رہے ہو۔“ شاہد بھالی نے آفریدی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”اپنی نئی گاڑی کی خوشی میں۔“ آفریدی نے مسکراتے ہوئے اصل وجہ بتائی۔ شاہد بھالی ہنستے ہوئے میچ کی طرف متوجہ ہوئے۔ عائکہ نے مسکراتے ہوئے سب پر نظر ڈالی اور رسالہ کھولتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔

”واقعی جیتہ ہماری ہے۔“



فرزاتہ کھنڈ

کھنڈ

بیرونی گیٹ عبور کرنے تک جیسے چپک جاتی تھی۔ اس نے آسمان کی جانب نگاہ کی "آج موسم کے رنگ ڈھنگ بدلے ہوئے تھے" ہوا بدلتی رت کا سندیسہ لیے درختوں کی شاخوں سے راز و نیاز میں مصروف تھی۔ اس کا موڈ ایک دم خوش گوار ہو گیا۔ موسم اس کے مزاج بہ بڑی حد تک اثر انداز ہوتے تھے۔ پورچ میں کھڑی آٹو کو گڈ بائے کہتی وہ کسی اور ہی ترنگ میں تھی، بے دھیانی میں اس کا کندھا پورچ کے مرمرین ستون سے ٹکرا گیا۔ اسے ٹھیک ٹھاک پتا چل گیا کہ دن میں مارے کیسے نظر آتے ہیں۔ اس نے

حسب معمول کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے قدم سست پڑ جاتے۔ کمرے سے آتی آوازیں۔ کوئی ایک آدھ جملہ اس کے کانوں میں بڑتا۔ اندر روزانہ کی طرح انا کے شکوے گلے اور ارمان کی جھوٹی دل جوئیاں وہ سوچتی کہ اگر چچی بیوی کے قدموں میں بیٹھا بیٹھا دیکھ لیں تو مارے دکھ کے اگلا سانس بھی نہ لے سکیں۔ اوپر والے پورشن کا بیرونی زینہ جہاں ختم ہوتا تھا وہاں ذرا سا موڑ مڑتے ہی بیڈ روم کی عقبی کھڑکی کے ساتھ گزر گاہ تھی۔ اور معمول کے مطابق ایک بلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ

مکمل ناول

Downloaded From
Paksociety.com



Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

دائیں ہاتھ سے اپنے کندھے کو سہلایا اور سامنے آتے
سبحان کو دیکھا جو یقیناً ”یہ حادثہ دیکھ چکا تھا وہ قریب
آنے پر رک گیا۔“

”اردگرد سے لاپرواہی برتا تکلیف کا باعث بن جاتا
ہے۔ لہذا اردگرد نواح پر نظر رکھا کرو۔“ اس کا ذوق معنی
لہجہ بہت کچھ جتنا ہوا تھا۔ عشنا نے اس کے متبسم
چہرے پر ایک اڑتی پڑتی نظر ڈالی اور زمین بوس قائل
اٹھانے کو جھگی جو کہ سبحان نے اس سے پہلے ہی اچک
لی۔

”ویسے صبح صبح کہاں کا پروگرام ہے؟“ اس نے
قائل پکڑاتے ہوئے عشنا کی سوجی سوجی آنکھوں اور
دھلے دھلائے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”لاہیرری کھنگالنے کے بعد تیار ابو کی میڈیسن لیتی
ہیں۔“ عشنا نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے

مختصر جواب دیا۔ سبحان نے یونہی بے ارادہ ذرا سا مڑ
کے دیکھا۔ چھوٹے گیٹ کے باہر کھڑی طیبہ کی ہلکی سی
جھلک دکھائی دی تو اس کے دل کو بڑی تسلی سی ہوئی۔
”سبحان! وہاں کھڑے ہو کر کون سا وظیفہ بڑھ رہے
ہو؟“ رافعہ کے لہجے کی کٹ سے وہ جان چکا تھا کہ
انہوں نے اسے عشنا سے بات کرتے دیکھ لیا تھا ”آہ
۔۔ ان دونوں خواتین کی جنگ میں ہتا نہیں میں غازی کا
رتبہ پاؤں گا یا شہادت نصیب ہوگی“ اس نے عسٹری
سانس لی اور ست روی سے اندرونی دروازے کی
جانب بڑھا۔



دو گھنٹے لاہیرری میں گزارنے کے بعد وہ دونوں باہر
آئیں تو یونہی بانندی ہو رہی تھی۔
”یہ تم نے آٹھ کس خوشی میں نہیں لی؟“ طیبہ نے
منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکتے ہوئے پوچھا۔
”موسم کس قدر دلفریب ہو رہا ہے بدذوق لڑکی۔
واک کے لیے ایک دم آئیڈیل۔“ عشنا نے ہنسلی
پہلو کرکے کچھ بوندوں کو منگی میں قید کیا۔

”آئیڈیل کی خالہ سنڈے کو بھی سونے نہیں دیتی
ہو، تم سے تو بہتر تھا کام والی ماسی سے دوستی کر لیتی جو
چھٹی کے دن تو آرام کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔“
جو اب ”عشنا کے بے ساختہ قہقہے پر طیبہ نے اسے جی
بھر کے کوسا۔“

”سحر خیزی صحت کے لیے اچھی ہوتی ہے مونی
چوڑی۔ ہم نوبے گھر سے نکلے تھے پورے دو گھنٹے
لاہیرری میں تم نے سو کر گزارے ہیں۔“ عشنا نے
میڈیکل اسٹور کا دروازہ کھولتے ہوئے طیبہ کو اپنے
ساتھ اندر کھیٹا۔ طیبہ نے اپنے بانوں میں گڑھی اس کی
انگلیاں ہٹائیں اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ کر کاؤنٹر
کے ساتھ رکھا اسٹول سنبھالا اور سامنے بڑے چائے
کے کپ کو ندیدوں کی طرح گھورا۔ عشنا نے نسخہ
نکال کر سیلزمین کو پکڑایا۔ اس نے باری باری تمام
دوا میں کاؤنٹر پر رکھیں تمام دوائیں چیک کیں پھر بل پہ
اک نظر ڈالی۔

”ان میں سے ایک دوا آپ نے مس کر دی ہے۔“
وہ سیلزمین سے مخاطب ہوئی۔

”میڈم! یہ میڈیسن پچھلے ایک ہفتے سے قاتب
سے اس کے لیے آپ کو تمام شہر کھنگالنا پڑے گا۔“
سیلزمین نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ چہرے پہ سجا کر کہا۔
”چلیں جی ایک اور مسئلہ۔“ وہ منہ ہی منہ میں
بڑھائی۔ پیسے دے کر نسخہ اور بقایا میسے اس نے بیگ
میں ڈالے۔ اور طیبہ کو باہر کی جانب بھیجا۔

”عشنا تم جانتی ہو صبح میں جب تک تین چار کپ
چائے نہ پی لوں میری سستی دور نہیں ہوتی۔“ طیبہ
نے آنکھیں ملتے ہوئے مصومیت سے کہا۔

”ہاں۔۔ ہاں گھر تو چلو۔۔۔ صرف چائے بلکہ پکوڑے
بھی ٹھوس لیتا۔“ عشنا نے قریب سے گزرتے
ہوئے خالی رکشے کو ہاتھ کے اشارے سے روکا جس پہ
طیبہ نے سکھ کا سانس لیا۔

”شکریہ مجھ سے خالی پیٹ بالکل نہیں چلا جاتا۔“
عشنا کا دھیان تیز ہوئی بارش پہ تھا ورنہ وہ طیبہ کو

ضرور کرارہ سا جواب دیتی۔

وہ جب گھر پہنچیں تو دو ہواں دھار بارش ہو رہی تھی پوریج میں پہنچنے تک وہ دونوں اچھا خاصا بھیگ چکی تھیں۔ سو وہیں رک کر کپڑے جھاڑنے لگیں پوریج سے ملحقہ لاؤنج میں زندگی پوری رفتار سے رواں دواں تھی۔ اور دیوار گیر کھڑکی سے نظر آتا اندرونی منظر کسی ڈرامے کا حصہ لگ رہا تھا۔ اجمل چچا پچاس ارنج کی ایل ای ڈی پہ نظریں جمائے دنیا و مانیہا سے بے خبر کسی ایکشن فلم میں پوری آنکھیں اور آواہانہ کھولے محو تھے، فون پہ با آواز بلند کہیں مارتی رافعہ چچی جلیبیاں کھانے کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ رہی تھیں جبکہ اربان بھائی نہ فلم دیکھ رہے تھے نہ جلیبیاں کھا رہے تھے بس ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کبھی مسکراتے تو کبھی سنجیدہ شکل بنا لیتے سامنے صوفیہ بیٹھا سبحان اپنے سامنے اخبار پھیلائے پورے اسٹماک سے بڑھ رہا تھا اس نے جو نظر اٹھائی تو موسم کی تمام دلکشی ایک

چہرے کی اوٹ میں چھب گئی گلان میں لگے، پھول پورے جو تھوڑی دیر پہلے محض ایک منظر تھے اب ایک وجود اپنا کر کسی وجدی کیفیت میں جھوم جھوم کر ایک ہستی پہ فدا ہونے لگے، چار سو سرسبز منظروں کو ایک چہرے نے شہری چھب دکھلا کر روشن ہالے میں مقید کر دیا تھا سبحان کی آنکھیں اس ہالے میں اپنے آپ کو بے بس و بے اختیار محسوس ہونے لگیں عشنا نے اندرونی منظر سے نظر چرا کر رابداری کی طرف بھاگتے ہوئے قدم بڑھائے اور اس کے پیچھے کرتی پڑتی طیبہ نے اس کی تقلید کی۔ وہ جب اوپر پہنچیں تو آمنہ نے ان کی اچھی خاصی کلاس لی۔

”خراب موسم میں پیدل جانے کی کوئی تک ہنتی ہے گاڑی کیوں نہیں لے گئیں، خوا خواہ کی ٹینشن عشنا! کچھ تو عقل کا استعمال کر لیا کرو۔“ امی کی ہر ڈانٹ پہ طیبہ نے سر ہلانا ضروری سمجھا۔

”امی پلیز! آپ وہم کرنا چھوڑ دیں بس ذرا سی بارش ہی ہوئی ہے کوئی سونا ہی نہیں تھا جو ہمیں کہیں

سے کہیں بہا لے جاتا۔“

”ہاں بھئی میں تو وہ ہموں کی ماری ماں ہوں، تم عقل کل ہو۔ طیبہ بیٹا! تم ہی اسے کچھ سمجھایا کرو کیونکہ تم تو سمجھ دار ہو۔“ ماں کی بات سن کر منہ بسورتی عشنا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”امی پلیز بی بی آن کیجئے گا بروننگ نیوز ہے۔ طیبہ بی بی اور سمجھ دار؟ عشنا ہنستے ہنستے بے حال ہونے لگی جس پہ طیبہ کا چہرہ غصے سے لال بھبھو کا ہو گیا۔

”بس میں جا رہی ہوں۔“ وہ باہر کی جانب لپکی۔
”اچھا، سوری پاپا چلو آؤ کپڑے پیچ کریں پھر دونوں مل کر پکوڑے بنائیں گے۔“ عشنا اسے کلائی سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے جانے لگی۔
”میرا ہاتھ تو چھوڑو، ہٹلر کی ملکہ۔“ طیبہ نے وہابی دی۔

”چلو پھر کیلے کپڑوں کے ساتھ صوفیہ یہ مو، ہٹلر کی بیوہ۔“ عشنا ادھار رکھنے کی قائل نہیں تھی۔ ان دونوں کی تکرار دیکھ کر آمنہ کچن میں جا کر پکوڑے تلنے لگیں۔

”امی زندہ باو۔“ عشنا نے مڑ کے نعرہ لگایا۔ وہ دونوں جب کپڑے بدل کر آئیں تو آمنہ چائے بھی بنا چکی تھیں۔

”قسم سے آئی! آپ کی اکلوتی بیٹی پچھلے جنم میں ضرور کٹھنہ رہی ہے۔“ طیبہ نے پکوڑا منہ میں ڈال کر شکوہ کیا عشنا نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔
”میں اتنی بد ذوق نہیں کہ تمہارے جیسے لوگوں کو اغوا کرتی پھروں یہ خوش قسمی دل سے نکال دو۔“ وہ ہنسی کے دوران بولی۔

”امی! میں ذرا تایا ابو کو پکوڑے دے آؤں آپ میری دوست کا خوب دھیان رکھے گا۔“ اس نے پلیٹ اٹھا کر کن اکھیوں سے منہ بناتی طیبہ کو دیکھا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔



وہ تیا ابو کے کندھوں اور گردن کا مساج کر رہی تھی ایک سکون اور ماحول تھا پرندوں کی آوازیں اور وہ پھر کی خاموشی آپس میں راز و نیاز کر رہے تھے، جیسے موسم سے چھڑنے کا تازہ تازہ دکھ ڈھلتے سایوں نے اپنے تن پہ لپیٹ رکھا تھا اور خوش ہوتے پرندوں سے خفگی بھری چپ میں بے وفائی کا ہر جانہ مالتے نظر آتے تھے اے سرنہیو ڈائے چپ کی بطل مارے بدلتے موسموں کو دیکھ کر تیا ابو جیسے سروں میں ہیریا بلتے شاہ کا کلام پڑھتے کم گنگناتے زیادہ تھے وہ عموماً "نیم دراز رہتے تھے اس لیے عشنا روزانہ ان کی گردن کا مساج کرتی اور ساتھ ساتھ ان سے کافیاں سنتی تھی اب بھی وہ دونوں گزرتی دوپہر کے سائوں میں اپنی آواز کا سرتلا کرتے والے موسم کو خوش آمدید کہہ رہے تھے کہ ایک لخت ماحول کے فسوں کا پیرا غرق کرتی رافحہ چچی کی آواز آئی۔

"چار گھنٹوں میں میں ہزاروں کام نپٹا کر آگئی ہوں اور مہارانی سے ابھی تک گھر کی صفائی نہیں ہو سکی۔ ذرا ارہن کو آئیے دوپہر دیکھنا میں تیرا کیا حشر کرواتی ہوں

"تیا کی گردن پہ مساج کرتی عشنا کی انگلیاں رک چکی تھیں۔

"اب چھوڑ یہ جھاڑ پونجھ اور کچن میں چل کر روٹیاں پکا، بھوک سے برا حال ہے" تیا نے اپنے کندھوں پہ رکھے عشنا کے ساکت ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھاما اور اسے اپنے سامنے والی کرسی پہ بٹھایا۔

"کیا ہوا یہ تو روز کا معمول ہے۔" تیا نے پرسکون لہجے میں کہا، جو اب "عشنا نے انہیں شکایتی نظروں سے دیکھا تیا نے کندھے اچکائے۔

"مجال ہے کہ اس بے حس پر ذرا اثر ہو، کل چار گھنٹے میں اسے لیکچر دیتی رہی ہوں کہ خدا کی بندی جواب میں کچھ تو بولا کرو کوئی ایک لفظ، جملہ یا پھر ایک غصے بھری نظر ہی ڈال لیا کرو، اپنے زندہ ہونے کا ثبوت تو دو۔" عشنا جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"مگر یہ ایسی ڈھیٹ ہے کہ بس کیا ہو گا زیادہ سے

READ
Secti

زیادہ چچی اسے اپنے گھر سے بے دخل کر دیں گی۔" عشنا نے تل کی بوتل کا ڈبکھن زور سے بند کیا تیا بس مہم سا مسکرائے تھے۔

"اچھا بتاؤ۔ اگر اتنا بولے گی، جھگڑا کرے گی تو بھالی سدھر جائیں گی، نہیں عشنا بی بی! حالات اور بگڑ جائیں گے اور اتنا کہے لیے زندگی اور مشکل ہو جائے گی کیونکہ بھابھی کبھی بھی نہیں بدلیں گی۔" تیا کے لہجے ٹھوس حقیقت عشنا کا منہ چڑا رہی تھی۔

"اگر ارہن بھائی بیوی کی عزت نہیں کروا سکتے تو سب کے سامنے اس کی بے عزتی تو نہ کروائیں۔" عشنا کی سوئی ہنوز وہی اٹکی ہوئی تھی۔

"جب تم اس طرح کی باتیں کرتی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے میرے سامنے اہل آن بیٹھی ہیں۔" تیا کی آنکھوں میں گزری کہانیوں نے کئی اور آق پلٹنے چاہے تھے مگر عشنا ان بند کتابوں کو ایک خوب صورت رین میں باندھ کے یادوں کے سب سے الگ تھلگ کرنے میں رکھ چکی تھی۔

"داوی بہت بھلا رہیں میں تو ان کا پاسنگ بھی

نہیں ہوں۔" عشنا نے ماضی کا پلو تیا کے ہاتھ سے فوراً ہی چھڑا لیا تھا ورنہ وہ کئی دنوں تک اپنے آپ سے غافل رہتے۔

"آپ کے پسندیدہ پروگرام کے ریپیٹ ہونے کا نام ہو رہا ہے۔" اس نے ٹی وی آن کیا اور چھوٹی موٹی چیزوں کو ان کی جگہ پہ رکھا۔

"میں امی کو بھیجتی ہوں۔" وہ تیا سے کہتی باہر کی طرف بڑھی۔ چچی کھانا کھا رہی تھیں اس نے انہیں سلام کیا اور کچن کی جانب آئی، سارا کچن پھیلا ہوا تھا "کس قدر کپاڑا بھر رکھا ہے۔" اس نے وہی آواز میں کہا۔ اتنا گھبرا کے دروازے کی طرف نگاہ کی۔

"فکر مت کرو وہ سب کچھ بھلا کر کھانا کھاتی ہیں مگر تم بتاؤ یہ صفائی دھلائی وہ بھی تفصیلی، باجرا کیا ہے؟" عشنا نے اتنا کہے تھکے تھکے وجود سے نظر چرا کر رہتوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔

”بارہ سال بعد امی کی بہن دوعنی سے بمعہ فیملی آ رہی ہیں یہ سب ان کے اعزاز میں ہو رہا ہے۔“ انا نے برتن صاف کرنے والا کپڑا دوسرے ہاتھ میں شفت کرتے ہوئے انتہائی دھمے کبجے میں بتایا۔

”پھر تو تمہاری سزا کا دورانیہ کلنی لمبا لگتا ہے۔“

عشنا نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”مگر جب تک تم خود نہیں چاہو گی تمہاری ساس کا رویہ اور سلوک ایسا ہی رہے گا۔“ وہ اپنی بات کہہ کر پلٹی تو پیچھے ارمان کھڑا تھا۔

”اب تو تمہارا بہادر شوہر آیا ہے بھالی اس کی سیوا میں جت جاؤ۔“ عشنا نے کھا جانے والی نظروں سے ارمان کو دیکھا۔

”ارے انا! بچہ کب سے آیا ہوا ہے کچھ خبر بھی ہے کہ نہیں۔“ چچی کی زوردار آواز نے کچن میں تھمکے چچا دیا تھا دو تین برتن انا کے ہاتھ سے گرے۔

”آئے ہائے اب کیا توڑ دیا۔ تین چار وقت کھاتی ہے پھر بھی تیرے ہاتھوں میں طاقت نہیں۔“

”چچی! وہ بیچاری کیا کریں جس چیز کی چنتی عمر ہوتی ہے وہ اتنا وقت ہی گزارتی ہے۔“ عشنا نے مدبرانہ انداز اپناتے ہوئے لگلا لگایا اور پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا۔

”ہمارے گھر کی چیزیں ہی کم عمر لاتی ہیں جو روز بروز ٹوٹی رہتی ہیں اوپر سے تو کسی چھنکے کی آواز نہیں آئی۔ اور تم میری بہو کو پٹیاں مت بڑھایا کرو۔“ چچی کا لہجہ آگ برساتا ہوا تھا وہ چھٹی سیڑھی پہ پہنچ چکی تھی ایک سیڑھی نیچے اتری اور چچی کی آنکھوں میں جھانک کر پراعتقاد لہجے میں بولی۔

”جب ہاتھ کپکپاتے ہیں تو کچھ گرتا ہے ٹوٹتا ہے لہذا اوپر سے کبھی چھنکے کی آواز نہیں آئے گی۔“

اندر آنا سجان داخلی دروازے میں رک چکا تھا۔

”اور رہی بات آپ کی بہو کو پٹیاں بڑھانے کی تو وہ پتا نہیں کون سی زبان سمجھتی ہے ورنہ۔“ وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر تین فن کرنی سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

”پتا نہیں کون سی زبان سمجھتی ہے ورنہ۔“ وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر تین فن کرنی سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

”پتا نہیں کون سی زبان سمجھتی ہے ورنہ۔“ وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر تین فن کرنی سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

”پتا نہیں کون سی زبان سمجھتی ہے ورنہ۔“ وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر تین فن کرنی سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

”توبہ توبہ ایسی قینچی کی طرح اس کی زبان چلتی ہے نہ دیدوں میں شرم نہ حیا۔“ رافعہ نے کالوں کو ہاتھ لگائے اور سبحان سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی سرورجنگ اب گرما گرم میدان میں ہونے لگی تھی یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی کم از کم اس کے لیے تو بالکل بھی نہیں۔



”اچھا شانی یہ بتا لڑکی زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں ہے نا۔“ چچی کی پاٹ دار آواز پورے گھر میں یا آسانی سنی جا سکتی تھی وہ تاپا ابو کے کمرے میں ان کے کپڑے پریس کر رہی تھی۔

”ارے نہیں آیا! میری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے صرف دس جماعتیں مشکل سے پڑھی ہیں مگر شکل کی اچھی ہے۔“ شافعہ نے بسکٹ چائے میں ڈبوئے ہوئے وضاحت کی۔

”شکل کی تو چلو خیر ہے مگر یہ پڑھی لکھی لڑکیاں ساری زندگی شوہروں سے اپنے جوتے سیدھے کر داتی ہیں۔“ چچی نے ٹیکھے لہجے میں کہا۔

”ہاں رافعہ! تمہاری ساس بھی بیڑی اونچی نوکری کرتی تھیں اور کیا اونچا ہاتھ مارا تھا ساری برادری حیران پریشان رہ گئی تھی۔“ عشنا کے دل پہ جیسے کسی نے گرم دھکتی ہوئی سلاح رکھ دی تھی۔

”اور تیری جٹھانی کا کیا حال چال ہے۔“ چچی کی بہن نے لہجہ دھیما رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا حال ہونا ہے راج کر رہی ہے اوپر نیچے دونوں پورشنز میں اس کا قبضہ ہے جس سب میری ساس کے کمال ہیں خود بھی دو سرا خضم کیا اور یہ ہو ہو کو بجائے اس کے امل باوا کے پاس بھیجنے کے معذور بیٹے کی لائٹھی بنا دیا۔“ دونوں ماں بیٹیاں اوپر نیچے دندناتی میرے سینے پہ مونگ دلتی رہتی ہیں اگر میری ساس آمنہ اور عشنا کو اس کے میکے بھیج دیتیں تو سب ہمارا ہوتا عاصم کا کیا تھا معذور انسان ایک کمرے میں پڑا رہتا۔“ چچی آج اپنے اندر کا زہر اگل رہی تھیں۔ جسے سن کر عشنا کے

احساسات منجمد ہوئے جا رہے تھے اس کی ہتھیالیاں ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔

”کیا اب تک عشنا کا رشتہ — نہیں ہوا۔“ شافعہ نے بہن کی طرف جھک کر رازداری سے پوچھا۔ ”کہاں کا رشتہ ابھی تک پڑھ رہی ہے، کبھی ہے بڑی افسر بنوں گی۔“ چچی نے جیسے دانت کچکپائے تھے۔ ”ماں اور تایا نے اسے کھلی چھٹی دے رکھی ہے سارا دن شتر بے مہار سڑکوں پہ گاڑی بھگاتی ہے۔“ چچی آج دوہی پلٹ بہن کے سامنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

”اور میرا شوہر مجال ہے ان کے خلاف ایک لفظ بولتا ہو۔ میں بول بول کے ہانپ جاتی ہوں اور وہ گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھا رہتا ہے۔“

”اچھا چل چھوڑ اس قصے کو مجھے بتا اب میرے ساتھ شاپنگ کب شروع کرنی ہے۔“ شافعہ نے جیسے بور ہو کر کہا تھا۔

”شاپنگ کی تو کوئی الجھن نہیں بس یہ اتنا مسئلہ ہے پھر سارا دن عشنا اس کے کان بھرے گی۔“ چچی کے لہجے سے بے زاری ٹپک رہی تھی عشنا کے ہونٹوں پہ بڑی انوکھی سی مسکراہٹ آئی۔ شافعہ جی بھر کے ہنسیں۔

”ارے رافعہ! تو کب سے کسی سے ڈرنے لگی ہے وہ بھی ایک لڑکی سے۔“ وہ پھر سے کھلکھلائی۔

”ارے نہ پوچھ وہ لڑکی وڑکی نہیں لو ہے کاستون ہے تاکوں چنے چبواتی ہے اور پھر سبحان۔“ چچی نے ایک دم اپنی زبان کو بریک لگائے۔

”کیا ہوا سبحان کو؟“ شافعہ نے بہن کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

”ارے کچھ نہیں اب تم آگئی ہو تو مل کر سوچیں گے۔“ رافعہ نے تمام گفتگو میں پہلی مرتبہ احتیاط کے ساتھ رازداری برتی تھی۔



”ایک تو یہ میرا حافظہ بھی نالالام۔ اسی آپ نے

میرا موبائل دیکھا ہے؟“ عشنا نے کچن میں جھانک کر پوچھا۔

”ہاں مگر اتنا خوار ہونے کے بعد اب پوچھنے کا فائدہ۔“ آمنہ کے لہجے میں ہلکی سی ڈانٹ کا عنصر تھا۔

”اب بتا بھی چکیں۔“ مجھے ضروری کل کرنی ہے۔“ عشنا جھنجھلائی۔

”تمہارے تایا کے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ہو گا۔“

”یعنی کہ ہو گا۔ سو فیصد نہیں۔“ اس نے کنگھا ڈریں تک پہ تقریباً ”چٹا اور لمبے سلکی بالوں کو لیٹھ کر جوڑا بنا کر کچھو میں قید کیا اور پھر لاؤنج میں آکر کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ کچن میں گئی۔

”امی! آج اکیڈمی کے بعد مجھے شہر جانا پڑے گا تو ذرا لیٹ آؤں گی۔“ اس نے بیگ کی کھلی زپ میں جھانک کر نسخہ اور گاڑی کی چابی چیک کی دونوں چیزیں اندر ہی تھیں۔

”آپ کو کچھ متکوانا تو نہیں۔“ آمنہ نے جو پالیوں میں چلے چھان رہی تھیں، مڑ کر سر تپا اسے بغور دیکھا۔ ہلکے سنہری رنگ کے شیفون کے سوٹ میں اس کی سنہری رنگت عجب لوہے رہی تھی۔

”شہر جانا ہے۔ وہ بھی اتالیٹ۔“ اب آمنہ پوری کی پوری پلٹ کر اس کی جانب آئیں۔

”تایا ابو کی پین مگر نہیں مل رہی ہے وہی لینے جاؤں گی۔“

”اکیلی؟“ آمنہ نے اسے ٹرے تھمائی جس میں تین کپ چائے تھی۔ عشنا نے بیگ کندھے پہ ڈال کر ٹرے تھامی۔

”یہ نیچے لے جاؤ تایا کے ساتھ ہی چائے پی لیتا“ صبح سے تمہارا پوچھ رہے ہیں۔ اور ہاں طیبہ یا اس کے چھوٹے بھائی پوپو کو ساتھ لے کر جانا۔“

”ہاں وہ تو جیسے ہر وقت میرے لیے فارغ بیٹھے ہوتے ہیں۔“ وہ دھیمی آواز میں بڑبڑاتی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ وہ جانتی تھی کہ تیسرا کپ کس کے

لیے ہے۔ وہ عموماً اس وقت تایا کے کمرے میں جانے سے پرہیز کرتی تھی کیونکہ اس وقت سبحان وہاں موجود ہوتا تھا، خیر سامتا تو کرنا پڑے گا ڈونٹ وری۔ عشنا بی بی اس نے خود ہی اپنی پیٹھ ٹھونکی اور دروازے پر پہنچ کر ہلکا سا کھنکھاری۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بشاش لہجے میں کہتے ہوئے دونوں کو باری باری مسکرا کر دیکھا۔

”شکر سے آج میری بیٹی نے شام سے ذرا پہلے ہی سہی مگر جنہ تو دکھایا۔“

”آج کا دن بے حد مصروف گزرا، کل آپ کی بیٹی سورج نکلنے کے ذرا دیر بعد آپ کو چہرہ دکھا جائے گی۔“

عشنا نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے سبحان کو چائے کا کپ تھمایا۔ اس کی آنکھوں کے ساتھ میچ

گرا تاہم اسوٹ اس کی شخصیت میں عجب سی دلکشی کا باعث بن رہا تھا اس کی پلکیں واہونے سے پہلے عشنا نے نظر مٹالی۔

”شکریہ۔“ وہ دم لہجے میں بولا۔ جبکہ وہ اپنا کپ لے کر تایا کے پاس ہی بیٹھ چکی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ صبح کہہ رہی ہے تو کل سورج نکلنے کے ذرا دیر بعد تایا کے کمرے میں وہ چہرہ دیکھنے کے لیے تمام رات اس دروازے کی چوکھٹ پہ کھڑا ہو کر گزار سکتا ہے۔ آج

کافی عرصے بعد وہ اس کے سامنے اس طرح تک کر بیٹھی تھی اس نے چھوٹے چھوٹے لیتے ہوئے

بڑی فرصت سے عشنا کے چہرے کو فوکس کیا۔

آج دکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد

آج کا دن گزر گیا ہے

اس کی مفلس آنکھیں لمحہ لمحہ شوق دید کے سکوں سے بالابل ہونے لگیں۔

”کیسی ہے؟“

تایا نے — مگر کچھ ذمہ معنی لہجہ اپناتے ہوئے مسکراہٹ لہجوں تلے دیا کر پوچھا۔

”جی۔“ وہ کڑھایا۔

”مگر کیا سمجھے میں تو چائے کی بات کر رہا ہوں؟“

”میری مصروفیت کی نوعیت اس قدر محویت لیے ہوئے تھی۔ کہ چائے کے ڈالنے کی خیر خبر یاد نہیں۔“ سبحان نے قدرے سنبھل کر انہیں جواب بھی ذمہ معنی دیا۔ تایا کے بے اختیار ہنسنے میں وہ ان کی کچی کچی لہلہ جیسی خوشبو تھی۔ سبحان اور وہ بڑے رازدار قسم کے دوست تھے، عشنا کو سبحان کی مطلب و معنی سے پرہیز گفتگو ایک ایسے راستے پہ لاکھڑا کرتی تھی جہاں پیچھے پھولوں کے لائق لوہوے تھے اور آگے تپتا صحرا۔ وہ اس کی نظروں کے پیرے توڑتی ایک دم کھڑی ہوئی اور گھوم کر دوسری جانب کی درواز کھول کر اپنا موبائل اٹھایا اور تایا ابو کو اللہ حافظ کہتی باہر نکل گئی اور حسب عادت سبحان نے اس کی ابری پی نمایاں مل کو غروب ہوتے سورج کی طرح دیکھا۔ تایا نے اس کو بڑی چابختی نظروں سے دیکھا اور آنکھیں بند کر کے دھیمے سڑوں میں گنگنائے۔



پارکنگ کی جگہ ڈھونڈنے ڈھونڈتے آٹھ بج چکے تھے اس کے بعد ایک میڈیکل اسٹور سے دوسرے اور پھر کئی میڈیکل اسٹور کھنگال ڈالے مگر وہ واہنوز نہیں ملی تھی، آخر کار ایک اسٹور میں براجمان بزرگ نے اسے مشورہ دیا کہ آگے تھوک کی مار کیٹ ہے وہاں سے وہ ضرور مل جائے گی، بمشکل وہ وہاں تک پہنچ ہی گئی۔ اور گرد نظر دوڑائی تو احساس ہوا کہ بھرے بازار میں وہ واحد عورت ہے دل بڑے زور سے دھڑکا

— بڑے بڑے کرشن لوڈ کرتے لوگ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں تھے، لوڈنگ سواریاں چنگھاڑتے ہارن۔۔۔ حقیقتاً وہاں کھوے سے کھو اور چھل رہا تھا مردوں کا ایک سیل رواں تھا اس

قدر افزا تفری اور شور کہ کان بڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی وہ جہاں سے گزرتی کچھ فانی چہرے نظروں میں حیرانی سمو کر اسے دیکھتے تو وہ کچھ گھبرا جاتی وہ مسلسل آیت الکرسی کا ورد کر رہی تھی اسے داوی کی نصیحت یاد آئی، بھرے بھجے میں چہرے یہ سختی اور متانت کا

استخراج سجا کر مضبوط قدموں سے چلتے رہو تو تمام مرد تمہاری خود اعتمادی کے آگے پانی بھرتے نظر آئیں گے سو وہ اسی نصیحت کا عملی جملہ نظر آرہی تھی۔ اللہ کر کے مطلوبہ دکان نظر آنے پر اس نے پرسکون ہو کر شیشے کا دروازہ دھکیلا۔ اور سامنے نظر اٹھاتے ہی تھوک مارکیٹ کے تمام لوڈنگ کرٹن جیسے اس کے اوپر آگرے تھے وہاں بیٹھے چار مردوں میں ایک چہرہ یقیناً سبحان کا تھا اور رات کے نو بجے عشنا کو وہاں دیکھ کر زمین آسمان اس کی آنکھوں کے آگے گھوم گئے تھے مغرب کے بعد تیار نے اسے اپنی دواؤں کے متعلق بتایا تھا تو وہ اپنے دوست کے ساتھ کلنی خواری کے بعد یہاں تک پہنچا تھا اور یہ عشنا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کس کے دو پھپھر تو اس کے منہ پہ ضرور مارے گا ورنہ یہ بیٹھے آوی نے اسے میڈیا کی بندی سمجھا تھا اس لیے وہ وضاحتیں دینے لگا۔

”دیکھو بی بی! ہماری میڈیسن دو نمبر نہیں ہوتیں یقیناً خفیہ کیمزے کیس سے ہمیں دیکھ رہے ہوں گے آپ تسلی کر لیں آدھا بازار تو بند ہو چکا ہے بس ہم بھی ابھی نکلنے ہی والے تھے۔“

اس کی بی بی چوڑی تقریر سن کر عشنا اپنے حواسوں میں آئی۔
”آپ غلط سمجھ رہے ہیں اصل میں میں تو۔“

”جی یہ میرے ساتھ آئی ہیں۔“ سبحان کرسی دھکیل کر ایک طرف کرنا ہوا کلوٹر کی جانب بڑھا اور وہاں موجود لفافہ اٹھا کر اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل گیا اس کا دوست بھی بہ عجلت اس کے پیچھے نکلا عشنا کو مجبوراً اس کی تقلید کرنا پڑی پتا نہیں ان دونوں کے درمیان کیا طے ہوا، دوسرا لڑکا سبحان کو ہاتھ ہلا تا پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ عشنا نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا سبحان نے اپنے ہونٹ سختی سے بچھ رکھے تھے اور جب وہ شدید غصے میں ہوتا تھا تو اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو ٹھوکر سے اڑا دیا کرتا تھا۔

”لو میں ایسے ہی اس سے ڈر رہی ہوں میں نے ایسا کیا کیا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں ڈھارس بندھا رہی تھی وہ تیز تیز چلنا ایک دم رکا اور فوراً ”مڑا عشنا جو اس سے دو قدم پیچھے تھی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اور ہاتھ پہ نل ڈال کر اسے گھورا۔
”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ اپنی پرانی جون میں لوٹ آئی۔

”مجھے گاڑی کی چابی دو۔“ وہ بھی جو اپنا کڑے تیوروں سے ہلکا سا غرایا۔

”تو یہ بات آرام سے بھی ہو سکتی ہے۔“ عشنا نے بیک سے چابی نکالتے ہوئے محتاط لہجے میں کہا۔

”اس وقت ہم گھر کے لان میں نہیں کھڑے عشنا منیر۔“ وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوا۔

”آپ کا گھر یہاں سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔“ وہ اپنے سابقہ لہجے میں تپ کر بولا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

”یہ تیار ابو بھی ناں کیا ضرورت تھی سبحان کو تانے کی۔“ اس کے قریب گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ اور چارو ناچار اسے بیٹھنا بڑا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بات کرنا مگر جس رفتار سے وہ گاڑی بھگا رہا تھا آخر کار اسے بولنا ہی پڑا۔

”میں ابھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔“ سبحان کا دل چاہا کہ وہ کہہ دے میں تمہارے ساتھ مرنا چاہتا ہوں مگر

وہ اس سے شدید ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا اس لیے خاموش رہا پھر قدرے توقف سے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”زندہ رہنے کی وجہ۔“
”زندگی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے میں یہ رٹا رہتا ہوں جملہ نہیں بولوں گی مجھے اپنی ماں اور تیار کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے بڑھ بڑھ کے صلغ ماؤف ہو چکا ہے اپنا سی ایس ایس کا لیٹر کرنا ہے۔“
”اور۔“ وہ ٹکراتے اتر آیا۔

”اور بہت سے کمال کرنے ہیں۔“ وہ بھی چڑ کر

”جن میں سے ایک تازہ کمال کا مظاہرہ ابھی ہوا ہے۔“ سبحان نے لہجے میں بدستور اجنبیت استوار رکھی۔

”یہ میرا کمال نہیں ضرورت ہے۔“ عشنا نے بھی اجنبی لہجے میں بتایا۔ ایک دم اس کا پاؤں بریک پر گیا گاڑی رک گئی۔

”تایا جان سے صرف تمہارا رشتہ ہے کیا؟“ افسردگی سے اس کا لہجہ چٹکا۔

”وہ میری ذمہ داری ہیں۔“ عشنا نے پراعتماد لہجے میں وضاحت دی۔

”وہ ہم سب کی ذمہ داری ہیں۔“ وہ تیز لہجے میں کہتا اب دوبارہ گاڑی بھگا رہا تھا۔ عشنا کو جتنی آیتیں یاد تھیں وہ بڑھنے لگی۔

”تم کیوں مرنا چاہتے ہو۔“ سبحان کے لب لہجہ کو مسکراہٹ سے آشنا ہوئے۔

”نہیں میں اس وقت صرف تم ہونا چاہتا ہوں۔“ اس کا بھاری لہجہ سرگوشی کرتا ہوا تھا۔

”وہ بھی تمہارے ساتھ۔“ اس کے لب نرم ہوا سے اڑنے والی خشک ریت کی طرح سرسرائے تھے مگر عشنا کو خواب آگیاں لہجوں کے زیر اثر نہیں رہنا تھا، کسی بھی طلب کو اپنے لہجے سے کھرچ کر پھینک دینے کی صلاحیت وہ رکھتی تھی۔

”میرا پوری دنیا میں کسی سے کوئی مقابلہ نہیں۔“ وہ بلاوجہ ہی ہنسی گاڑی سگنل پہ رک چکی تھی ایک بارہ

تیسو سالہ بچے نے کھڑکی کے ساتھ منہ چپکا کر کھرچے دکھائے۔ سبحان نے دونوں طرف کے پیشے نیچے کر لیے۔

”صاحب اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ لے لو صاحب۔“

”میں کوئی ٹاول کی یا ڈراموں کی ہیروئن کی طرح تمہاری دعا پہ شوا کر رہی ہوں۔“ عشنا نے لہجے میں خیردوں کی۔ کیوں کہ جوڑی میرے ساتھ نہیں بننے کی پھر بھی

سارے کھرچے مجھے دے دو۔“ عشنا نے بیگ سے پیسے نکال کر اسے پکڑائے سبحان جو سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے عشنا کو جواب دینا چاہتا تھا لب بھینچ کر رہ گیا۔ پھر اسے زچ کرنے کے لیے بولا۔

”تمہاری پیش گوئی کی سزا یہ ہے کہ ایک کجرا میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے پستاؤں گا۔“

”منہ دھور کھو۔“ عشنا نے لاپرواہی سے کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے تمام رات یہیں کھلتے بند ہوتے سگنل دیکھیں گے۔“ اب پورا گھوم کر اس نے لفافے سے ایک کجرا اٹھالیا سگنل کھل گیا تھا ہارن پہ ہارن بجتے لگے عشنا نے بو کھلا کر اس کا چہرہ دیکھا جہاں ایک معصوم سی خواہش کی جستجوئے چلنے والی ساعتوں کا راستہ روک دیا تھا۔

”سوچ لو ٹرٹک جام ہو جائے گا پھر میڈیا والے اور پھر۔“ عشنا نے کلائی آگے کر دی۔ سبحان نے خوشبو کے سنگ محبت باندھ کر ایک انٹ گٹھی کو کلائی پہ

شبث کر دیا۔ باقی سارا سفر خوشبو اور محبت نے کاٹا وہ دونوں خاموش رہے گیت پر پہنچ کر عشنا نے کجرا اتار لیا تھا۔ جو کیدار نے مستعدی سے گیت کھولا وہ گاڑی

زن سے اندر لے آیا اترنے سے پہلے عشنا نے وہ کجرا سیٹ پر رکھ دیا اور پچھلے زینے کی جانب اس کے قدم

ستر کرنے لگے اس بے قدری اور بے اہتنائی پر سبحان کے دل نے بڑا شور کیا وہ کتنی ہی دیروہیں بیٹھا رہ گیا اس

کے جی میں آیا کہ کجرا اٹھا کر دوڑ پھینک دے اس نے جنونی سا ہو کر اٹھایا ضرور مگر پھینکنے کی جسارت نہ کر

سکا۔ اسے لگایا اس کے وجود کا ایک حصہ ہے جو وہ اسے دان کر گئی ہے۔



عشنا نے آہستگی سے دروازہ کھولا ہلکی سی آواز پہ صوفے پہ لیٹی آمنہ کی آنکھ کھل گئی عشنا نے آہستہ

آواز میں سلام کیا اور کوئی نہ لہجے میں بولی۔

”امی! آپ نے بھی ضرور مجھے پریشان کرنا ہوتا ہے ابھی تک کیوں جاگ رہی ہیں۔“ عشنا نے سینڈلوں

سے اپنے پیروں کو آزاد کیا۔

”الٹا چور کو تو مال کو ڈانٹے۔“ آمنہ نے اس کا موڈ دیکھتے ہوئے لہجہ نرم رکھا۔

”میں کون سا آدمی ہوں؟ گئی ہوئی تھی چل چل کے پاؤں بھی سوچ گئے ہیں۔“ وہ ہاتھ سے پاؤں کی انگلیاں سہلاتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں غلط نہیں کہہ رہی ہوں مگر فون کس مرض کی دوا ہوتا ہے۔“

”یہاں میں غلط ہوں کیونکہ اس قدر شور میں مجھے آواز سنائی نہیں دی۔“ اس نے بیگ میں سے موبائل نکالا، تیا اور امی، طیبہ کی بھی لاتعداد مسند کالز تھیں، آمنہ بے تاثر چہرہ لپے بیٹھی تھیں، عشنا کو اپنی ماں پہ ڈھیروں ترس آیا وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے پہلو سے جڑ کر سران کے شانے پر ٹکا دیا۔

”جن لڑکیوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے اور قسمت سے وہ اکلوتی بھی ہوں تو ان کے اندر سے عام لڑکیوں جیسی نزاکت اور جذباتیت ختم ہو جاتی ہے میں کل کو آفیسر بنوں گی دن کی روشنی یا رات کا اندھیرا میرے لیے ایک جیسے ہیں اور پھر آپ کی بیٹی بزدل ہرگز بھی نہیں، مجھے آف جی کہنے والے یا والیاں اپنے تلوے چاٹتے رہ جاتے ہیں۔“ عشنا نے جان بوجھ کر پھنے خاں جیسے انداز میں کہا تو آمنہ بے ساختہ ہنس دیں۔

”اور آپ چچی کی وجہ سے مت پریشان ہوا کریں بلکہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا کریں ایسے لوگ اندر سے بڑے بزدل ہوتے ہیں۔“

”دوسروں کی ٹوہ میں رہنے والے اپنے گریبان میں جھانکنا پسند نہیں کرتے۔“ آمنہ نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

”یقیناً“ کئی مرتبہ میرے بارے میں پوچھ چکی ہوں گی؟“ عشنا نے تائیدی انداز میں ماں کی طرف دیکھا۔ آمنہ نے بے دھیالی میں ہی سر ہلا دیا۔

”چچی کا بس چلے تو پچھلے زینے پہرے دار بٹھا دیں

بہتم سے حورم سلطان کے سارے جراثیم ان کے اندر موجود ہیں۔“ عشنا نے ہنستے ہوئے اچانک منہ پہ ہاتھ رکھا کہ مہلوا آواز نیچے تک نہ جائے۔

”اچھا آپ جائیں تیا ابو جاگ رہے ہوں گے میں بھی نماز پڑھ لوں، صبح ملاقات ہوگی انشاء اللہ۔“ اس نے ماں کی پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے انہیں شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں چلی آئی نماز پڑھنے کے بعد اس نے اوہ کھلے دروازے سے باہر جھانکا امی نیچے جا چکی تھیں۔ وہ تمام غیر ضروری بتیاں بند کر کے مڑی ہی تھی کہ اس کی چیخ نکلتے، نکلتے رہ گئی اس کے پیچھے سے گزر کر خاصا موٹا چوہا الماری کے نیچے چھپ گیا۔ ہم لڑکیاں برے سے برے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہیں مگر

ایک چوہا ہمارے دل ہلا کر رکھ دیتا ہے، وہ دل ہی دل میں بے تحاشا ہنسی اور کھولا لاک کر کے بیٹھتا ہے لیٹ گئی، کروٹ بدل کر کلائی رخسار کے نیچے رکھی تو گلاب اور موتیا کی ملی جلی مہک پتہ نہیں کیا گیا یا دولا گئی، میرے آئینہ میں تم کہیں بھی نہیں ہو سجان اجمل۔ اور میں عہد گزشتہ میں جینے والی لڑکی نہیں بنوں گی تم اپنی بے چینیوں مجھ پہ ظاہر کر کے مجھے کمزور کرنے کی کوششیں ترک کیوں نہیں کر دیتے، وہ بالکل چت لیٹ گئی مگر خوشبو کا تو کام ہی مل سکتا ہوتا ہے وہ اس سے دامن کیو مگر چھڑاتی۔

☆ ☆ ☆

”تیا ابو! کبھی کبھار باہر بھی نکلا کریں ہرے بھرے منظر اور رنگ برنگے پھول آنکھوں کو تراوٹ بخشتے ہیں۔“ عشنا نے اخبار ان کے ہاتھ سے پکڑ کر چھوٹی پتائی پہ رکھا اور کرسی ٹھیسٹ کر عین ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

”مجھے اپنے حصے کا آسمان کھڑکی سے نظر آجاتا ہے۔“ انہوں نے بند آنکھوں کے ساتھ آہستہ سے جواب دیا۔

”عجیب بات ہے آسمان کوئی پر اپنی تو نہیں۔“ عشنا نے جیسے خود کلامی کی۔

”آسمان چاند رشتے“ مجھتیں جس کے نصیب میں جتنا ہوتا ہے اسے اتنا ہی ملتا ہے اتنا ہی دکھتا ہے بچن کو اللہ تاعمر صحت مند رکھتا ہے وہ پورا آسمان دیکھتے ہیں اور ہر موسم کی ہوا کا لمس چکھتے ہیں اور کچھ میرے جیسے کبھی باہر نکلیں تو ہوا کا لمس بھیک کی طرح ملتے ہیں پھر ان کی آنکھیں پورے آسمان کی وسعتوں کی عادی نہیں رہتیں۔ ”ماحول یہ عجیب سا بو بھل پن طاری ہو گیا وہ کچھ دیر کے لیے کچھ بھی بول نہ پائی ابھی اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ باہر طیبہ کی آواز سنی۔ وہ اتنا سے باتیں کر رہی تھی۔

”آپ یہ مت سمجھتے گا کہ میرے پاس آپ کے سوالوں کا جواب نہیں۔“ عشنا نے پتائی سے اخبار اٹھا کر انہیں پکڑتے ہوئے کہا۔

”مگر میں نے تو سوال کیا ہی نہیں۔“ تایا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ تھوڑا جزبہ زہونی اور پھر خوشگوار سے بولی۔

”چلیں سوال نہ سہی میرے پاس آپ کی باتوں کے جواب بھی موجود ہیں۔“ اب کے تایا کا شفاف تقہہ ٹومبر کی ہلکی خشک ہوانے کھڑکی کے پاس رک کر دل سے سنا تھا۔ عشنا کا چہرہ خوشی کے رنگوں سے چمک گیا اس کا مقصد انہیں اس یاسیت بھری کیفیت سے نکالنا تھا جس میں اسے کامیابی ہوئی۔ طیبہ نے کھلے دروازے سے نا صرف جھانکا بلکہ پوری کی پوری اندر چلی آئی تایا نے اس سلام کا جواب انتہائی محبت سے دیا اور ساتھ ہلکا سا شکوہ کر ڈالا۔

”کہاں غائب ہو؟“

”ابھی تو موجود ہوں۔“ طیبہ نے برجستہ جواب دیا۔ تایا اس کے برجستہ جواب پہ کھل کے مسکرائے۔

”ہاں البتہ آپ کی بیٹی غائب ہونے کے تمام ریکارڈ توڑ چکی ہے۔“ طیبہ نے آنکھوں میں شرارت بھر کے عشنا کی طرف دیکھا۔

”باتیں بعد میں بتاؤ کہاں جانا ہے؟“ عشنا نے انتہائی چالاکی سے اس کی توپوں کا رخ موڑ دیا تھا۔

”پہلے شاپنگ پھر واپسی پہ آنٹی کی طرف تھوڑی دیر رکھیں گے۔“

”کیوں بھی؟ عشنا نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ اور بیڑیہ رٹا شوٹڈریک اٹھایا۔

”عظمتی کو چند سوٹ سلوانے کے لیے دیے تھے وہ تیار ہیں۔ بس جاتے ہی لے لیں گے۔“

”بس جاتے ہی لے لیں گے۔“ عشنا نے اس کی نقل اتاری۔

”تمہاری خالہ محترمہ جیسے جھٹ سے پکڑا دیں گی۔ قسم سے چائے کے ساتھ اتنا کلف کرتی ہیں۔ اور زبردستی باقاعدہ ٹھنواتی ہیں۔“ عشنا کی سچ روہا سی ہو کر بولی۔

”ایک تو میڈم کے اعزاز میں خریدا کرو۔“ پھر محبت سے کھلاؤ اور اس کا رویہ تو دیکھیں تایا ابو طیبہ جان بوجھ کر سنجیدہ ہوئی ورنہ عشنا کے انداز پر تو ہنس ہنس کر دوہرا ہوا جاسکتا تھا۔ تایا ان دونوں کی لوگ جھونک دلچسپی سے سن رہے تھے اسی لمحے آمنہ اندر داخل ہوئیں۔

”تو تم دونوں ابھی تک نہیں ہو پھر اندھیرا کر کے لوٹو گی۔“

”ارے امی اندھیروں کی بات رہنے ہی دیں، آپ کی بیٹی جہاں جاتی ہے پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔“ جیسے حالات ہو جاتے ہیں۔“ عشنا نے طیبہ کے غبارے جیسے پھولے ہوئے منہ سے ہوا نکالنا چاہی اور جو فوراً نکل بھی گئی۔

”یہ بالکل سچ کہہ رہی ہے کیونکہ چراغوں کو پھونک مار کر بجھانے کے لیے تو یہ مجھے ہر وقت ساتھ رکھتی ہے۔“ اور طیبہ کی اس بات پر تایا کا کمرہ زعفران کا کھیت بن چکا تھا۔

طیبہ نے اسے کہنی ماری۔ ”کیا ہے؟“ وہ تپ گئی۔

”وہ کھو ساتھ والی دکان پہ منہا!“

”تو یہ بات بغیر تشدد کے نہیں بتائی جاسکتی تھی۔“

عشنا نے اس کی نظروں کی تقلید میں دیکھ کر کہا۔
 ”توبہ ہے عشنا بالکل میڈیا کی بندی لگتی ہو ہر بات میں تشدد کا پہلو نکال لیتی ہو۔“ طیبہ اب کھڑی ہو چکی تھی۔

”تم پے منٹ کرو میں منہا سے مل لوں۔“ وہ تینوں کالج میں بیسٹ فرینڈ تھیں پھر تھرڈ ایئر میں اچانک اچھا رشتہ آنے پر اس کی شادی ہو گئی وہ بیاہ کر کراچی چلی گئی۔ آج چار سال بعد اچانک ہی اس سے ملاقات ہو گئی اب وہ تینوں — شاپنگ مال کے پرسکون حصے میں فون نمبر کا تبادلہ کر رہی تھیں پھر جلد ہی ملاقات کا وعدہ کر کے اپنی اپنی راہ ہوئیں۔
 ”میرا سوال ابھی اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔“ گاڑی میں بیٹھے ہی طیبہ نے مجبوروں کے ڈھیر کے بارے میں استفسار کیا۔

”اور میرا جواب بھی محفوظ و ممنون رہے گا۔“
 عشنا نے ہلکا سا لہجہ اپنایا۔

”تمہارا جواب کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں جو ماں کی گود میں ممنون ہو محفوظ رہے۔“ طیبہ نے تشریح کر تیزی سے کہا۔ عشنا کچھ تاری تھی کہ اترتے وقت لفافہ اندر کیوں چھوڑ گئی اس نے ہر ایک لگائے۔

”ہاں جی طیبہ مجاہد آپ کی خالہ عرف ساس کا گھر حاضر ہے قدم رنجہ فرما کر انہیں شرفِ ملاقات سے نواز لے۔“ مسکراہٹ عشنا کی آنکھوں میں رقص کر رہی تھی۔

”اب تو مجھے یقین ہے کہ رات کچھ ایسا ضرور ہوا ہے جس نے تمہارے پیلیغ کی چولیس ڈھیلی کر دی ہیں۔“

وہ باتوں میں طنز لائونج کے داخلی دروازے سے اندر چلی آئیں۔

”چلو پہلے تمہارا ابو کو تمہارے سرال کی روداد سناتے ہیں۔“ عشنا پر جوش ہو کر بولی طیبہ نے اس کی تقلید میں قدم بڑھائے ابھی وہ لائونج میں پہنچی تھیں کہ رافعہ چچی کی کراخت آواز نے عشنا کو جیسے کٹہرے میں کھڑا کر

دیا۔
 ”رات تم سبحان کے ساتھ تھیں؟“ عشنا کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی اور اس کا اٹھا ہوا قدم کچھ لمبے ہوا میں ہی معلق رہا۔ ایک لخت غصے کی شدید لہر سے اس کے جسم نے ایک جھٹکا کھلایا تھا اس نے مضبوطی سے اپنے قدم زمین پر جمائے اور کٹ دار لہجے میں بولی۔

”اے جملے کی تصحیح کیجئے میں اس کے ساتھ نہیں تھی بلکہ آپ کے بیٹے نے مجھ سے لفت لی تھی۔“
 جہاں کی تہاں کھڑی طیبہ ہونقوں کی طرح ان دونوں کا منہ تک رہی تھی رافعہ کے چہرے پہ بڑی شاطرسی مسکان جمی ہوئی تھی حالانکہ سبحان صبح ہی انہیں من و عن تمام واقعہ سنا چکا تھا۔

”تم اسے لفت دینا چھوڑ دو۔“ رافعہ کا سرد لہجے میں کہا گیا جملہ اس کا دماغ بھک سے اڑا گیا اسے سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔

”اس سے کہیں کہ وہ مجھ سے لفت مانگنا چھوڑ دے۔“
 وہ پرسکون ہو کر بولی اس کے جواب پہ رافعہ کا رنگ اڑا ضرور مگر وہ بھی جواباً ”خُل سے گویا ہو میں۔“
 ”تم اس کے راستوں میں سفر کرنا تو چھوڑ سکتی ہو۔“

”معاف کیجئے گا رافعہ چچی! اگر کہیں ذرا دیر کو بھی گاڑی رکے تو مانگنے والوں کا مجمع لگ جاتا ہے۔“ وہ استہزائیہ ہنسی رافعہ چچی نے خود کو دھواں دھواں ہوتے محسوس کیا۔

”مجھے آپ کے بیٹے میں نہ کل دلچسپی تھی اور نہ آنے والے کل میں ہوگی آئندہ آپ کی کوئی بھی بات برداشت نہیں کروں گی۔“ عشنا نے انگلی اٹھا کر انہیں سخت لہجے میں تنبیہ کی اور ہموار قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی سب سے اوپر والی سیڑھی پہ آمنہ ساٹ چہو لیے کھڑی تھیں۔ عشنا کھٹکی ضرور نگر پھر نارمل سے انداز میں ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کچن میں لائی۔

”کیا بات ہے؟“ عشنا بھی قہنجی رکھ کر اس کی طرف رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔
 ”ارمان سے جھگڑا ہوا ہے؟“
 ”نہیں۔“ اس کا سر لٹی میں ہلا۔
 ”اوہ تو پھر تمہارا منہ کس خوشی میں لٹکا ہوا ہے۔“

عشنا نے تلملا کر پوچھا۔
 ”جھگڑا تو ہوا ہے مگر امی اور سبحان کا۔“
 ”اچھا۔“ وہ چونکی۔
 ”مگر کیوں...؟“ اس نے خواجواہ ادھر ادھر دیکھا۔
 ”اس نے کل آپ دونوں کو لڑا دیکھ لیا تھا۔“ انا کے لہجے میں افسردگی تھی۔
 ”ہونا۔۔۔ سدا کی بے وقوف بہم لڑ تو نہیں رہے تھے۔ کچھ باتیں تھیں جو وضاحت طلب تھیں۔ بس جب ایک دوسرے پہ کھل گئے تو قصہ ختم۔“ عشنا نے مٹی ہاتھوں سے جھاڑتے انا کی بات کا سیدھا سا

”جلدی سے کھانا گرم کریں شدید بھوک لگ رہی ہے میں ذرا طیبہ کی خیر خبر لیتی ہوں۔“ آمنہ نے رخ موڑ کر اسے روکنا چاہا پھر کچھ سوچ کر چپ کر گئیں۔
 عشنا نے نیچے جھانکا تو طیبہ ہنوز پہلی سیڑھی پہ بت بنی کھڑی تھی۔

”اوہو۔۔۔ طیبہ بی بی یہ لاری اڑا نہیں۔۔۔ اب کون سی بس کا انتظار کر رہی ہو؟“ طیبہ کو اپنی سماعتوں پہ دھوکے کا گمان گزرا۔ عشنا کی آواز اور اس قدر بیشاش۔

”جلدی آؤ کھانا لگ چکا ہے۔“ عشنا نے جان بوجھ کر آواز اونچی کی۔
 ”ہونہ۔۔۔ داوی کی طرح ڈھیٹ جان۔“ رافعہ نے زہر خند ہنکارا بھرا اور کھا جانے والی نظروں سے انا کو گھورا۔

”یہاں کھڑی میرا منہ تک رہی ہو، دودھ پتی بنا لاؤ اور ساتھ میں نان ختائی بھی لانا۔“ طیبہ کو نہ اور والے پورشن کے کھانے کی طلب تھی نہ نیچے والوں کی چائے بسکٹ سے دلچسپی وہ سبحان کے لیے فکر مند تھی جو عشنا اور اپنی ماں کی تمام گفتگو سن کر دروازے سے لوٹ گیا تھا۔ کاش الہ دین کے چراغ کا جن کہیں سے برآمد ہو اور مجھے یہیں سے عتاب کر کے اڑالے جائے طیبہ کو تایا جان کا کمرہ ہی قریب لگا سو وہ اسی میں ٹھس گئی۔ دونوں خواتین کمال کا حوصلہ رکھتی تھیں پتا نہیں وقت کے ہاتھوں کس کا مہو پٹنا تھا۔



کل کے واقعے کا شائبہ تک اس کے چہرے پہ نہیں تھا انا نے ٹیس پہ دھرے گملوں کی کانٹ چھانٹ کرئی عشنا کو سراپا۔۔۔ اور وہیں چلی آئی۔ عشنا اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”لگتا ہے آج تمہاری ساس کی کوئی منت بر آئی ہے جو اپنی کوتاہی کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔“ مگر انا کے چہرے پہ شجیدگی ڈیرے جمائے ہوئے تھی۔

READING
Section

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
 بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

300/-	راحت جنیں	ساری بھول ہماری تھی
300/-	راحت جنیں	او بے پروا جن
350/-	خزلیہ ریاض	ایک میں اور ایک تم
350/-	نسیم سحر قریشی	بڑا آدمی
300/-	عائدہ اکرم چوہدری	دیکھ زہد محبت
350/-	میونہ خورشید علی	کسی راستے کی تلاش میں
300/-	شمرہ بخاری	ہستی کا آہنگ
300/-	ساترہ رضا	دل موسم کا دیا
300/-	نقیہ سعید	ساڈا چڑیا دا چنبا
500/-	آمنہ ریاض	ستارہ شام
300/-	نمرہ احمد	مصنف
750/-	فوزیہ یاسین	دست کوڑہ گر
300/-	میراجید	محبت من محرم

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، مندر بازار، کراچی

جواب دیا۔

تم جس گھر میں آئی ہو بس پلیٹ میں بڑی ہو تم سے
محبوبوں کے دعوے کرنے والا اپنے ہر اقرار سے مگر چکا
ہے ہم از کم سب کے سامنے بند کمرے کی محبت
معتبری کا درجہ حاصل نہیں کرتی اگر بند کمرے میں مرد
جو تا بھی مار دے تو عورت اپنی نظروں میں ہلکی بڑ بھی
جائے مگر دنیا کے سامنے سراٹھا کر چل سکتی ہے لیکن لوگوں
کے سامنے مرد کا اونچی آواز میں بولنا بھی عورت کی
ہستی کو تنکے جیسا کر دیتا ہے میری داوی کہتی تھیں جو
عورت اپنے شوہر سے مار کھاتی ہے۔ ہے وہ رنگین
کپڑوں میں بھی جب جب آئینہ دیکھے خود کو کفن میں
پہنا دیکھتی ہے کیونکہ وہ اندر سے مرجاتی ہے میں تم کو
عشنا بنانا چاہتی ہوں۔ اور تم مجھے انا کے روپ میں
دیکھنا چاہتی ہو۔ ”عشنا ایک کھوکھلی ہنسی ہنس کر انا
کے تاثرات اس کے سپاٹ چہرے پہ کھوجے گئی۔
”تم نے سچ کہا عورت خود ہی ٹوٹ کے جاتی ہے
۔۔۔ اور پھر خود ہی پلٹی ہے۔“ لفظ جیسے انا کے سرو
ہو توٹل سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔

”میری ماں کہتی ہے اب تمہارا گھر وہ ہے اور میری
ساں کہتی ہے اگر میرے سامنے سراٹھایا تو گھر بھیج
دوں گی۔“ وہ جیسے گری نیند میں بول رہی تھی کبھی تو
میرا شوہر ماں سے کہے یہ میرا گھر بھی تو اس کا ہی ہے
کبھی کسی نے میرا بھی تو مان بنے۔“ وہ جو سبحان کی
جنگ لڑنے آئی تھی اپنی ہی کہانی کے پچھو خم میں الجھ کر
رہ گئی۔

”وقت ایک سا نہیں رہتا وقت کے ساتھ کچھ
تبدیلی ضرور آئے گی۔“ عشنا نے اس کے سروہاتھوں
کو اپنے ہاتھ میں لے کر حرارت بخشی۔
”چچی کے بھانجے کی شادی کب ہے؟“ اس نے انا
کو افسردہ کیفیت سے نکالنا چاہا۔
”دو ہفتے بعد شاید۔“ آج وہ کسی عجیب ہی رنگ
میں تھی۔

اسی لمحے ارمان کی آواز نے رنگ میں بھنگ ڈالا۔
”آپ کی مسز کو میں نے اغوا کر لیا ہے۔“ عشنا با

”تم کچھ نہیں جانتیں کچھ بھی نہیں چچی کے ساتھ
میرا بچپن اور جوانی گزری ہے میں ان کی رگ رگ
سے واقف ہوں ان کی کسی بھی بات کا کسے جواب دینا
ہے اچھی طرح جانتی ہوں۔“ عشنا ٹھہر ٹھہر کر بولی۔
”اچھا چلو تمہاری آزادی کی خوشی میں تمہیں اچھی
سی چائے پلاؤں۔“ اس نے انا کو لاؤنج میں بٹھایا اور
خود چن میں چلی آئی وہ چائے اور سینڈویچ لائی تو انا کی
خاموشی اسے کھلی۔۔۔ وہ دونوں اپنے اپنے کپ لیے پتا
نہیں کن سوچوں میں گم تھیں آج کے۔ ایک
او اس کر دینے والا وحشت زدہ سکوت سورج کی کرنوں
کے ساتھ ہی دھرتی پہ اتر آیا تھا ہر منظر کے چہرے
اترے ہوئے لگ رہے تھے ایک جلد چپ انا کے
ہو توٹل۔۔۔ کُل ڈال کے جانے کس طرف جا نکلی تھی۔
”جو گھنا چاہتی ہو کہہ دو۔“ عشنا نے اتنی وہی
آواز میں کہا کہ شاید اس کی سماعتوں نے بھی بمشکل سنا
ہو۔

”سبحان کا دل ٹوٹ جائے گا۔“ انا نے نظر اٹھا کے
سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانکا عشنا کو اس کی التجا
کرتی آنکھوں میں بس خللین نظر آیا تھا۔
”اپنا حشر بھول گئی ہو۔ تم نے بھی تو ارمان کا دل
جوڑنے میں اپنی ہستی کو تیاگ ڈالا پھر کیا ملا۔“ وہ چپ
ہوئی پھر قدرے توقف سے بولی۔
”سارے رشتے عورت کو بھلنے پڑتے ہیں وہ بھی

جو پیچھے چھوڑ کر آتی ہے۔ اور وہ بھی جو نئے گھر میں اس
کے منتظر ہوتے ہیں مگر ہر قسمی سے وہ خوش فہمیوں کی
نرم ڈوریوں سے خود کو باندھے رکھتی ہے نہ پیچھے اس کا
انتظار ہوتا ہے اور نہ آگے خبر گیری ہوتی ہے وہ خود ہی
لوٹ کے جاتی ہے اور پھر خود ہی پلٹی ہے وہ اس نمک
کی طرح ہو جاتی ہے جو آٹے میں کم ہو جائے تو بے مزہ
رہتی اور زیادہ ہو جائے تو منہ سے نکل کر پلیٹ
میں پڑی رہ جاتی ہے ہاں مگر سو میں ظنن ایسے بھی ہوتے
ہاں کے جو بے مزہ بھی اور تیز نمک بھی نہ لیتے ہیں مگر

”بھاری تلوں بلائیے گا۔“

”وہ کہہ رہا ہے اوپر ہی رکھو۔“ وہپ وہپ کر کے سیڑھیاں چڑھتی طیبہ نے لقمہ دیا۔
 ”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ ماں کو گھر میں نہ پا کر اربان ایک دم گیدڑ سے شیر بن جایا کرتا تھا۔
 ”جاؤ بھئی بہادری کے رتبے پہ فاتر شوہر کو جی بھر کے دیکھ لو۔“ عشنا نے لہجے میں شرارت سمو کر کہا۔
 اور پھر انا کے نیچے جانے کے بعد سیڑھیوں سے جھانک کر اربان سے مخاطب ہوئی۔

”چچی کے سامنے تو تم پورے فرعون بن جاتے ہو۔“

”ماں کا دل خوش کرنا ہوں ثواب کا کام ہے۔“

”ہاں بھئی تم موروں نے ثواب کمانے کا اچھا طریقہ ڈھونڈ لیا ہے نہ تو یہ استغفار نہ اللہ اللہ ماں کے کندھے سے کندھا ملا کر بیوی سے دو دو ہاتھ کر لیے۔ ماں نے بھی فوراً ”جنت کی چالی پلو سے کھول کر بیٹے کے ہاتھ پہ رکھ دی۔“ عشنا نے باقاعدہ لڑاکا طور توں کی طرح ہاتھ اٹھا اٹھا کر اربان کی دوڑ گت مہلتی۔

”میں معافی مانگ لیتا ہوں۔“ اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تب ہی آمنہ اپنے کمرے سے باہر نکلیں اور تاسف سے سیڑھیوں پہ کھڑی طیبہ اور عشنا کی طرف دیکھا۔ دونوں فوراً ”لوپر کی جانب لپکیں۔“

”ہاں جی۔ طیبہ صاحبہ! نہ سندیسہ گیا نہ پالکی بھیجی گئی تو اپنی آمد کی وجہ ظل الہی کے سامنے پیش کی جائے۔“

”ظل الہی کی بھیجی! منہا بی بی کا فون آیا تھا۔ کل آپ کے محل میں قدم رنجہ فرمانے کی جسارت کریں گی اگر حضور کا حکم ہو تو اجازت نامہ بھیجوں۔“ طیبہ نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اسی کے اسٹائل میں کہا تو دونوں ہی بے ساختہ کھلکھلا میں لوپر آئی آمنہ سوچ رہی تھیں کہ آج کے دور کی لڑکیاں ہر فکر سے پرے لمحوں میں ہمت و حوصلے کی بستیاں آباد کر لیتی ہیں۔ ایک ہم تھے کہ ایک کہ کو لے کر مہینوں بتا دیتے تھے۔



رافعہ اور سبحان کے بیچ بات چیت بالکل بند تھی۔ اچھل نے ان دونوں کے درمیان ٹھنڈاؤ کو محسوس کر لیا تھا۔ چند دنوں کے لیے انہوں نے دونوں کو ان کے حال پر چھوڑے رکھا۔ سبحان کبھی ناشتے کی ٹیبل سے غائب تو کبھی ڈنر پر موجود نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ جمعہ کی نماز پڑھ کر آئے تو دونوں کو مقلبل ہٹھا کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر پہلے وہ بیوی سے اکیلے میں کچھ باتوں کی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔

”آجائیں اربان کے ابا! کھانا لگ گیا ہے۔“ رافعہ نے دروازے میں کھڑے ہو کر آواز دی۔

”آپ تھوڑی دیر کے لیے اندر آ سکتی ہیں۔“ شوہر کی سپاٹ آواز اور ٹھنڈے لہجے رافعہ کا ہاتھ ٹھکا۔ وہ دل ہی دل میں مقابلے کی ٹھان کر ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔

”تمہارے اور سبحان کے درمیان کس بات پہ جھگڑا ہوا ہے۔“ انہوں نے بغور رافعہ کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”عشنا اور وہ رات کے بارہ بجے گھر آئے تھے۔ میں نے پوچھ کچھ کی تو دونوں ہتھے سے اکھڑ گئے میں

بہنوں کے لیے خوشخبری
 خواتین ڈائجسٹ کے ناولوں پر

40% رعایت

یہ رعایت صرف ہماری دکان

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی پر دستیاب ہے

یہی بات ہے۔“ رافعہ نے لاپرواہی سے ماتھا چڑھا کر کہا۔

”دونوں کے ایک ساتھ انٹالیٹ آنے کی کوئی ٹھوس وجہ ہوگی۔ ورنہ عشنا بہت محتاط بچی ہے۔“ اجمل نے سوچتے ہوئے بڑے سجاؤ سے بات سنبھالی۔

”ہاں کہہ رہا تھا، تیا کی دوایاں یعنی تمہیں تو اتفاقاً“ میڈیکل سٹور پر ٹاکرا ہو گیا بس۔“ رافعہ نے بات آگے بڑھائی۔ ”اب دیکھو نا ہمیں تو پتا ہے اپنے بچوں کے مزاج و عادات کا مکرو دنیا والوں کا بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ سوچو اتنی رات کو گلی محلے والے انہیں گاڑی میں پھر تا دیکھیں گے تو ہزار باتیں بنائیں گے۔ سبحان کی تو چلو خیر مگر جو ان یتیم لڑکی یہ سو سوائگلیاں انہیں گی۔ بس تمہارا بیٹا اتنی سی بات کا بظن لڑنا کر بیٹھ گیا ہے۔“ رافعہ نے اپنی طرف سے انہیں مطمئن کر دیا تھا مگر وہ بھی زندگی کا ایک حصہ ان کے ساتھ گزار چکے تھے۔ اتنا تو اسے سمجھ ہی سکتے تھے کہ وہ عشنا کو۔ پسند نہیں کرتیں۔

”خیر جو بھی ہے۔ تمہارا لہجہ سب کے ساتھ ہنک آمیز ہوتا ہے اسے کچھ درست کرو۔ کل کو عشنا نے ہماری بہو بننا ہے۔ سوچ لو پھر وقت کا پیرہ کس اور گھومے گا۔ عشنا کے امتحانوں کے بعد باقاعدہ رشتہ ڈالیں گے۔ ہر طرح سے اس رشتے کے لیے خود کو تیار رکھو۔ میں نہیں چاہتا ہمارا کاروبار اور گھر الگ الگ ہوں کیونکہ بھائی صاحب بھی اپنی جائیداد اسی کو دیں گے۔ مجھے الجھنوں میں ڈالنے کے بجائے ہوش کے ناخن لو۔ اس میں تمہارے بیٹے کی ہی بھلائی ہے۔“ اجمل نے اپنے لب و لہجے کو قدرے درشت ہی رکھا تھا۔

”ہاں تو میں نے کبھی آپ سے کہا ہے کہ سبحان کے لیے میں اپنی بھانجی یا بیٹی بیابا لاؤں گی۔ میری طرف سے ابھی رشتہ مانگنے چلیں۔“ اسنے دل میں برپا ہونے والی قیامت وہی جانتی تھیں مگر اجمل نے نظر جما کر انہیں دیکھا جس سے وہ تھوڑا جزبر ہوئیں۔

”اچھا اب اٹھو بھی کھانا دوبارہ گرم کرنا پڑے گا اور ہاں اتنا کچھ ہاتھ ہولار کھا کرو۔ میں تمہیں گھر پہ نہیں ہوتا اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولے اور بیوی سے ہلکے کمرے سے نکل گئے۔ اور وہ جانتی تھیں کہ اجمل کچھ نہیں جانتے، خالی خوبی دعوے کرتے ہیں۔ وہ شطرنج کھیلتا نہیں جانتی تھیں مگر بازی پلٹانا نہیں آتا تھا۔



جب منہا صاحبہ کی تشریف آوری ہوئی تو وہ دونوں تقریباً ”بچن کا کام ختم کر چکی تھیں۔ کھانا کھانے کے دوران وہ تینوں کلج کے مزید واقعات۔ دہرا کر خوب گزرے وقت کو یاد کرتی رہیں۔ ان دونوں کو منہا کچھ ابھی کچھ اداس سی لگی۔ کھانے کے بعد چائے کے کپ لے کر وہ عشنا کے کمرے میں آ گئیں۔

”ہاں اب کھل کر بتاؤ کیا الجھن ہے؟“ عشنا نے اتنے وثوق سے پوچھا کہ منہا ششدر رہ گئی۔ ”بس یار! کیا بتاؤں۔ بظاہر تو بہت اچھی گزر رہی ہے مگر اندر ہی اندر نرمی گڑ بڑ ہے۔“ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

”کیوں۔۔۔ ساس یا ساندول کا مسئلہ ہے؟“ طیبہ نے منہا کے اداس چہرے کو افسردگی سے دیکھا۔ ”اول۔۔۔ ہوں۔“ اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔

”خاور کارویہ بہت ہی پراسرار سا ہے۔“ اس نے بولنا شروع کیا تو ان دونوں نے چپ سا دھلی۔ ”ہر ماہ گھر بلو اخراجات کے لیے اچھی خاصی رقم بھی دیتا ہے۔ عاشر کا بھی خیال رکھتا ہے۔ سب کے سامنے پھر بھی بات چیت کر لیتا ہے مگر ہمارے بڈروم میں بالکل انجان بن جاتا ہے اور اکثر دو تین ہفتے گزر جاتے ہیں۔ ہوں ہاں کے سوا کچھ نہیں بولتا۔ میرے کچھ بھی پہننے اوڑھنے۔ اس کا کوئی رسپانس نہیں ہوتا۔ عاشر کے لیے شاپنگ کرتا ہے مگر میرے لیے کبھی چھلا تک نہیں لایا۔ اسے مجھ سمیت میرے کسی بھی

معالجے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اس کے لیے کمرے میں موجود سالن کی طرح ہوں۔ وہ دیکھے لہجے میں بولتی اپنا سارا دکھ ان سے کہہ گئی۔
 ”گھر کے باقی لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہے“ طیبہ کا دل۔ برا ہو رہا تھا۔

”گھر والوں کے ساتھ بس نارمل بی بی ہو رہے مگر یار دوستوں میں بہت خوش مزاج، جناب کے قہقہے ہی نہیں رکھتے۔“ منہا جیسے جل کر بولی تھی۔
 ”بس یا کچھ اور۔“ عشنا نے بڑا عجیب سا لہجہ اپنا کر اس کی طرف دیکھا۔

جیسے کہہ رہی ہو تیرا کوئی حال نہیں منہا خاورؔ

”تو کیا اس کا مجھ سے اس قسم کا رویہ پریشان کن نہیں؟“ انسا منہا نے سوال واٹھا۔
 ”اوہو اللہ کی بندی! میں کب کہہ رہی ہوں ٹھیک ہے۔ اس کا رویہ ناقصی! پریسٹ غلط ہے اور تمہاری سوج بھڑو پریسٹ۔“

”کیا مطلب؟“ منہا نے ماتھے پر ہل ڈالے۔
 ”اب میری بات مکمل ہونے تک بیچ میں ٹوکنا مت۔“ عشنا نے سیالی بوڑھیوں کی طرح انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔

”وہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ تم پر اس کا اوب و احترام واجب اور یہ ہوی ہونے کے ناتے اس پر تمہارا ان نفعہ فرض۔ تم اس کا گھر اور اس کا بچہ سنبھال رہی ہو وہ تم دونوں ماں بیٹے کو معاشی اور گھریلو تحفظ دے رہا ہے۔ اب تم پریشان ہو کہ وہ تم سے بات نہیں کرتا۔ تمہاری طرف دیکھتا نہیں، تمہیں سراہتا نہیں اور یقیناً تمہاری سنتا بھی نہیں ہو گا۔ خدا نے اسے مجازی خدا کا درجہ دیا ہے۔ اپنی جگہ اسے عرش معلیٰ پہ نہیں بٹھا دیا کہ تم تڑپ رہی ہو۔ ارے بھالی نہیں دیکھتا تو نہ دیکھے نہ بات کرے اور نہ سنے کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ہماری طرح کا ایک انسان ہی ہے۔ جس رب کریم نے ہمیں پیدا کیا ہے وہ ہماری طرف دیکھتا بھی ہے ہماری دعا میں سنتا بھی ہے اور ہم سے باتیں بھی

کرتا ہے۔ کیا یہ ہماری تسکین کے لیے کافی نہیں ہے منہا ڈیر عمیرہ احمد نے اپنے ناول میں لکھا تھا کہ مو نے عورت کا راستہ روک رکھا ہے۔ وہ اسے اللہ کی طرف جانے ہی نہیں دیتا اور اوزے میں بیٹھا ہے اسے راستہ نہیں دیتا۔ ہم 1857ء کی نہیں بلکہ 2015ء کی عورتیں ہیں، ہمیں راستہ چاہیے اللہ کی طرف جانے کا اپنی ذات کے اندر جھانکنے کا خود سے ملنے کا اور ہم ہیں کہ مو کے معاملوں میں اپنی زندگی الجھا کر بیٹھی رو دو عورتیں ہیں۔ اگر وہ تمہاری ناقدری کر رہا ہے تو اللہ کے آگے خود جوابدہ ہو گا۔ اگر دوسری عورت کے چکر میں ہے تو اپنی آخرت خراب کر رہا ہے جو تمہارا حق ہے وہ کسی اور پہ نچھاور کر رہا ہے تو اپنی عاقبت خراب کر رہا ہے۔ سوچو! ایک بے وفائی کے نتیجے میں ساری خرابیاں اس کے حصے میں آ رہی ہیں اور تم خواجخواہ اپنی زندگی کو دیمک لگا کے بیٹھی ہو پانچ وقت نماز پڑھا کرو، اچھی کتابوں کا مطالعہ کرو رات کو ڈرامہ وغیرہ دیکھ لو یا اپنی دوستوں سے ملو یا ان سے فون پر گپ شب لگایا کرو اگر پھر بھی وقت بچ جائے تو بیٹے کے لیے کچن میں کچھ خاص پکا لیا کرو۔ اپنی زندگی اس ایک شخص کے لیے کڑھ کڑھ کے ضائع مت کرو۔ جب وہ تمہیں اپنے خراب رویے پر نارمل اور پرسکون زندگی گزارنے دیکھے گا تو تمہارے بارے میں سوچے گا ضرور اور جب تم بونہی بلا وجہ خود پر دھیان دو کی تو وہ الو اپنے دھیان میں وجہ ضرور ڈھونڈے گا۔ اگر تم اسی طرح اس کے پیچھے بے حال پھوگی تو تمہیں اور بد حال کرے گا۔ اس بات کی ہمیں فکر نہیں کہ اللہ ہماری طرف دیکھے، بلکہ دن رات یہ فکر ستاتی ہے کہ شوہر تنگنکی باندھ کر پوچھے۔ ”بیگم لپ اسٹک سونس لیج کی ہے یا لور نیل والوں کی۔“ عشنا نے آخری بات کچھ اس انداز سے کی کہ طیبہ اور منہا جو حق، وق اس کا لیکچر سن رہی تھیں ان کی ہنسی پھوٹ گئی۔

”عشنا! تم میں سارے جراثیم شادی نہ کرنے والی لڑکیوں کے پائے جاتے ہیں۔ تمہاری باتیں سن کر میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔ شادی شدہ زندگی میں شوہر سے

اس قدر غفلت نہیں برتی جاتی میری جان۔ ” منہا نے اسے کچھ سمجھانا چاہا۔

”کچھ بھی ہو میں تو اپنے شوہر کی بے اعتنائی یہ اپنی ہستی فنا نہیں کروں گی۔ ” عشنا نے ناک سکیڑ کر ایک دلبرانہ اداسے کہا۔

”کیونکہ تمہیں پتا ہے وہ تم پہ مرے گا۔ ” طیبہ نے دانت نکالے۔

”تم اپنی نجومیہ کو اپنے اندر ہی دفن رہنے دو۔ مارنک شو سے تمہیں آفر نہیں آنے والی۔ ” منہا نے اس کی بات کا خوب مزہ لیا۔

”ارے ہاں وہ تمہارے دو کزن بھی ہوتے تھے ان کا کیا پتا۔ ”

”بنتا کیا ہے۔ ابھی تک انسان ہی ہیں۔ ایک آباد مگر ناشاد ہے اور دوسرے کا دل ناکام و برباد ہے۔ ” عشنا کے بجائے طیبہ نے رنجیدہ لہجہ اپنا کر آہ بھری۔

”ہں! مگر اس قدر تنگی حالات کیوں؟ ” منہا بھی اپنی پرانی جون میں آئی۔

”بڑے کی بیگم پہ ساس نے مکمل قبضہ جمایا ہوا ہے۔ اکثر راتوں کو بھی اس کے کمرے میں سوتی ہے کہ میرا میاں خراٹے لیتا ہے تو نیند پوری نہیں ہوتی سو ان کو نیند بھی پوری کرنے کا موقعہ دیتی ہیں اور اپنی بھی۔ ” طیبہ نے آنکھ دیا کر خاصے اور قرآنہ انداز اپنایا۔

”اور چھوٹا سمجھو انڈیا اور پاکستان کے درمیانی پاؤں تعینات ہے۔ اوہرے بھی کوئی کاخدشہ اوہرے بھی سو کسی دن ٹائیں فٹاں آؤ گی ہائے۔ ” عشنا نے اس کی کمر میں زور وار دھمو کا جڑا۔

”کے بک کرنا کوئی تم سے سکھے۔ ”

”دیکھ رہی ہو منہا! کج کل یہ۔ ” خبر ناک مذاق رات جیسے پروگرام دیکھتی ہے۔ اس کی جگتیں ذرا سنو۔ ” عشنا کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

”یاد آیا۔۔۔ منہا تمہارا میاں تم سے اس قدر بے زار اور اوزار اور جتنے بھی زار ہیں سب ہے تو پھر یہ عاشق کس کا ہے۔ ” طیبہ دور کی کوڑی لائی اور منہا کا چہرہ مسخ پڑ گیا۔

”بے شرم لڑکی!“ عشنا نے اس کی گردن دبوچی۔

”ارے ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ ” آمنہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ وہ تینوں نجل سی ہو گئیں۔

”کچھ نہیں امی بس کلج کی یادیں تازہ ہو رہی ہیں۔ ” عشنا نے اٹھ کر باہر کی راہ لی۔

”او! تمہیں تایا ابو سے ملو آؤں۔ ” تو اس کے پیچھے منہا اور طیبہ بھی لگیں۔

جب شام کو منہا رخصت ہو رہی تھی تو تینوں اداس تھیں۔

”پھر ملیں گے۔ ” عشنا نے ماحول کا بو جھل پن دور کرنے کو گنگناتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہاری بہت فکر ہو رہی ہے۔ تھوڑی سی لڑکیوں جیسی سوچ رکھو۔ قسم سے اس پورے مرد سے کون شادی کرے گا۔ ” منہا کی بات پہ تینوں کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا اور ایک خوب صورت دن کا اختتام ایک انوکھی سی شام نے اولیں ستارے کے ہاتھوں پہ سورج سے چھپا کر رکھا تھا اور سورج کو کیا خبر کہ شام کا اولیں ستارہ کتنے ہی عیدوں کا امین ہے۔



عشنا کے سی ایس ایس کے ایگزامز شروع ہوئے تو وہ دن رات کا حساب کتاب بھول گئی۔ کبھی تایا کے کمرے میں آتے جاتے ہلکی سی نظر ان کے چہرے پہ پڑ جاتی۔ اسے انا کی ناک کی سرخی بتا دیتی تھی کہ وہ روٹی روٹی سی ہے آج وہ فارغ ہوئی تو پہلے جی بھر کے سونے کا لطف اٹھایا پھر بھاپ اڑاتی چائے لے کر تایا کے کمرے میں آئی۔ آمنہ تکیوں کے غلاف بدل رہی تھیں۔

”امی! رات کو چنے چاول بتائیے گا۔ ” اس نے تایا ابو کو کپ پکڑایا۔ آمنہ نے مصروف سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

”شکر ہے آج میری بیٹی کے چہرے پہ مسکراہٹ تو

آئی۔ ” آج تو عشنا کی آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں
وہ کچھ یاد آنے پہ بولی۔

”تایا ابو! انا اور چچی کے درمیان کوئی مسئلہ چل رہا
ہے کیا؟“ آمنہ نے کام روک کر کچھ بھرکواسے دیکھا۔
”شاید مجھے اتنا علم نہیں۔ مگر تمہاری چچی کی گھن
گرج آج کل ساون بھادوں کو بھی مات دے رہی
ہے۔“ تایا ابو کے شوخ لہجے پہ اداسی کا رنگ غالب
تھا۔

”جو بھی ہے یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے۔ تم نے
بالکل دخل نہیں دینا۔“ آمنہ نے تکیے اور رگشن اپنی
جگہ سے سیٹ کیے اور عشنا پہ ایک خاموش نظر ڈال کر
چلی گئیں۔ عشنا کے اندر کھلبلی سی مچی ہوئی تھی
اس نے دونوں خالی کپڑے میں رکھے اور محتاط
انداز میں کمرے سے باہر تھانک۔ اس کی اس حرکت پہ
تایا ابو زیر لب مسکرائے۔

”وہ سبحان کے ساتھ بہن کی طرف گئی ہیں۔“ تایا
نے اس کی مشکل آسان کی۔ عشنا نے ان کی طرف
مستون نظروں سے دیکھا۔

”میں ذرا انا کی خیر خبر لوں۔“ لاونج میں آئی تو بالکل
خالی کسی ماتنے والے کے کشکول کی طرح۔ ستائے
سے اسے عجیب سی وحشت ہوئی۔ اس نے انا کے بیڈ
روم کا دروازہ ہلکے سے بجایا۔

”اندر آ جاؤ عشنا۔“
”ہیں! تمہیں کیسے پتا چلا۔“ عشنا نے حیران
ہوتے ہوئے اس کے زرد چہرے کو دیکھا۔ وہ برسوں کی
بیمار لگ رہی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے انا۔“ عشنا نے بے چینی سے
اس کے ہاتھ تھامے جو بالکل رخ تھے۔ ٹپ ٹپ آنسو
اس کے گالوں پہ بننے لگے۔ تب ہی واش روم کا دروازہ
کھلا اور ارمان کا مڑھلایا ہوا چہرہ دیکھ کر عشنا سمجھ گئی کہ
معاملہ گہیرا ہے۔

”پلیز انا! کچھ تو بتاؤ۔ میرے دل میں بڑے بڑے
وہم آ رہے ہیں۔“

”اس کی امی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے وہ کافی دن

ہسپتال میں ایڈمٹ رہی ہیں۔ اب گھر شفٹ ہو گئی
ہیں۔“

”او۔ چلو شکر طبیعت سنبھل گئی ہے۔ اللہ خیر
کرے گا۔“ عشنا نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے
تسلی دی۔

”اگلی کہانی بھی سنو۔“ ارمان دوبارہ گویا ہوا۔
”امی کے بھانجے کی شادی ہے اور وہ انا کو میکے کے
بجائے ایک ہفتہ شادی سے قبل بہن کے گھر لے جانا
چاہتی ہیں۔“ ارمان کا دل گرفتہ لہجہ عشنا کو بھی رنجیدہ
کر گیا۔

”اور آپ بالکل خاموش ہیں۔“ عشنا نے خود کو
بمشکل کنٹرول کیا۔

”میں کیا کروں۔۔۔ میں کوشش کے باوجود امی کے
سامنے نہیں بول سکتا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔“
”لور پچھا جان؟“ عشنا نے ارمان کو ہمت دلانے
والی نظروں سے دیکھا۔

”انہوں نے سمجھایا تھا امی کو جب وہ نہیں مانتیں تو
کہنے لگے انا بعد میں چلی جائے گی خواہ مخواہ گھر کا ماحول
خراب ہو گا۔ ارمان کی آواز بالکل دھیمی تھی۔

”میں اب بھی کہتی ہوں بڑوں کا چولا اتار کر مرو
بنو۔ یہ تمہاری بیوی ہے مگر کسی بیوہ کی طرح کا سلوک
ہوتا ہے۔ اس کی عزت کرواؤ۔“ ٹھیک ہے محبت کمرے
میں کرو مگر عزت تو محن میں اور آنگن میں لگے خوشنما
پھولوں کی طرح اپنی خوشبو دیواروں سے پھلا گئی ہوا
میں میلوں دور سفر کرتی پھلتی پھولتی اچھی لگتی ہے۔
اسے بند کمرے میں تمہاری ہمدردی نہیں چاہیے۔

پیار کے دیول، تسلی کے تین لفظ اپنی ماں اور اس کے
عزیز واقارب کے سامنے بول کر اسے اس کی ذات کی
پہچان بخش دو خدا کے لیے کبھی بھرے پرے گھر میں
اس کے بٹے آنسو پونچھو دادی کہتی تھیں بڑوں لوگوں
کے پاس سے اچھی خوشبو نہیں آتی اور اس وقت
تمہارے اس آراستہ بیڈ روم میں میرا دم گھٹ رہا ہے
ارمان بھائی۔ انا! میں ضرور کچھ کروں گی تم نے فکر ہو کر
سو جاؤ تم ان کی ملازمہ نہیں ہو کہ ہفتہ پہلے کام کے

لے پہنچ جاؤ۔ ”عشنا پھیکا سا ہنسی اور اس کا گل تھپک کر ہا ہر چلی آئی پھر جا کر مایا کو تمام قصہ سنایا۔
 ”ہے تو بری بات مگر عشنا بیٹا! ہم کیا کر سکتے ہیں۔“
 ”کیوں نہیں کر سکتے۔“ وہ تلک کر بولی۔

”بس آپ دیکھتے جائیں۔“ وہ ایک عزم سے وہاں سے اٹھی ”آج دن میں وہ خوب سوئی تھی سو اب نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ وہ ٹیرس پہ ٹہلنے لگی۔
 نو مبر کے آخری دن تھے۔ خنکی نے اپنے ہونے کا یقین دلایا مگر اسے سردی انجوائے کرنے میں مزہ آتا تھا۔
 آمنہ حسب معمول سونے سے پہلے ایک چکر اوپر کا لگا کے چاچکی تھیں۔ اس نے اپنے کمرے کی بلائٹ بند کی ہوئی تھی۔ پہلے بارہ پھر ایک بیچ گیا۔ پہل، پہل کے اس کے پاؤں دھتے لگے اس نے پہلی جمالی کو ناپسندیدہ مہمان کی طرح روک تھام ہی گیٹ پہ گاڑی کا ہارن بجایا۔
 تھوڑی دیر بعد گاڑی رکنے کی اور صرف ایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی اس کا دل خوشی سے جھومنا لگتا تھی نہیں آئیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ہتھیلی پہ جمایا اور پھر وہ دبے پاؤں بیڑھیاں اتری۔ صبح بات کر لوں گی صبح؟ اس نے کچھ سوچا امی چچا سب ہوں گے اور کیا خبر صبح چچی آجائیں۔ اب وہ آخری زینے پہ تھی جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ بے آواز چل کر اس کے دروازے تک آئی پھر بلکے سے دروازہ بجایا۔
 ”آجائیں ارمان بھائی۔“ اس نے اتنا دروازہ وا کیا کہ با آسانی وہاں سے گزر سکے۔ وہ سائیڈ ٹیبل پہ گلاس رکھ رہا تھا۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی عشنا نے اپنے پیچھے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ وہ جونہی مڑا اس کی بھاری ہوتی بو جھل آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔ وہ گمان کے آخری کنارے پہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ رات ایک بجے وہ اس کے کمرے میں آئے گی۔ وہ تو دن کو کہیں بھولے سے نظر آنے پر اس کی نظروں کے پیرے توڑتی بلک بھٹکتے میں ادھر ادھر ہو جایا کرتی تھی۔ کئی لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے دھیرے دھیرے اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ قدم آگے بڑھا۔

”زبے نصیب رات ہے نیند کا عالم ہے خواب بھی ہو سکتا ہے کو تو چھو کر دیکھوں اس کے جسم پر ہے پہ اک کف آگین رنگ ٹھہرا۔
 ”لیکن میں نہ نیند کے عالم میں ہوں نہ خواب دیکھ رہی ہوں۔“ وہ بھی چار قدم آگے بڑھی اور اس کے عین سامنے ٹھہر گئی۔

”تمہارے ٹھکانے چاند پہ ہوتے ہیں۔ تم بہت اونچی شے ہو۔ ہم زمین پہ بسنے والے گنہگار بندے ہمسے سے بخشش کی آرزو بھی نہیں۔ سبحان کا بو جھل لہجہ تپ کر کندن ہو رہا تھا اور وہ بڑے دھیان سے عشنا کے سوتے جاگے چہرے کو والہانہ نظروں سے تک رہا تھا عشنا نے بری طرح اسے گھورا۔

”تم نے پوچھا نہیں میں کیوں آئی ہوں۔“ وہ دھیسے مگر تیز لہجے میں بولی۔
 ”میں جانتا ہوں۔ تم عشنا ہو اور بڑی باکمال ہو۔“ وہ بھی لہجے میں شرارت سمو کر بولا۔
 ”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ صوفیہ بیٹھ گئی۔

”میں تمہاری غیر ضروری بات بھی بڑی محبت اور توجہ سے سن سکتا ہوں۔“ وہ اس کے عین سامنے کرسی ٹھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے گلون کی مہک عشنا کی سانسوں سے اچھنے لگی عشنا نے اس وقت کو کوسا جب اس نے اس کے کمرے میں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”مجھے انا کے بارے میں بات کرنی ہے۔“ اس نے چہار سو پھیلی خوشبو کی حدود سے لگتا چاہا اور نگاہیں اپنے ہاتھوں پر ٹکا کر بات کی۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا تھا جیسے اسے بولنے کا موقع دے رہا ہو۔ ”چچی اسے اپنے ساتھ تمہاری خالہ کے کمرے لے جانا چاہتی ہیں جبکہ وہ ماں کے کمرے جانا چاہتی ہے۔“ عشنا نے اپنی جانب محویت سے تکتے سبحان کو لہجہ بھر کے لیے دیکھا۔

”اور تم کیا چاہتی ہو؟“ سبحان نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بیڈ پر بڑی سگریٹ کی ڈبیا اٹھالی۔ عشنا نے اچھسے سے اس کی طرف بے ساختہ دیکھا۔

”تم میرے لیے بہت محترم ہو، میری نظر میں بہت بلند اور مجھے بہت محبوب ہو۔ آئندہ اگر جان چاہیے ہو تو بھی میرے کمرے میں اس طرح کبھی مت آنا۔ میں بہت عام سا انسان ہوں۔“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اس کے کان پر گری لٹ کو نرمی سے کان کے پیچھے اڑسا، عشنا نے دروازہ کھولنے میں ایک پل کی تاخیر نہیں کی تھی۔ وہ آئی تو بے پناہی میں مگر جاتے وقت وہ کسی اور ہی ترنگ میں تھی جیسے اپنے پاؤں میں ان دیکھی سی جھانچر جھکنے۔ کاڈر ہو اس کے وجود سے اٹھنے والی سبحان کے کلون کی خوشبو نے اسے پتا نہیں کب تک جگائے رکھا۔

اس کے ہونٹوں پہ کچھ کانپتا رہ گیا
آتے آتے میرا نام سا رہ گیا



آج تیا کو ہلکا سا بخار تھا تو وقتاً فوقتاً ”سب ہی ان کے کمرے میں آ جا رہے تھے اور عشنا تو ان کی پابنتی سے لگ کر بیٹھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سبحان کے آنے سے پہلے کا تمام وقت وہ ان کے پاس گزارے۔ عشنا کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر تیا اسے کتنی ہی رفقہ خفگی سے ڈانٹ چکے تھے مگر اس کی حالت ان کی بیماری میں ایسے ہی غیر ہو جایا کرتی تھی۔ کچھ دیر پہلے بچی ہو کے جا چکی تھیں جن کے تھے ہوئے چہرے پہ ہزاروں بل اندھوں کو بھی نظر آسکتے تھے۔ عشنا نے دل ہی دل میں یا ہو کا نعرہ لگایا گویا سبحان بازی پلٹ چکا تھا۔ وہ خود بخود ہی مسکرائے جا رہی تھی۔

تیا نے اس کے ہونٹوں سے چپکی مسکراہٹ کو تجسس سے دیکھا اور سر جھٹک کر فس دیے۔
”کس کے دھیان میں میری بیٹی کا چوہ گل و گلزار بنا ہوا ہے؟“ اس نے ایک دم جوہ سپاٹ کیا۔
”نیا ابو! آپ بھی بل کی کھل نکالنے میں ماہر ہیں۔“

”ہاں وہ تو ہوں۔ آخر تیا کس کا ہوں۔“ ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی اور ان کے اس

وہ دھیمے سروں میں ہنسا اور سگریٹ سلگائی۔ اس نے جلد ہی خود کو سنبھالا اور اپنے مقصد کی طرف آئی۔

”میں چاہتی ہوں وہ اپنی ماں کے گھر جائے۔“
عشنا اس کو پہلی دفعہ سگریٹ پینا دیکھ رہی تھی اور اس کا دل بڑا عجیب سا ہو رہا تھا۔ سبحان نے ایک لمبا کس لیا اور دھواں اس کے چہرے پہ چھوڑا۔
”کسی لڑکی کے سامنے اس طرح سگریٹ پینا پید تمیزی کے زمرے میں آتا ہے۔“ وہ جیسے تپ کر بولی تھی۔

”کسی لڑکی کا رات کے دس بجے کسی جوان آدمی کے کمرے میں آنا کیا کہلاتا ہے۔“ شرارتی لہجے میں کہتا آگے کو جھک کر بولا۔

”مجھے اخلاقیات مت پڑھاؤ۔ بتاؤ پھر اتنا کی مدد کرو گے نا۔ وہ کچھ دھیمی ہوئی۔ سہرا ل اسے اپنا کام نکلوانا تھا۔

”پلیز سبحان! انا بہت ڈسٹرب ہے۔ وہ کئی دنوں سے ڈسٹرب ہے۔“ عشنا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کس طرح سمجھائے دو سروں کے لیے پریشان ہوتی دو سروں کی جنگ لڑتی بظاہر نازک سی مگر چٹانوں جیسی مضبوطی رکھنے والی اس لڑکی پہ اسے ڈھینوں پر پار آیا۔

”ساری دنیا کی پریشانی تمہیں نظر آجاتی ہے سوائے میرے۔“ سبحان نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ اچانک کھڑی ہو گئی۔

”پھر کیا خیال ہے۔“ وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے بولی۔

”میرے خیال کے بارے میں نہ ہی پوچھو۔“ وہ پھر پٹری سے اترنے لگا۔ پھر فس کر بولا۔ ”کچھ بھی مانگ لو نہ۔ وہ تو بات کرنا۔“ مگر وہ نظر انداز کر کے دروازے کی جانب بڑھی ”عشنا! اس کا نام اس کے ہونٹوں پہ رات کے آخری پہر کی گئی سرگوشی کی طرح سرسرایا۔ دروازہ کھولتے اس کے ہاتھ وہیں ٹپک گئے۔ اس کے بے چین لہجے نے سفر کو فنا کر کے ہوا میں معلق کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔

طرح مسکرانے کے انداز پر عشنا ہمیشہ چڑجاتی تھی۔
”تو کیا میں سچ سمجھا ہوں تو پوں کے رخ دیرینہ
رقیب کی طرف ہیں۔“

”کس کے نصیب کی بات ہو رہی ہے؟“ انا نے
اندر آکر بڑے موڈ میں پوچھا۔

”ہم دونوں کے عشنا نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ
جما کر انا کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھا۔ تیا نے بھی انا کی
خوشیوں کی پیشگی کے لیے دل سے دعا کی۔

”میں کل امی کی طرف جا رہی ہوں۔“ آج انا
پوری کی پوری کھلکھلا رہی تھی۔

”اور اس خوشی میں بقول میری اماں کے تمہاری
سہیلی ہمیں اچھی سی چائے پلائے گی۔“ وہ اندر آکر
گھوم کے بیڈ کی دوسری جانب گیا اور تیا کے ساتھ نیم
دراڑھوتے ہوئے انا کی طرف نگاہ کی جو اپنا رخ موڑ چکی
تھی۔

”راتوں رات بھالی کی کیا کیسے پٹی؟ کل تک تو انا کی
ڈیڑھ گھنٹہ اس گرمی میں گنا گرم جنگ چاری تھی۔“ تیا جو
خاندانی سیاست سے ذرا دور ہی رہتے تھے۔ پوچھ
بیٹھے۔

”اس بات کو نہ ہی چھیڑیں تو اچھا ہے۔“ سبحان
کے لہجے میں جیسے روشنی سی لگی تھی اس نے باہر جاتی
عشنا کی ہلکی سی جھلک ہی دیکھی۔

”وہ میرے سامنے ہی گیا اور میں راستے کی طرح
دیکھتا رہ گیا۔“ اس کے لب بے ساختہ دھیمے سے
گنگنائے تھے۔ ”تیا نے بھرنی پری نظروں سے ذرا سا
اس کا جائزہ لیا۔

”راستوں کی بھی تو ہمت دیکھو نا محبوب کے نقش پا
ہی ان کا مقدر ہیں۔“ انہوں نے اس کی ہمت بندھانی
تھی۔

”پار تیا۔ اگر نقش پا پہ گزارہ نہ ہو تو؟“ وہ سیدھا
ہو کر تھوڑا لٹن کے قریب ہوا۔

”یہ تو عشق کی شدت پہ منحصر ہے کہ نقش پا پہ ہی
ہمارا سر جھک جائے بس زیادہ کی طلب کی تو خاک۔“

”لاہاں ہی لبوں میں مسکرائے۔ سبحان نے اپنی

شہادت کی انگلی اپنے سامنے کی اور اس کی پور کو بڑے
جذب سے دیکھا جہاں لمبے بھر کا لمس الاؤ کی صورت
دبک رہا تھا۔ وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

”ہمیشہ محبت کی شدت جدائی ناپتی ہے۔ وصل
سارے پیانے توڑ دیتا ہے اور ٹوٹی ہوئی چیزوں کو تو ہم
ہمدردی سے بھی نہیں دیکھتے بس اس چھٹاکے کی آواز
یہ چوکتے ہیں۔“ اپنے تئیں تیا اسے پتا نہیں کیا
تجربہ جانا چاہ رہے تھے شاید وہ اس کے دل کی سر زمین کو
خبر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اگر عشق تھا تو بھر میں بھی سبز ٹہنیوں کے پیراہن
اوڑھ کے گلابوں کی فصل تو تازہ رکھ سکتا تھا اور اگر
خواہش تھی طلب تھی تو بے بہا بارشوں میں بھی زمین
کھر زہ رہتی تھی جہاں کچھ نمونہ نہیں پانا، کیونکہ وہ
عشنا کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ خواب دکھانے
والوں میں سے نہیں تھی وہ خواب دیکھنے والوں میں
سے بھی نہیں تھی۔

”بچے میری سہیلی کے ہاتھ کی بنی مزیدار سی چائے
۔ انا نے ان کی گفتگو میں خلل ڈالتے ہوئے بڑے
خوشگوار لہجے میں کہا۔ سبحان کی حالت ایسی تھی جیسے
بہت دور تک سفر کرنے کے بعد کسی نے اسے بتایا ہو
کہ جناب آپ وہ شہر پہنچے چھوڑ آئے ہیں۔

”انا! آج بھی چکو ڈیر ہو رہی ہے۔“ ارمان نے اونچی
آواز میں ہانک لگائی۔

”بس ایک منٹ۔“ وہ دونوں کو کپ تھما کر چلتی
بنی چائے کی خوشبو اور رنگ اس کا ذائقہ تیار ہے تھے۔
”تم نے صرف چائے کی فرمائش کی تھی یہ نہیں
کہا تھا کہ بنانے والی خود لے کر آئے۔“ تیا نے اس کی
حالت دیکھتے ہوئے جیسے اندر ہی اندر سانس لی تھی۔

سبحان نے گرم چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اس کی تخی
پیشانی پہ سلوٹس دیکھ کر وہ بچھ سے گئے۔
”اگر یہی گھونٹ ڈالتے اور چاشنی کو محسوس کرتے
ہوئے لیا ہوتا تو نہ تمہیں کوئی شکوہ ہوتا اور نہ ہی تمہارا
منہ جلتا۔“ تیا نے بچھے بچھے انداز میں بات کی تو سبحان
جو چائے کو گھور رہا تھا شہد رسا انہیں دیکھا رہ گیا اور

پیشانی پہ سلوٹس دیکھ کر وہ بچھ سے گئے۔
”اگر یہی گھونٹ ڈالتے اور چاشنی کو محسوس کرتے
ہوئے لیا ہوتا تو نہ تمہیں کوئی شکوہ ہوتا اور نہ ہی تمہارا
منہ جلتا۔“ تیا نے بچھے بچھے انداز میں بات کی تو سبحان
جو چائے کو گھور رہا تھا شہد رسا انہیں دیکھا رہ گیا اور

پیشانی پہ سلوٹس دیکھ کر وہ بچھ سے گئے۔
”اگر یہی گھونٹ ڈالتے اور چاشنی کو محسوس کرتے
ہوئے لیا ہوتا تو نہ تمہیں کوئی شکوہ ہوتا اور نہ ہی تمہارا
منہ جلتا۔“ تیا نے بچھے بچھے انداز میں بات کی تو سبحان
جو چائے کو گھور رہا تھا شہد رسا انہیں دیکھا رہ گیا اور

پیشانی پہ سلوٹس دیکھ کر وہ بچھ سے گئے۔
”اگر یہی گھونٹ ڈالتے اور چاشنی کو محسوس کرتے
ہوئے لیا ہوتا تو نہ تمہیں کوئی شکوہ ہوتا اور نہ ہی تمہارا
منہ جلتا۔“ تیا نے بچھے بچھے انداز میں بات کی تو سبحان
جو چائے کو گھور رہا تھا شہد رسا انہیں دیکھا رہ گیا اور

پیشانی پہ سلوٹس دیکھ کر وہ بچھ سے گئے۔
”اگر یہی گھونٹ ڈالتے اور چاشنی کو محسوس کرتے
ہوئے لیا ہوتا تو نہ تمہیں کوئی شکوہ ہوتا اور نہ ہی تمہارا
منہ جلتا۔“ تیا نے بچھے بچھے انداز میں بات کی تو سبحان
جو چائے کو گھور رہا تھا شہد رسا انہیں دیکھا رہ گیا اور

پیشانی پہ سلوٹس دیکھ کر وہ بچھ سے گئے۔
”اگر یہی گھونٹ ڈالتے اور چاشنی کو محسوس کرتے
ہوئے لیا ہوتا تو نہ تمہیں کوئی شکوہ ہوتا اور نہ ہی تمہارا
منہ جلتا۔“ تیا نے بچھے بچھے انداز میں بات کی تو سبحان
جو چائے کو گھور رہا تھا شہد رسا انہیں دیکھا رہ گیا اور

ان کی بات کی گہرائی میں جھانکا تو ماتھے پہ سلوٹوں کی جگہ پسینہ اتر آیا۔ وہ ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔



اس نے جونہی لاؤنج میں قدم رکھا تو ناک کی سیدھ میں طیبہ بیٹھی تھی۔ وہ اس طرف نظر پڑی تو طیبہ کی مہا گود دیکھ کر تھکی جو تانیا ابو اور اجمل چچا سے دھیسے دھیسے لہجے میں کچھ کہہ رہی تھیں جبکہ امی اپنی ہتھیالیوں پہ نظر جمائے کسی خیال میں کم تھیں۔ چچی یقیناً ”بہن کے گھر تشریف لے جا چکی تھیں“ عشنا کو تمام صورت حال کافی عجیب لگی اس لیے وہ سب کو سلام کر کے رکی نہیں تھی بلکہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اسے پتا تھا طیبہ کے پیٹ میں موڑا ٹھہر رہے ہوں گے اور وہی ہوا ابھی وہ اپنی سانس بحال کر رہی تھی کہ طیبہ دانت نکوستی اس کے سامنے آگئی۔

”ایسا کیا ہوا ہے“ قلعی زور رات لگ رہی ہو۔“
عشنا نے گلاس میں پانی ڈالا اور عشا غٹ چڑھا گئی۔
”تمہیں میرا سسرال پسند آیا تھا نا۔“

”تو؟“ عشنا نے اس کی مسہنس بھری آنکھوں میں جھانکا۔ ”تو جناب وہاں سے تمہارے لیے پروپونل آیا ہے۔“
”میں سے لو چلی تھی وہ بھی نو مہر میں۔ اس نے پانی کا بھرا ایک اور گلاس لیوں سے لگایا۔

”اب بک بھی چکو۔“ وہ پاس دھرے صوفیہ بیٹھ گئی۔
”آپ کے تانیا ابو نے سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے۔“

”اور اجمل چچا؟“ جونہی اس کے لبوں سے پھسلا۔
”انہوں نے بات کرنا چاہی تھی مگر تانیا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا یہ کہہ کر کہ پھر بات کریں گے۔“ طیبہ نے ذرا سنجیدگی کا چولا اوڑھا۔ عشنا بھی اور گلاس میں پانی ڈالا اور واپس صوفیہ بیٹھ گئی۔
”اگر ایک پروپونل پہ پورے لاہور کا پانی پی جاؤ گی تو

دوسرے پہ راوی کنارے بیٹھنا ہوگا۔“ طیبہ نے کچھ تلخی سے کہا اور اس کے جواب نے بغیر نیچے چلی گئی۔ پتا نہیں کیوں عشنا اسے روک نہ سکی اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی۔

شام کو عجب واقعہ ہوا۔ اجمل چچا، چچی کو لے آئے، ایک بار پھر ڈیرہ جملا۔ جگہ بدلی گئی۔ اب مسکن تانیا کا کمرہ تھا۔ ایک ہی دن میں یہ عشنا کے لیے آنے والا دوسرا پروپونل تھا۔

”ہم نے سوچا۔“ تمہیں بھی ہے پتا نہیں کیسی سسرال ملے۔ ہم اجمل کے بھائی کو کیا منہ دکھائیں گے۔“ چچی نے جان بوجھ کے آواز کا سراو نچا رکھا۔

”یہ تو گھر کی بات ہے۔ اب باہر کے لوگ کہاں نوکری کرتی لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں ان کے خیال میں تو ایسی لڑکیاں گھر بسا ہی نہیں سکتیں۔ اللہ بخشنے اب اماں کی ہی مثل لے لو۔“

”دیکھئے بھائی صاحب! عشنا اور بھائی کا مزاج بالکل نہیں ملتا۔ کچھ ماہ بعد وہ افسرین جائے گی اس کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوگا۔ وہ گھر پہ توجہ نہیں دے سکے گی۔ فی الحال تو وہ پانچ چھ سال تک شادی کرنا ہی نہیں چاہتی“ اس لیے آپ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کے سبحان کا رشتہ طے کر دیں۔ ہم سب کے لیے یہ بہتر ہوگا، رہی بات جائیداد کی تو سبحان بھی میرا بیٹا ہے میں اپنا گھر اور پر اپنی عشنا اور سبحان دونوں میں برابر تقسیم کروں گا، اللہ بچوں کے نصیب اچھے کرے اور ہاں بھائی جہاں تک اماں کی بات ہے، آپ انہیں اپنی گفتگو میں مت گھسیٹا کریں وہ جیسی بھی تھیں اپنی بہوؤں کی عزت کرتی تھیں۔“
انہوں نے دو زیدہ نظروں سے رافعہ کو دیکھا۔

”معاف کیجئے گا بھائی صاحب عشنا میں سارے گن داوی جیسے ہیں مانو اپنا آپ کھول کر اسے پلا گئی ہیں“ رافعہ نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بڑی فاتح نظروں سے ان دونوں میاں بیوی کو دیکھا۔ اجمل دل ہی دل میں کھول کر رہ گئے۔

وہ صحیح معنوں میں پریشان تھے کیونکہ انہیں عشنا بے حد عزیز تھی مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رافعہ اور اس کا ایک دن بھی گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہ تے قدموں سے بیوی کے پیچھے ہو لیے۔ آمنہ کی مسلسل خاموشی عاصم کو کھٹک رہی تھی۔

انہوں نے بغور ان کی طرف دیکھا۔
 ”میرا فیصلہ تمہیں اچھا نہیں لگا؟ کیا تم ایسا نہیں چاہتی تھیں؟ میں جانتا ہوں عام ماؤں کی طرح تمہارا بھی یہی خواب ہو گا کہ بیٹی آنکھوں کے سامنے رہے اور پھر پچکار پچکار کر تم اسے ایک ایسی ساس کی خدمت پہ مجبور کرو جو عزت کے معنوں سے بھی ناواقف ہے۔“ آخر میں ان کا لہجہ زہرا گلنے لگا تھا۔

”اب اپنا یہ جذباتی پن عشنا پہ مت ظاہر کرنا۔ سچی خواہ پریشان ہوگی۔“
 ”مگر سبحان تو اچھا۔۔۔ بالآخر انہوں نے چپ کا روزہ توڑا۔

”وہ مجھے بھی بہت پسند ہے مگر صرف شوہر کے ساتھ گزارہ نہیں کرنا ہوتا۔۔۔ وہ ان کی بات کٹ کر تیز لہجے میں بولے۔“ آئندہ ہمارے بیچ اس موضوع پہ کبھی بات نہیں ہوگی۔“ ان کا لہجہ دو ٹوک تھا آمنہ نے بمشکل سکون کا سانس لینے کی کوشش کی۔

”خود کو ریلیکس کر کے اوپر جانا۔ ہم نے جو کچھ کرنا تھا وہ کر لیا اب انتظار کرو کہ وہ اپنے لیے کیا فیصلہ کرتی ہے۔“ عاصم نے سائیڈ ٹیبل سے بیگ اور میگزین اٹھایا۔

”کبھی کبھی دل مار کر خود کو زندہ رکھنے پر انسان مجبور ہو جاتا ہے۔“ ان کی سر دوسپاٹ آواز نے آمنہ کا وجود کلیشیر میں بدل دیا تھا۔

ادھر ارمان نے گھر میں قدم رکھا ادھر رافعہ کے اندر جانے کب سے ابلتا لاولا جیسے پھٹ پڑا تھا۔
 ”اب تم دونوں بھائیوں کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی۔ تیری بیوی بھی سکون سے رہ رہی ہوگی اور اس نے بھی ماں کی بے عزتی کروا کے جیسے کوئی تمہنجہ جیت لیا ہے۔“ انہوں نے اندر آتے سبحان کی طرف اشارہ

کیا۔
 ”اب آتے ہی میں نے کیا کر دیا ہے؟“ وہ ناراضی سے گویا ہوا۔ ”آپ نے تو ادھر رہتا تھا۔“ اس نے جیسے یاد آنے پر حیرانی سے ماں کو دیکھا۔

”تیرا باپ یوں مجھے عجلت میں گھر لے آیا جیسے رشتہ آنے پر وہ اسی کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی۔“ اس کا دل غم بھک سے اڑ گیا۔
 ”کس رشتے کی بات کر رہی ہیں۔“ اس کے دل میں خطرے کا الارم بجنے لگا۔

”تو بے خبر ہی رہتا میرے بچے!“ ادھر تجھے دیوانہ بنایا ہوا ہے ادھر کسی اور سے محبت کی پینٹکس بڑھا رکھی ہیں۔“

”امی عشنا ایسی بالکل بھی نہیں اور نہ اس نے مجھے دیوانہ بنایا ہوا ہے۔“ وہ بھی تڑخ کر اونچی آواز میں بولا۔

”سن رکھ، اگر تجھ سے اس کا بیاد ہو بھی جاتا تو دوسرے کو مٹھی میں رکھتی، داوی کی طرح۔“
 ”خدا کے لیے امی مرے ہوؤں کو تو بخش دیں۔“ سبحان کا دل غم ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا تھا سو وہ اپنی آواز ہلکی نہ رکھ سکا۔

”اور ہو بھی جاتا سے کیا مطلب۔“ وہ الجھ کر بولا۔
 ”جیٹ، صفا انکار کر دیا ہے تیرے تایا نے۔“ رافعہ نے بیٹے کے دل پہ ہاتھ ڈالا تھا جیسے ساتوں آسمان اس کے اوپر آگرے تھے۔

”ہاں ہاں۔۔۔ ہو گیا تا چہ فوق۔۔۔ ہوش اڑ گئے۔ اس کے لیے ماں سے لڑنا تھا، اس کا کا حرف آخر میں سب سمجھتی تھی انجان نہیں تھی۔ تیری خاطر تیرے ماں باپ نے سوائی بن کے بھی دیکھ لیا۔ آخر ٹھکرا دینا اس نے تمہیں۔“ مگر وہ اپنے حواسوں میں کہاں تھا۔
 دکھ کا ایک سیل رواں تھا جو اسے اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا۔ باوجود کوشش کے وہ خود کو ہلا بھی نہ سکا۔
 ”اے سبحان! میں کہتی ہوں اب ہوش میں آجا۔ ایک مہینے کے اندر، اندر تیرے لیے چاند سی دلہن نہ لائی تو پھر کہنا۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور گھر سے ہی

باہر چلا گیا۔

”ارے کہاں جا رہا ہے۔ بات تو سن۔“ وہ اس کے پیچھے لپکیں۔ ارمان نے انہیں پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔

”اے ہے دیکھ لینا اب بھجوں بن کر اس کی جو کھٹ پہ بیٹھ جائے گا۔“ وہ با آواز بلند وہائیاں دینے لگیں۔

اوپر میگزین کی ورق گردانی کرتی عشنا کے لیے یہ سب سنا کر قابل برداشت ہو چکا تھا۔ وہ عارف ذہن کے ساتھ ننگے پاؤں ہی دھڑا دھڑیٹھیاں اتر آئی۔

”خدا کے لیے چچی! میرے دل میں جو آپ کی ذرا سی عزت ہے وہ تو قائم رہنے دیں۔ میں کس طرح سمجھاؤں کہ مجھے آپ کے بیٹے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کبھی بھی نہیں چاہیے۔ میرے دل میں اس کی کوئی خواہش نہیں۔ یہ میری اور آپ کی جنگ پر سوں برائی ہے۔ درمیان میں سبحان کو مت لایا کریں۔ کم از کم میری آنکھوں میں آنسو دیکھنے کی حسرت لیے آپ اس دنیا سے رخصت ہوں گی۔“ اس نے رافعہ سے پرانا حساب بے باق کیا۔ ”بہ بدیں ضرور مگر وہیٹ بنی چٹھی رہیں۔“

”آپ جتنا بھی واویلا کر لیں نہ تو میں یہاں سے جاؤں گی اور نہ آپ کی باتوں سے خوفزدہ ہو کر اوپر بیٹھ کر ٹھہر کر کانپوں گی۔ آپ چاہے سات دنوں کے اندر اس کی سات شاویاں کر لیں۔ مجھے رتی برابر فرق نہیں پڑنے والا کیوں میں عشنا منیر ہوں رافعہ اجمل نہیں۔“ اور عشنا کا اتنا کہہ دینا جلتی پہ تیل کا کلام کر گیا۔

”لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکیں۔ اس کے تیور ہی ایسے تھے وہ رکی نہیں تین فن کرتی اوپر چلی گئی اور رافعہ مٹی کا ڈھیر بنی بیٹھی رہ گئیں۔“

آمنہ عشا کی نماز پڑھ رہی تھیں جب انہوں نے سلام پھیرا تو عشنا ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ آمنہ مسکرائیں اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے وہ بچپن میں بھی

ایسا ہی کرتی تھی۔ جائے نماز پہ اپنے لیے ذرا سا جگہ بنا لیتی اور ماں کے ساتھ جڑ کر بیٹھ جاتی۔ آمنہ نے دعا ختم کر کے بازو پھیلا دیا اور اسے مزید اپنے ساتھ لگا لیا۔

”ایسے لوگوں کے ساتھ الجھنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ تم ان کے منہ مت لگا کرو۔ ماں بھی ان سے مقابلہ کرنے کی روادار نہیں تھیں یہ منہ پھٹ اور بد لحاظ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں۔“ دھیرے دھیرے کلام کرتی آمنہ نرمی سے اس کا بازو سہلارہی تھیں۔

”کیوں امی؟“ وہ ان کے بازو کے حصار سے نکلی۔

”آخر کیوں امی؟“ وہ جیسے جرح پہ اتر آئی تھی۔ ”آپ جیسے لوگوں نے ہی انہیں ڈھیل دے کر ان کا دل خراب کیا ہوتا ہے اگر اتنے ہی عقل سے پیدل ہیں تو انہیں باندھ کے رکھنا چاہیے۔“ عشنا غم دھمکے کی ملی جلی کیفیت میں جب دل کا تھما جی بھر کے نکل چکی تو چپ کر گئی۔

”بس! آمنہ نے بیٹی کے شفاف اور غصیلے چہرے کو غور دیکھتے ہوئے کہا۔“

”نہیں۔“ وہاں کے ایک لفظ پہ چڑھ کر بولی۔

”اگر چچی اپنے گریبان میں جھانک لیں تو داوی یا میرے اوپر ہمتیں لگائی چھوڑ دیں مگر قتل آپ کے ایسے لوگ آئینہ دیکھنا پسند نہیں کرتے اتنے سالوں سے کبھی ان کا راز ہم نے ان کے منہ پہ مارا ہے؟“ دکھ کے مارے عشنا کا چہرہ سیاہ پڑ رہا تھا۔ ہاتھ نہیں وہ اپنے اندر سے کون کون سے دکھ کھرج کے نکل پھینکنا چاہتی تھی۔

”شش۔“ آمنہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور اسے تنبیہ کرتی نظروں سے دیکھا۔ پھر توقف کے ساتھ سادہ و سادہ لہجے میں بولیں۔

”اگر صبر کر ہی لیا ہے تو ضبط کی انتہا کرو۔ اب اس میں ہی سب کی بچت اور عزت ہے۔“ بات کے اختتام پر وہ بتا اسے دیکھے کچن میں چلی گئیں۔ عشنا نے ماں کی بات برول میں چلنے والے جھکڑوں کو تھمتے محسوس کیا تھا۔ کوئی گروسی گروسی جو بگولوں کی صورت کانتوں کو بھر بھر کے اس کی آنکھوں میں چھو رہی تھی

اور وہ آنکھیں مل بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ ضبط لازم ٹھہرا تھا۔ امیر شہر نے پھولوں کے ڈھیر جانے کن پستیوں میں بنوادیے تھے۔ تھی داماں پڑ پودے ہوا کے خالی ہاتھوں کو کرب سے تک رہے تھے۔



سبحان نے اپنے گھر کو اجنبی نظروں سے دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں اندر کسی کے بھی موجود نہ ہونے کی دعا کر رہا تھا، سنسان لاؤنج کو دیکھ کر اس کے تمام وجود میں تلخی سی بھر گئی۔ پتا نہیں قبولیت کی کونسی گھڑی تھی وہ جیسے اپنے آپ پہنسا اور کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھولا۔ وہ فی الحال کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا سوائے عشنا کے اسے کسی سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ تازہ سے بھی نہیں۔ اندر پہنچ کر اس نے کمرہ لاک کیا اور بیڈ پہ اوندھ حالت گیا۔ وہ تمام رات کا جاگا ہوا تھا جلد ہی نیند اس پہ مہمان ہو گئی۔ وہ آنکھیں بند کرنے سے پہلے غنودگی میں جانے سے پہلے نیند میں اترنے سے پہلے بھی اس کا چہرہ تک رہا تھا تمام رات اس نے پچھلے زمانوں کے خواب دیکھے۔ ایک چھوٹی سی بچی، بڑی سی پونی جھلا جھلا کر اس کے آگے پیچھے بھاگتی ہوئی، اس سے اپنی گڑیا چھتتی ہوئی، پچھلے زینے کی سب سے چلی بیڑھی۔ وہ دونوں سوکھی ٹہنیوں اور پتوں سے گھر بنایا کرتے تھے اور پھولوں کی سرخ ویزرو پتیوں سے اسے سجایا کرتے تھے۔ اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔

شاید وہ بخار میں تپ رہا تھا اس نے اپنے خشک ہوتے حلق کو تر کرنا چاہا۔ بچی کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کی بوتل تھی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا پھر اس نے اسے پکڑ لیا تھا اور پانی کی بوتل اس سے پھینکی وہ روتی ہوئی بیڑھیوں کی طرف بڑھی پھر رک گئی۔ اس نے مڑ کے دیکھا اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں بچے نے بوتل کا ڈھکن کھولا، ابھی وہ منہ تک لے جا رہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”پانی پیا تو میں یہ گھر توڑ دوں گی؟“ بچی نے مسکرا

کے پاؤں اٹھایا۔ بچے نے پھرتی سے بوتل واپس کر دی۔

”نہیں نہیں اسے مت توڑنا۔ یہ ہمارا گھر ہے اسے ہم دونوں نے محنت سے بنایا ہے، کہیں سے شاخیں کہیں سے بچے کہیں سے پھول توڑے ہیں۔“ وہ کرلا تارہ گیا۔ اس نے گھر پہ اپنا پاؤں رکھا اور اسے روندتی چلی گئی۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ یکلخت جیسے چیخا تھا پھر اپنی چیخ سے ہی بیدار ہوا۔ اس کے حلق میں کانٹے آگ رہے تھے۔ وہ سینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی شرٹ کے بٹن ایک جھٹکے سے کھولے اور سائیڈ ٹیبل پہ پڑے پانی کے جگ کو دیکھا، وہ کناروں تک بھرا ہوا تھا۔ اس نے گلاس میں اینڈیلا پھر گلاس کو ہاتھ میں پکڑ کر دیکھا رہا۔ دیکھتا ہی رہا لیوں تک لے جانے کی کوشش کی غب ذرا سے خم ہوئے اس نے گلاس ہٹایا اور دیوار پہ دے مارا پھر اس نے جگ اٹھایا اور اسے بھی گلاس کی طرح توڑ دیا۔

”مجھ پانی نہیں چاہیے۔“ وہ بلند آواز سے رویا۔

”مگر یہ گھر مت توڑو یہ ہمارا ہے۔ ہم دونوں کا ہے۔“ وہ بچکوں سے رو رہا تھا۔ روتے روتے جانے کب وہ غنودگی میں یا بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا۔

کرچیاں دیوار دور کو اور وہ انہیں دیکھتی ہی رہ گئیں۔



”آمنہ!“۔ عاصم نے بے چینی سے اسے پکارا۔

”جی۔“ وہ الماری بند کر کے پلٹیں۔

”پانی سب تو شافحہ کے گھر ہوں گے۔ ارمان سے فون کر کے پوچھو۔ کیا سبحان بھی وہیں ہے دونوں سے گھر نہیں آیا؟“ انہوں نے خشک ہوتے ہونٹوں پہ زبان پھیر کر پیشانی کو ملا۔ آمنہ نمبر ملانے لگیں۔ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد ان کے ماتھے پہ بھی نفلر کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ وہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”نہ وہ مارٹ گیا ہے اور نہ ان کے ساتھ ہے۔“ آمنہ

دیکھ کر شرمندگی نے اسے گھیرا جبکہ ان دونوں نے اسے ہوش میں آتے دیکھ کر خدا کا شکر کیا پانچ بجے ڈاکٹر نے ڈرپ بند کر کے دو انجکشن لگائے۔ انہیں کچھ کھلائے پلائیے اور خوش رکھیں۔ ڈاکٹر نے سبحان کے نڈھال سے وجود کو پر سوچ نظروں سے دیکھا وہ اچھا خاصا جاذب نظر اور وجہ تھا۔

”یک مین! زندگی ٹیڑھی میڑھی راہوں پہ سفر کرنے کا نام ہے۔ سیدھا راستہ صرف خدا کی طرف جاتا ہے اور ہمیں جہاں بھی جانا ہے بلالوے پہ جانا چاہیے۔ خاص کر خدا کے پاس تو اس کی رضا سے جاتیں ہوں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔“ ڈاکٹر نے اس کا کندھا تھپکا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ آمنہ وقتے وقتے سے اسے کبھی بخنی تو کبھی جوس پلائی رہیں۔ رات تک کمزوری محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر بخار نہ ہوا تھا۔

”بھئی! اب ہم بوڑھے تھک گئے ہیں۔ اب ڈیوٹی چنچ کرتے ہیں۔ کیوں آمنہ؟“ عاصم نے آمنہ سے مایہ چاہی۔

”کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔ اب ہم بھی کچھ پیٹ پوجا کر لیں۔“ دونوں اپنے اپنے کمرے میں آگئے۔ ”عشنا کو میرے پاس بھیج دو۔“ ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنی کپڑی کی رگ رگ بار بار ہار رہے تھے۔ عاصم کے آنک آنک سے اضطرابی حالت نمایاں تھی۔ آمنہ نے سر ہلایا۔

تھوڑی دیر بعد عشنا ان کے پاس تھی۔ ”وہ تمہارے جتنا مضبوط نہیں۔ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اسے کچھ نارمل کرو کسی بھی طرح سمجھا بھجا کر ورنہ کوئی نئی کہانی ضرور جنم لے گی۔“ نایا نے مناسب لفظوں کا چناؤ کیا سفید بے داغ سوٹ میں عشنا کھلتے گلاب کی مانند لگ رہی تھی۔ نایا نے بے ساختہ نظر چرائی۔

”دو کپ اچھی سی چائے بنا کر لے جانا۔“ عشنا کے چہرے اور آنکھوں میں خاموشی کا راج تھا وہ کسی ہی حالت میں اٹھ آئی پہلے اس نے چائے بنائی پھر اوپر

کالہ کاپ رہا تھا۔ ”میرے موبائل پہ اس کا نمبر ملاؤ۔“ عاصم کی آواز جیسے گہری کھائی سے آئی تھی۔ نیل جا رہی ہے۔ آمنہ نے فون انہیں پکڑا یا کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ ”سبحان پٹنا! کہاں ہو؟“ اندر آئی عشنا دروازے کے پاس رک گئی۔

”میں پوچھ رہا ہوں کہاں ہو؟“ نایا جیسے منت کر رہے تھے۔

”شاید ہمیں سے کیا مراد۔“ نایا نے جملہ دہرایا۔ ”یہیں، مطلب گھر پہ ہو؟ کمرے میں ہو؟“ انہوں نے فون پٹھا۔

”آمنہ! وہ اپنے کمرے میں ہے مگر مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔“ عشنا جلدی سے واپس مڑی تھی اور آمنہ نے ان کی وہیل چیئر کو منبھوٹی سے پکڑ لیا تھا۔ دروازہ لاکڈ تھا۔ آمنہ پگن سے چابیوں کا پچھالے آئیں۔

”خدا کرے چنچتی نہ گئی ہو۔ ان کا انداز دعائیہ تھا شکر ہے چابی کھماتے ہی دروازہ کھل گیا۔ اور عاصم کی جان میں جان آئی مگر سامنے کا منظر دیکھ کر بس وہ کمرچیوں میں بٹ گئے اونداھالینا سبحان کھلے پہ ذرا ترسھا ہوا اس کے پوٹے اس قدر سوچے ہوئے تھے کہ بمشکل آنکھیں کھلیں۔

”آمنہ! اسے تو شدید بخار ہے۔ مجھے فونڈ اپانی اور پٹیاں دو۔ تم ذرا ڈاکٹر کو فون کرو۔“ عاصم نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ تھوڑی دیر بعد اس کا بخار اترنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اسے چیک کرنے کے بعد شدید ڈپریشن بتایا تھا۔

”کل تک بخار اتر جائے گا۔ انہیں یہ میڈیسن دیتے رہیں ان کا ذہن کچھ پرسکون ہو گا۔ فی الحال میں انہیں ڈرپ لگا رہا ہوں پانچ بجے پھر چکر لگاؤں گا ضروری ہدایات کے بعد ڈاکٹر چلا گیا تو عاصم اور آمنہ نے شدید دکھ کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ آدمی ڈرپ کے بعد اسے کچھ ہوش آنا شروع ہوا اس نے ارد گرد نگاہ کی۔ ان دونوں کے مغموم چہرے

کا سارا پورشن لاک کر کے نیچے چلی آئی۔ تایا کے کمرے کی لائٹ آف ہو چکی تھی گوکہ اس کے اندر کافی ہمت تھی مگر سبحان کے ری ایکشن کا سوچ کر اسے کھیرا ہٹ ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ لیٹا ہوا ہو گا مگر سوچ کے برعکس وہ کمرے میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی آمد پہ بھی اس نے وہی مصروفیت جاری رکھی۔ عشنا نے ٹرے ٹیبل پہ رکھی اور اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

”صبح سے میرے اہل ابا کو خوار کیا ہوا ہے۔ اچھے بھلے تو ہو۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔ وہ تیزی سے مڑا اس کے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ تھا یقیناً۔ وہ وہی ڈھونڈ رہا تھا۔ پیکٹ بیڑپہ اچھالا۔ وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی عدھال چوہ بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ عجب مجنوں سا لگ رہا تھا عشنا نے اراداً ”نظر چرائی۔ سبحان کی آنکھیں سرخ انگارے کی طرح جل رہی تھیں۔ وہ اس کی جانب بڑھا اور قریب آ کر رک گیا۔

”منع کیا تھا تاکہ آئندہ میرے کمرے میں مت آنا۔“ وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔

”تو۔“ عشنا نے صنویں چڑھائیں۔

”تو۔“ اس نے زیر لب دہرایا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پہ دھرے۔

”میرے اندر الاؤ دیک رہا ہے۔ جل رہا ہوں میں تم میری تیمارداری کی غرض سے آئی ہو تو جاسکتی ہو مجھے ہمدردی نہیں چاہیے۔“ وہ اس کی کلاسیوں کو جھٹک کر بولا۔ عشنا نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے صوفے پر بٹھا کر تھوڑی ترچھی ہو کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اس کا تپتا ہاتھ عشنا کی ہتھیلی بھگو گیا۔ عشنا نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی ملاحت سے پکڑ لیا اس کے اس انداز نے اسے مزید تپا دیا اس کے ہاتھوں میں موجود تمازت اس کی بے چینیوں کی غماز تھی۔

”نہ تیمارداری نہ ہمدردی۔ میں تمہیں دیکھنے آئی ہوں اور بچپن کے بعد پہلی دفعہ تم سے ملنے آئی ہوں۔“

”بس۔“ سبحان نے پھر کر اسے ٹوکا۔ ”ان عنایتوں

کی وجہ سمجھ سکتا ہوں؟ نہ میں نے پہلے تم سے ہاتھ چھڑائے ہیں نہ اب چھڑاؤں گا اب بھی تم میرے ہاتھ چھوڑو اور جاؤ۔“ وہ سلوٹ زہ لہجے میں بولا ”مجھے تمہارا ترحم آمیز لمس نہیں چاہیے۔“ عشنا نے خود کو بے بسی کی انتہا پہ پایا وہ بس لب کٹ کر رہ گئی۔

”سبحان تمہارا بخار تیز ہو رہا ہے۔ تم لیٹ جاؤ۔“ وہ انتہائی نرمی سے بولی۔

”یہ میری زندگی ہے۔ اور اپنی زندگی اس میں سے تم مجھے بے دخل کر چکی ہو عشنا۔“ اس نے دکھ سے آنکھیں بند کی تھیں۔

”اف میں اسے کیسے سنبھالوں کیسے سمجھاؤں۔ اس کے اندر دھڑکنوں نے اودھم مچا رکھا تھا بہر حال اسے کچھ تو کہنا تھا۔“

”مان لیا کہ میں نے اپنی زندگی سے تمہیں بے دخل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ تم کیا چاہتے ہو۔“ اور وہ اس کی بات پہ گنگ رہ گیا۔

”کسی کے جسم سے روح کھینچ کر کوئی پوچھے کہ تم کیا چاہتے ہو؟“ غضب کا دکھ انتہا کی ملامت اس کے لہجے سی ٹپک رہی تھی۔

”مگر سبحان! تمہارا بخار۔“

”اگر بخار میں مرنا ہوتا تو کل یا برسوں رات مر چکا ہوتا۔“ وہ پھٹکارا اور اٹھ کر بیڑپہ چلا گیا۔ ”نہ ماما کہہ رہی تھیں یہ میڈیسن تم نے لگتی ہے۔ وہ بیڑ کے قریب۔“

کرسی کھینٹ کر بولی اور گلاس میں پانی ڈالا اس نے خاموشی سے عشنا کی ہتھیلی سے چھوئی سی ٹیبلٹ اٹھائی اور پانی کے ساتھ نگل لی۔

”اب میں سونا چاہتا ہوں۔“ وہ خفگی کی حد میں عبور کر رہا تھا۔

”تو سو جاؤ۔“ عشنا نے کرسی سے ٹیک لگائی ”میں اپنی ڈیوٹی پر ہوں۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ جب سے وہ کمرے میں آئی تھی وہ غصے کے عالم میں مسلسل اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ اب اس نے انتہائی دھیان سے گہری نظروں سی اس کا جائزہ لیا سفید لباس میں وہ اسے بے حد ملول اور دلگرفتہ سی لگی۔

”میں آخری بار اپنی داوی کی موت پر روئی تھی اور اب — بار تم سے جدا ہونے کا دکھ مجھے رلا رہا ہے۔“ اس کے آنسو سجان کا پہلو بھگور رہے تھے سجان کے لبوں پہ بڑی خفیف سی مسکراہٹ عود آئی۔ عشنا نے اس سے نظر چرا کر وال کلاک کی طرف دیکھنا شروع کر رہے تھے۔



ایک ہفتے بعد رافعہ کی واپسی ہوئی تھی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ انہوں نے وہاں موجود تمام افراد کے چہروں پہ بہتیرا کچھ کھوجنے کی کوشش کی مگر کوئی بھی نتیجہ اخذ نہ کر سکیں۔ سجان بھی معمول کے انداز میں بالکل پہلے کی طرح مصروف و مگن تھا۔ عشنا بھی حسب معمول تایا کے کمرے میں آ جا رہی تھی اور آمنہ تو تھیں ہی سدا کی بدھو۔ یا شاید انہوں نے اپنے تئیں انہیں بے وقوف سمجھا ہوا تھا۔ مگر رافعہ عشنا کی اس دن کی گفتگو کے بعد محتاط ہو گئی تھیں۔ وہ اتنے عرصے تک یہ سمجھتی رہیں کہ وہ راز صرف ان کی سانس تک محدود تھا مگر اس دن عشنا کی پھنکار نے ان پہ بہت کچھ واضح کر دیا تھا۔ شادی میں بھی وہ بے دلی سے تمام فنکشن بھگتاتی رہیں اور انابارات اور ولیمہ پروہاں آئی بھی تو رافعہ نے بس اسے سرسری سا لیا۔

انانے آتے جاتے گم صم بیٹھی سانس کا چہرہ دیکھا جو سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

”امی رات کے کھانے پہ کیا بناؤں؟“ بہو کی آواز اسے حال میں واپس لے آئی۔

”ارمان سے فون کر کے پوچھ لو۔“ رافعہ نے جان چھڑانے والے لہجے میں کہا تو انانے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”اب مجھے سجان کی شادی میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے ورنہ بہت کچھ غلط ہونے کا خدشہ ہے۔“ ان کے بے چین و بے قرار دل نے کئی امکان و جواز گھرنے شروع کر دیے تھے۔

نہیں، مجھے خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔

”تمہاری تکلیف مجھے بھی دکھ دیتی ہے سجان۔“ اس نے سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانک کر سرگوشی کی۔ اس کا نرم مدھم لہجہ سجان کے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر گیا۔

”پلیز خود کو سنبھالو۔ مجھے اس طرح رسوا مت کرو۔ اس طرح تو میں تماشابین کر رہ جاؤں گی۔ آج تایا ابو نے مجھے جن نظروں سے دیکھا تھا میرا دل چاہا زمین میں گڑ جاؤں۔“ وہ روہا سی ہو کر بولی۔

”جواب اشارت ہو گئی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی مجھے میری ہی نظروں میں مت گراؤ۔ جو لوگ دل میں بستے ہیں وہ کبھی جدا نہیں ہوتے۔ میں تمہاری زندگی میں آگئی تو دل سے نکل جاؤں گی۔ اور میں تمہارے دل میں رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے یہیں رہنے دو پلیز۔“ عشنا کے کہنے پر سجان نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا۔

”عشنا مجھے مت چھوڑو۔ میں ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں وہ ہاتھ کو اپنے لبوں سے مس کر کے جیسے کر لایا تھا۔ میں تمہیں الگ گھر میں رکھوں گا۔ ہم بہت دور چلے جائیں گے۔ بہت دور تم جیسے کوگی میں۔ ل۔ ل۔ ل۔“ اس کا ذہن غنودگی میں ڈوبتا جا رہا تھا شاید وہ سکون اور ٹیلیٹ تھی عشنا نے سوئے سجان کو ازر کرنا چاہا۔

تمہاری خواہش کی مٹھیاں بے دھیانیوں میں کبھی کھلیں تو یقین کرنا کہ تیرے ہاتھوں کے لمس تازہ کی خواہشوں میں ہماری چاہت کے جگنوؤں نے بڑے گھنیرے اندھیرے کاٹے۔

کاش تم رافعہ چچی کے بیٹے نہ ہوتے تو میں تم سے کھل کے اپنی چاہت کی شدتوں کا اظہار کرتی۔ میں تمہاری خواہشوں کے گھر کبھی بھی نہ مسمار کرتی۔ میں جانتی ہوں یہ کچھ پھر کبھی ہماری زندگی میں نہیں آئیں گے۔ میں بلو وجود چاہنے کے کبھی تمہیں اتنی فرصت سے نہیں دیکھ پاؤں گی۔“ اس نے سجان کا بازو ذرا سا چپے لیا اور اس پہ اپنا سر ٹکا دیا۔

باشت بھر کی چھو کری خود کو اپنے جذبات کو ڈھانپ چھپا کر کسی خزانے کی طرح رکھ سکتی ہے تو میں تو زمانہ ساز عورت ہوں دنیا کو اپنی انگلیوں سے نچایا ہوا ہے اگر میں اپنی پرانی جون میں نالوںی تو سب ٹھنک جائیں گے اور سبحان پھر سے اس چھپکلی کا طلب گار بن بیٹھے گا گھر۔ انا کا راج قائم ہو جائے گا سب کچھ گڑبڑ ہو جائے گا اگر آج تک میرا دل سکون نہیں پاسکا تو میں کسی کو بھی دل کی حسرت پوری نہیں کرنے دوں گی اندر کی چھڑی جنگ سے ان کا منہ لال انگارہ بنا ہوا تھا میں اگر ساری دنیا کو بھی جڑ سے کھینچ کر نکال پھینکوں تو بھی میرا وجود شانت نہیں ہو سکتا۔

”ارے انا کہاں کھپ گئی ہو جگ بھر کے پانی لاؤ برف بھی ڈالتا۔“

”جی ای۔“ وہ بوکھلائی ہوئی کہیں سے نکلی تھی مگر ساس کی خواہش سن کر وہ مزید بدحواس ہوئی تو میرا کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی کی طلب کوئی جواز نہیں رکھتی تھی۔ اس نے کندھے اچکائے اور لیکن کا رخ کیا۔ راتھ نے ہاتھ سے اپنے دل کی جگہ کو مسلاتھا دل وہاں نہیں تھا کئی سالوں سے وہاں ایک گڑھا بن چکا تھا خالی کھنڈر دل تو اس حادثے میں مرے نوالے کے ساتھ دفن ہو گیا تھا۔ انا نے پانی کا جگ ٹیبل پہ رکھا اور گلاس بھر کے انہیں تھمایا خود وہاں سے کھسنے میں عافیت جانی۔ کچھ لمحوں بعد وہ وہاں سے گزری تو جگ خالی تھا اب وہ حیرت زدہ نہیں تھی کیونکہ اکثر اس کی ساس ایک ہی وقت میں اسی طرح جگ خالی کرتی تھیں پتا نہیں کونسی تلخی ان کے اندر اتر آتی تھی۔

رات کے کسی بھی پہر جب کبھی اس کا دل گھبراتا تھا تو وہ اٹھ کر باہر آجاتی اور سب سے اوپر والی سیڑھی پہ بیٹھ کر اسے خود پہ داوی کا گمان ہوتا تھا پتا نہیں دل اتنا خاموش کیوں ہے چار سو ہو گا عالم تھا یوں لگتا تھا دستک دینے والے ہاتھ بھٹک کر دیر انوں کی طرف جا چکے تھے اور اڑے منظر جلد نگاہوں سے قدموں کی دور ہوتی

آوازوں کو آہٹوں کو پکارنا چاہتے تھے مگر ان کے لب کسی انہونی نے سی دیے تھے کہیں کوئی ارتعاش برپا ہو کوئی پتا ہی کھٹکے اس کے دل نے عجب سی خواہش کی۔ کسی نے زینے کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا۔ کوئی خشک پتا اس کے پاؤں کے نیچے چر مرایا تھا خواہش یوں بھی پوری ہوتی ہے۔ باوجود گوشش کے بھی اس کے لب ہسکرانے سے عاری رہے۔ کوئی اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا ہمہ تن گوش لمحے انہیں نکلنے لگے خاموشی کا اصرار بڑھنے لگا کوئی تو بولے کچھ تو کہے آہ نے بھی چپ سا رہ لی تھی۔

”ٹریٹنگ کے لیے کب جا رہی ہو؟“ آنے والے نے کچھ تو کہنا ہی تھا۔

”اسی ہفتے میں کسی دن۔“ وہ انگوٹھے سے انگشت شہادت کا ناخن کھرچتے میں مصروف رہی۔

”تم نے رخت ستر باندھ لیا ہے۔“ اس کا لہجہ کسمسایا کسی پرندے نے اڑان بھری تھی نبیوں کی پھڑپھڑاہٹ سے سکوت شب میں حل چل سی تھی کبھی عشنا نے پرندے کو دیکھنے کے لیے چاروں اور نگاہ کی جواندھیوں سے نکل کر لوٹ آئی۔ چاند تو مفقود تھا ہی تارے بھی شب سیاہ کی گھونگھٹ میں چھپ گئے تھے۔

”ہاں۔“ کچھ دیر بعد اس نے جواب دیا۔ سبحان جب سے آیا تھا۔ اس سے نظر چرا ہی تھی۔

”تم نے ایک بار صرف ایک بار مجھے اوپر آنے سے منع کیا تھا اور میں نے چار سال بعد یہ زینہ طے کیا ضرور ہے مگر تمہارے گھر کی حدود نہیں پھلاتیں۔ میں کبھی نہیں چاہتا تھا تمہاری عزت۔ کوئی حرف آئے۔ اور پھر تم خود کو مجھ سے چھپا چھپا کر رکھنے لگی تھیں کبھی گزرتے ہوئے سر راہ تم۔ نظر پڑ جاتی تھی کبھی تاپا کے کمرے میں تمہاری آدھی ادھوری جھلک دکھ جاتی تھی تمہاری رضا اور خوشی کی خاطر میں نے ہمیشہ اپنی زبان اور جذبوں پہ بند باندھے رکھا اس دن کے بعد سے میں اب بھی تمہارا سامنا نہیں کر پارہا تمہیں اب بھی نہیں دیکھ پارہا ہوں پتا نہیں روشنی نے خود کو کس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

مداہوشی سے بچانا تھا۔ سنبھالنا تھا ماحول کو اس برسوں
کیفیت سے آزاد کرنا تھا۔ وہ حواس بحال کرنے لگی۔
”جب خواہشوں سے بے دخل کر دیا ہے تو رعایت
کیوں مانگ رہے ہو۔“ عشنا نے اس کی طرف سے
ریخ موڑا ساہ سپاٹ نارمل سالجہ سبحان کو جیسے کسی
نے کند چھری سے فتح کیا تھا۔

”سات برسوں میں خود کو چھپا کر رکھو۔ مت
رعایت دو۔“ وہ تند و تیز لہجے میں بولا۔ اور وہ یہی
چاہتی تھی کہ ماحول کا رنگ بدلے۔ وہ اس کی خوشبو
سے پہلو چھڑا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”کبھی کبھی اوپر آجلیا کرنا کھانا کھلا دیا کروں گی پانی
بھی ساتھ ملے گا اس سے زیادہ کی توقع مت رکھنا۔“ وہ
روکھی ہو کر بولی اور اس کے ساتھ ہی کھڑی ہوئی۔

”جلد ہی چچی تمہارا ایسا بندہ دست کریں گی کہ میری
شکل تو کیا آواز تک بھول جاؤ گے۔“ اس نے سبحان
کے کان سے ان کو کبھی گرو جھاڑی۔

”جو تم نے چاہا وہ ہو گیا۔ اب میری زندگی میں وہ ہو
گا جو میں چاہوں گا۔“ وہ برہم ہو کر بولا۔

”نہ خود شادی کروں گا نہ تمہیں کرنے دوں گا۔“ وہ
دو ٹوک لہجہ اپنا کر دھیمے سے گرجا تھا عشنا کے سر پہ
جیسے کسی نے بم پھوڑا تھا وہ دھپ دھپ کرتا تیزی
سے سیزھیاں اتر گیا اور وہ کتنی ہی دیر تک ہل بھی نہ
سکی۔



کمرے میں آنے کے بعد بھی وہ تادیر جاتی رہی۔
اس کی بند مٹھی میں ایک لٹس تانہ کی خوشبو دھک رہی
تھی اس نے مٹھی کھول کر پھیلی کو لیوں سے چھوا
”اک ہجر تیری خوشبو سے برے کوئی شہر سنانے والا
ہے۔“ نیند کا موسم بھی روٹھ چکا تھا وہ دل کی دھک
دھک سے تنگ آ کر ٹیرس پہ آگئی نیچے نظر گئی تو دل
اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ لان میں چھل قدمی کرتے ہوئے
سگریٹ پینے میں مشغول تھا۔ وہ بے دھیانی میں اس
کو دیکھتی رہی ”تم کچھ بھی نہیں جانتے ہو سبحان۔“

جہان میں گم کر لیا ہے۔“ اس نے بے چینی سے آسمان
کو ٹکا۔ تم نے اپنے راستے اپنی گزر گاہیں تک بدل ڈالی
ہیں گھر میں میرے موجود ہونے کے اوقات میں اپنی
آواز تک دھیمی کرتی ہو ”تین ماہ سے میں تمہاری ہلکی
سی جھلک دیکھنے کو ترس گیا ہوں میری نظریں تمہاری
ایڑھی کا تل تک دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔“ اس کے
دھیمے مسلتے ہوئے کبجے میں صحرا بول رہے تھے کچھ دیر
پہلے تک وہ چاہتی تھی کہ کہیں کوئی ارتعاش برپا ہو۔ اور
اب اس کا جسم ارتعاش کی زد میں تھا۔

”میں نے تمہارا عشق رکھ لیا ہے تمہیں پانے کی
خواہش سے دستبردار ہونا ہوں۔“ عشنا کے دل اور
سبحان کے لہجے نے مرنے والوں کی طرح آخری پچھلی
تھی کہیں سے نچرستہ سرد ہوا کے جھونکے نے ان کے
جسموں کو چھو کر بر حرارت روحوں کو بر فیلے احساس
تلے منجمد کر دیا تھا۔ کتنے ہی بل اسی عالم میں گزر گئے
کسی خواہش کی موت یہ اسی جھونکے نے بین ڈالے
تھے اس کی کراہتی بین ڈالتی آواز میں شوریدہ پتے بھی
ماتم کناں تھے۔ بس نہیں تھے تو وہ دونوں۔

”میں یہ راز جان گیا ہوں کہ آج کی رات اس قدر
سناہ کیوں ہے۔“ سبحان نے پہلی مرتبہ زینے سے نظر
اٹھا کر اس کی طرف رخ موڑا۔

”کیونکہ۔“ وہ رکا ”میرا پہلو روشن ہے۔“ اس کا آج
وہ لہجہ اس کے کان کے پاس ستارے کی طرح چمکا تھا
۔ سبحان نے اس کا ہاتھ ملا نمت سے تھا۔

”کسی بھولے جھٹکے جھونکے کی طرح کبھی پاس
سے گزر جایا کرو۔ کبھی اچانک برسنے والی بارش میں
ڈھل جایا کرو۔ آنسو کی طرح پلکوں پہ ٹھہر جایا کرو۔ کبھی
لہجہ بھر کو اپنی خوشبو میرے وجود کو دان کر دیا کرو۔“ وہ
اس کا ہاتھ ہلکا سا دبا کر ہنسا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی
حرارت سے پھیلی پہ تپش اترنے لگی تھی برف باری
کا موسم جا چکا تھا چہار سو پانی تھا۔ سیلاب تھا جس میں
وہ بہ رہی تھی ہلکورے لے رہی تھی عشنا نے بلا
ارادہ اس کی طرف چہو موڑا اس کے قرب کا سحر اس
قدر دل فریب تھا کہ سانس بھی مہکنے لگی مگر اسے خود کو

READING
Section

پھر ان سے جڑ کر بیٹھ گئی۔

”تو پھر میں کیسے بہاؤ رہوں؟“ وہ اپنی خوب صورت لائبریری کے کونوں کو جھپٹتا کر بولی۔

داوی کو اس پر ڈھیروں پیار آیا۔ انہوں نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

”بہاؤ لوگ خواہشوں کے قلام نہیں ہوتے بلکہ

ان سے دامن چھڑا کر بھاگتے ہیں اب اگر سبحان

تمہیں سائیکل پہ بیٹھنے کی آفر کرے بھی تو انکار کرو تیار

بہاؤ رہی ہوگی۔

”اگر اس نے آواز دی تو؟“ عشنا ان کی بات

کٹ کر بولی۔

”جب انکار کرو تو مڑ کر دیکھنا یہ بھی تمہاری بہاؤ رہی

ہوگی۔“ اس نے معصومیت سے ان کی بات سمجھ کر سر

ہلا دیا تھا اتنا وہ جان چکی تھی چچی انہیں پسند نہیں کرتیں

اور داوی ان کے ذکر پر غم سے سر جھٹک دیتی تھیں۔

سبحان اور وہ ایک ہی اسکول جاتے تھے پہلے وہ ایک ہی

کلاسی میں آتے جاتے تھے اب وہ الگ الگ آتے

جانے لگے تھے اس بات نے عشنا کو کئی پریشان کیا

تھا۔

”داوی اکیلے ڈرائیور کے ساتھ مجھے ڈر لگتا ہے۔“

عشنا نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اب وہ داوی کے

کمرے میں آئی۔

”سبحان کی ماں نہیں چاہتی کہ وہ آپ کے ساتھ

آئے جائے۔“ داوی نے اس کے بالوں میں انگلیاں

پھیرتے ہوئے کہا۔ ”جب کوئی ہمیں پسند نہ کرے تو

ہمیں بھی اپنے دل سے اس کے لیے نرم گوشہ ختم کر

دینا چاہیے اگر وہ تمہیں پسند نہیں کرتی تو تم بھی اس

سے محبت نہیں کرو سبحان اس کا بیٹا ہے وہ اس کے لیے

کوئی بھی فیصلہ کر سکتی ہے کھیلنے کو دل چاہے تو طیبہ کے

گھر چلی جایا کرو۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ وہ داوی کے مشورے سے خوش ہو

کر بولی۔ اس کی ماں کی عدت پوری ہو چکی تھی مگر اب

وہ داوی کے ساتھ سونا پسند کرتی تھی داوی اسے روز

کہانی سناتی تھیں جب عشنا کی آنکھ کھلتی تو کمرے

کسی کا عذاب تو میں نے جھیلا ہے۔“ وہ سرد آہ بھر کر رہ

گئی تار یک خلی آسمان کی طرح وہ بھی اندر سے بالکل

خلی تھی جس کے اندر کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اگلی پچھلی

کتنی ہی بے چینیوں نے اسے گھیرا تھا وہ آہستہ سے

اپنے پیچھے ٹیس کا دروازہ بند کرتی اندر آئی۔ کمرے میں

بدل بدل کر نیند تو نہ آئی مگر اس کا ماضی دبے پادوں

دروازہ کھول کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

وہ نو سال کی تھی جب اس کے ابو کا ایک سہ ماہی

میں انتقال ہوا تھا۔ اس کی ماں روتی رہتی مگر داوی

خسک آنکھوں سے انہیں روٹا دیکھتی رہتیں وہ بھی ماں

کو روٹا دیکھ کر ان کے ساتھ آنسو بہاتی تھی اس کی ماں

زیادہ تر کمرے میں بند رہتی تب وہ عورت کے معنی

نہیں سمجھتی تھی مگر وہ داوی سے سوال کرتی تھی کہ اس

کی ماں اب اسے باہر لے کر کیوں نہیں جاتی اسے اپنا

باپ یاد آتا تھا وہ ان کے لیے اس بھی داوی نے اسے

خود سے قریب کر لیا تھا۔ وہ سبحان سے کھیلنے نیچے جاتی تو

چچی اسے عجیب نظروں سے گھورتی رہتیں یا ڈانٹ کر

وہاں سے بھاگ دیتیں وہ ان کے رویوں پر حیران ہوتی کہ

ابو کی زندگی میں تو چچی کا رویہ اچھا ہوتا تھا وہ اس کی امی

کے پاس اکثر اوپر ہی وقت گزارتی تھیں مگر اب نہ تو وہ

اوپر آتیں اور نہ ہی امی اور داوی نیچے جاتیں ان کے

درمیان عجیب سا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

”داوی سبحان مجھے اپنی سائیکل پہ نہیں بیٹھنے

دیتا۔“ اس نے منہ بسور کر شکایت لگائی۔

”نہیں بیٹھنے دیتا تو خواہش چھوڑ دو۔۔۔ روز روز کی

شکایت ختم کرو۔“ داوی نے خفگی سے ڈانٹ کر کہا اس

کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سچ کرتی داوی نے اس

کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو دیکھا پھر اسے اپنے پاس

بٹھالیا اور نرمی سے بولیں۔

”روتے ہوئے بچوں کے بابا ان سے ملنے نہیں

آتے نہ خواب میں نہ گھر میں۔“ اس نے جھٹ

سے آنسو پونچھ ڈالے ”ویسے بھی عشنا بڑول لوگوں

سے اچھی خوشبو نہیں آتی اور پھر سب ان سے دور

دور بیٹھتے ہیں“ داوی نے ناک سکوڑ کے اسے دور کیا وہ

میں داوی کو موجود نہ پا کر وہ باہر آتی تو پچھلے زینے کی سب سے اوپر والی سیڑھی پہ وہ اسے بیٹھا دیکھتی تھیں۔ داوی اسے جانتی تھی کہ ”جانے والے رات کے پچھلے پر تاروں پہ سفر کر کے آتے ہیں اور ملتے ہیں۔“ پھر وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھی بیٹھی سو جاتی وقت سر کتا رہا اب وہ گیارہ برس کی ہو چکی تھی اب وہ رویوں کو جانتے لگی تھی۔ عاصم تیار دو سرے شہر میں رہتے تھے کبھی کبھی ہی گھر آتے تو وہ بھی ان کے ساتھ کراچی جانے کی ضد کرتی وہ ہریار اعلیٰ دفعہ لے جانے کا وعدہ کر کے چلے جاتے۔ ایک دن وہ اسکول سے آئی تو داوی اور چچی کی لڑائی ہو رہی تھی۔ داوی کی دھیمی آواز تھی تو چچی کی آواز پورا محلہ سن رہا تھا عشنا پوری بات تو نہیں سمجھ سکی مگر اسے اتنا پتا ضرور چل گیا تھا کہ چچی کچھ اچھی گفتگو نہیں کر رہی تھیں۔ جس سے داوی کی دل آزاری ہو رہی تھی۔ اجمل چچا گھر میں بہت کم دکھائی دیتے، صبح سویرے جاتے اور رات گئے واپس آتے چھٹی والے دن وہ ان کے پورشن میں بھی آتے تھے عشنا سے بھی بہت محبت سے ملتے تھے۔ آج کل داوی ہر وقت عاصم تیار کی شادی کی باتیں کرتی سنا تھا کہ تیار کراچی میں شادی کرنا چاہتے تھے گھر کے اواس و سپاٹ ماحول تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا عاصم تیار بھی آئے ہوئے تھے اس دن جمعہ تھا اور وہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے تھے وہاں بم بلاسٹ ہوا تھا اور وہ بھی کافی لوگوں کے ساتھ بلے کے نیچے دب گئے تھے مگر زندہ بچ گئے وہ ماں کے ساتھ انہیں دیکھنے ہسپتال گئی تو اس کی چینی نکل گئیں تیار کا تمام وجود سفید پیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس نے سنا کہ ان کی ایک ٹانگ کھٹنے کے اوپر سے کلٹ دی گئی ہے ان دنوں گھر میں اواسی اور چپ نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے صرف چچی مسکرائی دکھائی دیتی داوی اور امی ہر وقت ہسپتال میں رہتی تھیں سو وہ رافعہ چچی کے رحم و کرم پہ تھی اس نے بارہ سال کی عمر میں ہی داوی کی نصیحتوں پہ عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ پندرہ سالہ سجان اب اس کا دھیان رکھنے لگا تھا روزانہ ناشتے کی ٹیبل پہ رافعہ اس کے لیے

اندھ بنانا بھول جاتی اور اگر بتائیں بھی تو جلا ہوا کبھی دودھ میں نمک ملا دیتیں کبھی جان بوجھ کر دودھ کا گلاس ٹیبل پہ گرا دیتیں مگر عشنا صبر کے ساتھ ہر بات سہ جاتی بھوک بھی برداشت کر لیتی۔ ان کی آنکھوں میں عشنا کے لیے نفرت ہوتی وہ اکیلی سونے کی عداوی نہیں تھی مگر اب وہ اکیلے سونے پہ مجبور تھی۔ ایک دن وہ نما رہی تھی کہ پانی ختم ہو گیا چچی نے کتنی ہی دیر بعد پانی کی موٹر چلائی تھی آنکھوں میں سیپو جانے کی وجہ سے اس کی آنکھیں کتنے ہی دن خراب رہی تھیں سجان کے لاکھ پونچھے پر بھی اس نے سچ نہیں بتایا تھا وہ آمنہ کی بیٹی کو رونا سسکتا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں مگر مجال ہے کہ ہر سختی کے بلو جو اس کی آنکھیں نم کبھی ہوتی ہوں۔ ایک دفعہ عشنا ان کو چائے پکڑانے لگی تو رافعہ نے جان بوجھ کر اس کے ہاتھ پہ گرا دی اس کی سکاری نکل گئی سجان جلدی سے برتل لے آیا مگر عشنا نے لگانے سے انکار کر دیا تھا اس کی یہ حرکت رافعہ کو حیران کر گئی تھی۔ دن میں کبھی آمنہ تو کبھی داوی ایک چکر ضرور لگاتی تھیں اور عشنا کا بچھا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ بہت کچھ سمجھ جاتی تھیں۔

تیار تین ماہ بعد گھر واپس آئے تھے تو عشنا نے سکھ کا سانس لیا وہ سوکھ کر بھاگتا ہوا چلے گئی تھی۔ داوی نے رافعہ کو خوب کھری کھری سنائی تھیں انہوں نے بھی اوجھار نہیں رکھا تھا۔ امی اکثر اسے تیار کے کمرے میں بٹھا کر جاتیں وہ خاموش خلاؤں میں تکتے رہتے تھے ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھن گئی تھی اور ان کی آنکھوں کی قدیلیں بچھ گئی تھیں ہاں البتہ کبھی کبھار عشنا کی طرف دیکھ کر مسکرا لیتے تھے۔ وہ اور سجان اکثر ان کے کمرے میں بیٹھ کر لڈو کھیل لیتے تھے ارمان اب کلج جانے لگا تھا وہ بالکل ماں کے اشاروں پہ چلتا تھا اور عشنا کو اہمیت نہیں دیتا تھا البتہ سجان کا رویہ ہمیشہ نرم ہوتا اور وہاں سے ارمان کی طرح نہیں دیتا تھا۔



وہ جاڑوں کی ایک سردرات تھی وہ داوی کے بستر

میں دہکی ہوئی تھی آمنہ۔ کمرے میں آئیں۔ وہ دونوں عشنا کو سوتا سمجھ رہی تھیں۔

”آمنہ میں تم پہ چند باتیں واضح کرنا چاہتی ہوں تاکہ تمہارے دل میں میرے لیے شکوک و شبہات نہ رہیں۔“ وہ جیسے لہجے میں بولیں۔

”امی ایسا مت کہیں میں آپ کے بارے میں ایسا ویسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ آمنہ نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامے۔

”میں ماضی پہ بڑی گرو جھاڑنے کی قائل نہیں مگر اب چھپانا ممکن نہیں رہا۔ شادی سے پہلے میں یونیورسٹی میں لیکچرار تھی وہیں ہمارے پروفیسر ہارون مجھ میں دلچسپی رکھتے تھے مگر میں ان کے بارے میں ایسا کچھ نہیں سوچتی تھی میرے لیے ایک بڑے زمیندار گرانے سے باسط کا رشتہ آیا میرے اہل ایانے چند میڈیوں کے اندر میری شادی طے کر دی باسط اچھا شوہر تھا مگر بہت رنگین مزاج تھا شروع کے سات آٹھ برس اچھے گزر گئے پھر وہ ایک ناپسندیدہ والی عورت کے چکروں میں پڑ گیا اور تب تک میں تین بیٹوں کی ماں بن چکی تھی اب اس نے پراپرٹی بیچنی شروع کر دی وہ گھر میں بہت کم آتا تھا میں نے اسے جائیداد فروخت کرنے سے روکا تو مجھ سے کالم گلوچ شروع کر دی ہمارے درمیان آئے دن جھگڑا ہونے لگا میرے بیٹے بڑے ہو رہے تھے میں نہیں چاہتی تھی کہ انہیں باپ کے کروتوں کی خبر ہو ایک دن میرے شوہر نے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا دوسرے دن میں اپنے بیٹوں کو لے کر لاہور اپنے باپ کے گھر چلی آئی تمام صورت حال جاننے کے بعد میرے ابا نے مجھے دوبارہ جا ب کرنے کا مشورہ دیا ہم ایک ٹل کلاس فیملی سے تھے میں اکلوتی تھی بوڑھے باپ پہ بوجھ بننے سے ہمت تھا کہ میں جا ب کرتی۔

ایک دن میں اسی یونیورسٹی میں جا ب کے لیے گئی جہاں میں پہلے لیکچرار تھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں پروفیسر ہارون اب پرنسپل کے عہدے پہ ہوں گے انہوں نے مجھے وہاں دوبارہ رکھ لیا شب و صبح اس طرح گزرنے لگے باسط نے ساری زمینیں بیچ

دی تھیں اور اب اس عورت کے گھر پہ رہ رہا تھا ایک دن اس کی طرف سے طلاق نامہ موصول ہوا میں شروع سے ہی ہر طرح کا مقابلہ کرنے کی ہمت اپنے اندر رکھتی تھی میں نے اپنے غم سے بڑھال ماں باپ کو بھی حوصلہ دیا اور اپنے بیٹوں کو اچھے تعلیمی اداروں میں داخل کر دیا تھا ہارون نے یونیورسٹی میں بھی مجھ سے میری گھریلو زندگی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا ایک دن ان کی بہن میرے لیے شادی کا پیغام لا میں میری والدہ نے سوچنے کا وقت مانگا میرے انکار پہ مجھے زہلے کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا مجھے سمجھایا کہ اپنے بیٹوں کے اچھے مستقبل کے لیے ہارون کا ہاتھ تھام لو ہارون کی ایک ہی بہن تھیں میں دوسری شادی نہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی مگر اپنے بچوں کے لیے مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا یوں میں ایک دن سادگی سے ہارون کی زندگی میں شامل ہو گئی۔

وہ بہت اچھے انسان تھے چند دن بعد وہ میرے بیٹوں کو بھی لے آئے پھر ہم دونوں نے اپنی مرضی سے یہ گھر بنوایا تھا قاصم کے لیے اوپر والا پورشن اور میرا اجمل کے لیے نیچے دو پورشن جو ایک ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ہارون ایک اچھی اور خوشحال فیملی سے تعلق رکھتے تھے شہر میں انہوں نے اپنی دکانیں بیچ کر وہ نیو مارٹ بنایا جو بہت جلد ترقی کر گیا انہوں نے وہ میرے تینوں بیٹوں کے نام کر دیا وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور میرے بیٹے جب جوان ہو گئے ہمیں اپنے باپ کی طرح کامزاج رکھتا تھا سو میں نے اس کے لیے تمہارا انتخاب کیا اجمل نے لڑکی پسند کرنے کا مرحلہ خود ہی طے کر لیا تھا جب میں رشتہ دیکھنے گئی تو مجھے رافعہ کے اطوار پسند نہیں آئے تھے بوڑھانہ نشی باپ اور دو بہنیں ایک پرانے سے گھر میں رہتے تھے یہ اجمل کے مارٹ پہ آتی جاتی تھی خاصی خوب صورت تھی پتا نہیں کس طرح اس نے اجمل کو پھانس لیا خیر ہارون کے سمجھانے پر میں رشتہ طے کر آئی تھی مگر شادی سے پہلے ہی ایک دن اچانک سینے میں اٹھنے والے درد نے انہیں آگلا سانس بھی لینے کی مہلت

نہیں دی میرے بیٹے ہارون کی بہت عزت کرتے تھے اور وہ ان سب سے محبت کرتے تھے پھر میں نے دونوں بیٹوں کی ایک ساتھ شادیاں کر دیں، عاصم جس سے شادی کرنا چاہتا تھا اس کی فیملی والے ابھی رضامند نہیں تھے وہ کاروبار کے بجائے جب کو ترجیح دیتا تھا اس لیے کراچی میں اچھی جا بلی تو وہیں مقیم ہو گیا اور پھر شادی کے بعد کی تمام صورت حال تمہارے سامنے ہے۔ ”داوی نے اپنی کہانی ختم کر کے عشنا کے منہ سے لحاف ہٹا کر دیکھا وہ گہری نیند میں سوتی بن گئی۔ تو انہوں نے اطمینان سے گہرا سانس لیا۔

”آمنہ تم بہت خوب صورت تھیں میں جانتی تھی منیر حسن پرست ہے اس لیے میں نے تمہیں چنا تھا مگر میں یہ نہیں جانتی تھی کہ تم حد سے زیادہ سادہ دل اور سادہ نظر ہو، منیر منیر بھی بہت خیر و اور وجہ تھاجہاں سے گزرتا تھا لوگ رک رک کے دیکھتے تھے شادی کے دوسرے دن ہی اسے دیکھ کے جو چمک رافحہ کی آنکھوں میں اتری تھی اس نے مجھے چونکا دیا تھا اور پھر میں وقتاً فوقتاً ”بہیں رافحہ کی طرف سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرتی رہتی تھی مگر میرے اشاروں کنایوں کو تم جان ہی نہ سکتیں۔“ داوی کالجہ دکھ کی انتہا کو چھو رہا تھا گرم لحاف کے اندر بھی عشنا کا جسم سرور پڑ چکا تھا جیسے وہ پتھر بن گئی تھی۔

”ای وہ بہت ہوشیار ہے میں سمجھتی رہی وہ میری محبت میں اوپر کے چکر لگاتی ہے اور منیر مجھوں کا دیوانہ ہے اس لیے مجھے گھسارتا تھا۔“ آمنہ کرجی کرجی ہو کر بول رہی تھیں۔

”کیسا شب خون مارا تھا اس عورت نے کہ ہم لٹ گئے بریاد ہو گئے۔“ داوی دہائیاں دے رہی تھیں۔

میرا اجمل سدا کا سیدھا کبھی کبھی سمجھ ہی نہ پایا کہ اس کی ناک تلے کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

”ایک بات تو جانتی ہیں امی! رافحہ کو کیسے پتا چلا کہ سر ہارون اور آپ شادی سے پہلے ایک ہی یونیورسٹی میں تھے۔“ آمنہ کے لہجے میں جھجک تھی۔

”یہ اتفاقاً“ کچھ عرصہ قبل اپنی کسی دوست کے

ساتھ ہارون کے گھر گئی تھی تو ہارون کی بہن نے باتوں باتوں میں بتا دیا کہ میرا بھائی اس وجہ سے شادی میں تاخیر کرتا رہا اس بات کا اسے اپنی شادی کے بعد پتا چلا تھا۔“ داوی تلخ و ترش لہجے میں بولیں ”کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے عیبوں پہ پردہ رکھنے کے لیے کسی پہ کچھڑ اچھالنا شروع کر دیتے ہیں انہیں ڈر رہتا ہے ہم سے اس لیے حفاظتی بند باندھ لیتی ہے میں ڈرتی ہوں کہ میرے پوتے بل نہ جائیں ورنہ ایسی عورت کو میں ایک منٹ بھی گھر میں برداشت نہ کرتی۔“ داوی کالجہ دکھ سے سننا رہا تھا ”مگر خدا نے بھرم رکھ لیا اگر اس دن میں اسے شافحہ سے باتیں کرتے سن نہ لیتی تو سوچو کیا قیامت گزرتی، ہم پہ پھر لوگ میرے منہ پہ تھوکتے کہ سلطانہ جہاں کا بیٹا بھلا جو کبھی لے گیا۔“ آخری بات انہوں نے نہایت دھیمی آواز میں کی تھی کہ عشنا بمشکل کان لگا کے سن پائی وہ دکھ کے باوجود رو بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی کوئی بھگی پہ عیاں نہ کر دے کہ وہ جاگ رہی ہے۔

”سوچتی ہوں تو کالجہ منہ کو آتا ہے جب رافحہ بھاگنے کے بعد اجمل سے یہ کہہ کر طلاق کا مطالبہ کرتی کہ منیر اور میں شادی کر رہے ہیں، میرے معصوم بچے کا تول ہی بند ہو جاتا۔“ آمنہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو رواں تھے۔

”ڈائن میرے بچے کو کھا گئی۔ مگر قدرت نے اسے بھائی کی عزت پہ ہاتھ صاف کرنے کی سزا بھی تو دینی تھی، مجھے میری تربیت میری ممتا کو سرخرو بھی کرنا تھا، ہارون سے شادی کے فیصلے پر شکرانے کے نفل پڑھتی تھی کہ میرے بیٹوں کو اچھا ٹھکانہ اور بہترین مستقبل مل گیا اور منیر کے جانے کے بعد شکرانے کے نفل پڑھتی ہوں کہ پتا نہیں میری کس نیکی کے عوض اللہ نے ہماری عزت رکھ لی۔“ آمنہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

”رونا کمزوری کی علامت ہے اور کمزور لوگ اللہ کو پسند نہیں، آمنہ بہادر بنو۔“ داوی کی آواز میں لوہے جیسی کٹ تھی۔ ٹھہراؤ تھا۔

”اجل آج تک یہی سمجھتا رہا کہ اس دن رافعہ کے ساتھ میکے جارہی تھی مگر عاصم کو کچھ شک تھا وہ آٹا تلو بھائی بھائی کے رنگ ڈھنگ سے کھکتے تھے پوچھتا تھا مجھ سے کہ اہل کوئی گڑبڑ ضرور ہے میرا ہون بیٹا کیسے معذور ہو کر پلنگ سے لگ گیا ہے اللہ میرے دل کو صبر و قرار سے نوازے۔“ وہ اندر سے لڑ چکی تھیں مگر ان کے چہرے پہ بردباری اور چٹانوں کی سختی تھی، داوی کی شخصیت شانت و وقار کا مالا جلا اجزاج تھی، آمنہ ان جیسی کبھی نہیں بن سکتی تھیں مگر عشنا میں سارے گن ان ہی جیسے تھے نہ بات آنے کے لیے طمانیت کا باعث تھی۔

”آمنہ۔۔“ کچھ لمحوں بعد داوی نے پکارا۔ ”اس سے پہلے کہ رافعہ کوئی بڑی تہمت لگا کر تہیں اور عشنا کو بے دخل کرے تم خود کو عاصم کے نکاح کے لیے رضامند کر لو۔ کیونکہ میں اندر سے کھوکھلے درخت کی طرح ہو چکی ہوں نہ جانے کب گر جاؤں۔“

”جی۔۔“ آمنہ کے سر پہ جیسے پہاڑ ٹوٹا تھا وہ گنگ سی انہیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔

”میں عاصم سے بات کروں گی اسے متالوں گی تم خود کو ذہنی طور پر تیار کرو۔“

”عاصم کے لئے خواب ہیں انی۔“ آمنہ مرے مرے لہجے میں روہا گئی ہو کر کہیں۔

”اس کے خواب ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکے ہیں وہ لڑکی ایک معذور کا ہاتھ نہیں تھامے گی۔ بیٹا میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور عشنا بچی ہے عاصم کی ذمہ داری صرف تم اٹھا سکتی ہو مگر ایک محرم رشتے میں اور آمنہ اس کام کا اجر تمہیں اللہ روز قیامت ضرور دے گا۔“ داوی نے ان کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

”اب جاؤ سو جاؤ رات بیت چکی ہے۔“ اور ان دو عورتوں کے ساتھ وہ رات عشنا نے بھی آنکھوں میں کھلی تھی۔

پتا نہیں داوی نے تیا کو کیسے راضی کیا تھا اور آمنہ نے خود کو کیسے منایا تھا یہ تو اللہ جانتا تھا اجمل سے مشورہ کرنے کے بعد ایک انتہائی سرد کمر سے بھری شام

کو آمنہ کا نکاح عاصم سے کر دیا گیا اور عشنا کی خشک آنکھیں خشک ترین ہو گئی تھیں اب وہ اور داوی ایک دوسرے کی دوست ہم راز اور ہم زبیاں بن چکی تھیں۔ اسے داوی کی تمام باتیں ازبہر تھیں انہوں نے اسے کوٹ کوٹ کر مضبوط سکھ بنا دیا تھا عشنا نے ماں اور باپ دونوں کا رنگ و روپ چرایا تھا وہ بلاشبہ حسین تھی اسماٹ تھی ایک آہنی دیوار کی مانند تھی، داوی کہتی تھیں۔

”رافعہ کے ہوتے اس گھر میں کوئی بندہ خوش نہیں رہ سکتا وہ صرف دکھ اور آنسو بنا جاتی ہے۔“ عشنا پندرہ سال کی تھی جب داوی اسے داگی جدائی دے گئیں وہ زار و قطار رو رہی تھی جب رافعہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

”بس کرو عشنا آنسو سنبھال لو آمنہ کے لیے۔“ وہ مسکرا رہی تھیں۔ ”بھی تمہیں بہت رونا ہے۔“ رافعہ کی آنکھیں ہنس رہی تھیں عشنا کے آنسو رگ گئے اور وہ حیرت سے ان کا منہ تک رہی تھی۔ عشنا نے اس عورت کے سامنے نہ رونے کی قسم کھالی مجھے اس سے جیتنا ہے زندگی کے ہر موڑ پہ اور پھر اس نے رافعہ کی ہر اوچھی حرکت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔

سبحان اور وہ شعور کی عمر میں آئے تو عشنا نے محسوس کیا وہ اسے بہت دھیان اور توجہ سے دیکھتا ہے اس کی بے چینی پہ بے چین ہوتا ہے اس کی ہر ضرورت پوری کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے وہ دونوں اکتھے بیٹھے ہوتے تو رافعہ کی نظروں کے حصار میں رہتے وہ بیٹے کی پسند سے واقف ہو چکی تھیں وہ اکثر ان کے پورشن میں گھسارتا تھا عشنا اسے کھل کے روکتی بھی نہیں تھی ایک دن وہ تیا کے لیے پانی لینے ان کے پکن میں آئی تو رافعہ نے اسے سبحان سے دور رہنے کی تنبیہ کی، کچھ عرصہ بعد عشنا نے اسے اوپر آنے سے منع کر دیا تھا ان دونوں وہ تھروڈ ایئر میں تھی سبحان کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھ گیا تھا وہ اپنی ماں اور عشنا کے بیچ تعلقات استوار نہ کر سکا، وقت گزرنے کے ساتھ وہ اسے مکمل نظر انداز کرنے

گئی تھی اور وہ اب بے باکی سے اپنے جذبوں کا اظہار کرنے لگا تھا۔

ارمان کی شادی کے بعد عشنا اور رافعہ کی اکثر جھڑپ ہو جاتی تھی پہلے ان دونوں کے درمیان کھنچاؤ رہتا تھا آمنہ رافعہ سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھیں بیٹوں کے جوان ہونے پر اجمل نے بھی فرصت کا منہ دیکھا تھا سبحان کو تیا سے دلی لگاؤ تھا وہ ان کے ساتھ وقت گزار کر خوش رہتا تھا وہ فرصت نکال کر روز ان کو وقت دیتا تھا جبکہ ارمان باپ کی طرح بالکل سرد مزاج رکھتا تھا وہ ماں سے ہمیشہ دب کر رہتا تھا اور بیوی کے معاملے میں بھی ماں کی حمایت کرتا تھا عشنا سے سخت ناپسند کرتی تھی ارمان بھی اس کے سامنے مطمئن نہیں رہتا تھا اس لیے عشنا سے اس کا سامنا کم ہی ہوتا۔ اتنا رافعہ کے عتاب کا نشانہ بنی رہتی پتا نہیں وہ کن کن دکھوں کے حساب اس سے لیتی تھیں وہ اتنی چیخ چلا کر عشنا کو باور کراتی تھیں کہ میری بہو بننے کے خواب دیکھنا چھوڑ دو ورنہ تمہارا حشر اس سے بھی برا ہوگا عشنا اگر سبحان سے شادی کی ہاں بھر لیتی تو وہ اسے الگ گھر میں بھی رکھ سکتا تھا مگر اسے رافعہ سے کوئی بھی رشتہ روار کھینا گوارا نہیں تھا وہ اس کے باپ کو ہرکا کر گناہ گار کر گئی تھیں۔

الماری میں رکھ کر پٹی تب ہی ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر وہ دندنا ہوا اندر آیا۔ وہ ایک عرصے بعد اس کے کمرے میں آیا تھا۔ امی اور طیبہ کی ماں زیور خریدنے گئی ہوئی تھیں وہ اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ عشنا نے کم صم انداز میں اس کے چار حانہ تیور دیکھے۔

”میں نے کہا تھا تاکہ تم کسی سے بھی شادی نہیں کرو گی۔“ وہ انگشت شہادت اٹھا کر بولا۔ ”پھر ان لوگوں کو صاف انکار کیوں نہیں کیا گیا۔“ اس کا پتا ہوا لہجہ بلند تر تھا۔

”آہستہ بولو۔“ عشنا کے وحیے لہجے نے بھی چنگاریاں چھوڑیں۔

”پہلے مجھے جواب دو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ناگواری سے بولا۔

”میں نہیں جانتی تیا ابو سے پوچھو۔“ وہ روہا سی ہو کر رخ موڑ گئی اور یونہی الماری میں سرگسارایا۔

”عشنا۔“ سبحان نے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

”پہلے مجھے مر لینے دو پھر اپنا نام کسی اور کے ساتھ جوڑنا۔“ وہ ہونٹ چباتا ہوا ہنوز درشت لہجے میں بولا۔

”چلو پھریوں کرتے ہیں۔ پہلے تم شادی کر لو بعد میں میری باری آئے گی۔“ وہ کندھے اچکا کر پرسکون انداز میں بولی۔

”نہ میں نہ تم۔“ وہ عشنا کی پیشانی کے بیچ انگلی لگا کر وارن کرتی نظروں سے اسے دیکھ کر بالکل سرد ساٹ اور ہلکی آواز میں بولا۔

”سبحان تم پی کر تو نہیں آئے؟“ عشنا نے اس کی انگلی پکڑ کر حد درجہ ناراضی و بے اعتباری سے اسے دیکھا۔ وہ کئی ثانیے اسے دیکھتا ہی رہا۔ وہ یہ چہرہ رک کر ٹھہر کر سالوں بلکہ صدیوں یونہی کھڑا کھڑا دیکھ سکتا تھا۔ جس ہاتھ میں عشنا نے اس کی انگلی کو پکڑ رکھا تھا اس نے وہ ہاتھ بید روی سے کھینچ کر اپنے سینے پر رکھا۔

”کل سے میرے دل نے میرے سینے کے اندر وہ

وہ ٹریننگ سے لوٹی تو طیبہ کی شادی کی ڈسٹ لکس ہو چکی تھی سو تیا کے پاس بیٹھنے کا بھی کم کم موقع ملتا تھا۔ وہ اور طیبہ تمام دن بازاروں کے چکر کاٹی تھیں۔ دو سرے دن بناتائے طیبہ کی خالہ باقاعدہ رشتہ لے کر آگئیں تیا نے سوچنے کے لیے کچھ دنوں کی مہلت مانگی۔ اس معاملے میں عشنا نے کھل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اب سبحان سے سامنا کرنے سے گتراتی تھی۔

تھی۔ وہ ہتے سے اکھڑ جاتا تھا یا پھر شادی سے اترنے لگتا تھا۔ اب جلد ہی اس کی پوسٹنگ ہونے والی تھی۔ اس کا ارادہ تیا ابو اور امی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کا تھا۔ طیبہ کی ہندی میں وہ دن رہ گئے تھے۔ وہ کپڑوں کو

طوفان برپا کر رکھا ہے کہ ایک پل کا سکون بھی نہیں لینے دیا یا تو اس پر پونزل سے انکار کر دیا پھر میرے دل سے کہو وہ دھڑکننا بھول جائے۔ اس کے چہرے پہ سینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ وہ ابھی ہوتی سانسوں سے دل کو سنبھالنے میں حد درجہ ناکام ہو رہا تھا۔

”جب تم مجھے میرے حوالے کر چکے ہو تو خدا کے لیے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر منت آمیز لہجے میں بے بسی کی چادر اوڑھ کر بولی تھی۔

”تم میرے ساتھ اتنا ظلم کیسے کر سکتی ہو۔ تم میرے سامنے کسی دوسرے شخص کے ساتھ چلی جاؤ گی۔ میرے ہوتے ہوئے میرے سامنے۔“ وہ اپنے لفظوں کو بار بار دہرا رہا تھا وہ بے یقینی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

”اف میرے اللہ۔“ عشنا نے گہرا سانس لیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے سامنے نہیں بلکہ کسی دوسرے شہر میں جا کر شادی کر لوں گی۔“ اب وہ حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا جیسے عشنا کے اندر سے کسی اور کی آواز آرہی ہو۔ اس کے چہرے پہ تغیر تھا اس کی آنکھیں دھواں دھواں سی ہو رہی تھیں اس کے ہونٹ بالکل سیاہ پڑ چکے تھے۔ عشنا کو لگا وہ ابھی اس کے سامنے گر جائے گا اسے کچھ ہو جائے گا۔

”سبحان! عشنا نے اس کے ہاتھ پکڑے۔ اس نے ایک لمحے میں چھڑا لیے۔ عشنا نے اس کے کندھے کو چھوا۔ سبحان نے اس کا ہاتھ نخوت سے جھٹک دیا۔

”میں تمہیں بددعا دیتا ہوں عشنا منیر کہ پوری دنیا میں تمہیں میرا چہرہ کبھی نظر نہ آئے۔“ ان الفاظ سے اس کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ”اور تم یہ چہرہ دیکھنے کے لیے تا عمر ترسو۔“ اب وہ پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ عشنا کا رنگ فق ہو گیا۔ کیا تھا جو اس لمحے عزرا نیل ہاتھ سے

کھینچ کر صبح نکال لیتا اور یہ جسم خالی رہ جاتا۔ کیا تھا جو اسرا نیل صورت پھونک دیتا عشنا کے دل سے وظائف

کی طرح دعا جاری تھی۔ وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر چلا گیا تھا اور وہ اپنے پیروں پہ کھڑی نہیں رہ سکی تھی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے کے مرغولے سے بن رہے تھے۔ دوسرے ہی پل وہ زمین بوس ہو چکی تھی۔

داہری اسے آوازس دے رہی تھی۔ کہیں گرواڑ رہی تھی کہیں لوگ گراہ رہے تھے وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر چیخ چیخ کر رہی تھی۔

”عشنا! اٹھو عشنا۔“ طیبہ نے اسے جھنجھوڑ کر اس کے چہرے پہ پانی کے چھپاکے مارے تھے۔

”اسے کہو اپنی بددعا واپس لے لے اسے کہو۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے طیبہ کو دیکھا طیبہ نے اس کے ہونٹوں سے پانی کا گلاس لگایا۔

”اسے کہو اپنی بددعا واپس لے۔“

”خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔“ طیبہ نے پورا گلاس اس کے چہرے پر الٹ دیا۔ اسے ہوش آ رہا تھا وہ لمحہ بہ لمحہ حواسوں میں آنے لگی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ طیبہ نے اسے تھام کر بیٹھنے

پٹھایا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ محض اتنا ہی بول پائی۔

”میں آئی تو تم نے ہوش نہیں۔“

”طیبہ تم اپنی خالہ کو انکار کر دو۔“

”ہیں۔“ طیبہ کے چہرہ طبع روشن ہوئے۔

”تین دنوں بعد میری شادی ہے۔“ اس نے سٹیٹا کے عشنا کو دیکھا۔

”بے وقوف! میں اپنی بات کر رہی ہوں۔“ وہ پشیمون سی مسکرائی۔

”کیوں؟“ طیبہ سنجیدہ ہوئی۔

فی الحال کچھ عرصہ تک میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ طیبہ نے اسے غور سے دیکھا۔

”طیبہ! چلو راوی کنارے چلتے ہیں۔“ وہ کسی اور

ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ ”میں سارے لاہور کا

پانی پی چکی ہوں پھر بھی میرا حلق تر نہیں ہوتا۔“ طیبہ نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

”ٹھیک ہے میں گھر جا کر فون کروں گی۔ تم پریشان مت ہو۔“ طیبہ نے اسے تسلی دی ہمیں تمہیں بلاوا دینے آئی تھی۔ ابو بھی آئی ہوئی ہے۔ آج سب نے ڈھونڈ لی رکھی ہے آؤ گی نا؟“

”کل آؤں گی۔ وہ آہستگی سے بولی طیبہ نے سر ہلا دیا۔“

”او عشنا“ تایا ابو کے کمرے میں چلیں پتا نہیں پھر یہ فرصتیں کب نصیب ہوں۔“ طیبہ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ تو وہ اس کے ساتھ کھینچی چلی گئی۔ تایا نے ان دونوں کے افسردہ چہروں کو غور سے دیکھا۔

”اچی اداس کیوں ہو دونوں عشاوی تو خوشی کا نام ہے۔ ہم تو ہنس ہنس کے قربان ہوئے تھے۔“ تایا نے انہیں ہنسانا چاہا۔

”اگر قسمت میں ہوا تو دونوں اکٹھی ہی رہو گی انشاء اللہ۔“ انہوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”یہ جدائی“ پھڑپھڑاتا اور پھر اس دکھ پہ ماتم کناں ہوتا یہ سب ذہنی خرافات ہیں۔ سر پہ سوار کر لیتے ہیں ہم ہر سوچ ہر جذبہ بھٹی! سب کچھ جھٹک دو ہر جذبے پہ خوشی اور سکون کو حاوی رکھو۔ خدا کی رضا یہ خوش اپنے کے گئے فیصلوں پہ خوش دل کے اندر چھٹی محبت پہ خوش، محبوب کی جدائی پہ خوش تو بس غم بھاگ جائیں گے۔“ انہوں نے کچھ ایسے منہ بنایا کہ وہ دونوں کھکھلا دیں۔

”اب جاؤ شہباز! خوب اچھے گیت گانا۔“ تایا نے عشنا کے کندھے کو پیار سے تھپکا۔ وہ طیبہ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

”ہاں چلو! آج دکھ پہ مطلب دکھ کے لیے خوشی منائیں۔“ تایا نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر ہونٹ بھینچ کر سر جھکا لیا۔ ان کے لبوں سے بے ساختہ آہ برآمد ہوئی تھی۔

کچھ چھوڑ دیتے ہیں۔۔۔ کچھ چھوڑ جاتے ہیں محبت

نہیں چھوڑتی اندر موجود رہتی ہے۔

آج وہ طیبہ کی مہندی پہ دل سے تیار ہونا چاہتی تھی۔ وہ دکھ کے ہر احساس سے عاری ہونا چاہتی تھی۔ دین میں اس نے اچھی نیند لی تھی۔ اب وہ بالکل فریش تھی۔ اس نے ایک عرصے بعد دل جمعی سے میک اپ کیا۔ پھر سرخ و سبز امتزاج لیے بڑا نفیس سا سوٹ پہنا ساتھ میچنگ جیولری آج اس کی سرخ و سفید رنگت خوب دکھ رہی تھی۔ وہ ماں سے اجازت لے کر لاؤنج کے راستے ہی باہر آئی۔ اندر بیٹھی رافعہ نے اس کا سنہرا رنگ و روپ مل کھائی ناگن کی طرح دیکھا۔ عشنا نے ان کی طرف خوب صورت سی مسکراہٹ اچھالی تھی۔ وہ گیٹ کے پاس پہنچی تو سبحان اندر آ رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا دونوں ہی نظر نہیں چرپائے۔

”تم ولی اللہ نہیں ہو کہ تمہاری دعائیں قبول ہوں۔“ عشنا لبوں پہ شرارت سجا کر بڑے جتانے والے لہجے میں بولی۔ اس نے کترا کے لکھنا چاہا تو عشنا نے کلائی تھام لی۔

”کر دیا ہے انکار غواپ خوش ہو جاؤ آؤ میرے ساتھ! آج دل سے نہیں گئے دل سے دیکھیں گے۔“ عشنا کے ہاتھ میں اس کی کلائی تھی۔ اس کا سرخ باہر کی جانب تھا سبحان کا اندر کی جانب تھا اس نے واپسی کے لیے قدم پیچھے کئے وہ مسکرا دی۔ وہ یونہی اس کی کلائی تھامے طیبہ کے گھر تک پہنچی۔

”آگے بڑھو۔“ وہ اس سے دو قدم آگے تھا سبحان نے اسے جی بھر کے دیکھا اور اس نے یہ موقع فراہم کیا تھا۔ وہ ہنسا بھی مسکرایا بھی کھکھلایا بھی۔ وہ ڈھیر ساری خوشیاں اپنے دامن میں اکٹھی کیے رات تا دیر لوٹے لان میں پہنچے تو وہ بیچ میں رک گئی۔

”تایا ابو کہتے ہیں کچھ چھوڑ دیتے ہیں کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ محبت رہ جاتی ہے وہ کہیں نہیں جانی پھر دکھ کیسا؟“ میں چھوڑ جانی ہوں۔۔۔ تم مجھے چھوڑ دو محبت رہے گی۔“ اس نے اس کے دل پہ ہاتھ رکھا

”یہاں بھی پھر۔ ہاتھ اپنے دل پہ رکھا اور ماں بھی“

Downloaded From
Paksociety.com

تاریخ صدیقہ

کامیاب و عمدت

نظر سامنے پڑے ”میگزین“ پر حتمی ہائے یہ پڑھنے کا
شوق۔ اس نے یونہی میگزین اٹھایا تو صفحہ نمبر 30
کھل گیا۔
”اپنے پر اہل مز اپنے شوہر کے ساتھ شہر کیجئے“

خواہ انہوں نے مارا میر کو خواہ آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو
کا جسم شدید دکھ رہا تھا اور سر تو جیسے پھٹنے کو تھا۔
پہلے گھرے میں آکر صوفے پہ ڈھے سی گئی۔ اس کی

ماہنامہ شعاع مارچ 2016 117

ساری زندگی نتیجے سننے تھے ایک فائل جسے اس نے لاکر میں نہ رکھا تھا وہ کھولی۔ وہ اس کی سی وی تھی۔ لیکن ربنے کے لیے اس نے اپلائی کرنا تھا۔ پڑھانا اس کا دیرینہ خواب تھا۔ مگر احر نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے جا ب کرنے والی نہیں بلکہ گھریلو بیوی چاہیے۔

اس نے اپنی وہ سی وی اٹھائی اور اسے دو تین حصوں میں تقسیم کر کے کچر اوان میں ڈال دیا۔ اسے اب یہاں اپنا آپ منوانا تھا۔ بھی نہ ختم ہونے والے کاموں کو نہایت خوش اسلوبی سے پٹاتے ہوئے خندہ پیشانی سے سب کچھ سہتے ہوئے۔

اندر دل بولا کہ میرا کیا؟ میرے خواب، میرے ارمان!

دماغ نے بھی دلی دلی سی آواز میں دل کی حمایت کرنی چاہی، مگر مصلحت کے تحت چپ ہو گیا اور اس کے بعد بیچہ نے جیسے اپنے دل کو ہمیشہ کے لیے چپ کر دیا تھا۔ اسے سمجھا دیا تھا کہ آج سے تمہارا کام صرف خون چپ کرنا ہے جب تک زندگی ہے دھڑکتے جاؤ اور اپنا کام کرتے جاؤ اور میرے رستے سے ہٹ جاؤ۔



صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے
لاؤنج میں حسب معمول چل پھل تھی۔ بیچہ کچن میں کام کر رہی تھی۔ آج رات کو فرزانہ آنے اپنے سرال واپس چلے جانا تھا تو اسی لیے سب جہنیں آئی ہوئی تھیں۔

فرزانہ آپا کے چار بچے تھے۔ وہ بیچہ سے عمر میں کافی بڑی تھیں، مگر بیچہ کی شادی سے صرف ایک سال پہلے بیاہی گئی تھیں تو چاروں بچوں کی دفعہ ان کا بڑا آپریشن ہوا۔ فرزانہ آپا ہرنچے کی پیدائش سے ایک دو ماہ پہلے ہی بھائی کے گھر آجائیں اور پھر بچوں کے پیدا ہونے کے چالیس دن بعد ہی سرال جا آئیں۔ گھر کے سب کام بیچہ ہی کرتی۔

READING
Section

اپنا تو اس کا ایک ہی آٹھ سالہ اکلوتا بیٹا تھا۔ بیچہ کی شادی کو اب دس سال ہو چکے تھے اس کا بچہ بہت ہی پیارا اور بیبا تھا۔ ماں کو ہر دم کاموں میں مصروف دیکھتا رہتا جس کے پاس اپنے لیے تو کیا اپنے اکلوتے بیٹے کو دینے کے لیے چند منٹ نہیں ہوتے تھے وہ ضد نہیں کرتا تھا، مگر چاہتا تھا کہ ماں اسے وقت دے۔ بیچہ خود ایم ایس سی نفسیات تھی۔ سمجھتی تھی اپنے بیٹے کی نفسیات کو، مگر کیا کیا جاسکتا تھا۔ وہ ایک بھرے پرے خاندان کی بہو تھی۔ کام تھے کہ سارا سارا دن ختم ہونے میں نہیں آتے تھے احر سے تو کچھ بھی کہنا فضول تھا۔ وہ بڑے آرام سے کہتا کہ ”میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں تم جانو اور تمہاری گھرواری۔“

لاؤنج سے کچن تک آوازیں با آسانی سنائی دے رہی تھیں۔ بیچہ تیز تیز ہاتھ چلا رہی تھی تب ہی چھوٹی اپنے روتے چیختے بیٹے کو اٹھائے کچن میں چلی آئی۔ چھوٹی بھی اپنے بچے کی پیدائش کے دنوں میں بیچہ کے گھر پہ ہی رکی ہوئی تھی تاکہ آسانی رہے۔

لاؤنج میں اس وقت ”چھوٹی“ کے پسندیدہ موضوع یہ بات ہو رہی تھی اور یہ بد تمیز شایان روئے جا رہا تھا۔ ”بیچہ! پلیز شایان کو پکڑنا زرا۔ مجھ سے چپ نہیں ہو رہا۔“ چھوٹی نے لاڈ بھرے انداز سے کہا۔ بیچہ نے شایان کو گود میں اٹھایا۔ اسے کینٹ سے ٹافیاں نکال کر دیں۔ وہ چپ ہو گیا۔

”تم کیسے سب کچھ سنبھال لیتی ہو بیچہ! میرا تو اتنا اسٹیجنا نہیں ہے بھئی۔“ چھوٹی نے ستائشی انداز میں اسے دیکھا۔ پھر اس نے دو سالہ شایان کی طرف دیکھ کر اس سے پوچھا۔ ”شایان کی سب سے اچھی والی آنٹی کون سی ہے؟“ ”مایا آنٹی“ اس نے بیچہ کی طرف اشارہ کیا جو اسے اسٹول پہ بٹھا کر اب ساتھ ساتھ کام کر رہی تھی۔

”اچھا تو پھر آپ ادھر اپنی آنٹی کے ساتھ ساتھ کھیلو، مزے مزے کی باتیں کرو، اوکے! مجھے تنگ نہیں کرنا اب۔“ پھر بیچہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”بیچہ! پلیز اسے

کچھ کھلا پلا دو۔ صبح سے اس نے کچھ بھی صبح سے نہیں کھایا اسی لیے شاید بار بار ضد کیے جا رہا ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ اب یلیجہ کیا کہتی بھلا۔

چھوٹی بے فکر ہو گئی۔ شایان کا گل تھپتھا کر لاؤنج میں چلی گئی جہاں سب بہنیں جمع تھیں۔

وہ سب اکٹھی ہوتی تھیں تو اپنے بچوں کو بھی فراموش کر دیتیں۔ اس وقت گھر بالکل مچھلی بازار کا سا منظر پیش کر رہا تھا۔ بچے پورے گھر میں دندناتے پھر رہے تھے۔ یلیجہ کو کھانے پکانے کی فکر کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں کو بھی روکنا پڑ رہا تھا۔ پچکار پچکار کر اس کے جڑے دکھنے لگے۔ کیوں کہ آخر کو اس کا گھر تھا تو اسے ہی فکر ہونا تھی۔ لاؤنج میں ”غیبتیں“ ہو رہی تھیں۔ پورے زور و شور سے موضوع گفتگو کبھی تازو بھا بھی تو کبھی شہینا بھا بھی۔ پھر اپنے اپنے سرال کے دکھڑے رونے لگ جاتیں۔

وہ سب الگ الگ گھروں میں رہتی تھیں۔ صرف چھوٹی ہی ابھی تک سرال کے ساتھ تھی۔ کیوں کہ اس کا شوہر تمیز اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ سو وہ اسے الگ نہیں کر سکتے تھے تو چھوٹی سب سے زیادہ مظلوم بنی ہوئی تھی۔ اسے نت نئے مشوروں سے نوازا جاتا۔ اکلوتے ہونے کے نقصانات یہ سیر حاصل بصرے ہوتے۔ رہی بات یلیجہ کی، تو اس نے جو نفسیات میں ماسٹرز کیا تھا تو وہ ان سب کی نفسیات سمجھنے سے قاصر تھی اس کی بے پناہ ذہانت اور قابلیت جس سے احمد اور اس کے تمام گھروالے متاثر تھے وہ تو کب کا قصہ پارینہ بن چکی تھی۔



وقت گزرنا رہا

رساں تھی سی تھی

تسکرار ہے تھے ہم

پر آنکھوں میں کچھ نمی سی تھی

ساتھ ہمارے یہ جہاں تھا سارا

گھر ہر طرف کچھ نمی سی تھی

شام کی چائے پی جا رہی تھی۔ احمد نے فرمائش کر کے چپس اور پالک کے پکوڑے بنوائے تھے جو اسے بہت پسند تھے۔

آٹھ سالہ اکلوتے لاڈلے بیٹے سفیان کو یلیجہ نے نوڈلز بنا کر دیے تھے۔ اور اب وہ اسے انگلش کا سبق یاد کروا رہی تھی۔

”ہفتہ ہو گیا ہے، چھوٹی نے چکر نہیں لگایا۔“ احمد نے یلیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی وقت اس کا فون بجا۔ احمد نے فون اٹھلایا۔ تو اسی کا فون تھا۔ چھوٹی بولی۔

”بھائی! ہم سب بہنوں نے پروگرام بنایا ہے کہ یہ ویک اینڈ ماں ابا کے گھر مطلب آپ کے گھر گزارا جائے۔ آج شام کو آرہے ہیں ہم سب مل کے۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولتی گئی۔ وہ مسکراتا ہوا سر ملاتا رہا۔

چھوٹی کی گفتگو میں دوسرے بندے کو صرف ہوں ہاں کرنے کا مورچہ بھی بمشکل ملتا تھا۔

”اور ہاں احمد بھائی، وہ دراصل... میری دو مندریں بھی ساتھ آرہی ہیں۔ انہوں نے یلیجہ بھا بھی کے ہاتھ کی مٹن بریانی اور شامی کباب کھانے کی فرمائش کی ہے۔ اچھوٹی... وہ... میں بہت تعریف کرتی تھی نا بھا بھی کے ہاتھ کے کھانوں کی تو انہوں نے بھی میرے ساتھ آنے کو کہا ہے۔ آخر انہیں بھی تو پتا چلے کہ ہماری بھا بھی کیا چیز ہیں۔“ اسپیکر آن تھا۔ یلیجہ بھی سن رہی تھی۔ احمد اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر بولا۔

”ہم ابھی تمہیں ہی یاد کر رہے تھے تم لوگوں کا اپنا گھر ہے یوں فون پہ پہلے پوچھنے، بتانے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ جب چاہے آؤ۔“

وہ بدستور یلیجہ کی طرف ہی دیکھتے مسکرا کر بولا۔ وہ

بھی جواباً ”پھیکا سا مسکرا کر شام کے کھانے کی تیاری کرنے کے لیے کچن میں آگئی۔ فون پر بتانے کی ضرورت اس لیے ہے کہ فرمائشیں پہنچائی جاسکیں۔

دو گھنٹے بعد وہ سب اکٹھے ہو گئے۔ گھر پہ خوب رونق

ہی کو بہتر سمجھا۔
 سب کچھ ہمیشہ کی طرح اس نے خوش اسلوبی سے
 نمٹایا۔ سب نے ہی کھانے کی تعریف کی۔ اس کے
 جیٹھ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ”آج ہمارے خاندان
 میں اگر کوئی عورت ہر لحاظ سے کامیاب ہے تو وہ یلیجہ
 بھابھی ہیں۔“

ان کی بات سن کر شہنا بھابھی نے جل کر نازو بھابھی
 کے گلن میں جو کچھ کہا وہ تو یلیجہ کو سنائی نہ دیا۔ البتہ نازو
 بھابھی کی بڑی ہاٹ صاف سنائی دی کہ
 ”ہاں کامیاب عورت کا حلیہ بھی تو دیکھو۔ تم کر لوگی
 سارا سارا دن ماسیوں کی طرح کام۔“ شہنا بھابھی نے
 جواباً ”جو کہا وہ سن نہ سکی۔“

چائے کافی پیتے ہی سب اپنے اپنے گھروں کو چل
 دیے۔ چھوٹی کو گھر چھوڑنے اور گیا تھا۔ نعیمہ آئی جو
 آج کی دعوت میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکی
 تھیں۔ انہوں نے واپسی پہ احمر کے ساتھ آنا تھا۔
 ”بقول نعیمہ آئی کے بچے بہت اداس ہو رہے ہیں۔“
 سب نے خوب مزے کیے۔

یہی بات یلیجہ کی تو اس کے لیے ایک دو تعریفوں
 کے بعد اب پورا بکھرا ہوا گھر پچن میں جھولنے برتنوں کا
 ڈھیر۔ اوپر سے شدید تھکن۔ نوکر وہ لوگ اس قدر
 منگائی میں بالکل بھی انورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ ناچار وہ
 جلدی جلدی سب کھینچنے لگی۔

آٹھ گھنٹے کی مزید محنت کے بعد اب گھر کچھ سمٹا
 ہوا نظر آنے لگا تھا۔ استری کرنے والے کپڑوں کے
 ڈھیر کو نظر انداز کر کے اس نے صرف احمر کے آفس
 کے لیے ایک سوٹ استری کر کے لٹکایا اور پھر پچن
 میں آگئی۔ برتنوں کا ڈھیر دیکھ کر وہ پاگل ہونے کو تھی۔
 وہ پچن میں سب یونہی چھوڑ چھاڑ کر اپنے کمرے میں
 آگئی۔ اب اس میں مزید ہمت نہیں بچی تھی۔ وہ بیڈ پہ
 ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ذہن اس وقت مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔
 اسے کچھ دیر قبل جیٹھ صاحب کے کہے الفاظ یاد

نظر آنے لگی۔ اس دوران شام کی اذان ہوئی۔ اس کی
 نماز رہ گئی۔ نجانے کتنی ہی نمازیں ان ہی چکروں میں
 رہ جاتی تھیں۔ لاؤنج بھرا ہوا تھا۔ یلیجہ مسکراتی ہوئی
 اسلی بھاگ بھاگ کر ڈشیز رکھ رہی تھی۔ احمر خوب
 چٹک رہا تھا۔ سب خوش نظر آ رہے تھے۔ یوں ان کے
 یہاں اکٹھے ہونا سالوں کا دستور تھا۔ مرد حضرات کے
 لیے یلیجہ نے الگ کمرے میں کھانا لگایا تھا۔ پچن میں
 کھڑے ہو کر گرمی میں سب کچھ پکاتی وہ شدید تھک
 چکی تھی۔ خود اس کی بھوک تو پکا پکا کر ختم ہو چکی تھی۔
 مگر پھر بھی وہ چہرے پہ بشاشت طاری کرتے ہوئے ان
 سب کے درمیان آکر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی بیٹھی ہی تھی کہ
 شامی کباب سے بھری ہوئی دونوں ٹرے منٹوں میں ختم
 ہو گئیں۔ سارے بچوں نے کباب کباب کی رٹ
 لگادی۔ کباب تو اب پچن میں بھی نہیں بچے تھے۔ سو
 اس نے بچوں کو اور چیزیں دے دے کر بمشکل بسلا یا
 اور منٹن بریانی لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی
 دروازے سے باہر ہی نکلی تھی کہ فرزانہ آیا کا قصداً
 اونچی آواز میں کہا گیا ”عربی جملہ کان سے نکل گیا۔ ان کی
 عادت تھی کہ زور و شور سے تعریف کر کے مطلب
 نکالتی تھیں۔“

”اس میں شک نہیں کہ یلیجہ کھانا بہت مزے دار
 پکاتی ہے۔“

”ارے آج کل کھانا پکانا کوئی ایسا ”آرٹ“ نہیں
 ہے۔ ڈھیروں کوکنگ چینلز اور ڈھیروں رہسپیڈز
 ایٹرنیٹ کی آسانیاں ہی آسانیاں۔“ چھوٹی فوراً بولی
 تھی۔

”کوکنگ شووز“ زندہ بار۔“ نازو بھابھی نے بھی ہنستے
 ہوئے نکلنا لگایا۔

”ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔“ باقی سب بھی فوراً
 متفق ہو گئیں۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ دل میں

آیا تھا کہ کہہ دے کہ کیا وہ کوکنگ چینلز ڈشیز بنا سکا
 گھروں میں بھی دے جاتے ہیں کہ دعوتیں نمٹاؤ مگر
 کچھ کہنے کا مطلب تھا مزید دس باتیں سننا سو خاموشی

آئے

”کامیاب عورت۔“ وہ طنزیہ مسکرائی۔ ”میں کامیاب عورت“ اس بات کے ساتھ ہی اسے ناز و بھابھی کے الفاظ یاد آئے۔
”حلیہ دیکھا ہے اس کا اور سارا سارا دن ماسیوں کی طرح کام۔“

اس کی نظر ڈرینگ ٹیبل پہ پڑی تو وہ چلتی ہوئی اس تک آئی۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھا پال جو اسے جان سے بڑھ کر عزیز تھے اور جن کی دیکھ بھال وہ باقاعدگی کے ساتھ کرتی تھی۔ اب اپنی پہلے والی چمک دمک کھوپکے تھے اور چاروں سے بے حد اچھے بڑے تھے۔ سو اس نے اوپر اوپر سے کنگھا کر کے جوڑا پہنایا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے شہنا بھابھی کے بالکل نئے انداز سے کٹوائے گئے سیاہ چمکتے بال لہرائے۔ بالوں سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں اپنی آنکھوں اور جلد پہ پڑیں۔ ویران آنکھیں اور خشک ہونٹ اور جلد جلد صاف تو تھی مگر کہیں بھی شادابی نہیں تھی۔ کام کر کر کے جسم پر غیر ضروری چربی تو نہیں چڑھی تھی۔ لیکن آلودہ عام سے گھریلو کپڑے اسے آج دعوت پہ آنے والی تمام خواتین کے کپڑے یاد آئے جنہوں نے جدید تراش خراش کے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ وہ بلیجے جیسے شادی سے پہلے یونیورسٹی میں لڑکیاں ”حسن کی دیوی“ کہا کرتی تھیں۔ آج جب وہ صرف اکتیس سال کی تھی تو اس کے سر اُپے میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ پھر بیڈ پہ آکر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ سوچنے لگی کہ میں کیوں رو رہی ہوں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ مجھے ”کامیاب عورت“ کہا جا رہا ہے۔ پورے خاندان میں مجھے گھرواری میں طاق سمجھا جاتا ہے۔ ”ہر فن مولا“ کہا جاتا ہے۔ ہر طرف میری مثالیں دی جاتی ہیں۔ خاندان میں اتنی مقبولیت ہے۔ اس سب کے باوجود یہ آنسو کیوں ہیں؟ تب ہی اندر کہیں سینے کے نہاں خانوں سے ایک دبی ہوئی آواز آئی، سسکتی ہوئی۔

وہ تھا تھی۔ سو آج اس نے وہ آواز سنی تھی جسے اس نے ہمیشہ نظر انداز کیا تھا۔
دس سال بعد۔ دل مبہم سا مسکرایا پارہ سال بعد تو ”روڈی“ (سب کے کوڑا پھینکنے کی جگہ) کی بھی سنی ہی جاتی ہے تو وہ تو پھول تھا۔ اس کے جسم ہی کا ایک حصہ دل کر لایا اور ایک جان لیوا سوال کیا۔

”بلیجے! کیا تیرے کامیاب ہونے کے لیے مس پرفیکٹ بننے کے لیے ایک مثال سے بے مثال تک کے ٹرین جیسے سفر میں کیا ضروری تھا کہ مجھے ہی پشروی پہ بچھا دیا جاتا اور اس پشروی پہ ساری زندگی چلنے والی ٹرین کے نیچے مجھے روندنا اتنا ضروری تھا۔ سب کو خوش کرنے کے چکروں میں مجھے کیوں پس پشت ڈال دیا۔ ایک کونے میں مجھے میرے خوابوں سمیت کیوں دفن کر دیا گیا۔ کیا مجھے مارنا اتنا ضروری تھا۔ میرا خون کرنا اتنا ضروری تھا۔“

وہ ششدر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہر ایک کا دل اور اس کے ارمان مختلف ہوتے ہیں اور دل ایسی چیز ہے کہ اگر اس کے ارمان پورے نہ ہوں تو اس کے آگے دنیا کی نعمتوں کے انبار بھی لگا دو تب بھی یہ خوش نہیں ہوتا۔ وہ ساکت بیٹھی تھی۔ افسرہ اور ست سی۔ تب ہی کھنٹی کی آواز پر چونک گئی۔ لگتا ہے احمر آگئے۔ چلو جی دل صاحب آپ کا ٹائم ختم۔

اس نے چہرے کے تاثرات ٹھیک کیے مسکراہٹ سجائی اور دروازہ کھول دیا۔ احمر کے ساتھ آئے نعیمہ آپی اور ان کے بچوں کا اہمانہ استقبال کیا۔ ان کو لاؤنج میں آرام دہ صوفوں پہ بٹھا کر وہ ایک دفعہ پھر کچن کی طرف چلی گئی۔



صدا کے آواز پر



Downloaded From Paksociety.com

سیاہ حاشیہ پارت کر۔ پوچھتاؤ گی۔ ایک نادرہ آواز رکھتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔



عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں لایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے روٹی والے کو دے دی ہیں۔

124 2016 مارچ شعل

عزیز کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبد اللہ سے اس کے متعلق پوچھنے کی۔
 عبد اللہ پابند صوم و صلوة وہ مسجد کا موزن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عزیز کی اس کے ساتھ منگنی
 ہو چکی ہے۔ عزیز ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
 عزیز کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ
 حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

ناولٹ



عزیز عبد اللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبد اللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی
 صالحہ تپانے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
 شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریپ روائٹ کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
 ڈاکٹر بیٹس نیلی کو بھی میں اپنے بیٹے ارجم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرشل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔
 نیلی کو بھی کے دوسرے حصے میں ان کے نایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اورید کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی
 شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اورید کو پاکستان اپنے باپ کے پاس
 بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔

ماہنامہ شعور مارچ 2016 125

اورید اور ارصم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر بھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
سرمد اپنے دوست کے بروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی فمتیں کر رہی ہے کہ وہ
ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں
ہے صرف ایک پھونچکا ہے جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور رباب کو
کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے۔ لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے
اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شو بزم میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک باریات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی
ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔
اورید ارصم کے ساتھ پیچھے دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اورید کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر
بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اورید اپنے باپ تیور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو
گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں۔ آغا جی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

نی دی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے
دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔

ارصم اورید کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اورید کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔
مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً شادی کر لے۔
عبداللہ نے فوراً شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جواز کر لیا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آتی ہے۔
عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط
راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل شانزے کو خوشی ہونے پر تسلی دیتا ہے وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ
شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارصم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔
عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

بارہویں قسط

”چھوڑو تم اسے ہزار دفعہ کہا ہے، میری چیزوں کو
بغیر پوچھے ہاتھ مت لگایا کرو۔“ وہ گڑبڑا سا گیا۔
”میں یہ ہرگز نہیں دوں گی۔“ اس کی آنکھوں میں
ایک محسوس کی جانے والی خفگی اور بغاوت تھی۔
”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم پر دھوگی اسے؟“ وہ
سخت حیران ہوا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو۔؟“ ہاشم ناراض نظروں سے
دیکھتا ہوا اس کی جانب پر دھا۔ جب کہ بخشاؤر کے چہرے
پر اس وقت اشتعال ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔
”یہ گھٹیا کتاب تمہارے پاس کیا کر رہی ہے؟“
اس نے بھنویں اچکا کر غصے سے اپنے شوہر کی طرف
دیکھا، جو اس وقت حواس باجمہ لگ رہا تھا۔

”میرے داغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا نہیں ہوا اور نہ ہی شیطان اتنا غالب ہوا ہے مجھ پر کہ میں یہ تھرڈ کلاس لٹریچر پڑھنا شروع کروں۔“ اس نے بے تحاشا غصے سے ٹرنگ بند کر کے اس کی طرف دیکھا جو اس وقت ایسے کھڑا تھا جیسے رنگے ہاتھوں چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہو۔

”یہ میری نہیں، میرے ایک دوست کی ہے۔“ ہاشم نے کچھ سوچ کر صفائی دینے کی کوشش کی۔ ”میری ایسی کوئی دوست ہوتی تو خدا کی قسم میں اسے گولی مار دیتی۔“ وہ جذباتی ہوئی کتاب ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

”اس میں اتنا حساس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔؟“ اس نے حیرانی سے اپنی بیوی کا یہ نیا روپ دیکھا۔

”اس میں کیا کچھ بکواس نہیں کی گئی، میں اپنے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسا لکھنے والے کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔“ وہ غصے سے بچن کی طرف بڑھی۔

”آزادی، تحریر اور آزادی اظہار ہر انسان کا فطری حق ہے۔“ وہ اس کے پیچھے لپکا۔

”تم نے پڑھا ہے اسے۔؟“ بخٹاور کی آنکھوں سے شعلے نکلے۔

”ہاں۔“ اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

”تمہیں ذرہ برابر بھی شرم نہیں آتی، تم نے اتنی بکواس باتیں پڑھ کیسے لیں۔؟“ وہ خفگی میں ہاشم کو ”آپ“ کے بجائے ”تم“ پر لے آئی تھی۔ ”یہ ایک انسان کی ذاتی سوچ ہے، میری نہیں۔“ وہ بیزار لہجے میں گویا ہوا۔

”یہ انسان نہیں شیطان ہے، جو اس خبیث کی شکل میں دنیا میں گھوم رہا ہے۔“ وہ تشریح کر رہی۔

”تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا، کسی پر ایسے عقیدہ کرنے کا۔“ اسے بھی غصہ آ گیا۔

”تو کیا اسے حق ہے کہ وہ کروڑوں مسلمانوں کے

جذبات سے کھیلے، مجھے تو تم پر حیرانی ہو رہی ہے کہ تم کیسے ایسا چپ مواد سنبھال کر اپنے بکس میں رکھ سکتے ہو۔“ بخٹاور کا غصہ کسی صورت بھی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”بتایا ناں، کچھ سال پہلے میرا ایک دوست بھول گیا تھا میرے پاس، میں نے پرانی چیزوں کے ساتھ اسے بھی رکھ دیا۔“ وہ ہلکا سا جھنجھلا کر اسے دیکھنے لگا جو بچکن میں داخل ہو کر چولہا جلارہی تھی، ہاشم کو ابھی تک اس کے ارادوں کی خبر نہیں ہوئی۔

”تمہیں پتا ہے اس کتاب کی اصل جگہ کہاں ہے؟“ وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کہاں۔۔۔؟“ وہ واقعی ہی نہیں سمجھا۔

”یہاں۔۔۔“ بخٹاور نے جلدی سے وہ کتاب جلتے چولہے کے اوپر رکھ دی۔ ہاشم کو کرنٹ سا لگا۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم۔“ وہ فوراً الٹک کر چولہے کے پاس پہنچا، کتاب کے صفحات دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔

”داغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔“ اس نے آگ کے شعلوں سے اس کتاب کو بچانے کی کوشش کی، اس کوشش میں اس کا ہاتھ ہلکا سا چھلس گیا اور تکلیف کے احساس سے اس نے فوراً ہی کتاب زمین پر پھینک دی۔

اودھل کھول کر ٹھنڈا پانی اپنے ہاتھ پر ڈالنے لگا۔ ایک آگ زمین پر بھڑک رہی تھی اور دوسری ہاشم کے دل میں، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ

اپنی بیوی کو اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دے۔

”بے وقوف عورت! میرا ہاتھ اچھا خاصا جلا دیا۔“ وہ آبلوں کے اوپر پھونکیں مار کر اپنی جلن کو کم کرنے لگا۔

”ہلکی سی تپش سے تمہارا یہ حال ہے، ذرا سوچو، جنم کی آگ سے کیسے بچو گے۔“ بخٹاور نے اس کا ضمیر جگانے کی ناکام کوشش کی۔

”ٹٹ اپ۔۔۔!“ وہ غصے سے پلٹا۔ ”بیٹیوں کی سوت نے تمہارا۔۔۔ داغ گھما دیا ہے، جو تم ایسی

بگلوں جیسی حرکتیں کر رہی ہو۔“ اس نے بھی جو مسز

127

2016 مارچ

ماہنامہ شعاع

www.paksociety.com

online library for pakistan

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

عیں آیا کہہ دیا۔

”اور شیطان تم پر حاوی ہو چکا ہے جو تم ایسی چیزیں پڑھتے ہو۔“ اس نے بھی جواباً ”حساب پورا کیا۔“
”اسندہ میری چیزوں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہو گا۔“ وہ غضب ناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اور اگر ایسی کوئی چیز دوبارہ مجھے اس گھر میں نظر آئی تو اس کا انجام بھی ایسا ہی ہو گا۔“ بخناور نے نفرت آمیز نظروں سے زمین پر ادھ جلی کتاب کی طرف اشارہ کر کے دوبارہ جواب دیا۔ ہاشم کا دل غمگن ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی چٹاخ سے بخناور کے دائیں گل پر پڑا۔ وہ اس اچانک حملے سے سنبھلتے ہوئے بھی شیفت سے جا ٹکرائی۔ اذیت کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے سامنے کھڑے اس اجنبی شخص کو دیکھ رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنا گھر بار عزیز رشتے دار سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ ان میں سب سے مہنگی چیز اس کے والدین کی عزت تھی جسے اس نے کوڑیوں کے بھاؤ بیچتے ہوئے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا تھا اور جس شخص کی خاطر اس نے یہ سب کیا اس نے بھی ایک پل میں اسے سر سے اتار پھینکا تھا۔

”وہ شخص گمراہ ہے اس نے اپنے اوپر نقاب چڑھا رکھا ہے۔“ اگلے دن وہ نیلم کو فون کر کے دھواں دھار

رونے لگی۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی اس کی کتابوں کو ہاتھ لگانے کی۔“ دوسری طرف وہ بھی صدمے بھرے انداز میں بولی۔

”وہ حد درجہ گمراہ ہو چکا ہے اور ان سب کے پیچھے ایسے ہی لٹریچر کا ہاتھ ہے۔“ وہ بلند آواز میں روتے ہوئے نیلم کو پریشان کر رہی تھی۔

”بڑے بڑے لوگ گمراہ ہو کر واپس پلٹ آتے ہیں اللہ کی رحمت سے ماپوس مت ہو۔“ اس کی دوست

نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”میں حیران ہوا اس قدر نیک برہیزگار، مذہبی انسان سے کون سی ایسی غلطی ہو گئی جس کے نتیجے میں اللہ نے اسے ایسی اولاد سے نوازا۔“ وہ بھیکے لہجے میں ہاشم کے والد کے بارے میں بات کرتے ہوئے بولی۔

”ضروری نہیں یہ کسی غلطی کی سزا ہو اللہ نیک بندوں کی آزمائش بھی تو کرتا ہے اور اولاد کے ذریعے بھی انسان کو آزماتا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا، لیکن بخناور کو بالکل بھی سکون نہیں آ رہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے اللہ نے مجھے بھی والدین کی نافرمانی کی سزا دی ہے۔“ وہ ایک دفعہ پھر روئی۔

”حوصلہ کرو بخناور! ایسا کچھ نہیں ہے تم بہار اور محبت سے ہاشم بھائی کو بدلنے کی کوشش کرو۔“ نیلم نے خلوص دل سے اسے مشورہ دیا۔

”اللہ جس شخص کے دل پر مہر لگا دے اس پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا، ورنہ اس کے باپ نے کیا کوشش نہیں کی ہو گی۔“ وہ ماپوس کی انتہا پر تھی۔

”ہدایت دینا اللہ کا کام ہے تم بس اپنی کوشش جاری رکھو۔“ دوسری طرف نیلم کو پورا یقین تھا کہ وہ اسے راہ راست پر لے آئے گی۔ تب ہی اس نے نیلم کو خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ خسارے کا سودا اس نے اکیلے کیا تھا اور اسے تنہا ہی اس آزمائش سے تینا تھا۔

موسم کافی حد تک بدل گیا تھا۔ سردی کی شدت میں

کمی کے بعد بہار کی آمد آمد تھی، تبھی فضا میں ایک خوشگوار سی مہک رچ بس سی گئی تھی۔ کھلا کھلا سایہ موسم مزاجوں پر اچھے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ عینہ کی بے رخی اور بے نیازی، عبد اللہ کے لیے پریشانی کا موجب بن رہی تھی، اس لیے وہ کچھ سوچ کر اس کے کلج چلا آیا۔ اور یہ اسے اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ آج اکیلی ہی کلج آئی ہے۔ اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں

میری نظموں سے گرا دیا تھا۔ اس کے ہر انداز میں دکھ اور شکوے کا رنگ نمایاں تھا۔

”اور پھر اس بات کی سزا دینے کے لیے آپ نے مجھے چن لیا۔“ وہ اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے ناراضی سے گویا ہوئی۔

”میں اپنی پی ایچ ڈی کے بعد تم سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔“ عبد اللہ نے ہلکا سا جھجک کر اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

”تو پھر ہو گئی پی ایچ ڈی۔“ اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش شامل ہوئی۔

”نہیں، تمہیں آہستہ آہستہ آخری مراحل میں ہے، میں ملائیشیا کی ایک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔“ اس نے سادگی سے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”تو ٹھیک ہے پھر پی ایچ ڈی کر ہی لیں سکون سے اور مجھے بھی پڑھنے دیں۔“ وہ اپنی فائل اٹھا کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”عدینہ! کیوں کر رہی ہو تم میرے ساتھ ایسا۔؟“ اب کہ وہ پریشان ہوا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے۔؟“ اس کا لہجہ ساٹ ہوا۔

”میں چاہتا ہوں، تم اپنی ساری ناراضی، گلے، شکوے سب کچھ ختم کرو۔“ وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔

”ٹھیک ہے، ختم کر دیے۔ اب۔؟“ وہ اسے لمحہ لمحہ حیران کر رہی تھی۔

”میرا تھیسس فیکسٹ چھ مہینوں میں ختم ہو جائے گا، میں پھر آپ کے پاس آؤں گا۔“ وہ اپنا اگلا پروگرام اسے بتا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر تب ملاقات ہوگی۔“ وہ اپنی کتابیں اور فائل اٹھا کر چل پڑی عبد اللہ کو دھچکا لگا وہ

کئی لمحے تک اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔

”میرا خیال ہے، تمہیں شاید اب میری ضرورت نہیں رہی۔“ وہ اس کے پیچھے لپکا۔

تھا تب ہی تو وہ وہاں چلا آیا۔ اس کی ایک کلاس فیو نے بتایا تھا کہ وہ اسپورٹس گراؤنڈ میں موجود ہے، وہ ایک نسبتاً سنسان گوشے میں بلند سی جگہ پر ٹانگیں لٹکائے اکیلی بیٹھی تھی۔ وہ خاموشی سے اس سے تھوڑا فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔ عدینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی ناگواری کا تاثر اس کے چہرے پر نمایاں ہوا، لیکن اس کی دھڑکنیں حسب معمول بغاوت کر چکی تھیں۔

آخر اس شخص کو دیکھ کر میری دھڑکنیں بے ربط ہونا کب چھوڑیں گی؟ اس کے چہرے پر بھنجلاہٹ نے بسیرا کیا۔

”کیوں آئے ہیں آپ یہاں۔؟“ اس کے لہجے میں چھپی خفگی بے ساختہ چھلکی۔

”تم سے ملنے۔“ وہ معصوم انداز میں گویا ہوا۔

”کیوں۔؟“ اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

”آخر مجھے تمہاری طرف ہی آنا تھا۔“ عبد اللہ کا سر جھکا ہوا تھا اور عدینہ اس کی طرف دیکھے بغیر بتا سکتی تھی کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

”مجھ پر اب یہ یا نہیں اثر نہیں کرتیں۔“ وہ چڑکر گویا ہوئی۔

”اچھا، پھر کیا چیز اثر کرتی ہے۔؟“ عبد اللہ نے پہلی دفعہ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ عدینہ کے چھلکے چھوٹ گئے، وہ گڑبڑا کر ایک قدم اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر پھیلی سرخی سے عبد اللہ نے دانستہ نظر سچرائیں۔

”کوئی بھی نہیں۔“ وہ اسپورٹس گراؤنڈ میں کھیلنے لڑکوں کو دیکھنے لگی۔

”میں بہت شرمندہ ہوں تم سے، لیکن تم سے رابطہ کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا میرے پاس۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”کیوں، آپ کا نمبر بھی ڈیلیٹ کر دیا تھا آپ نے؟“ اس نے طنز کیا۔

”میں آپ سے خفا تھا، انہوں نے اس رات مجھے

”دیکھیں عبد اللہ! میرا کالج میں ایک ایچ ہے اور میرے کلاس فیلوز میری بہت ریسپیکٹ کرتے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”کیا مطلب۔؟“ وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔
 ”آپ کا اس طرح روز روز آنا میرے لیے مسائل کا موجب بن سکتا ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا تو عبد اللہ کے دل پر گھونسا سا پڑا۔

”عدینہ! تمہاری عزت و وقار پر میں نے آج تک آنچ نہیں آنے دی، تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں تمہارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کروں گا۔“ وہ اب افسردگی سے اپنے سامنے کھڑی اس ناراض لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس کے کردار کی مضبوطی کی گواہی وہ آنکھ بند کر کے دے سکتا تھا۔ وہ بھلا کیسے اسے میلا کر سکتا تھا۔
 ”میں آپا کو بتائے بغیر آپ سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتی۔“ اس نے سر جھکا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اور میں اس بات کے لیے تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گا۔“ سچائی بھی نمایاں وصف تھی۔

”پھر۔۔۔؟“ عدینہ نے ایک دفعہ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن اس دفعہ اسے مایوسی ہوئی، وہ سر جھکائے اس طرح سے کھڑا تھا کہ افسردگی اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔“ وہ تھوک نکل کر بمشکل بولا، ”میں

چاہتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ دوبارہ یہاں نہ آوں۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دو سری طرف چل دیا۔ عدینہ نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا، اس کا دل گویا بغاوت پر اتر آیا، جسم کی ساری رگوں میں ایک حشر سا برپا ہو گیا۔ وہ خوف زدہ لگا ہوں سے عبد اللہ کی پشت کی طرف دیکھنے لگی، وہ سر جھکائے اس طرح سے

چل رہا تھا جیسے کوئی شخص اپنی کل کائنات لٹا کر جا رہا ہو۔

ایک لمحے کو عدینہ کا دل چاہا کہ وہ اسے آواز دے دے، لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اپنی

عزت اور اپنا وقار اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا، اس لیے وہ خود بر جبر کرتی ہوئی بمشکل اپنی کلاس کی طرف چل پڑی، لیکن اب جھکن اور اداسی اس کے سارے وجود کا احاطہ کر چکی تھی۔

”تمہیں اس سے بات کر لینی چاہیے تھی۔“
 شام کو اوریدانے سارا قصہ سن کر سادگی سے کہا۔

”پتا نہیں کیوں، اس کی طرف دیکھتے ہی میرے سائے زخموں کے ٹانگے اوھڑنے لگتے ہیں۔“ وہ بے چارگی سے گویا ہوئی۔

”ایسا ہی ہوتا ہے جس شخص کو ہم نے نہانے میں سب سے زیادہ چاہا ہو، اس کی ایک سرورنگاہ بھی دل میں قیامت برپا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس نے تو تمہیں اتنا عرصہ رلایا ہے۔“ اوریدانے کا دکھ سمجھ سکتی تھی۔

”وہ سامنے آتا ہے تو یقین مانو، اپنی بے قدری کا دکھ مجھے نشتر کی طرح کاٹنے لگتا ہے۔“ عدینہ نے اپنی مشکل بیان کی۔

”اسے اور خود کو ٹائم دو، وقت بہت سے زخموں پر مرہم رکھ دیتا ہے۔“ اوریدانے اسے خلوص دل سے مشورہ دیا، جو اس کی سمجھ میں آ بھی گیا تھا، اس لیے اس دفعہ وہ سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔



آپا صالحہ کو اب اکثر ہی بخار رہنے لگا تھا۔ اس دن وہ بے جی کے بار بار کہنے پر اپنے کچھ ٹیسٹ کروانے کے لیے ”نوری اسپتال“ آئی تھیں۔ حسب معمول مونا ان کے ساتھ تھی۔ انہوں نے ٹیسٹ کے نمونے لیے اور اب آپا صالحہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھیں اور مونا باہر۔ ارد گرد بیٹھے لوگوں کے چہرے بڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ ہر چہرے پر دکھ اور غم کی ایک علیحدہ

تحریر تھی۔ مونا کا دل ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا۔ آپا صالحہ کو ڈاکٹر کے کمرے میں گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ ان کا سیل فون بھی مونا کے پاس تھا۔ اچانک اس کی گھنٹی بجی۔ دو سری طرف عدینہ تھی۔

”السلام علیکم عدینہ باجی۔۔۔“ مونا فون لے کر کورڈور سے باہر لان کی طرف آئی۔
 ”کیسی ہو مونا؟“ عدینہ کا انداز اسے کچھ بچھا بچھا سا لگا۔

”میں ٹھیک ہوں“ آپ کیسی ہیں۔۔۔؟“ اس نے جواباً پوچھا۔

”فائن۔۔۔! آپ کہاں ہیں؟ ان کا سیل فون تمہارے پاس کیسے آیا؟“

”آپا ٹھیک نہیں ہیں عدینہ باجی۔۔۔“ مونا نے دائیں بائیں دیکھ کر قدرے آہستگی سے سرگوشی کی،
 دوسری طرف عدینہ کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔
 ”کیوں؟ کیا ہوا مونا؟ میری بات کرو او آپا سے۔۔۔“ وہ بے تاب ہوئی۔

”وہ سو رہی ہیں“ اس لیے بات نہیں کروا سکتی۔“
 مونا نے جھوٹ بولا وہ اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ آپا کے ساتھ اسلام آباد میں ہے۔

”لیکن ہوا کیا ہے انہیں۔۔۔؟“ وہ پریشان ہوئی۔
 ”ہر دوسرے دن بخار ہو جاتا ہے اور پیٹ بھی اکثر خراب رہنے لگا ہے۔“ مونا نے محتاط انداز میں بتایا۔
 ”میں اس ویک اینڈ پر گھر آتی ہوں“ اور پھر لاہور لے کر جاؤں گی انہیں۔“ عدینہ نے اپنے ارادوں سے اسے آگاہ کیا۔

”ہاں ضرور، لیکن پلینز انہیں مت بتائے گا کہ یہ بات میں نے آپ کو بتائی ہے۔“ اس نے گہرا کرایا دہائی کر والی۔

”نہیں بتاؤں گی، لیکن آپا جیسے ہی انھیں میری بات کروانا اور ہاں ان کا بہت زیادہ خیال رکھنا اور میڈیسن ریگولر دیتی رہنا۔“ عدینہ نے اسے نصیحت کر کے فوراً فون بند کیا تو مونا نے اطمینان بھرا سانس لیا، اسے یقین تھا کہ عدینہ اس ویک اینڈ پر ضرور گھر

آجائے گی، وہ خود بھی اس کے لیے او اس ہو رہی تھی اور کچھ آپا کی گرتی ہوئی صحت نے اسے اور بے جی دونوں کو فکر مند کر دیا تھا۔

آپا صالحہ، ڈاکٹر سے ملاقات کے بعد تھکے تھکے انداز میں باہر نکلیں۔ ان کے ہاتھ میں اپنی فائل تھی، انہوں نے اپنا آدھا چہرہ چادر سے چھپا رکھا تھا۔ مونا لپک کر ان کے پاس آئی۔ جب کہ آپا گھوجتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”کس سے بات کر رہی تھیں تم۔۔۔؟“ وہ شاید نہیں یقیناً“ اسے فون کان سے لگائے دیکھ چکی تھیں۔
 ”عدینہ باجی کی کال تھی۔“ اس نے ہلکا سا جھجک کر بتایا۔

”تم نے اسے بتایا تو نہیں، ہم لوگ اسپتال آئے ہوئے ہیں۔“ انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔
 ”آپ کی اجازت کے بغیر میں کیسے بتا سکتی تھی۔“ مونا کی بات نے انہیں مطمئن کیا۔

”چلو اب نکلتے ہیں۔“ انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”عدینہ باجی، ویک اینڈ پر گھر آرہی ہیں۔“ اس نے آپا کو بے سکون کیا۔

”اچھا میں گھر جا کر بات کرتی ہوں اس سے۔“ ان کے اعصاب ملنے سے تن گئے۔

”آپ ان کو پلینز منع مت کیجئے گا۔“ مونا نے نوری اسپتال کے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے ان سے درخواست کی۔

”میں ابھی اس سے ملنا نہیں چاہتی، وہ میری صحت دیکھ کر پریشان ہو جائے گی۔“ آپا صالحہ نے اپنی مجبوری بتائی۔

”لیکن کبھی نہ کبھی تو انہیں بتانا ہی پڑے گا۔“ مونا نے محتاط انداز میں کہا۔

”لیکن جب تک اسے علم نہ ہو، یہ اچھا ہی ہے، وہ پرسکون ہو کر اپنی پردھائی تو کر سکے گی۔“ وہ ایک ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔ انہیں فیض آباد اڈے پر جانا تھا۔ ٹیکسی والے سے معاملات طے کر کے وہ

دونوں بیٹھ گئیں۔
 ”عدینہ باجی کو جب بھی پتا چلے گا تو وہ بہت خفا ہوں

گی آپ سے۔۔۔ مونا نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”میں دیکھ لوں گی اسے۔۔۔ وہ لاہروائی سے بولیں۔
 ”ڈاکٹر نے کیا کہا آپ سے۔۔۔؟“ مونا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”وہی ایک بات کہ فوراً ”سرجری کروالیں۔“ وہ پھلکے سے انداز میں مسکرا دیں۔
 ”تو پھر آپ دیر کیوں کر رہی ہیں آخر۔۔۔؟“ وہ خفا ہوئی۔

”عدینہ کے ایگزام ہو جائیں پھر دیکھتی ہوں۔“ وہ ابھی تک اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھیں۔
 ”آپ! اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔“ مونا کے لہجے میں احتجاج کا رنگ نمایاں ہوا۔

”کچھ نہیں ہوتا۔“ وہ لاہروائی سے بولتے ہوئے ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔

ان کی ٹیکسی اسلام آباد ایکسپریس روے کے ایک سگنل پر کھڑی تھی، اچانک آپا صاحبہ کی نظر ایک بڑے بل بورڈ پر پڑی، انہیں جھٹکا لگا، وہ کسی نئے سیریل کا اشتہار تھا جس کی ہیروئن ایک نئی لڑکی تھی، لیکن اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی آپا صاحبہ کے دل کی دنیا میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس لڑکی کے جانے پہچانے نقوش دیکھنے لگیں۔ مونا نے بھی ان کی نظروں کے تعاقب میں رکھا۔

”آپا! اس لڑکی کی شکل آپ سے کتنی ملتی ہے۔“ اس کے منہ سے پھسلا۔

”خواتنواہ ہی۔۔۔“ انہیں کرنٹ لگا۔ ”تم ہر لڑکی کو مجھ سے مت ملایا کرو۔“ وہ برہان لگیں۔

”میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔“ مونا نے خفت بھرے انداز میں سر جھکا لیا۔

سگنل کھل چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی آپا صاحبہ کے دل و دماغ میں بھی ایک فلم چل پڑی تھی۔ ان کا سارا وجود گویا زلزلوں کی زد میں تھا۔ دائیں بائیں بھاگتی

دوڑتی گاڑیوں اور مناظر سے ان کی دلچسپی پک دم ہی

ختم ہو گئی اور ذہن میں ایک ہی چہرہ نقش ہو گیا تھا، وہ چہرہ جو اس بڑے بل بورڈ پر ان کی طرف استہزائیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جس نے ان کا سارا سکون عارت کر دیا تھا۔



اس واقعے کے بعد بخٹور کارو کر برا حال تھا، اس نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کل سے لاک کر رکھا تھا اور ہاشم کو رات۔۔۔ ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر سونا پڑا۔ اس وقت بھی وہ وہیں بیٹھا دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا۔

”مجھے بخٹور پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔۔۔“ اس کے دماغ میں مسلسل ایک ہی فکر کی تکرار ہو رہی تھی۔

”لیکن اس نے بھی تو بد تمیزی کی تھی۔“ وہ خود کو مطمئن کرنے کے لیے ایک جواز ڈھونڈ رہی لایا۔

”جو بھی ہو، اس طرح کسی عورت پر ہاتھ اٹھانا کہاں کی مردانگی ہے۔“

وہ اٹھ کر بخٹور کے کمرے کے باہر آن کھڑا ہوا، اس نے ہلکا سا جھک کر دروازے پر دستک دی۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔

”بخٹور، آئی ایم سوری یار، دروازہ تو کھولو۔“ وہ ہلکا سا جھک کر گویا ہوا۔

”دیکھو میں مانتا ہوں، ساری غلطی میری ہے لیکن ہم بیٹھ کر بھی تو اس موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔“ وہ

اس دفعہ دروازہ زور سے بجاتے ہوئے اونچی آواز میں بولا لیکن دوسری طرف بخٹور نے بھی شاید آج اس کی کوئی بھی بات نہ سننے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”دیکھو تم جو کوگی عیش مان جاؤں گا، لیکن تم دروازہ تو کھولو۔“ وہ نرمی سے اسے لالچ دیتے ہوئے بولا۔

”مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”میری جان! ایسے مسئلہ کیسے حل ہو گا۔۔۔؟“ وہ

پریشان ہوا۔

”مجھے آپ کے خود ساختہ مسائل کو حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ اس نے بھی بے رخی کے ریکارڈ توڑے۔

”اچھا دروازہ تو کھولو۔“ دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

”پلیز بخٹور! دروازہ کھولو، میری ساری میڈیسن کمرے میں ہیں، میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ اس دفعہ بخٹور نے دروازہ کھول دیا۔ ہاشم کی جیسے ہی اس پر نظر پڑی اس کا دل شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرا۔ اچھے بال، متورم آنکھیں اس کے رخسار پر ابھی بھی سرخی نمایاں تھی۔

”آئی ایم سو سوری یار۔“ وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بخٹور کی آنکھوں سے ایک دفعہ پھر آنسو پھسلنے لگے۔

”پلیز بخٹور! رونامت میں بہت شرمندہ ہوں۔“ اس نے محبت سے بخٹور کے بازو پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی، اس نے ناراضی سے اپنے بازو کو پرے کیا اور بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ وہ سخت کا شکار ہوا۔

”بتا نہیں، مجھے کیا ہو گیا تھا۔؟“ وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”شیطان غالب آ گیا تھا اور کیا ہونا تھا۔“ بخٹور نے دل ہی دل میں لہجے سے سوچا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔ پلیز مجھے معاف کرو۔“ اس نے دوبارہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”اپنا ہاتھ ہٹائیں، مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ وہ بولی نہیں پھنکاری تھی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں بخٹور! تم ایسی تو نہیں تھیں،“ وہ حیرانی سے گویا ہوا۔

”آپ بھی تو“ ایسے“ نہیں تھے، جو شخص جانوروں کا اتنا خیال رکھتا ہو، وہ کسی انسان کے ساتھ ایسا سلوک کیسے کر سکتا ہے۔“ اس نے اسے مزید شرمندہ کیا۔

”یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ وہ

ابھن آمیز انداز میں بولتا ہوا، اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”لیکن میری سمجھ میں آگئی ہے۔“ اس نے ناراضی سے سر جھٹکا۔

”کیا۔۔۔؟“

”جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لکھی جانے والی کتابیں پڑھتا ہو، وہ کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ وہ اس سے ٹھیک ٹھاک خفا تھی۔

”تم بات کو غلط سائیز پر لے جا رہی ہو بخٹور۔“ وہ جھنجھلا یا۔

”اور آپ پورے کے پورے غلط سائیز پر جا چکے ہیں یہ بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔“ اس نے بھی تلخ لہجے میں دودھو جواب دیا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے بخٹور! میں کسی سے جھوٹ نہیں بولتا، کسی کو دھوکا نہیں دیتا، میرے زندگی گزارنے کے اپنے اصول ہیں۔“ وہ سخت زندہ انداز میں اسے صفائی دے رہا تھا۔

”آپ کو اپنے سارے اصول و ضوابط مجھے شادی سے پہلے بتانے چاہیے تھے۔“

”تو کیا کرتیں تم۔؟“ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”اس کے بعد ہی میں سوچ سمجھ کر شادی کا فیصلہ کرتی۔۔۔“ وہ ساٹھ انداز میں کہہ کر کمرے سے نکل گئی، کچھ لمحے تو ہاشم کو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ جملہ اس لڑکی نے کہا ہے جو اس کی محبت میں اپنے کپڑے پتی باپ کی عیش و عشرت کی زندگی کو ٹھوکر مار آئی تھی۔ جس نے اس کی محبت میں ایک آگ کا دریا پار کیا تھا۔

”میں نے کہا تھا، مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ وہ کچن میں اس کے پیچھے چلا آیا۔

”تو اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔۔۔؟“ وہ تل کھول کر برتن دھونے لگی۔ پورا کچن گل سے بکھرا پڑا تھا۔ اس نے جھانک کر بھی نہیں وہاں دیکھا تھا۔

”تم مجھے معاف کر کے پہلے کی طرح ہو جاؤ۔“

اس کی فرمائش پر وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔
 ”عورت کوئی موسم کی گڑیا نہیں ہوتی کہ اسے مرد
 جب چاہے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے۔ اپنی
 آنکھ کے اشاروں پر چلائے اور اپنے اختیار کے موسم
 اس پر مسلط کر کے اس کی سانسوں پر بھی پاپندی لگا
 دے۔“ وہ آج ایک نئے ہی رنگ ڈھنگ میں تھی۔
 ”بخٹاور پلیز بس کرو اب۔۔۔“ اس کے ضبط کا پیمانہ
 بھی چھلکا۔

”آپ پلیز جائیں یہاں سے اور مجھے میرے حال پر
 چھوڑ دیں۔“ وہ برتن دھوتے ہوئے اجنبیت سے گویا
 ہوئی تو ہاشم کچھ لمحے تو اسے دیکھتا رہا اور پھر کچھ سوچ کر
 بچن سے نکل گیا۔ بخٹاور نے اس کے نکلنے ہی ایک لمبی
 سانس لی اسے پہلے دفعہ ہاشم کی موجودگی میں ٹھٹھن کا
 احساس ہوا تھا اور یہ احساس اسے خوفزدہ کرنے کے
 لیے کافی تھا۔

آنے والے دنوں میں ان دونوں کے درمیان ایک
 محسوس کی جانے والی اجنبیت کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی
 ہاشم نے ان فاصلوں کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی
 لیکن بیٹیوں کی وفات کے بعد بخٹاور نے بے حسی کی
 چادر تان لی تھی وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر
 ٹھٹھنوں قرآن پاک کھول کر تلاوت کرتی رہتی اور ہاشم
 ناگواری سے اسے دیکھتا رہتا، لیکن خیریت اس لیے تھی
 کہ اب ہاشم نے اسے ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔



بینش کے گھر سے آنے والی ڈھولک کی آواز اوریدا
 کے اعصاب کو بری طرح چٹخا رہی تھی۔ اس نے
 ساری کھڑکیاں دروازے بند کر رکھے تھے لیکن بینش
 نے اپنے لان میں فنکشن کا اہتمام کر رکھا تھا وہ
 بہانے بہانے سے کئی چکر بڑے ابا کے گھر کے لگا چکی
 تھیں۔ ان کے انگ انگ سے سرشاری ٹپک رہی
 تھیں اور بات بات پر لبوں سے ہنسی کے فوارے
 پھوٹ رہے تھے۔

”ہوا آپ نے شام میں ارصم کی منگنی پر ضرور آنا

ہے۔“ انہوں نے کن اکھیوں سے اوریدا اور عدینہ کو
 دیکھتے ہوئے بوار حمت کو مخاطب کیا۔ اوریدا کا چہرہ ایک
 لمحے کو تاریک ہوا اور عدینہ نے ناپسندیدہ نظروں سے
 اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی اس مغرور عورت کو دیکھا
 جس کی گردن آج فخر سے تنی ہوئی اور لہجے میں محسوس
 کیا جانے والا زعم جھلک رہا تھا۔

”بیٹیا! میری طرف سے تو معذرت، آج تو ٹھٹھنوں
 کے درو نے بے حال کر رکھا ہے۔“ بوار حمت نے
 انہیں صاف ٹالا۔

”بھئی اوریدا اور عدینہ! تم لوگ تو آؤ گے نل۔۔۔“
 انہوں نے ختماتے ہوئے انداز میں دونوں کو دیکھا۔

”نہیں بھئی، آج ان میں سے کوئی بھی نہیں آئے
 گا، ہم لوگ ایک ڈنر پر انوائٹڈ ہیں۔“ بڑے ابا نے
 لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے اپنی بات سے ان دونوں
 کو حیران اور بینش کو پریشان کیا۔ وہ ہکا بکا انداز میں ان
 کی طرف دیکھنے لگیں۔

”تیا ابا! آپ ارصم کی انکھیج منٹ میں نہیں
 آئیں گے کیا۔؟“ بے یقینی ان کے ہر انداز میں
 نمایاں تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ڈاکٹر
 جلال کی طرف سے ایسا فقرہ بھی انہیں سننے کو مل سکتا
 ہے۔

”نہیں بیٹا! آج ڈاکٹر منصور کے پوتے کا ولیمہ ہے
 اور اس نے اسپیشلی اوریدا کو لانے کو کہا ہے۔“ وہ
 اپنی ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بینش کا سارا سکون
 غارت کر گئے۔ اوریدا نے بھی حیرانی سے بڑے ابا کا
 سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

”لیکن وہ اوریدا کو کیسے جانتے ہیں۔۔۔؟“ بینش کو
 یقین نہیں آیا۔

”اوریدا تیمور کی بیٹی ہے اور تیمور ڈاکٹر منصور کے
 بیٹے کا بہترین دوست ہے، وہ جب بھی انگلینڈ جائے تو
 اس کے پاس ہی قیام کرنا ہے۔“ بڑے ابا نے خلاف
 عادت تفصیل سے جواب دیا۔

”لیکن آپ مجھے پہلے بتاتے نل، میں ارصم کا
 فنکشن دوپہر میں ارنج کروا لیتی۔“ وہ ٹھیک ٹھاک

بد مزاج ہوئیں۔

”اٹس اوکے“ آپ لوگ اپنا پروگرام جاری رکھیں، انشاء اللہ ارصم کی شادی پر سارے اردن پورے کر لیں گے۔“ انہوں نے لاپرواہی سے کہہ کر ٹی وی کا ری موٹ کنٹرول اٹھایا اور چینل سرچ کرنے لگے۔

”لیکن بڑے ابا! آپ کے بغیر کیا خاک مڑا آئے گا؟“ بینش پریشانی سے ان کے صوفے پر آن بیٹھیں۔

انہیں اب بڑے ابا کو جذباتی طور پر بلیک میل کرنا تھا جس میں وہ اکثر ہی کامیاب رہتی تھیں۔

”وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن میں ڈاکٹر منصور کو بھی منع نہیں کر سکتا، آپ اچھی طرح جانتی ہیں، میرے ان سے کتنے اچھے تعلقات ہیں۔“ انہوں نے بھی نرمی سے اپنی مجبوری بتائی۔

”وہ تو ٹھیک ہے، تیا ابا! لیکن آپ بچیوں کو تو مت لے کر جائیں۔ اوریدا کو تو آنا چاہیے ارصم کی منگنی میں، دونوں کی اتنی تو دوستی ہے۔“ بینش نے بھی آج اوریدا کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔

”آپ چلے جائیں ناں، بچیاں فنکشن اٹینڈ کر لیں گی۔“ انہوں نے مزے لیتے ہوئے مشورہ دیا۔ بڑے ابا نے چونک کر اوریدا کا ہر اسماں چہرہ دیکھا، وہ شدید اضطراب کا شکار لگ رہی تھی۔ انہیں پہلی دفعہ بینش کی سنگ دلی پر افسوس ہوا۔

”نہیں اوریدا کو تو میں کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا، اس کی بڑی اماں نے اسپیشلی فون کر کے کہا ہے کہ وہ ولیمہ پر ضرور جائے کیونکہ اس کے باپ کی فرمائش ہے یہ۔“ بڑے ابا کی بات پر اوریدا نے سکون کا سانس لیا۔

”چلیں مرضی ہے آپ کی۔“ وہ ناراض انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”بڑے ابا! گرین ٹی بناؤں آپ کے لیے؟ پھر ایک ٹاپک سمجھتا ہے آپ سے۔“ عدینہ نے بے تکلفی سے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئی۔

”ہاں ہاں بیٹا! کیوں نہیں، آج ایک اسپیشل آرٹیکل بھی ڈسکس کرنا تھا آپ سے۔“ بڑے ابا کا محبت بھرا انداز بینش کو سلگا کر رکھ گیا۔

”ٹھیک ہے تیا ابا! میں اب چلتی ہوں۔“ وہ نرمے انداز میں گویا ہوئیں۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، جا کر انتظامات دیکھو اور ہاں ارصم کو مبارک باد دینا میری طرف سے۔“ بڑے ابا کا لاپرواہ انداز ان کا دل جلا کر رکھ گیا، انہوں نے بیزارگی سے سر ہلایا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی لاؤنج سے نکل گئیں۔ عدینہ، بڑے ابا کو گرین ٹی دے کر اس کے ساتھ بیڈ روم میں آگئی تھی۔

”یہ خاتون بالکل تو نہیں ہیں۔“ عدینہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے تاگواری سے کہا۔

”کون۔۔۔؟“ ایک لمحے کو تو اوریدا بالکل نہیں سمجھی۔

”ارصم کی اماں حضور۔“ سخت شنسن میں بھی عدینہ کا دل جلا انداز اوریدا کے لبوں پر مسکراہٹ لے آیا۔

”یہ شروع سے ایسی ہی ہیں۔“ اس نے کمرے کے پردے ہٹاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

”اگر شروع میں ہی انہیں کسی اچھے سائیکالرسٹ کو دکھا دیا جاتا تو قسم سے بہت سے لوگوں کے مسئلے حل ہو سکتے تھے۔“ وہ اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی، جبکہ اوریدا کی نگاہیں لان میں سجائے گئے ہنڈال پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے سامنے اس کی متقل گاہ سچی ہو، جہاں آج اس کی چاہت اور محبت کو تختہ دار پر لٹکایا جانا ہو۔

”کیوں، خود کو اذیت دے رہی ہو۔“ عدینہ نے بازو پکڑ کر اسے بیڈ پر بٹھایا اور کھڑکی کے پردے برابر کر دیے۔

”مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا، ارصم میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے۔“ اس کی آواز عدینہ کو کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”محبت کے معاملے میں دنیا کے سارے مرد ایک

جیسے ہوتے ہیں اور جب انہیں اس چیز کا اور اک ہو جائے کہ کوئی لڑکی ان کے عشق میں گرفتار ہے تو وہ اس لڑکی کو اپنی آنکھ کے اشاروں پر چلا کر اپنی مرواگی کی تسکین کرتے ہیں۔ مرد ہر معاملے میں صرف حکمرانی چاہتا ہے، جہاں کوئی عورت اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی ہے وہیں اس کا جنون بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس کی صاف گوئی اور بیدار کا دل دکھا رہی تھی۔

”ارصم ایسا نہیں تھا۔۔۔“ اس نے جھجک کر صفائی دینے کی کوشش کی۔

”رہنے دو تم اچھی طرح پتا چل گیا ہے مجھے سخت زہر لگتے ہیں ایسے مرد جو عورت کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ عدینہ نے ناک چڑھا کر اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کیا۔

”وہ تو میرے ساتھ آخری حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”کون سی آخری حد؟ کسی لڑکی کو اپنی بزدلی کی سزا دینا کہاں کا انصاف ہے؟“ وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

”بزدلی کی۔“ اور بیدار نے الجھ کر اس کا بیزار چہرہ دکھا۔

”جب کوئی مرد اپنی محبت کے لیے اسٹینڈنڈ لے سکے اسے اپنے ہی گھر میں وہ مقام نہ دلا سکے جس کی وہ حق دار ہو، یہ اس کی بزدلی اور ناکامی ہی ہوتی ہے۔“ وہ سر جھٹک کر بیزار سے بولی۔

”لیکن اگر کوئی مرد اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر اسے اپناتا ہے تو یہ اس کی محبت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔“ اور بیدار نے فوراً اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”یہ میرے نزدیک محبت کا ثبوت نہیں بزدلی کی دلیل ہے۔“ وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھی۔

”وہ کیسے۔۔۔؟“ اور بیدار نے بحث کی۔

”کسی لڑکی کو چھپ کر نکاح کی ترغیب دلانا اور پھر اس پر عمل درآمد کروانے کا کام وہی مرد کر سکتا ہے جو اس کی خاطر زمانے والوں سے نہیں لڑ سکتا اور دنیا کی

احتمق ترین لڑکی وہی ہوتی ہے جو ایسے شخص کی محبت میں مدھی ہو کر اس کی پیروی کرتی جائے۔ جو اسے

اس کا جائز حق ناجائز طریقے سے دلا کر لوگوں کی انگلیوں کا رخ اس کی جانب کر دیتا ہے۔“ اس کی باتیں اور بیدار کے دل میں کھب کر رہ گئیں۔

”تمہیں پتا ہے گھر والوں کی مرضی کے خلاف بھاگ کر شادیاں کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟“

ساری زندگی وہ اس لیبل کو نہیں اتار سکتے، کل کو ان کی اولاد کو بھی اسی پیمانے میں پرکھا جاتا ہے۔“ عدینہ کی باتوں نے اس کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگا دی۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور بو رحمت ہانپتی کانپتی داخل ہوئیں۔

”بڑے صاحب کہہ رہے ہیں تیار ہو جائیں، آٹھ بجے نکلتا ہے۔“ انہوں نے پیغام پہنچایا۔

”میرا دل نہیں کر رہا بوا۔“ اور بیدار نے افسردگی سے جواب دیا۔

”یہاں بیٹھ کر دو سروں کے ڈھول ڈھکے سن کر کون سا دل خوش ہو گا۔“ بو رحمت کے انداز میں کچھ تھکا اور بیدار نے چونک کر ان کا بے غرض چہرہ دیکھا، وہ اس کے لیے خاصی فکر مند تھیں۔

”اچھا آپ چلیں، ہم لوگ تیار ہو کر آتے ہیں۔“ اس نے بوا کی پریشانی دور کرنے کے لیے کہا۔ اسی وقت اس کے سیل فون پر ماہیر کی کال آگئی، جو اس نے انتہائی بیزارگی سے اٹینڈ کی۔

”تم ٹھیک ہونا۔۔۔؟“ ماہیر نے کوئی تیسری دفعہ اس سے پوچھا تو وہ اچھا خاصا چڑھی گئی۔

”بھائی کیا پر اہلم ہے آپ کے ساتھ؟ آپ کو یقین کیوں نہیں آ رہا کہ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ برامان کر بولی تو دو سری جانب ماہیر گڑبڑا گیا۔

”دیکھو اور بیدار! ماما کی ڈتھ کے بعد میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ ہر ممکن تمہارا خیال رکھوں اور مجھے نہیں معلوم، میں اس کوشش میں کتنا کامیاب ہوا ہوں، لیکن بہت سی چیزیں جو مجھے ذاتی طور پر ناپسند بھی تھیں، میں نے صرف اس خیال سے تمہیں نہیں ٹوکا کہ تم ہرٹ ہوگی اور اب بھی میں

تم سے یہی کہوں گا کہ بعض معاملات کو اللہ پر چھوڑنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے سمجھانے کی غرض سے بولا۔

”بھائی! میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ وہ ایک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

”ضروری تھوڑا ہوتا ہے کہ ہر بات لفظوں میں ادا کی جائے۔“ وہ لاپرواہی سے گویا ہوا۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔؟“ وہ جھنجھلا گئی۔

”کسی لڑکی کے لیے اس کی عزت اور وقار سب سے اہم چیز ہونی چاہیے اور ان دونوں پر سمجھوتا کرنا خود کو دوسروں کی نظروں میں رسوا کرنے کے مترادف ہے۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بہت کچھ سمجھا گیا۔

”پاپا کی طبیعت کیسی ہے۔؟“ اوریدانے دانستہ بات کا رخ بدلا۔

”پہلے سے کافی بہتر ہیں اور ہم لوگ بہت جلد واپس آ رہے ہیں۔“

”اچھا کب۔؟“ وہ بے تابی سے گویا ہوئی۔

”ابھی کوئی چیز بھی فائنل نہیں ہے میں بتا دوں گا جیسے ہی کوئی پروگرام کفرم ہو گا۔“ ماہیر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو بڑی اماں سے بات کرو۔“ بڑی اماں نے بھی سلام دعا کے بعد چھوٹے ہی پوچھا۔ ”ارصم کی سنگتی پر کون کون جا رہا ہے؟“

”کوئی بھی نہیں۔“ اس کی بات نے بڑی اماں کو حیران کیا۔

”خیر تمہارے بڑے ابا تو ضرور ہی جائیں گے کوئی اور جائے نہ جائے۔“ وہ منہ بنا کر بیزاری سے بولیں۔

”بڑے ابا میرے اور عدینہ کے ساتھ انکل منصور کے پوتے کے ولیمہ پر جا رہے ہیں۔“ اوریدانے جھٹ سے اطلاع دی۔

”منصور احمد گرویزی کے پوتے کی بات کر رہی ہو نا۔“ انہوں نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

”ہاں ایک ہی تو فرینڈ ہیں بڑے ابا کے اس نام سے۔“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”ان کے پوتے کا ولیمہ تو کل رات ہو گیا ہے میں نے خود مسز منصور کو مبارک باد کا فون کیا تھا۔“ بڑی اماں کی بات پر اسے حیرانی کا جھٹکا لگا۔ کئی لمحے تک تو وہ بول ہی نہیں سکی۔

”ہو سکتا ہے وہ کوئی اور ہوں۔“ اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

”لو اب راتوں رات اور کون سا منصور آگ آیا زمین سے۔“ وہ برامان گئیں۔

”یہ تو اب بڑے ابا ہی بتا سکتے ہیں۔“ اوریدانے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی۔

”ہاں ہو سکتا ہے، لیکن یہ بات مجھے ابھی بھی ہضم نہیں ہو رہی، جلال صاحب، ارصم کا فنکشن کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟“ بڑی اماں کا لہجہ حیرانی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن انہیں یہ بات سمجھ میں آئی ہو یا نہ آئی ہو اوریدانے کو کافی حد تک آگنی تھی۔

وہ رات کو عدینہ اور بڑے ابا کے ساتھ باہر نکلی تو سامنے روشنیوں سے سجے بندال کو دیکھ کر اس کے زخم ہرے ہو گئے۔ اس کا خوش گھم دل ابھی بھی کسی انہونی کا منتظر رہا لیکن وہ انہونی شاید آج کی رات ان کے گھر کا راستہ بھول گئی تھی۔

”ہم نے تو کسی کے ولیمہ پر جانا تھا نا۔“ عدینہ نے اسلام آباد کلب میں داخل ہوتے ہوئے بڑے تعجب سے ڈاکٹر جلال کا چہرہ دیکھا۔

”میرا موڈ بدل گیا تھا سو چا آج بیٹھ کر کہیں مزے کا ڈنر کرتے ہیں۔“ انہوں نے مینو کارڈ اٹھاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ عدینہ کی آنکھوں میں تحیر کے رنگ ابھرنے لگے جبکہ اوریدانے اپنے ہی غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کھانے کے دوران بھی عدینہ اور بڑے ابا میڈیکل سے متعلق چیزوں کو ہی ڈسکس کرتے رہے، دونوں ہی اپنے پروفیشن کے معاملے میں جنونی تھے۔ جب کہ اوریدانے کا سارا دھیان اس فنکشن کی طرف تھا۔ جہاں ارصم اپنی زندگی کی نئی شروعات کا پہلا قدم اٹھانے جا رہا تھا۔

”اوریدانے! اپنا کھانا ختم کرو۔“ بڑے ابا نے اسے

کسی سوچ میں گم دیکھ کر ٹوکا تو وہ بے دلی سے کھانے لگی۔

”ارے ڈاکٹر جلال آپ...؟“ بڑے ابا کے ایک کولیگ انہیں اچانک ہی مل گئے تھے وہ ان کے ہمراہ گفتگو کرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔

”اور ید ا کیا ہو گیا ہے یار بی بیو...“ عدینہ نے افسردگی سے اس کا سوگوار چہرہ دیکھا۔

”پتا نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے...“ وہ اپنے شدید دکھی ہوئے جذبات پر بمشکل بند باندھ کر کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

”بے وقوف لڑکی! کیوں تماشا بناؤ گی اپنا...“ اس نے محبت بھرے انداز سے اسے ڈانٹا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرا داغ پھٹ جائے گا“ کیوں کر رہا ہے وہ میرے ساتھ ایسا؟“ اس نے نشو سے اپنی آنکھوں کو بے دردی سے رگڑا، لیکن آنسو آج بغاوت کے موڈ میں تھے اس لیے باہر نکل ہی آئے۔

”ٹینشن مت لو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ قدرے نرم لہجے میں اسے تسلی دے رہی تھی۔

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا“ مجھے پتا ہے۔“ بولتے ہوئے ایک دفعہ پھر اس کی آواز بھاری ہوئی۔

”اچھا اب رونا تو بند کرو، بڑے ابا پریشان ہو جائیں گے۔“ اس نے فکر مندی سے دوسری طرف دیکھا۔

ڈاکٹر جلال اپنے دوست کے ساتھ شاید باہر کی طرف نکل گئے تھے۔

”مجھے لگتا ہے بڑے ابا جان بوجھ کر ہمیں گھر سے نکل کر لائے ہیں وہ خود بھی اس فنکشن میں نہیں جانا چاہتے تھے۔“ عدینہ نے بے تکلفی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”ہاں مجھے اندازہ ہے۔“ اس نے نشو سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا۔ ”ایک ہی چیز تو میرے دل کو حوصلہ دے رہی ہے۔“

”لیکن وہ کیوں کر رہے ہیں ایسا۔“ عدینہ اس پہلی کو بوجھنے سے قاصر تھی۔

”کچھ بھی ہو، خون کے رشتے کہیں نہ کہیں تو اپنا

آپ منوا ہی لیتے ہیں۔“ وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے بعد وہ لوگ واپس آئے تو فنکشن اختتام پذیر ہو چکا تھا اور اب ملازمن ساری چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ اور ید ا نے دانستہ اس طرف دیکھنے سے پرہیز کیا اور بھرے دل کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلی آئی، آج کی رات اس کے لیے بہت بھاری تھی۔

”تم نے اچھا نہیں کیا اپنے ساتھ۔“ رات کا نہ جانے کون سا پھر تھا، جب آغا جی لان کی سیڑھیوں پر اس کے ساتھ آکر بیٹھ گئے۔ رات کے سناٹے میں ان کی آواز ارصم کے اعصاب پر کسی ہتھوڑے کی طرح لگی۔ اس نے زخمی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر افسردگی سے سر جھکا لیا۔ چاند کی روشنی میں وہ اس ٹھکے ہارے مسافر کی طرح لگ رہا تھا جو منزل پر آکر بٹک گیا ہو۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ اس نے اپنے پیروں پر خود اپنے ہاتھوں سے کھلاڑی ماری تھی۔ اب دل کو عجیب سی بے چینی لاحق ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ کئی فضا میں آکر بیٹھ گیا۔

”تو کیا کرتا...؟“ وہ کچھ افسردگی اور بے دلی سے بولا۔

”اگر کسی اور کے لیے اسٹینڈ نہیں لے سکتے تھے تو ارسلہ کے ساتھ انگریج منٹ پھر بھی نہیں کرنی چاہیے تھی تمہیں۔“ وہ ہنوز خشک لہجے میں گویا ہوئے۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں آغا جی۔“ ارصم کو شاک لگا۔

”مجھے تم سے اس قدر کم ہمتی کی توقع نہیں تھی، تمہیں اپنی ماں کو سمجھانا چاہیے تھا۔“ آغا جی کی بات پر اس کی پریشانی بڑھ گئی۔

”سب کچھ آپ کے سامنے ہی تو تھا آغا جی، میں نے انکار کیا اور می گا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا۔“ اس نے گھبرا کر وضاحت دی۔

”تم نے چیک کیا تھا اس کا بی بی۔؟“ انہوں نے
 خفگی سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں۔۔۔ وہ بوکھلا گیا۔“
 ”پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو۔؟“ وہ طنزیہ نگاہوں سے
 اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”وہ ماں ہیں میری، جھوٹ تھوڑا بولیں گی مجھ سے۔“
 وہ گڑبڑا سا گیا۔
 ”ٹھیک سے کل کو وہ کہے گی، ارسلمہ کے ساتھ باہر
 شفٹ ہو جاؤ تو کیا تب بھی چلے جاؤ گے؟“ آغا جی نے
 عجیب سے لہجے میں پوچھا۔
 ”ہرگز نہیں۔۔۔“ اسے کرنٹ لگا۔
 ”اور تب بھی تمہاری ماں کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا تو؟“
 وہ آج مکمل طور پر اس کی کلاس لینے کے موڈ
 میں تھے۔

”آپ نے بھی تو میرا ساتھ نہیں دیا۔“ وہ منہ بنا
 کر بولا۔
 ”تم نے تو پہلے ہی مرحلے پر ہتھیار ڈال دیے تھے،
 یہ ممکن اتنی بھی ضروری نہیں تھی، اگر تمہاری پھوپھو
 کو اتنی ہی چاہ تھی تو وہ دوبارہ بھی پاکستان آ سکتی تھیں،
 لیکن افسوس تم نے سمجھ داری کا مظاہرہ نہیں کیا۔“
 انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔
 ”آغا جی! میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔“
 اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔
 ”تو ٹھیک ہے اگر یہ فیصلہ کیا ہے تو پھر بھگانا بھی
 پڑے گا تمہیں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر اٹھ کھڑے
 ہوئے۔

ارصم نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا، وہ یہ بات ان
 کو کبھی بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ یہی سوچ تو اس کا سارا
 سکون غارت کر چکی تھی۔ آغا جی اسے مزید اجنبیوں
 میں مبتلا کر کے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ وہ
 بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹھیلنے لگا۔ اچانک اس کی نظر
 بڑے ابا کے پورشن کی طرف گئی، اس نے سراٹھا کر
 ان کے فرسٹ فلور کی طرف دیکھا۔ اور پیدائے کمرے
 کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ ٹھلٹھا ہوا ان کی طرف آ گیا

اور اسی سیڑھی پر آ کر بیٹھ گیا، جو اور پیدائے کی پسندیدہ جگہ
 تھی۔ بے شمار سوچوں نے اس کا دامن جکڑ رکھا تھا۔
 ابھی تو کسی اور کے ساتھ بندھے تعلق کو چند گھنٹے ہی
 گزرے تھے، پچھتاووں نے اسے چاروں طرف سے
 گھیر لیا تھا۔

”یہ میں نے کیا کر لیا۔۔۔“ وہ بے بسی کے کمرے
 احساس کے زیر اثر اپنے ہاتھ مسل رہا تھا۔ اسے
 احساس ہی نہیں ہوا، کب بڑے ابا کے پورشن کا مین
 دروازہ کھلا اور وہ سگار لیے باہر نکلے۔
 ”ارصم۔۔۔ تم۔۔۔“ انہیں باہر نکلتے ہی جھٹکا لگا۔
 ”السلام علیکم بڑے ابا۔۔۔“ اس نے گھبرا کر خفت
 زدہ انداز میں انہیں سلام کیا۔
 ”تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ان کا سپاٹ
 لہجہ ارسم کی روح خفا کر گیا۔

”کچھ نہیں بڑے ابا! نیند نہیں آرہی تھی، اس لیے
 ٹھلٹھا ہوا ادھر آ گیا۔“ اس نے گھبرا کر صفائی دی۔
 ”نیند نہیں آرہی تو کوئی ٹریکولائزر لیا اور سو جاؤ۔“
 ان کا لہجہ بڑا روکھا اور خشک سا تھا، ارسم نے حیرانی سے
 ان کی طرف دیکھا، جو اپنا سگار لیے لان کی روش پر ٹھل
 رہے تھے۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ ان کے انداز
 میں ایک محسوس کی جانے والی بے رخی ہے۔
 ”آپ کیوں جاگ رہے ہیں اس وقت۔۔۔؟“ وہ
 کچھ سوچ کر ان کے پاس آ کر فکر مندی سے بولا۔

”جن گھروں میں جوان بیٹیاں ہوں، وہاں بوڑھے
 والدین کی نیندیں ایسے ہی اڑ جاتی ہیں۔ کوئی پتا تھوڑی
 چلتا ہے، کون کس وقت چور دروازے سے اندر داخل
 ہو کر آپ کی عزت سے کھیل جائے۔“ بڑے ابا کا لہجہ
 جتنا ہوا اور آنکھوں میں اس قدر سرد مہری تھی کہ
 ارسم کے لیے ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہو گیا۔
 اس نے بوکھلا کر بڑے ابا کا چہرہ غور سے دیکھا،
 جہاں آج اس کے لیے اجنبیت بے گاہی اور خفگی کے
 سوا کچھ نہیں ہوتا۔

”بڑے ابا! آپ مجھ سے خفا ہیں کیا۔۔۔؟“ اس کے
 منہ سے بے اختیار پھسلا۔

”میں تم سے کیوں خفا ہوں گا۔۔۔؟“ انہوں نے جواباً ”طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف ایسے دیکھا کہ ارصم کو ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا ہوا محسوس ہوا۔ وہ لہے لہے ڈگ بھرتا ہوا اپنے پورشن کی طرف بڑھ گیا۔

”بڑے ابا بھی اس مقلنی کی وجہ سے ناراض ہو گئے ہیں مجھ سے۔۔۔“ وہ اپنے پورشن کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

”ہائے ارصم۔۔۔“ اس نے جیسے ہی ٹی وی بلاؤنج میں قدم رکھا، صوفے کے اندر دھنسی ہوئی ارسلہ اسے دیکھ کر پرجوش ہوئی۔ اس نے تنگ جینز کے اوپر چھوٹا سا ٹاپ پہن رکھا تھا۔ ارصم نے بے ساختہ اپنی نظریں ٹی وی کی طرح مبذول کیں وہاں انگلش قلم کا ایک بے ہودہ سا منظر چل رہا تھا۔

”استغفر اللہ۔۔۔“ اس نے جلدی سے ریموٹ اٹھا کر چینل تبدیل کیا۔ ”تم کیا فضولیات دیکھتی رہتی ہو؟“ اس نے منہ بنا کر ناگواری کا اظہار کیا۔

”ان تھرڈ کلاس پاکستانی پولیٹیکل شوز سے تو اچھی ہی ہوتی ہیں یہ موڈینس۔“ ارسلہ کو بھی غصہ آ گیا۔

”مجھے سخت ناپسند ہیں ایسی چیزیں۔۔۔“ اس نے ریموٹ کنٹرول صوفے پر اچھالا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

”جسٹ آمنٹ ارصم۔۔۔“ وہ بھاگ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”فرمائیے۔۔۔“ اس نے اپنے اندر بے ساختہ اٹھتی ہوئی ناگواری کی لہر کو بمشکل دبایا۔

”میں آج کے فنکشن میں کیسی لگ رہی تھی؟“ وہ اپنی ناراضی بھلائے بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”اچھی۔۔۔“ اس نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑانا چاہی۔

”سب کہہ رہے تھے پریل کلر مجھ پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔“ اس نے تحریہ لہجے میں گردن اٹھا کر کہا۔

”تم نے آج پریل کلر پہنا تھا کیا۔“ ارصم کے منہ

سے بے ساختگی میں نکلنے والا یہ جملہ ارسلہ کا چہرہ تاریک کر گیا۔

”کیا تمہیں یہ بھی نہیں پتا میں نے آج پریل کلر کی میکسی پینٹی بھی؟“ وہ جھنجھلا گئی۔

”نہیں تو۔۔۔“ خطرے کی کھنٹی ارصم کے ذہن میں بجی۔

”جھوٹ مت بولو، ممی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔۔۔ تمہارا ذہن کہیں اور تھا پورے فنکشن میں۔“ وہ خفا ہوئی۔

”ناٹ ایٹ آل یار، ایسا کچھ نہیں ہے، بس کلرز کے معاملے میں مجھے کچھ پتا نہیں چلتا، سارے ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔“ اس نے گھبرا کر صفائی دی، دوسری صورت میں اسے پتا تھا کہ ارسلہ اتنی آسانی سے یہ بات ہضم نہیں کرے گی۔

”تم سچ کہہ رہے ہوتاں۔۔۔“ اس نے بے یقین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آف کورس یار، بے شک ممی سے پوچھ لینا۔“ اس نے دانستہ لاروا انداز اپنایا۔

”اچھا، پھر ٹھیک ہے۔“ وہ کچھ مطمئن ہوئی تو ارصم نے سکون کا سانس لیا۔

”بات سنو، تمہاری کزن اور اس کے گرینڈ فادر کیوں نہیں آئے تھے فنکشن میں؟“ اس کی اگلی بات نے پھر ارصم کا سارا سکون دور ہم برہم کر دیا۔

”وہ لوگ کہیں اور انوائٹڈ تھے۔“ اس نے نظریں چڑا کر وہی بات دہرائی، جو پیش بیگم پورے فنکشن میں سب کے سامنے کہہ رہی تھیں، یہ اور بات وہ پوری تقریب میں بڑے ابا کے نہ آنے پر بری طرح تلملاتی رہی تھیں۔

”یہ کیا بات ہوئی، ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے انہیں سب سے پہلے تمہیں امپورٹنس دینی چاہیے تھی۔“ ارسلہ نے بر ملا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

”بھئی، اس ٹاپک پر صبح بات کر لیں گے، میں بہت تھک چکا ہوں۔“ ارصم نے اس سے جان چھڑانے کے لیے جمائی لی اور فوراً ”سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

ارسلہ کو شدید کوفت کا احساس ہوا اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی دوبارہ ٹی وی لاؤن جج کی طرف بڑھ گئی اور صدمہ سے پار پارایوس کر رہا تھا۔



بادلوں نے صبح سے آسمان پر ڈبرے جمار کھے تھے۔ موسم کی خوب صورتی بھی اس گھر کے مکینوں کے دلوں پر کوئی خوشگوار اثر چھوڑنے سے قاصر تھی۔ بندیا ابھی ابھی اپنے لوہے کے ٹرنک کے ساتھ گاؤں سے دوبارہ شہر پہنچی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک محسوس کی جانے والی کوفت نما بے زاری تھی۔

”خیر ہے تمہاری اماں نے کہیں اس دفعہ پٹائی تو نہیں کر دی تمہاری؟“ بینش نے اپنے مخصوص ٹیکے انداز میں اسے چھیڑا۔

”نہیں۔“ اس نے اپنے لوہے کے صندوق سے کپڑے نکالتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”منشی بچا ہمارے تھے تمہاری منگنی ہو گئی ہے۔“ بینش نے وہ جبریک کر ہی دی تھی جو وہ اس سے چھپانا چاہ رہی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے مختصراً جواب دیا۔

”تمہاری انگریج منٹ رنگ کہاں ہے۔“ بینش تجسس کے ہاتھوں ججور ہو کر اس کے پاس چلی آئی۔

”وہ تو آتے ہوئے اماں نے لے لی تھی۔“ اس نے بے خیالی میں بتایا۔

”لو منگنی تمہاری ہوئی ہے یا تمہاری اماں کی۔“ بینش استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ”ہاں انہوں نے سوچا ہو گا اتنی قیمتی چیز شہر میں کہیں کم ہی نہ ہو جائے گولڈ کی تھی نال رنگ۔“ وہ مزے سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”ہاں۔“ وہ افسردگی سے اپنے کپڑے الماری میں لٹکانے لگی۔

”ارے یہ تمہارا شگن کا جوڑا ہے کیا۔“ اس نے ایک سرخ رنگ کا ٹشو کا دوپٹا اٹھایا جس پر سنہری رنگ کی کرن لگی ہوئی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ! تم نے یہ دوپٹا اوڑھا تھا۔“ وہ منہ پر

پڑا اور زہا تھا۔

وہ منہ پر

ہاتھ رکھ کر زور زور سے ہنسنے لگی، کمرے میں داخل ہوتے تیسور نے یہ منظر بہت ناگواری سے دیکھا۔

بندیا کی آنکھوں میں شہرے ہوئے آنسو اور بینش کا تضحیک آمیز انداز اسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا اسے

اندر آتے دیکھ کر بینش کی ہنسی یکدم رکی، وہ بہت دن بعد ان کے پورشن کی طرف آیا تھا۔ بندیا کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔ وہ دانستہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”ارے تیسور تم۔۔۔؟“ بینش بے تالی سے کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی جگنو جھکے۔

”بندیا! تمہیں اماں بلا رہی ہیں۔“ وہ بینش کو نظر انداز کر کے اس سے مخاطب ہوا تو وہ لو کھلا کر مڑی۔

”تمہیں پتا ہے بندیا کی منگنی ہو گئی ہے اور کچھ عرصے بعد شادی۔“ بینش نے تیسور کے اعصاب پر ہم

گرایا۔

”اچھا مبارک ہو۔“ وہ خشک انداز میں گویا ہوا تو

بینش پر گھڑوں پانی پھر گیا۔

”میں جا رہا ہوں کچھ دیر بعد آجانا۔“ وہ جلدی سے مڑ گیا۔

”تائی اماں کیوں بلا رہی ہیں اسے۔“ بینش کے

کلن کھڑے ہوئے۔

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں، ولیہ، خوانا ہے جو کم از کم تمہیں تو بتانا نہیں آتا ہو گا۔“ وہ اس کی طنزیہ بات پر شفقت کا شکار ہوئی۔

”ظاہر ہے ایک میڈیکل کی اسٹوڈنٹ کو کہاں آتے ہوں گے ایسے کام۔“ اس نے ہلکا سا سنبھل کر

صغائی دی۔

”بندیا! جلدی آجانا تم۔۔۔“ وہ مڑے بغیر دوبارہ بولا اور کمرے سے نکل گیا۔

”تھینکس گاڈ“ اس کا موڈ کچھ تو بہتر ہوا۔ پتا ہے آج کتنے دنوں کے بعد اس نے مجھ سے بات کی ہے۔“ وہ اپنی ہی دھن میں خوشی سے بولی۔

”ہوں۔“ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”ایک تو تم گاؤں چلی گئیں، اوپر سے تیسور کوئی لفٹ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

نہیں کروا رہا تھا مجھے، مت پوچھو، کتنی یور ہوئی ہوں میں پچھلے دنوں۔“ وہ منہ بنائے گزشتہ دنوں کا احوال بتانے لگی، بندیا نے جلدی جلدی کپڑے سمیٹنے شروع کیے، اس کا تمام تر دھیان تیمور کی طرف تھا۔

”تالی اماں کی طرف جا رہی ہو کیا۔؟“ وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی، جب بینش نے اسے پیچھے سے پکارا۔

”ہاں۔۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”جلدی واپس آجانا، پھر اکٹھے مل کر چائے پیئیں گے۔“ بینش کا موڈ آج کافی خوشگوار تھا۔ وہ سر ہلا کر عجلت بھرے انداز میں گھر سے نکل آئی، جیسے ہی وہ اپنا لان عبور کر کے تیمور کی طرف آئی، وہ لان میں کھڑا پائپ سے پودوں کو پانی دے رہا تھا، اسے دیکھ کر اس نے پائپ زمین پر پھینکا، پانی کا ٹل بند کیا اور اس کے پاس چلا آیا۔

”اماں نے نہیں بلایا، مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی۔“ وہ خاصا سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”کیا ہوا۔۔؟“ بندیا کا دل بری طرح دھڑکا۔

”ادھر آؤ میرے ساتھ۔۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر گھر کے پچھلے حصے کی طرف لے آیا، وہاں ایک چھوٹا سا لان تھا، جہاں قطار میں کئی درخت لگے ہوئے تھے، وہ دونوں شیشم کے ایک نئے درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔

”میرے والدین نے میری منگنی کر دی ہے۔۔“ وہ اپنے ہاتھوں کو مسلتی ہوئی تیمور کو خاصی پریشان لگی۔

”کوئی بات نہیں، ادھر بابا بھی میرے نکاح کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“ تیمور کے انکشاف پر اس نے ہر اسماں نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

”پھر اب کیا ہو گا۔؟“ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”فکر مت کرو، میں آج بڑی اماں سے بات کروں گا۔“ اس نے نرم لفظوں سے اسے دلاسا دیا۔

”لیکن میرے امی، ابا تو کبھی بھی نہیں مانیں گے۔“ بندیا نے اسے کسی غلط فہمی میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

”مجھے معلوم ہے، کیونکہ فشی چاچا جانتے ہیں، میری اور بینش کی بات چیت طے ہے اور وہ مر کر بھی تمہارا رشتہ نہیں دیں گے ہمیں۔“ وہ ضرورت سے زیادہ آگاہ تھا، اس کی بات پر بندیا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”پھر سب کچھ کیسے سیٹ ہو گا؟“

”ہمیں کوئی بولڈ اسٹیپ لینا ہو گا۔“ وہ پُر اعتماد انداز میں بولتا ہوا اس کے چھکے چھڑا گیا۔

”میں ڈیزنی باجی کی طرح بہادر نہیں ہوں۔۔“ وہ گھبرا سی گئی۔

”میں اماں کو اعتماد میں لوں گا۔“ اس کی بات نے بندیا کو بوکھلادیا۔

”تالی اماں کو۔“ اس نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

”ہاں۔۔“ وہ مطمئن انداز میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”پلیز ایسا مت سمجھو گا، وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گی۔“ بندیا کو ایک نئی فکر لاحق ہو گئی۔

”ڈونٹ وری، وہ تمہارے مزاج کو اچھی طرح جانتی ہیں۔“ اس نے مسکرا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”لیکن۔۔“ وہ ابھی تک جو اس باختہ تھی۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں، تم مجھ پر بھروسہ رکھو بندیا۔“ ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے شرارت سے شیشم کا ایک بھاری بتا بلایا، کئی پتے ایک ساتھ دونوں پر آن کرے، بندیا، ایک دم ڈر کر ہلکا سا پیچھے ہٹی، تیمور قہقہہ لگا کر ہنسا اور نستاہی چلا گیا۔



اس ویک اینڈ پر عدینہ بغیر بتائے ہی گھر آ گئی تھی۔ شام کا وقت تھا جب اس نے گھر میں قدم رکھا، نضاؤں میں مغرب کی اذانیں گونج رہی تھیں۔ آیا صالحہ وضو کر کے غسل خانے سے نکلیں اور اندر داخل ہوتی عدینہ کو دیکھ کر انہیں جھٹکا لگا، جبکہ دوسری طرف عدینہ، آیا صالحہ کا نقاہت زدہ وجود دیکھ کر ایک دم حیران ہوئی، اس

نے ہاتھ میں پکڑا بیگ زمین پر پھینکا اور عجلت بھرے انداز میں ان کے پاس پہنچی۔

”آپا کیا ہوا ہے آپ کو طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ اس نے فکر مندی سے جلدی سے ہاتھ لگا کر ان کا ہاتھ چھوا، آپا صالحو کو مسیحا کی تاثیر روح تک اترتی محسوس ہوئی۔

”ہاں ہاں ٹھیک ہوں“ معمولی سا زلزلہ زکام ہے۔“ آپا صالحو نے دانستہ لاپرواہ انداز اپنایا۔

”لیکن کب سے ہے۔؟“ وہ ان کا بازو پکڑ کر پریشانی سے برآمدے میں لے آئی۔

”پچھلے ایک ہفتے سے۔“ عدینہ کے چہرے پر پھیلے فکر کے سائے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے وضاحت دی۔

”موسم بھی تو تبدیل ہو رہا ہے ناں۔“

”آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا“ میں اوریدا کے دادا سے اچھی سی میڈیسن لکھوا دیتی۔“ وہ ان کے ساتھ برآمدے میں رکھے لکڑی کے تخت پر بیٹھ گئی۔

”اچھا، اب لکھوا لیتا، پہلے یہ عبا یہ تو اتار لو۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”مجھے تو آپ کی شکل دیکھ کر شاک لگا ہے، لگتا ہے آپ کا ایچ جی بھی خاصا کم ہے، رنگ دیکھا ہے آپ نے اپنا۔“ وہ بے تکلفی سے اپنا عبا یہ اتارتے ہوئے پریشانی کا اظہار کر رہی تھی۔

”ارے عدینہ باجی آپ۔“ کچن سے نکلنے والا اسے دیکھ کر ایک دم خوش ہوئی۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں آیا بیمار ہیں۔“ وہ اس پر خفا ہوئی۔

”میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔“ موننا نے آپا کی تنبیہی نظروں سے گھبرا کر جھوٹ بولا۔

”تمہاری یادداشت دن بہ دن کچھ زیادہ خراب نہیں ہوتی جارہی ہے صبح و شام باوام بھگو کر کھایا کرو۔“

عدینہ نے اس کی کلاس لی۔

”موننا! عدینہ کے لیے کھانا لاؤ۔۔۔؟“ آپا صالحو نے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کروانے کے لیے

کہا۔

”کھانا نہیں، صرف چائے پیوں گی، وہ بھی کڑک سی“ عدینہ کا دھیان بٹ گیا تھا۔

”اچھا، پہلے آپ کا بیگ اندر رکھ آؤں۔“ موننا نے بھاگ کر اس کا سامان اٹھایا اور اگلے ہی لمحے اس کی کمر دہری ہوئی۔ ”استغفر اللہ عدینہ باجی! کیا اس بیگ میں اینٹیں بھر کر لائی ہیں آپ؟“ اس نے غصے سے بیگ زمین پر رکھ دیا۔

”اینٹیں نہیں، میڈیکل کی بھاری بھاری کتابیں ہیں، تم رکھ دو اسے، میں خود اٹھالوں گی۔“ عدینہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

”کتنے دن کے لیے آئی ہو۔؟“ آپا صالحو نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

”دو دن کے لیے۔“ اس کے جواب پر وہ کچھ مطمئن ہوئیں۔

کھانا کھا کر اس نے نماز پڑھی اور آپا صالحو کے کمرے میں چلی آئی، وہ ہلکا سا کھیس اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں، اس کے آنے سے پہلے آپا نے اپنی ساری ادویات الساری میں چھپا کر رکھ دی تھیں۔ وہ عدینہ کو اپنی بیماری کے سلسلے میں مشکوک نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

”آپ کی میڈیکل فائل کہاں ہے؟“ اس کی بات پر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔

”تم نے کیا کرنی ہے؟“ انہوں نے کوجتی نگاہوں سے اپنی بیٹی کا سادہ سا چہرہ دیکھا، وہ ان کے پاس آ بیٹھی تھی۔

”سوج رہی ہوں، اس دفعہ ساتھ لے جاؤں اوریدا کے دادا کو دکھاؤں گی۔“

”تو جاتے ہوئے لے جانا، ابھی تو ریٹ کر لو، سفر کر کے آئی ہو۔“ انہوں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”آپ کے پاس لیٹ جاؤں۔“ اس کے معصومانہ انداز پر وہ مسکرا دیں۔

”مسکرا کیوں رہی ہیں آپ۔؟“ وہ فوراً مشکوک

ہوئی۔

”اس لیے کہ ایسی کوئی فرمائش تم نے کبھی بچپن میں بھی نہیں کی تھی، جواب کرنے لگی ہو۔“ انہوں نے بھی بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔

”بچپن میں تو مجھے آپ سے ڈر ہی بہت لگتا تھا۔“ وہ جلدی سے ان کے پاس آکر لیٹ گئی، ”آپ نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ وہ ان کے ساتھ تقریباً پلٹ ہی گئی تھی۔“

”کیوں اب نہیں لگتا کیا۔؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں اب نہیں لگتا۔“ اس نے آیا کا ہاتھ پکڑ کر بوسا لیا۔ آیا کو اس کے لمس نے گہری طمانیت کا احساس بخشا تھا۔ کمرے میں ایک معنی خیزی خاموشی کے لمحات ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔

”آپ! آپ کو ایک بات بتانی تھی۔“ وہ ان کے کانوں میں سرگوشی کے انداز میں بولی۔

”ہاں بولو۔“ نہیں اس کا انداز غیر معمولی سا لگا۔ ”پہلے وعدہ کریں، مجھ سے خفا نہیں ہوں گی۔“ آیا صالحہ بے چین ہوئیں۔

”کیا بات ہے عدینہ! پہیلیاں کیوں بھجوا رہی ہو؟“ انہوں نے عجلت بھرے انداز میں کہا۔

”آپ وعدہ کریں۔“ آیا کو وہ آج پانچ سال کی معصوم بچی لگی تھی۔

”اچھا نہیں ہوئی۔“ انہوں نے بادل نحواستہ کہا۔ جب کہ عدینہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”آپ کو پتا ہے کیا۔؟“ وہ رکی۔

”کیا بولو ناں۔؟“ انہیں عجیب سی بے چینی لاحق ہوئی۔

”عبداللہ زندہ ہے۔“ عدینہ کے تین لفظی جملے پر انہیں شاک لگا۔ ایک لمحے کو تو انہیں لگا جیسے انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

”کون زندہ ہے۔؟“ آیا صالحہ کی آواز اسے کنوس میں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، کمرے میں چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوتی مونا بھی تجسس سے مجبور ہو

کر دروازے میں رک گئی۔

”عبداللہ۔“ عدینہ نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔ مونا بوکھلا کر اندر چلی آئی، اسے لگا تھا جیسے چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی۔ اس نے جلدی سے ٹرے میز پر رکھی اور ان کے پلنگ کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ آیا صالحہ نے سنبھل کر ساٹ لہجے میں پوچھا۔ انہوں نے کوئی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا، عدینہ کو تھوڑی سی ہاپوسی ہوئی۔

”ایک سڑک پر اچانک ملاقات ہوئی تھی میری۔“ عدینہ کی بات پر بھی ان کا چہرہ ساٹ رہا۔

”پھر وہ میرے کالج بھی آیا تھا۔“ اس بات وہ تھوڑا بے چین ہوئیں۔

”لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ وہ دوبارہ وہاں نہ آئے۔“ اس کے جملے نے آیا کی ڈوبتی ابھرتی نبضوں کو زندگی کا احساس بخشا۔

”میں نے اچھا کیا نا؟“ عدینہ نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا۔ آیا کے چہرے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ جبکہ مونا کا چہرہ ناراضی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

وہ احتجاجی نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی، جو اب بڑے مطمئن انداز سے آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ جبکہ آیا صالحہ کا سارا سکون بریاں چوچکا تھا۔



شائستہ بیگم کے لب حیرت کی زیادتی سے کھلے اور پھر بند ہونا بھول گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوف، حیرت اور پریشانی کے ملے جلے رنگ تھے، وہ بے یقینی سے تیمور کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جس نے تھوڑی دیر پہلے ہی ان کی سماعتوں میں صور پھونکا تھا۔

”پاکل تو نہیں ہو گئے ہو۔“ وہ بوکھلا کر ننگے پاؤں اٹھیں اور اپنے بیڈروم کا دروازہ اندر سے لاک کیا، اس پر بھی بس نہیں چلا تو کھڑکیوں کے پردے بھی اچھی طرح آگے کر دیے تھے لیکن ابھی بھی ان کے اندر ایک بھونچال برپا تھا۔

”میں کسی قیمت پر بھی بینش سے شادی نہیں کروں گا۔“ اس کا لہجہ بے لچک تھا۔
 ”لیکن بینش کی جگہ بندیا۔“ انہیں یہ بات بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ ”تمہارا باپ زندہ زمین میں دفن کر دے گا تمہیں۔“ انہوں نے اسے ڈرانا چاہا۔
 ”تو ٹھیک ہے، میں پھر لندن میں اپنی ایک انگریز کلاس فیلو سے شادی کر لوں گا۔“ تیمور کی اگلی تجویز پر انہیں ایک زوردار کرنٹ لگا۔
 ”کون سی کلاس فیلو۔“ وہ ایک دفعہ پھر بوکھلائی۔

”میرے ساتھ پڑھتی ہے اور پسند کرتی ہے مجھے۔“ وہ سپاٹ انداز سے گویا ہوا۔
 ”جیسا سالی ہے وہ۔“

”ہاں۔“ اس نے نظریں چرا کر کہا۔
 ”کس کا ہو گیا ہے تیمور تمہیں کیا تم بہن بھائیوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ اپنی ہاں کو کوئی خوشی نہیں دو گے؟“
 وہ خفا ہوئی۔ ”شرم آتی جا رہی ہے تم سب کو۔“
 ”اس گھر میں رہ کر آپ کی کسی اولاد کو کوئی خوشی نہیں ملے گی۔“ وہ حد درجہ بدگمان تھا۔

”لیکن بندیا کا باپ کسی بھی تمہارے چچا سے وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔“ انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔
 ”اس لیے اس کا خیال بھی دل سے نکال دو۔“
 ”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ آپ کسی مولوی کو بلوا کر نکاح پڑھو، دس میرا ایک ڈیڑھ ماہ میں۔ میں بندیا کے ڈاکو منٹس تیار کروا کر لے آؤں گا اور ہم لوگ ناموشی سے یہاں سے چلے جائیں گے۔“ اس نے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔

”دلغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟ میں کسی کی بچی کے ساتھ ایسا کیوں کروں؟“ وہ ٹھیک ٹھاک برا منا گئیں۔
 ”تو پھر ٹھیک ہے تیار ہو جائیں، آپ کے میاں صاحب نے آپ کی اولاد کے ساتھ برا کرنے کا پورا پروگرام ترتیب دے دیا ہے۔“ وہ تلخ انداز میں گویا ہوا۔
 ”آپ کو بتا ہے ابانے طیبہ کا رشتہ سلیمان چچا کے

بڑے بیٹے سے ملے کر دیا ہے، جو ایف اے فیل ہے۔“ تیمور نے ان کی سماعتوں پر ایک اور نم گرایا۔
 ”کیا صلاح الدین سے۔“ ان کا رنگ فق ہوا۔
 صلاح الدین ان کے میاں کے کزن کا بیٹا تھا۔
 ”ہاں صلاح الدین سے جو طیبہ سے پورے سترہ سال بڑا ہے اور بلایا میرے جانے سے پہلے پہلے طیبہ کا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔“ تیمور ناراضی سے کمرے میں ٹھلنے لگا۔ انہیں پہلی دفعہ اس کی پریشانی کھل کر سمجھ میں آئی۔

”تمہیں کس نے بتائی ہیں یہ ساری باتیں۔“ انہیں یقین نہیں آیا۔

”میں نے خود اپنے کانوں سے سنی ہیں انہوں نے سلیمان چچا کو کل اپنے اسپتال میں بلوا رکھا تھا۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوا۔

”کیا سلیمان بھائی مان گئے۔“
 ”ظاہر ہے ان کے تالاق بیٹے کو گھر بیٹھے ایک ڈاکٹر لڑکی کا رشتہ مل رہا ہے، وہ کیوں انکار کریں گے۔“ تیمور نے برا سامنہ بنایا۔

”لیکن تمہارے باپ نے مجھ سے تو کوئی ذکر نہیں کیا اور طیبہ کا بھلا کیا جوڑ بناتا ہے صلاح الدین سے۔“ ان کی تیوری کے بل کمرے ہوئے۔

”اب وہ ڈیزیزی کی غلطی کی سزا ہم سب لوگوں کی بے جوڑ شایاں کر کے دیں گے ہمیں اور آپ کو بھی عین نام پر بتائیں گے، تاکہ کوئی احتجاج بھی نہ کر سکے۔“ وہ ان سے ٹھیک ٹھاک ناراض تھا۔ اس کا اظہار اس کے لہجے سے بخوبی ہو رہا تھا۔

”دلغ خراب ہو گیا ہے تمہارے باپ کا اپنی انیس سال کی بیٹی کی شادی اس لفظ کے زمین دار سے کریں گے۔“ انہیں غصہ آیا۔

”آپ جتنا مرضی شور مچالیں، لیکن ہو گا وہی جو وہ چاہیں گے۔“ تیمور نے ان کو تلخ حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ تھوڑا نرم ہوئیں، اس بات کا احساس تو انہیں بھی اچھے طریقے سے تھا۔ ڈیزیزی کے غلط فیصلے کے بعد دونوں میاں بیوی کے درمیان اچھے خاصے فاصلے بڑھ

گئے تھے ڈاکٹر جلال کو لگتا تھا کہ ڈیزی کی تربیت میں جو
کی رہ گئی تھی اس میں سراسر قصور ان کی بیوی کا ہے۔
اس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے۔

اگلے ہی دن ڈاکٹر جلال نے شائستہ بیگم کو اپنے
کمرے میں بلوایا، وہ ذہنی طور پر تیار تھیں لیکن اس
کے باوجود انہیں ایک دفعہ پھر دھچکا لگا تھا۔ وہ دو ٹوک
انداز میں اپنا فیصلہ شائستہ بیگم کو سنا کر سگار سلگانے
لگے، جبکہ شائستہ بیگم کا سارا ہی وجود سلگ کر رہ گیا۔
”طیبہ اور صلاح الدین کی عمروں کا فرق دکھا
ہے۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوئیں۔

”خاندان میں رشتے کرتے ہوئے ایسی چیزیں نہیں
دیکھی جاتیں۔“ انہوں نے فوراً ہی یہ اعتراض رد
کر دیا۔

”وہ میڈیکل کے پہلے سال میں ہے۔ اسے سکون
سے پڑھنے تو دیں۔“ اس دفعہ ان کے لہجے میں ناگواری
کا عنصر شامل ہوا۔

”تمہارا کیا خیال ہے اسے بھی موقع دے دوں کہ
وہ جب چاہے اپنے باپ کی عزت اپنے پیروں میں
روندے اور کسی کے ساتھ منہ کالا کر کے بھاگ
جائے۔“ وہ مشتعل انداز میں گویا ہوئے۔

”طیبہ ایسی نہیں ہے۔“ انہوں نے کمزور لہجے میں
اپنی سب سے چھوٹی اولاد کا دفاع کرنا چاہا۔
”تو کیا ڈیزی کے ہاتھ پر لکھا ہوا تھا کہ وہ ایسی
ہے؟“ ان کے لہجے میں طنز کی آمیزش شامل ہوئی۔

”اس کی پڑھائی ڈسٹرب ہو جائے گی اور پھر طیبہ کو
کہاں عادت ہے گاؤں کے ماحول میں رہنے کی۔“ اس
دفعہ انہوں نے محتاط انداز اپنایا۔

”سلیمان نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ طیبہ کو
پڑھائی سے منع نہیں کرے گا۔“ ان کے پاس سارے
سوالوں کے جواب تھے۔

”پھر بھی آپ ایک دفعہ اور سوچ لیں۔“ ان کا دل تو
برا ہو ہی چکا تھا لیکن وہ پھر بھی مشورہ دینے سے باز نہیں
آئیں۔

”میں نے جتنا سوچنا تھا سوچ لیا اب مزید سوچنے

کی کوئی گنجائش نہیں۔“ انہوں نے فوراً ہی انکار کیا۔
”تو پھر مجھ سے کیوں مشورہ کر رہے ہیں۔“ ان کو
بھی غصہ آیا۔

”مشورہ نہیں کر رہا، تمہیں بتا رہا ہوں، جو شاپنگ
کرنی ہے، کر لو، مجھے تیمور کے جانے سے پہلے طیبہ کا
نکاح کرنا ہے۔“ انہوں نے بے چلک لہجے میں کہا تو وہ
ناراضی کے اظہار کے طور پر چپ کر گئیں۔

جیسے ہی یہ خبر طیبہ تک پہنچی اسے سن کر شاک ہی تو
لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی قوت گویا کی سلب ہو گئی
ہو، کچھ لمحے صدمے کے زیر اثر رہنے کے بعد اس نے
شکوہ کنناں نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

”اماں، ڈیزی باجی کے کیے کی سزا، بابا مجھے کیوں
دے رہے ہیں۔“ اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔
”میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹا، وہ تو کچھ بھی سننے کو تیار
نہیں، میں نے بہت بحث کر کے دیکھ لی ان سے۔“

انہوں نے بے بسی سے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا۔
”وہ اچھا نہیں کر رہے میرے ساتھ۔“ طیبہ کی
آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

”میں کیا کروں میری بیٹی! ایسا لگتا ہے جیسے یہ زندگی
نہیں دو دھاری تلواری ہے، میری ساری کی ساری اولاد
ہی بد قسمت نکلی۔“ وہ بھی دوپٹا منہ پر رکھ کر رونے
لگیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مور نے ان کا یہ جملہ
بشور سنا تھا۔

”میں بتا رہا ہوں اماں! میں اپنی زندگی سے کسی کو
بھی کھیلنے نہیں دوں گا۔“ وہ خفگی بھرے انداز میں ان
کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”تو کیا کرو گے تم۔“ انہوں نے بھیگے لہجے میں
پوچھا۔

”بتا رہا ہوں، اگر بابا نے میرے ساتھ زبردستی
کرنے کی کوشش کی تو خدا کی قسم ان کے ساتھ ساتھ
آپ کو بھی ساری زندگی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔“

تیمور کے لہجے میں کچھ تھا جس نے شائستہ بیگم کو اوپر
سے لے کر نیچے تک ہلا دیا۔

”اس میں میرا کیا قصور ہے۔؟“ وہ گھبرا گئیں۔

”جب آپ کے مجازی خدا اپنے بچوں پر اپنے فیصلے زبردستی مسلط کر سکتے ہیں تو آپ میری خوشیوں کی خاطر میرا ساتھ نہیں دے سکتیں۔“ وہ زخمی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہارا باپ جان سے مار دے گا مجھے۔“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولیں۔

”میں نے کہا تھا، آپ کا نام کبھی بھی میرے لبوں پر نہیں آئے گا، میں مر جاؤں گا لیکن یہ راز کبھی نہیں کھولوں گا۔“ تیمور نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”آپ لوگ کس چیز کے متعلق بات کر رہے ہیں۔“ طیبہ اپنا غم بھول کر پریشان ہوئی۔

”بتادیں گے تمہیں بھی۔ فی الحال تم اٹھو اور دو کپ چائے بنا کر لاؤ۔“ تیمور نے اپنی چھوٹی بہن کو منظر سے ہٹایا۔

”تم کو تو میں منشی غلام صابر سے بندیا کے بارے میں بات کر کے دیکھوں۔“ وہ نیم رضامندی سے بولیں۔

”ہرگز نہیں۔ بات کھل جائے گی اور سارا الزام آپ کے سر پر آجائے گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے منشی چچا کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ بینش کے باپا کی بہت عزت کرتے ہیں۔“ تیمور نے صاف گوئی سے کہا۔

”لیکن کسی کی بیٹی کے ساتھ ایسا کرنے کو میرا دل نہیں مانتا۔“ انہوں نے بے چارگی سے اپنا مسئلہ بتایا۔

”ماں! یہ ہم دو لوگوں کی خوشی کا سوال ہے۔ بندیا کی منگنی بھی زبردستی اس کے والدین نے کر دی ہے وہ بھی وہاں شادی کرنا نہیں چاہتی۔“ تیمور نے التجائیہ نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا جو — شش و پنج کا شکار تھیں۔

”آپ کیا چاہتی ہیں کہ بینش میری زندگی کو بھی جہنم بنا دے۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔“ تیمور اچھا خاصا پریشان تھا۔

”تم اپنے باپ کے سامنے انکار کرو۔“ انہوں نے ایک اور تجویز دی۔

”آپ کا کیا خیال ہے، وہ مان جائیں گے؟“ اس نے بے زاری سے سر کو جھکا دیا۔ ”وہ تو طیبہ کے ساتھ ساتھ میرا بھی زبردستی نکاح پر دھوا کر ہمیشہ کے لیے پاکستان روک لیں گے۔ پلیز ماں۔ آپ پھویشن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”چھ! مجھے کچھ سوچنے دو۔“ وہ کافی حد تک مان چکی تھیں۔

اسی شام وہ طیبہ اور صلاح الدین کے رشتے کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے آقا جی کی طرف نکل آئیں، انہیں امید تھی کہ ان کے دیور حماد صاحب۔ ان کی بات سمجھ کر اپنے بڑے بھائی کو قائل کرنے کی کوشش کریں گے، کچھ بھی تھا، ڈاکٹر جلال، اپنے چھوٹے بھائی کی رائے کو خاصی اہمیت دیتے تھے وہ کسی بھی قیمت پر طیبہ کی شادی صلاح الدین سے نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

انہوں نے بینش کے پورشن کی طرف قدم رکھا، ٹی وی لاؤنچ خالی تھا اور سامنے بینش کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، بندیا بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی اور بینش اس کے قدموں میں قالین پر اس طرح بیٹھی تھی کہ دونوں کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ بندیا سرسوں کے تیل کا پیالہ پاس رکھے بینش کے سر میں مساج کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ شائستہ بیگم ان دونوں کو مخاطب کر تیں، بندیا کی بات نے انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

”بیبا۔ آپ نے صلاح الدین کو دکھا ہے؟ تایا ابا، جس کے ساتھ طیبہ کا نکاح کر رہے ہیں؟“

”وہ بھی بھلا کوئی دیکھنے کی چیز ہے۔“ بینش استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

”کیا مطلب ہے؟“

”ایک نمبر کا جاہل، تنوار اور جنگلی بندہ ہے، نہ شکل اچھی اور نہ کروت۔“ اس کا بے لطفی سے کیا گیا تبصرہ شائستہ بیگم کا دل چیر کر رکھ گیا۔

”تو پھر تایا ابا کیوں کر رہے ہیں طیبہ کی اس کے ساتھ شادی؟“ بندیا کا مساج کرتا ہوا ہاتھ پریشانی کی وجہ

سے رک گیا۔

”میں نے ہی مشورہ دیا تھا انہیں۔“ اس نے مزے سے کہا۔

”آپ نے؟“ بندیا کے ساتھ ساتھ دروازے میں کھڑی شائستہ بیگم کو بھی جھٹکا لگا۔

”ہاں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ طیبہ کی شادی جتنی جلدی کروں گے تو اچھا ہوگا۔ پڑھائی تو ہوتی رہے گی۔“ وہ آنکھیں بند کیے بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول رہی تھی۔

”تو کیا صلاح الدین کا نام آپ نے لیا تھا ان کے سامنے۔؟“ بندیا کو افسوس ہوا۔

”میں نے تو نہیں لیا تھا، وہ تو سلیمان چچا کا فون آیا تھا ان کے پاس کہ کوئی اچھی لڑکی پتائیں ان کے بیٹے کے لیے۔ میں بھی وہیں موجود تھی۔“ وہ لاپرواہی سے سارا قصہ بیان کر رہی تھی۔

”پھر؟“ بندیا کا سانس رک گیا۔

”پھر خود ہی وہ بولے کہ طیبہ اور اس کا جوڑ کیا رہے گا؟“

”آپ کو منع کرونا چاہیے تھا۔“ بندیا نے پریشانی سے کہا۔

”میرا دماغ خراب ہے جو تاپا ابا کی کسی بات سے انحراف کروں، انہیں میری فرماں برداری اور تابعداری ہی تو بھاتی ہے، یہ علیحدہ بات کہ وہ کرتے وہی ہیں جو میں چاہتی ہوں۔“ اس کا زعم بھرا انداز شائستہ بیگم کے لیے نیا نہیں تھا لیکن انہیں حقیقتاً اس بات کا دکھ ہوا۔

”آپ پلیز تاپا ابا کو سمجھائیں نا، طیبہ بے چاری کا رورہ کر رہا حال ہے، وہ بندہ ان کے قابل نہیں ہے۔“ بندیا نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے پرانی آگ میں کودتی پھولوں۔ اچھا ہے، شادی ہو اس کی وہیں، تمہیں پتا نہیں، جب اس کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہوا تھا تاپا اباں کتا اترا ہی پھر رہی تھیں، انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بڑا سیرا لیا ہو۔“ اس کا لہجہ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

”لیکن اس میں طیبہ بے چاری کا کیا قصور ہے؟“ بندیا نے اس کے سر کا مساج کرتے ہوئے ناگواری کا اظہار کیا۔

”مزہ آئے گا اسے بھی صلاح الدین سے شادی کر کے، وہ بھلا کہاں پڑھنے دے گا اسے۔ پھر پتاؤں کی میں تاپی اماں کو اس خاندان میں صرف ایک ہی لڑکی ڈاکٹر بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور وہ ہے بینش حماد۔“

اس کا طنزیہ لہجہ اب ناقابل پروا شدت تھا۔ شائستہ بیگم لٹے قدموں واپس لوٹ آئیں، انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر جلال کو اب دنیا کی کوئی طاقت نہیں سمجھا سکتی۔ اس واقعے کے بعد بینش ان کے دل سے مکمل طور پر اتر گئی تھی اور انہوں نے جذبات میں آکر آخر کار وہ قدم اٹھا ہی لیا جس کے بارے میں سوتے ہوئے ان کا ضمیر ملامت کرنے لگتا تھا۔ اگلی ہی صبح بینش کے کالج جاتے ہی وہ تیمور اور بندیا کے ساتھ اپنی بہترین دوست فاخرہ کے گھر آگئیں، جہاں چند لوگوں کی موجودگی میں خاموشی سے تیمور اور بندیا کا نکل پڑا ہوا دیا گیا تھا۔



ہاشم ایک برائے فرم میں انٹرویو دے کر نکلا تو سامنے سے آئی ایک بے قابو بابتیک سے ٹکرا گیا، جس کے نتیجے میں اس کی ٹانگ ہلکی سی فریکچر ہو گئی تھی اور ڈاکٹر نے اس کی ٹانگ پر چھ ہفتوں کے لیے پلستر چڑھا دیا تھا۔ ہاشم کو اس کا ایک دوست فلیٹ میں چھوڑنے آیا تو اسے دیکھ کر بخشاور ایک دم پریشان ہو گئی۔ وہ اپنی ساری ناراضی بھلائے اب ہاشم کے آگے پیچھے پھر رہی تھی۔

”معلوم ہونا کہ تمہارے ناراضی ایسے ختم ہوگی تو میں بہت پہلے ہی اپنی کوئی ہڈی تڑوا لیتا۔“ وہ اس کے لیے یخنی بنا کر لائی تو ہاشم نے اسے چھیڑا۔ اس نے مسکرا کر یہالہ میز پر رکھ دیا۔ ”تم اب کچھ زیادہ ہی چپ چپ نہیں رہنے لگی ہو؟“ ہاشم نے کھوجتی نگاہوں

سے اس کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی۔
”نہیں تو۔۔۔ وہ چھیکے انداز میں مسکرائی۔

”جھوٹ مت بولو بخٹور۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے تم ابھی بھی مجھ سے خفا ہو۔“ وہ افسردگی سے گویا ہوا۔

”یہی بات نہیں ہے میری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ میں کیا بات کروں۔“ اس نے بے بس انداز میں اعتراف کیا۔

”آئی ایم سوری یار۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ حالات ایسے ہو جائیں گے۔“ اس حلوٹے کے بعد ہاشم میں کافی تبدیلی آئی تھی لیکن یہ تبدیلی چند روزہ ہی تھی۔

کچھ ہی دن کے بعد ہاشم اور بخٹور کو ایک بری خبر ملی۔ ہاشم کی دکانوں میں شارٹ سرکٹ کی وجہ سے آگ لگ گئی اور سارا ہی سلمان جل کر خاک ہو گیا۔ اس خبر نے جہاں بہت سے لوگوں کو پریشان کیا تھا وہاں ہاشم کے تو ہاتھ پیر پھلا دیے۔ وہ بیروزگار تھا اور اس کا ذریعہ معاش وہی دکانیں تھیں جو جل کر خاکستر ہو گئی تھیں۔
”اب کیا ہو گا بخٹور۔“ ہاشم بوکھلا گیا وہ ابھی چلنے پھرنے سے قاصر تھا اور پلستر کھلنے میں کافی دن تھے کوپر سے یہ سانحہ ہو گیا۔

”اللہ مالک ہے۔“ اس نے اپنے شوہر کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

”اللہ زمین پر آکر ہمیں کھانے کے لیے تھوڑا دے کر جائے گا۔“ وہ شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔

”اللہ کے بندے دے جائیں گے، ٹینشن لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ہاشم۔“ وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

”تمہیں صورت حال کا اندازہ نہیں ہے، ان دونوں دکانوں کی ہر چیز جل گئی ہے، انہیں اپنی صحیح حالت میں لانے کے لیے کافی پیسہ چاہیے جو میرے پاس نہیں ہے۔“ وہ اس وقت اپنے آپ سے بھی خفا لگ رہا تھا۔

”لیکن پریشانی بھی تو کسی چیز کا حل نہیں ہے۔“

بخٹور کو پہلی دفعہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت کمزور اعصاب کا مالک ہے۔

”میرے پاس اس مہینے صرف پانچ ہزار روپے ہیں، اب تم خود چٹاؤ میں کیا کروں؟“ بخٹور کو پہلی دفعہ صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر نے ہاشم کو گوشت اور تھنی زیادہ سے زیادہ پینے کا مشورہ دیا تھا اور یہاں دکانوں کے جلنے سے اگلے دو ماہ کے لیے بھی کرائے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے کچن میں چلی آئی، آٹے کا کنستر خالی ہونے کے قریب تھا اور تیل بھی تقریباً ختم تھا۔

اس نے ڈبے سے دال نکالی۔ خاموشی سے بیٹھ کر دال چننے لگی۔ دل بے شمار اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بیٹیوں کی موت کا دکھ پس پر وہ چلا گیا تھا اور معاشی مسائل منہ کھول کر سامنے آن لکڑھے ہوئے تھے۔

”ایک کپ چائے کا ملے گا کہ نہیں۔ سردی سے پشنا جا رہا ہے۔“ ہاشم اپنے کمرے میں لیٹا ہوا چیخا، اس نے گھبرا کر دال ایک طرف رکھی اور جلدی سے چائے کا پانی چولہے پر رکھا۔ چینی کا مریجان کھولا تو ایک اور دھچکا لگا، اندر صرف دو چمچہ چینی پڑی تھی، اس نے بو جھل دل کے ساتھ چائے بنائی اور کمرے میں لے آئی۔ وہ بے زار لیٹا ہوا تھا۔

”پتا نہیں کس بات کی سزا ملی ہے مجھے، لولا لنگڑا ہو کر پڑ گیا ہوں بیڑی۔“ اس نے جلدی سے چائے کا گھونٹ بھرا اور پھر ناگواری سے بخٹور کی طرف دیکھا۔
”اس میں تھوڑا دودھ تو ڈال لیتیں، بد مزہ سا قہوہ بنا کر لے آئی ہو۔“

”دودھ ختم تھا۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے صفائی دی۔

”ہاں۔ اب تو ہریات کے جواب میں یہی سننے کو ملے گا، قلاں چیز ختم ہے اور قلاں چیز لانی ہے۔“ وہ اپنے اندر کی فرسٹریشن نکالنے کے لیے موم ڈھونڈ رہا تھا۔ جو اسے بخٹور نے فراہم کر دیا تھا۔

”اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔“ وہ روہا سی ہوئی۔

”نہیں۔ میرا قصور ہے، میں نے خود جا کر اپنی دکانوں کو آگ لگائی ہے۔“ وہ ہر بات کا الٹا جواب دے رہا تھا۔ اس لیے بخٹاور نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ وہ یوں ہی اٹھ کر کمرے کی چیزیں سمیٹنے لگی۔

”سچ بتاؤ تم دل ہی دل میں پچھتاتی تو ہوگی، کس کنگلے سے شادی کر لی اور اپنے باپ کا شان دار بنگلہ چھوڑ کر آگئی۔“ وہ کہیں کا غصہ نہیں اور نکال رہا تھا۔ بخٹاور نے گلہ آمیز نظروں اس کی طرف دیکھا۔

”میری کس بات سے لگا ہے آپ کو۔؟“ وہ ہلکا سا جھنجھلا گئی۔

”یہی جو تم اپنے ہونٹوں پر خاموشی کے تالے لگائے پھرتی ہو، یقیناً دل ہی دل میں مجھے کوسی ہوگی۔“

”بہت ہی افسوس کی بات ہے، اگر آپ ایسا سوچتے ہیں۔“ اسے بھی غصہ آ گیا۔

”میں حقیقت بتا رہا ہوں تمہیں اور ایک تجویز ہے میرے پاس تمہارے لیے۔“ ہاشم کی اگلی بات نے اسے حیران کیا۔

”وہ کیا۔؟“ وہ پریشانی سے اس کا سپاٹ چہرہ دیکھنے لگی۔

”تم اگر چاہو تو اپنے والدین کے گھر واپس جا سکتی ہو، میری طرف سے اجازت ہے تمہیں۔“ وہ نظریں چڑا کر بولتا ہوا بخٹاور کو شدید صدمے سے دوچار کر گیا۔ وہ ہونق انداز سے اپنے شریک سفر کو دیکھنے لگی، اسے کہناں توقع تھی کہ وہ اس سے ایسی بات بھی کہہ سکتا ہے۔



”عدینہ باجی ا سخت خفا ہوں میں آپ سے۔“ رات کو وہ جیسے ہی اپنے اور مونا کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوئی مونا نے اس کی طرف دیکھتے ہی جھٹ سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔

”ارے وہ کیوں بھلا۔؟“ وہ مسکراتے ہوئے اپنا

بیک کھولنے لگی۔

”آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ عبداللہ بھائی زندہ ہیں۔“ وہ براسامندہ بنا کر بولی۔

”ہماری ملاقات ہوتی تو تب ہی بتاتی نا۔“ عدینہ نے اسے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

”اٹنی بڑی خوش خبری فون پر بھی تو سنائی جا سکتی تھی۔“ مونا جھنجھلا کر اٹھ بیٹھی۔

”تو پھر تمہارے چہرے کے اتنے پیارے تاثرات دیکھنے کو کیسے ملتے بھلا؟“ عدینہ نے پیار سے اس کی ٹھوٹی کو ہلایا تو اس کی ساری خفگی بھک کر کے اڑ گئی۔

”ویسے میں مان گئی آپ کی محبت کو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے عدینہ کا ہاتھ پکڑا تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ساری دنیا کہتی تھی کہ وہ زندہ نہیں ہیں لیکن آپ نے کسی کی بات کا یقین نہیں کیا۔“

”اس لیے کہ میرا دل ہی نہیں ماننا تھا۔“ اس نے اپنا رات کو ہنسنے کے لیے آرام دہ سوٹ نکالا۔

”ان کپڑوں کو چھوڑیں، یہ بتائیں کہ آپ کی کیا لہنگہ تھیں جب آپ نے پہلی دفعہ دیکھا انہیں؟“ وہ حد درجہ بے تاب ہو رہی تھی۔

”سچ پوچھو، تو میرا دل ایک دم بھک کر کے اڑ گیا تھا۔“ اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”پھر۔؟“ وہ تجسس ہوئی۔

”اس کے بعد مجھے اس پر بے تحاشا غصہ آیا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کچھ کر گزروں۔“ وہ مونا کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اس لیے سچ سچ بتا دیا جسے سن کر کم از کم مونا کو دو چپکا سا لگا تھا۔

”میں نے کھری کھری سادیں اسے اور یہ بھی کہا کہ وہ دوبارہ مجھ سے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے مجھے اب اس کی ضرورت نہیں۔“

”یہ تو سراسر ناشکری کی ہے آپ نے۔“ مونا کو غصہ آ گیا۔ ”پہلے اتنا عرصہ روٹی رہیں اور جب وہ مل گئے تو ایسی باتیں کہنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”اس لیے کہ وہ خود سے نہیں آیا تھا میرے پاس،“

وقت نے ملایا تھا ہم دونوں کو۔“ وہ ابھی تک خفا تھی۔
”مجھے تو سخت حیرت ہو رہی ہے کہ آپ عبد اللہ
بھائی سے اتنا خفا بھی ہو سکتی ہیں۔“ مونا کو یقین نہیں
آیا۔

”جن سے بے تحاشا محبت ہو ان سے ناراضی کا
تعلق بھی اتنا ہی گہرا ہوتا ہے۔“ اس نے سادگی سے
کہا۔

”لیکن ان کو کتنا دکھ ہوا ہوگا“ آپ کی اس بات
پر۔ “مونا افسردہ ہوئی۔ ”لیکن اس دکھ سے کم
ہوگا جو اذیت پچھلے ڈھائی سال میں نے برداشت کی
ایسے لگتا تھا جیسے زندگی ہی بل صراط بن گئی ہو۔ بس ہر
لحظ یہی کرب ستاتا تھا کہ وہ مجھ سے خفا ہو کر گیا تھا۔“ وہ
افسردگی سے نظریں جھکائے ہوئی۔

”تو اب کیا ہو گیا ہے آپ۔؟“ مونا نے نا سنجھی
سے اس کی طرف دیکھا۔

”اب میں اس خلش اور پچھتاوے کی بستی سے
نکل آئی ہوں“ محبت اپنی جگہ لیکن اس نے میری انا کو
مجرور کیا ہے وہ ڈھائی سال میری بے بسی سے کھیلا رہا
اسے ایک دفعہ بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ کسی کو اذیت
کے سمندر میں دھکیل آیا ہے۔“ عدینہ کے لہجے میں
گلے شکووں کا ایک جہان آباد تھا۔

”ان کے جہاز کو حادثہ پیش نہیں آیا تھا کیا؟“ مونا
نے حیرانگی سے پوچھا۔

”میں نے تو نہیں پوچھا لیکن میری دوست اور ریداکو
بتایا ہے اس نے۔ اس دن اس کا اور اس کے دوست
کا ایرپورٹ آتے ہوئے ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس
لیے اس کی فلائٹ مس ہو گئی تھی۔“

”وہ تو پھر۔“ مونا کی سانس رکی۔

”پھر اس کی ایک ٹانگ اور بازو فریکچر ہو گیا اور
اس کے دوست کی اس حادثے میں موت واقع
ہو گئی۔“ عدینہ نے ایک اور انکشاف کیا۔

”یہ تو بہت بُرا ہوا ان کے ساتھ۔“ مونا کے منہ
سے پھسلا۔

”ہاں اتنا رہا تھا کہ پورے چھ مہینے وہ اسپتال میں رہا

اور پھر اس نے اپنے ماموں سے رابطہ کر کے انہیں بلایا
اور سختی سے منع کر دیا انہیں کہ اس کی ماں کے علاوہ
کسی اور کو اس کے زندہ رہنے کا نہ بتائیں۔“ عدینہ کا
چہرہ تاریک ہوا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ مونا کو یاسی ہوئی۔

”وہ مجھ سے اور آپ سے خفا تھا“ اس لیے اس نے
اپنی ماں کو بھی ملائیشیا بلو الیا جہاں وہ پی ایچ ڈی کر رہا
تھا۔“ اس نے مزید بتایا۔

”یہ کیا بات ہوئی“ انہیں کم از کم آپ کو تو بتانا
چاہیے تھا۔“ اسے ایک دم غصہ آیا۔

”اس کے لیے اس کی والدہ اہم تھیں“ اس نے
انہیں آگاہ کر دیا باقی سارے لوگوں سے تو تعلق تو ٹوڑ چکا
تھا۔“ وہ بدگمان ہوئی۔

”خیر تعلق تو نہیں توڑا ہوگا“ اگر ایسا ہوتا تو اب کیوں
آپ کے پیچھے آرہے ہیں بار بار۔“ مونا نے فوراً ہی
طرف داری کی۔

”اب ایسی ہی کوئی خلش اسے ستا رہی ہوگی کہ
اس نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔“ وہ اپنے پلنگ
کی چادر ٹھیک کر کے لیٹ گئی۔

”تو اب آپ کیا کریں گی ان سے۔؟“ مونا پریشان
ہوئی۔

”وہی جو اس نے میرے ساتھ کیا تھا۔ لا تعلق کی
چادر اوڑھنا صرف اسی کو نہیں آتی۔ سارے ہی لوگوں
کو اپنی عزت اور انا عزیز ہوتی ہے۔“

وہ بے لچک لہجے میں اپنے ارادوں سے آگاہ کر کے
لیٹ گئی اور مونا ہکا بکا انداز میں اس کی پشت کو دیکھتی رہ
گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عبد اللہ واپس
آئے گا تو عدینہ اس طرح بے رخی سے اس کا استقبال
کرے گی۔

شانزے کا ڈر لانا آن ایر ہوتے ہی دھوم مچ گئی تھی۔
اس کی ابتدائی اقساط نے ہی ریٹنگ چارٹ میں سب
سے اوپر اپنی جگہ بنالی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شانزے

شانزے کا ڈر لانا آن ایر ہوتے ہی دھوم مچ گئی تھی۔
اس کی ابتدائی اقساط نے ہی ریٹنگ چارٹ میں سب
سے اوپر اپنی جگہ بنالی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شانزے

کے پاس آفرز کا ایک طوفان آگیا تھا۔ اس کے انداز میں ایک محسوس کیے جانے والا اعتماد اور بے نیازی آگئی تھی۔

”تم آخر کہاں بڑی ہو آج کل۔“ اس دن ماہیر کی اجاٹک ہی کال آگئی وہ کچھ اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔
”کہیں نہیں۔“ اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

”مجھے سرور بتا رہا تھا تم نے ہمارے آفس کی جا ب چھوڑ دی ہے؟“ اس کے اس سوال نے شانزے کو بوکھلا دیا۔

”ہاں وہ مینیج نہیں کیا رہی تھی۔“ اس نے گول مہل سا جواب دیا۔

”تمہاری ایسی کون سی مصروفیت ہو گئی ہے جو تم یہ مینیج نہیں کیا رہی تھیں۔“ وہ حیران ہوا۔
”کوئی خاص نہیں، تم آؤ گے تو بیٹھ کر بات کریں گے۔“ اس نے صاف سے ٹالا تھا۔

”میں نے پیپا سے تمہارے متعلق بات کی ہے۔“ ماہیر کی اس بات نے اس کے چمکے اڑا دیے۔
”پھر۔“

”وہ ملنا چاہ رہے تھے تم سے تم اپنی پھوپھو سے بات کرونا میں پاکستان آتے ہی یہ قصہ پھٹانا چاہتا ہوں۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بول رہا تھا۔

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔“ اس کی زبان لڑکھرائی اور ذہن میں وہ سارے پروجیکٹس کھومنے لگے جو وہ کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے جیسے تیسے بات ختم کی اور پچن میں رہا اب کے پاس آگئی جو فریڈ رائس بنا رہی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ شانزے! اب کیا ہو گا؟“ رہا اب کا حیرت کی زیادتی سے منہ کھل گیا۔

”یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا مجھے۔“ وہ بھی پریشان ہو چکی تھی۔

”کب تک آ رہا ہے وہ پاکستان۔“ رہا اب اپنے آپ کو سنبھال کر اب اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”کہہ تو یہی رہا تھا کہ جلد ہی آجائے گا۔“ وہ منہ

بناتے ہوئے پھلے ہوئے مٹر کھانے لگی۔
”تو اب کیا کرو گی تم۔“ اس نے پریشانی سے پوچھا۔

”تم بتاؤ نا اب تو سرور بھائی بھی مجھ سے خفا ہیں۔ ان سے بھی مشورہ نہیں کر سکتی میں۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”تم نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے انہیں خفا کر کے۔“ رہا اب نے سبزیاں تلتے ہوئے صاف گوئی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”مجھے کیا پتا تھا وہ ایسے ناراض ہو جائیں گے، دوبارہ مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔“ اس نے گاجر کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

”خیر اب تم یہ تو نہ کہو، تمہیں پتا نہیں تھا تم نے سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے۔“ رہا اب نے اسے آئینہ دکھایا۔

”ٹرسٹ می رہا اب، پہلے شو بزمیرا شوق تھا لیکن اب مجھے میری مجبوری کھینچ کر لائی ہے اس فیلڈ میں۔“ اس نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

”نن ساری باتوں پر میں یقین کر سکتی ہوں، ماہیر اور سرور نہیں۔“ رہا اب نے اسے مزید پریشان کر دیا۔

”اسی بات کی تو مینیشن ہے مجھے۔“
”بھی بھی بھی وقت ہے شانزے تم خود ماہیر کو بتا دو۔“ اگر وہ پاکستان آگیا اور اسے یہاں آکر اس بات کا پتا چلا تو وہ بہت ہرٹ ہو گا۔“ اس نے اسے سمجھایا۔

”وہ تو ٹھیک ہے یار! لیکن میری ہمت ہی نہیں پڑ رہی، وہ جان سے مار دے گا مجھے۔“ شانزے کو اب معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”پھر ایسا کرو سرور سے بات کرو، وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔“ اس نے نیا مشورہ دیا۔

”وہ بھی تو اسی کا کزن ہے، اسی کی طرف داری کرے گا۔“ شانزے نے منہ بنا کر اسے یاد دلایا۔

”تو ٹھیک ہے، پھر خود ہی بھگتنا اس ساری پھوٹیشن کو۔“ اس نے بھی ہاتھ جھاڑ کر چاولوں کو دم دیا اور سکون سے پچن سے نکل آئی۔

”زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟“ وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔

”ماہیر اور تمہارا رشتہ ختم بھی ہو سکتا ہے۔“ اس نے محتاط انداز میں اسے ڈرانا چاہا۔

”سو واٹ۔“ اب کے حیران ہونے کی باری رباب کی تھی۔ اسے شاک لگا، وہ تعجب اور حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی، جس پر نئی دنیاؤں کو تسخیر کرنے کی لگن صاف بڑھی جا رہی تھی۔ رباب کو اس کی کم عقلی پر ٹھیک ٹھاک افسوس ہوا۔

”تمہیں کوئی فرق نہیں پڑنا کیا۔“ وہ ناگوار نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”جب اسے فرق نہیں پڑے گا تو میں نے اکیلے سوگ منانے کا ٹھیکہ تھوڑی اٹھا رکھا ہے۔“ وہ مزے سے ڈرنگ ٹیبل سے ٹیل پالش اٹھا کر لگانے لگی۔

”اس کا مطلب ہے کل کو میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں تو تمہیں اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ رباب کے لہجے میں خفگی چھلکی۔

”میں نے ایسا کب کہا۔؟“ وہ بوکھلا گئی۔

”مطلب تو تمہارا ایسی تھا تا، تمہاری زندگی میں کوئی آئے جائے، تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ ٹھیک ٹھاک ناراض ہو کر الماری سے اپنا بیگ نکالنے لگی، اس دفعہ تو شانزے کے حقیقتاً ”چھلکے چھوٹ گئے۔“

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ وہ فوراً اس کے پاس لپکی۔

”ہوسٹل۔“ اس نے مختصراً جواب دیا اور وارڈروب سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تمہارا؟ کیوں کر رہی ہو تم ایسا۔؟“ رباب کے ارادوں نے اسے خوفزدہ کیا۔

”اس لیے کہ مجھے پتا چل گیا ہے، تمہاری زندگی میں رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں، شاید اس لیے کہ تم نے کبھی زندگی میں رشتوں کو برتاہی نہیں۔“ اس کا تلخ لہجہ شانزے کا دل حیر کر رکھ گیا۔

”تم کیسے کہہ سکتی ہو یہ بات۔“ وہ تھوڑا دم

”اس لیے کہ تم نے اپنی زندگی میں آنے والے کسی مخلص رشتے کی قدر نہیں کی، چاہے وہ سرد ہو یا ماہیر، تم نے محض انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے، کل کو جب تمہیں میری بھی ضرورت نہیں ہوگی تو تم ایسے ہی الفاظ میرے لیے بھی بول رہی ہوگی۔“ وہ سخت الفاظ میں اسے آئینہ دکھاتے ہوئے مزید گویا ہوئی۔ ”اور کم از کم میں وہ ٹشو پیپر نہیں بننا چاہتی، جسے تم اپنی ضرورت کے وقت استعمال کرو اور پھر پھینک دو۔“

اس نے غصے سے اپنے بیگ کی زپ بند کی اور مرکر شانزے کا دھواں دھواں چہرہ دکھا۔ وہ اس طرح رباب کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی ہو۔



عدینہ جیسے ہی اپنے گاؤں سے واپس آئی اور پیداکا بچا بچا سا چہرہ افسردہ آنکھیں اور ست انداز دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ ہی دن میں اور پیداکا کی شکل بنا رہی جیسی ہو گئی تھی۔ وہ خالی نگاہوں اور غیر حاضر دماغ کے ساتھ کلاس روم میں بیٹھی بس پروفیسرز کا چہرہ دیکھتی رہ رہتی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔ حالت دیکھی ہے تم نے اپنی۔“ عدینہ اس کا بازو پکڑ کر کیفے ٹیرا میں لے آئی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ زبردستی مسکرائے کی کوشش

میں عدینہ کو خاصی احمق سی لگی۔

”فار گاڈ سیک، ایسے مت مسکراؤ، مجھے غصہ آ رہا ہے تم پر۔“ وہ ہلکا سا چڑ کر بولی۔

”تو کیسے مسکراؤں؟“ اور پیدانے نگاہیں چڑا کر پوچھا۔

”میرے سامنے یہ فارمیٹھی نبھانے کی ضرورت نہیں، اٹھو اور میرے ساتھ گھر چلو۔“ وہ فوراً ہی فیصلہ کن انداز میں کھڑی ہو گئی۔

”کس کے گھر؟“ اس نے غائب دماغی سے پوچھا۔

”ظاہر ہے تمہارے گھر اور کہاں۔“ عدینہ کو اس

پر رحم آیا اس لیے اس دفعہ اس نے نرمی سے اس کا بازو پکڑا اور باہر لے آئی۔

”ارصم کے کیسٹ چلے گئے کیا؟“ گاڑی میں بیٹھے ہوئے اس نے دانستہ لاپرواہ انداز میں اوریدا سے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ اوریدا نے گاڑی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

”کتنی راتوں سے جاگ رہی ہو تم۔“ عدینہ نے فکر مندی سے دریافت کیا۔

”پچھلی تین راتوں سے۔“ اوریدا کی صاف گوئی پر اسے جھٹکا لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فوراً اس بات سے مکر جائے گی۔

گاڑی ان کے گھر کے پورچ میں داخل ہو گئی تھی وہ دونوں جلدی سے باہر نکلیں تو سامنے بڑے ابا کہیں جانے کے لیے عجلت بھرے انداز سے ادھر ہی آرہے تھے انہیں دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھنک کر رک گئے۔

”بڑے ابا! میں آپ سے سخت خفا ہوں۔“ عدینہ نے انہیں دیکھتے ہی بے تکلفی سے گلہ کیا وہ ایک لمحے کو حیران ہوئے۔

”میں دو دن کے لیے اپنے گھر گئی تھی آپ نے میری غیر موجودگی میں میری دوست کا بالکل بھی خیال نہیں رکھا۔“ اس کی بات پر اوریدا اسٹپٹاسی گئی جبکہ بڑے ابا کے ہونٹ بھی تھوڑے سے پھیلے۔

”کیا ہوا اوریدا کو۔“ انہوں نے غور سے اس کے ساتھ کھڑی اپنی پوتی کو دیکھا جس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بن چکے تھے۔

”کچھ نہیں ہوا ابا“ اسے تو فضول بولنے کی عادت ہے۔“ وہ سخت زدہ انداز میں سر جھٹکائے بولی۔

”میں کچھ مٹی وٹا منز بھجواتا ہوں ڈرائیور کے ہاتھ کھانا کھا کر اسے لو اور سو جاؤ۔“ انہیں فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شدید قسم کی نیند کی کمی کا شکار ہے۔

”آپ کیسی ہیں بیٹا؟ آپ کی والدہ خیریت سے ہیں۔“ بڑے ابا اب عدینہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

”میں ٹھیک ہوں لیکن امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“

اکثر ہی ٹیسر پچر رہنے لگا ہے انہیں۔“ عدینہ کو اچانک یاد آیا کہ وہ صبح جلدی میں اپنے ان کی فائل لیتا بھول گئی تھی۔ اسے دل ہی دل میں خاصی شرمندگی ہوئی۔

”آپ ان کی رپورٹس دکھا دیجئے گا مجھے، ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ انہوں نے نرم لفظوں میں اسے دلاسا دیا۔ اسی وقت گھر کا گیٹ کھلا اور سردی کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ پورچ میں ان کی گاڑی کے پیچھے اپنی کار کھڑی کر چکا تھا۔

”ماہیر۔“ اوریدا کو خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ چونکے تو بڑے ابا بھی تھے لیکن انہوں نے خود کو جلد ہی سنبھال لیا۔

”ارے بڑی اماں۔ آپ۔“ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا تو اوریدا کو ایک اور سربراہ نظر ملا۔ وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے قدم زمین سے جکڑ لیے۔ وہ ہکا بکا انداز سے کار سے نکلتے تیسرے فرد کو دیکھ رہی تھی اس نے بے یقینی سے اپنی آنکھیں ملیں ایک لمحے کو اسے ایسا لگا جیسے سامنے کا منظر اس کی بصارت کا ایک خوب صورت دھوکا ہو۔

”اوہ ماکی گاڈ“ حیرت کی زیادتی سے اس نے اپنی آنکھوں کو مسلا۔

”واٹ آسر براٹر“ وہ تیر کی طرح اڑتی ہوئی ان تینوں کی جانب بڑھی۔

جبکہ ان سب سے بے نیاز عدینہ بڑے ابا کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر اذیت دکھ، غم اور ناراضی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ دھواں دھواں نگاہوں سے اپنے سامنے کھڑے اس تیسرے شخص کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ان کے گمان کی آخری سرحدوں پر بھی نہیں تھا کہ قسمت کبھی دوبارہ۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کرے گی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بنتِ سحر

اگرچہ میں نے اپنی
ساری طاقت کو تھس تھس کرتی ہوئی۔

جرمن ہال کی سیڑھیوں پر میں بیٹھی تھی اور برف
گر رہی تھی۔ برف مجھے لگا میں برف سے بنے
کسی "تابوت" میں مقید کر دی جاؤں گی۔ میرا
اسپینٹس پن ٹوٹ کر آخری سیڑھی پر جاگرا تھا اور
سفید برف کے نیچے دیتا ہی جا رہا تھا۔ سب آوازوں پر
بھاری ایک آواز۔ میرے حوصلوں کو توڑتی ہوئی۔
میری طاقت کو تھس تھس کرتی ہوئی۔
" واٹ اے سر براڈر۔ " عالیہ پوسٹ۔



READING
Section

”مختلکریالے بالوں والی لڑکی کے لیے ٹشو پائس کا آرڈر دیا جا چکا ہے۔“ وہ برف کی بارش میں فرش کے پتھر اڑاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ طاقچوں کے چراغ ابھی بھی جل رہے ہیں۔ جلتے رہیں گے اور عالیہ یوسف جلد ”بازی“ کھیلنے والی ہے۔ سب سے بھاری بازی۔ عرب کے پتھروں سے بھی بھاری۔



ڈھنیل کرشل شاپ میں بکھری روشنیاں بہت گہری اور قیمتی سی لگتی تھیں۔ وہ کرشل پیس کر ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ میں پتھریلی نیس سی کرسی پر بیٹھی تھی۔ احمیت نے برکولیر کا لگ آن کیا تھا اور پھر چند ٹائیپے بعد بھاپ اڑاتی کافی کے دو کپ کاؤنٹر پر رکھے تھے۔

”تم کیا واقعی یہ سب کر لوگی؟“ وہ جھجک کر پوچھ رہا تھا۔ کپ کے کونوں پر بکھری حرارت انگلیاں جھلسانے لگی تھی۔

”قرض ہے میری ذات پر اتارنا ضروری ہے۔ میں بہت خوف زدہ ہوں احم۔“ وہ خود بھی ڈپر لیس لگ رہا تھا۔ گیم شروع ہونے کو تھا۔ اور میرے سارے مہرے کہیں لڑھک گئے تھے۔

”پرسل کورٹ میں سب سوالیوں کے جواب مسکرا کر دینے پڑتے ہیں۔ کچھ سوال تمہیں مشتعل کریں گے۔ کچھ دکھی کریں گے مگر تمہیں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ تمہیں سامعین کو خوش کرنا ہوگا۔“ میں جانتی تھی وہ مجھے سلی دے رہا تھا۔ مجھے مضبوط بنانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کافی کا گھونٹ لیا تھا۔

”میں اپنی ذات کے داغ دیکھ سکتی ہوں مگر اپنے ملک پر چھینٹے میں برداشت نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں۔ میں اچھی صحافی نہیں ہوں مگر اچھی محب وطن ہوں۔ تم جانتے ہو نا؟“ دو سروں سے تصدق چاہنا کتنا دقت طلب ہوتا ہے، میں اچھی طرح جانتی تھی۔ احمیت نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

پلین۔ اب اپنے کھیل ختم کرو۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو۔ تم ہمیشہ ”ہارنی“ آئی ہو قسمت سے لڑنے والے لوگ تم جیسے نہیں ہوتے۔ تم پاکستان سے محبت کرتے ہوئے اسی کا دفاع کرتی ہو۔ حب الوطنی کے راگ الاپتی ہو۔ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا تمہارے۔

”میں اپنے قلم سے سوچ بدلوں گی، ذہن بدلوں گی“ میرے لفظ میرے چراغ ہیں راستہ دکھائیں گے۔“

فریڈرک نے طویل قہقہہ لگایا تھا۔ جرمن ہال کی دیواروں پر نقارے کی طرح بچتا ہوا ابھرتا ہوا۔

”ایسی بستی بنانے کے خواب نہ دیکھو جہاں ذہن کی کھیتیاں بخر ہیں۔ جہاں جذبے کھوکھے ہیں۔ مر جاؤ گی یا ”مار“ دی جاؤ گی۔“

مر تو اب بھی رہی تھی۔

”خوف کی سیڑھی پر کھڑے ہو کر میں نے فریڈرک کے ہڈ میں برف جمع ہوتی دیکھی تھی۔“

”میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ہر دو قدم اٹھانے کے بعد پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی رہوں گی جس لمحے لگا قافلے کا آخری ”مسافر“ ہوں تب قلم توڑ دوں گی۔ میں نے اندھیرے کو اجالے میں ڈھالنے کا عمدہ کیا ہے اور میں عمدہ سے پھرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ میں نے اپنی ناک پر برف گرتی دیکھی۔

فریڈرک نے بغور مجھے دیکھا تھا۔ اس کی ہنسی بادل پر

برق کی مانند گری تھی۔ دھڑ۔ دھڑ۔ چنگاریاں۔

باغیچوں کو جلانے لگی تھیں۔

”چلو پھر۔ 23 مارچ کو دیکھیں گے تمہارے لشکر کو۔ مجھے تمہیں قافلے کا آخری مسافر دیکھ کر

بہت دکھ ہوگا۔ تم جانتی ہو نا یہ بات؟“

”ہاں۔ جانتی ہوں۔ نارنجی بالوں والے لڑکے انتظار کرو۔“ میں نے کوٹ کی جیبوں میں حرارت محسوس کرتے ہوئے دونوں ہاتھ جیب میں رکھ لیے۔

وہ ڈنٹس مارک کے جوتوں سے برف روندتا ہوا میرے قہقہے آیا اور میرے بالوں پر جمی برف کو جھاڑا تھا۔

READING
Section

”Yes I noow“ (ہاں میں جانتا ہوں) میں نے خالی کپ آگے سرکایا تھا۔ ”چلتی ہوں۔۔۔ 23 مارچ کو تم آؤ گے نا؟“ میں نے نی پنک اور رنگ رنگ سے بنا اسکارف ٹھیک سے اوڑھا تھا۔ یہ مجھے میرے ایرانی ہڈست نے گنٹ کیا تھا۔
 احم نے حوصلہ دلائی، ہسی سے کہا تھا۔

Sure I am always with you
 (ہاں میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں)

کرشل شاپ سے باہر کی دنیا ہمیشہ مجھے حیران کن لگتی تھی۔ میں ہینڈ بیگ تھامے روڈ پر چلتی جا رہی تھی۔ آوازیں، قہقہے، لوگ، سب پس پشت ڈالے میں صرف ایک آواز یاد کر رہی تھی۔

”عالیہ سنو۔ تم نے میڈیا میگ سے صحافت کا امتحان دینا ہے۔ اور وہاں کا رول ہے کہ وہاں کا مائیگریٹ اسٹوڈنٹ پر سٹل کورٹ میں پارٹ لیتا ہے اور وہاں کٹریں میں ہو کر تم نے بھی سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ وہاں مذہب، ملک کے حوالے سے سوال ہوں گے۔ تم نے ہر سوال کا جواب دینا ہے۔ جو میں نہیں کر سکا وہ تم نے کرنا ہے۔ میں کبھی بھی یہ قرض نہیں اتار پایا مگر تم یہ ضرور کرنا۔ میں نے مستقبل بچانے کے لیے سودا کر لیا تھا۔ میں ”بک“ کیا تھا۔ مجھے وہ سب نہیں بھولتا۔ تم۔ تم۔ وہ قرض اتار آنا۔ تم یہ کرو گی نا عالیہ۔“

میں نے اپنے صحافی باپ کے ہاتھوں کو بندھا دیکھا

تھا۔ جو میڈیا میگ کا ہرول عزیز گریڈ ممبر تھا۔ جوٹلی ویژن کے شو میں دلائل سے بات کرتا تھا مگر میڈیا میگ کے کچھ شریںڈ امیدواروں نے اسے ”استعمال“ کیا تھا اور پھر انہوں نے ”قلم“ ”سوچ“ سب بیچ دیا تھا۔ میں نے اسپتال کے فرش کی ٹھنڈک کو پورے وجود میں اترتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

”ہاں۔ میں ضرور یہ قرض اتاروں گی۔“ اور وقت قریب تھا۔ قرض اتارنے کا۔



READING
 Section

میں نے ہینڈ بیگ کندھے پر ڈالا اور جھک کر فلیٹ لاک کیا تھا۔ کوریڈور کی دوسری جانب جونٹ اپنی بلی کو تھامے کرسی پر جمول رہی تھیں۔ یقیناً یہ ان کا دلچسپ مشغلہ تھا اور میں یہ بات جانتی تھی۔ کوریڈور کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے گملوں میں انگریزی پورے لگے ہوئے تھے، جن کے پتے خوشبو دیتے تھے۔ اسی لیے میں ہر شام وہاں کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لیتی تھی۔

”یہ تم نے آج کیا پن رکھا ہے لڑکی؟“ انہوں نے بلی کو نیچے لٹھکا دیا تھا جو فرش پر خراہاں خراہاں چلتی جا رہی تھی۔

”اوہ! یہ ہمارے پرچم کے رنگ ہیں۔“

”اوہ۔ اچھا۔ میں بھی وہی دیکھ کر حیران تھی کہ یہ کیسی میچنگ ہے۔ تمیں سبز کلر کی ہو اور وہاں مشلوار سفید کلر کے ہوں۔“ میری نظریں ان کی بلی پر تھیں جو سدا بہار پورے کی اوٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ میں نے نظر مڑا کر جونٹ کو دیکھا تھا۔

”تمیں کیسی لگ رہی ہوں؟“ میں نے پوچھا تھا۔ وہ ہنسی تھیں۔

”مجھے تو کسی سبزی جیسی لگ رہی ہو۔“ میں بھی مسکرا دی تھی۔

”آپ میرے لیے دعا کریں گی نا؟“ میں نے ان کے ہاتھ تھامے تھے۔ جمولتی ہوئی کرسی جھٹکے سے رکی تھی۔

”کیوں عالیہ۔ تم کون سا جنگ لڑنے جا رہی ہو؟“ ”قرض اتارنا جنگ لڑنے سے زیادہ جان لیوا ہوا کرتا ہے۔ ہماری ذات کے قرض ہمارے وجود میں بے سکونی بھر دیتے ہیں۔ میں بھی بے سکون ہوں۔ وطن سے محبت، احترام میری گھٹی میں شامل کیا گیا ہے اور آج میرے لیے جنگ کا دن ہی ہے۔“ میں سیڑھیوں کی طرف مڑی تھی۔

”تمیں تمہارے لیے دعا نہیں کروں گی عالیہ یوسف۔“ میں نے ہینڈ بیگ کو مضبوطی سے پکڑا تھا۔

”ادہ آریو شیور؟“ شام کے چار بج رہے تھے۔ دور روخنیاں قطار دور قطار پھیلی نظر آتی تھیں۔ مجھے لگا وہ ماند پڑتی جا رہی ہوں۔ وہ بولی تھیں۔

”نہیں آئی ایم شیور“ میں نے کلمے کو ٹھوکری ماری تھی۔ شاید کلمے میں آج ہی ”کھاد“ ڈالی گئی تھی۔ کھاد کے بھورے بھورے دانے سارے میں بکھر گئے۔

”ادھی رات کو کبیل ڈالنے میں آؤں۔ برستی بارش میں بلی ڈھونڈ کر بھی میں لاؤں۔ سردی میں بخار سے پھینکتی مریضہ کے لیے سوپ بھی میں بناؤں۔ سارے بیکری آٹھمڑ بھی میں ہی لا کر دیتی ہوں۔“ وہ ہکا بکا مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں مدھم سا مسکرائی تھی۔ ”اور اب مجھے یقین ہے کہ تم میرے لیے ضرور دعا کرو گی۔“ میں تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ پیچھے وہ زور زور سے چلا رہی تھیں۔

”تم مجھے ہر بار بلیک میل کرتی ہو۔ تم اچھی لڑکی نہیں ہو۔ احسان کر کے جتانی ہو۔“ جیسے جونٹ کے کانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ زور سے بلی کو دوبارہ فرش پر پٹخ دیا۔ بلی نے نالواری سے اس تشدد پر آواز نکالی تھی اور ”وہ“ دونوں ہاتھ جوڑے اب دعا کا ارادہ باندھ رہی تھیں۔



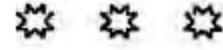
کچھ سال پہلے۔

ہال۔ یا۔۔۔ شاید کافی سال پہلے میڈیا میگ مائیگریٹ اسٹوڈنٹس میں سے ایک یوسف علی نے ”میر جعفر“ کا سا کردار ادا کیا تھا۔ میڈیا میگ ایک مشہور تعلیم صحافت کا ادارہ تھا۔ جس کی بنیاد ہی ”تعصب“ پر تھی۔ سالانہ تقریب منعقد کرائی جاتی تھی جس میں اپنا اپنے ملک کا اپنے مذہب کا حوالہ دیا جاتا تھا اور یوسف علی کٹھ پتلی کی ڈور پھینچ کر اس نے ”میر جعفر“ کا کردار ادا کروایا گیا تھا۔ کیموں کی چکا چونڈ روخنیوں میں یوسف علی نے اپنے میر جعفر ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ صحافیوں کی انگلیاں پیڈز پر حرکت کر رہی تھیں۔ فلیش لائٹس۔ پرووں کے پار سنہرے

عکس۔
 ”میں پاکستان سے ہوں۔ مگر میں اپنی شناخت کا حوالہ پاکستان سے بیان کر کے بہت شرمندہ ہوں۔ بچپن سے لے کر آج تک میں اپنی اس شناخت پر خائف رہا ہوں۔ میں نے اپنے وطن سے محبت کی ہلکی سی رمت کو بھی کبھی اپنے دل میں ابھرتے نہیں دیکھا۔ غربت، جمالت، تنگ نظری، تعصب پاکستان کا حصہ ہے۔ ساری بین الاقوامی تخریب کارانہ سرگرمیوں کا محرک پاکستان ہی رہا ہے۔ حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عوام بھی گریٹ ہے۔ بھلا کسی ایسے ملک سے محبت کی جا سکتی ہے؟ میں تو جلد ہی کسی قارن کنٹری میں شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے لیے اب پاکستان میں ایک لمحہ بھی گزارنا مشکل ہے۔ دوسرے ممالک سے خیرات مانگنے کی لاعلاج بیماری ہے پاکستان کو۔ ایسی بیماریوں کی دوا ہی نہیں ہوتی۔ فرقہ واریت بھی پاکستان میں موجود ہے۔ مذہب کے نام پر لڑنا بھڑنا پاکستان کے پاسیوں کی پرانی عادت بن چکی ہے۔“ ہال میں نکلیاں بج رہی تھیں۔ یوسف علی نے خود کو اونچا اڑتا محسوس کیا تھا۔ سیڑھی کے اوپر سیڑھی۔ دوسری سیڑھی کے بعد تیسری سیڑھی۔ آسمان پر ہاتھ پکھنچنے کو تھے۔ تقا خزانہ انداز سے یوسف علی صحافیوں کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔
 ”یوسف علی۔! آپ نے تو پاکستان کا کچا چٹھا کھول دیا ہے۔“

”جی میں بہت صاف گوانسان ہوں۔ میں نے آج تک کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ جو حقیقت تھی میں نے بتا دی۔“
 ”کیا آپ اپنی باقی لائف پاکستان میں گزاریں گے؟“
 ”نہ۔ نیور۔ آئی کین نوٹ لیوان پاکستان“
 میڈیا میگ کے سربراہان نے ایک عجیب سی مسکراہٹ سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور پھر کھل کر مسکرائے۔

یوسف علی جیسی بہت سی ”کٹھ پتلیاں“ ان کے پاس تھیں جنہیں وہ ”اسلامی ممالک“ کے خلاف استعمال کرتے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے عزت اور ذلت دینے کے اختیارات انسانوں کے پاس نہیں ہوتے، کبھی نہیں۔ یہ تھا۔ کچھ سال پہلے کا قصہ۔ اور اب چلتے ہیں کچھ سال بعد کے قصے کی جانب۔



23 مارچ کی شام۔

وہ شام اپنے وجود میں ان گنت روشنیاں لیے اتری تھی۔ کبھی کبھی بڑھتی تاریکی میں یوں گمان گزرتا تھا جیسے کسی نے شہر تاریک کے احاطے میں ننھے ننھے مٹی کے دیے جلا رکھے ہوں۔ ہال سے باہر سیڑھیوں کے اسٹیپس تک ریڈ کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتی جا رہی تھی جب میں نے اجت کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا۔

”تم آج تو جلدی آجاتی۔“ اس کے بھورے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں شکوہ سا تھا۔

”سوری احمد۔ تمہیں تو پتا ہے میں ہر کام سکون سے کرنے کی عادی ہوں۔“ ہم دونوں نے قدم آگے بڑھائے تھے۔ چھتوں پر لٹکتے فانوس کی جھالروں میں لگے ڈانٹلہ زست رنگی روشنیاں بکھیر رہے تھے۔ اسٹیج کے سامنے گلی کرسیوں کی قطاروں پر مختلف طلبہ منڈیا کے لوگ اور میڈیا میگ کے خزانہ سربراہان بیٹھے تھے۔

اسٹیج پر میرا نام بکارا جا رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اسٹیج کی طرف بڑھی تھی۔ وہیں مائیک پکڑتے ہوئے میری نظر اگلی رو میں بیٹھے فریڈرک پر پڑی تھی۔ جس کے چہرے پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ ہال کی روشنیاں دائرے کی شکل میں گھوم رہی تھیں۔ ست رنگ۔ نیلا۔ جانتی۔ پیلا۔ سبز۔ اور۔ بہت سے رنگ میڈیا میگ کے سربراہان کو بالکل بھی پتا نہیں تھا کہ وہ ”یوسف علی کی بیٹی نہیں“ عالیہ یوسف

کھڑی تھی۔ وہ عالیہ یوسف جو ایک محب وطن شہری تھی۔

میں نے گلا صاف کیا اور بغیر رکے بولنا شروع کیا تھا۔ مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ سارے میڈیا کی نظریں مجھ پر تھیں۔ کیمروں کی لائٹس ترچھے رخ سے بڑھ رہی تھیں۔

”میں عالیہ یوسف ہوں۔ ملک پاکستان کی ایک محب وطن شہری اور دین اسلام کے اصولوں پر پروان چڑھی ہوئی۔ مجھے آج سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا بتاؤں؟ کیا کہوں؟ مگر اتنا کہوں گی میرا خیر حب الوطنی کے جذبے سے اٹھایا گیا ہے اور میں پاک لوگوں کی سر زمین کی باسی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارا میڈیا پاکستان کو غلط رخ سے دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے اور میں اس بات کی بھرپور مذمت کرتی ہوں۔

ہمارا مذہب اسلام ہمیں مساوات، رواداری، اخلاقیات، متحمل مزاجی، معاملہ فہمی جیسے درس دیتا ہے۔ جو فرقہ واریت، تعصب پسندی اور تخریب کاری جیسے انتہا پسندانہ کاموں سے روکتا ہے۔ غیر ملکی تنظیموں نے پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سائیکھو حکمتا



نئی کہیں

قیمت - 300 روپے

منعاً ہے کاہنہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی۔ 32735021

14 اگست 1947ء کو یہ ملک پاکستان
تھیاری کے زور پر نہیں بلکہ سوچ کے زور پر نظریہ کی
پر حاصل کیا گیا۔ ایک ایسا ملک جس کی جڑیں اسلام
سے مشروط ہیں جو صرف امن کا درس دیتا ہے۔ جس

ملک کے مذہب کے اصول اتنے اعلا شان اور پختہ ہوں
وہ ملک آخر کو نگر فرقہ واریت اور تعصب پسندی جیسے
القاب حاصل کر سکتا ہے۔

جاننے کیوں غالبی برادری پاکستان کی آڑ میں ”وار
گیم“ کھیلتی ہے اور پھر نام پاکستان کا آگے کر دیا جاتا
ہے پاکستان کے باسیوں میں ابھی اتنی جرات، جوش،
ولولہ ہے کہ اپنے ملک کی طرف بڑھنے والی انگلیاں
جڑوں سے کٹ ڈالیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے
دینے کا حوصلہ ہے ابھی ہم میں۔ ہمیں تخریب کار کا
خطاب دینے والے خود ہی تخریبانہ تنظیموں سے گٹھ جوڑ
کرتے ہیں اور ان کی سرپرستی کرتے ہیں۔“

میں نے نظر سامنے دوڑائی تھی۔ ایسا لگتا تھا جسم
سے خون نچوڑا جا رہا ہو۔ فریڈرک کے چہرے پر جیسے
سیاہی پھرنی تھی۔ روشنیاں اپنے دائروں سے مخالف
سمت کھونٹے لگی تھیں۔ میں نے گھاتر کیا تھا۔

”کچھ سال پہلے اسی دن اسی جگہ یوسف علی
میرے ابو کو خرید لیا گیا تھا اور انہوں نے بہت کچھ غلط
کہا تھا“ آج میں ان کی جانب سے پوری پاکستان قوم
سے معافی مانگتی ہوں۔“ میں نے ہاتھ جوڑے تھے
صحافیوں کے سوال شروع ہو گئے تھے۔

”یوسف علی کو کس نے خرید اتھا؟“
”میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتی“ میرا مقصد صرف
انہیں احساس دلانا تھا۔ دیش آل۔“ میں نے بات
ختم کی تھی اور احمیت کو دیکھا تھا جو کٹری کا نشان ہٹائے
مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے گفتگو کے آخری سرے
جوڑے تھے۔

”کسی بھی ملک، کسی بھی مذہب کو تعصب پسندی
اور فرقہ واریت کا طعنہ دینے سے پہلے حقائق پر نظر نہ
ڈالنا حماقت ہی ہوگی اور میڈیا میگ کے سربراہان میں

ایسے احمق لوگ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ درس گاہ کا
مقصد درس دینا ہوتا ہے تاکہ کسی خاص ملک کو نچوڑا کھانا
اور پوری دنیا کے سامنے ڈی گریڈ کرنا اور آخر میں
میں بس اتنا کہوں گی۔ میرا ملک پاکستان مساوات اور
برابری کا درس دیتا ہے۔ ہمارے ملک کے جوانوں کو
حب الوطنی کی گھٹی پلائی جاتی ہے اور گھٹیوں کے
اثر زندگی کی آخری سانس تک قائم رہتے ہیں اور ہم
پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں
گے۔“ میں نے زور سے ڈانس پر ہاتھ مارا تھا اور ریڈ
کارپٹ پر چلتی ہوئی ہال سے باہر نکلنے لگی۔ میڈیا میگ
کے سربراہان پر طمانچہ مارا تھا میں نے اور اس کا اثر کتنا
گہرا تھا میں یہ اچھی طرح جانتی تھی۔ رات کے آچل
میں دھند گم ہوتی جا رہی تھی۔ میں ہال کی سیڑھیاں
آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ وجود جیسے ہلکا ہو گیا تھا۔
لوٹھی فلک بوس بلڈنگوں کے پار پٹنے جیسے جھول رہے
تھے۔ میں نے آہستہ سے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ ڈھیر
سارے پاکستانی طالب علم میرے پیچھے میرے قدموں
پر قدم رکھتے ہوئے آ رہے تھے شاید انہیں پیسہ نہیں
خرید سکا تھا یا پھر حب الوطنی کی گھٹی کا اثر باقی تھا۔ ہم
نے گول دائرہ بنا کر ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے آواز لگائی
تھی۔

”پاکستان زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔“

”ہم پاکستانی ہیں“ ٹیلی ویژن اسکرین پر لائیو
نشریات نشر ہو رہی تھیں۔ میں فریڈرک کے پاس آئی
تھی۔

”نک ایٹ ایم آئی ایم نوٹ الون“ ”دیکھو۔
میری محنت۔ افسوس۔ میں قافلے کا۔ آخری
مسافر نہیں ہوں۔ اپنے ٹشو بکس اب خود ہی یوز کرو۔“
میں اور احمیت کرشل شاپ میں کافی پینے جا رہے تھے۔
”آپ ہمیشہ اپنی گھٹی پر چلیں جو آپ کو حب الوطنی
کا درس دیتی ہے۔ میرے بھائی بناؤ لٹ ہے۔ بس۔ دل
کی گرد اور جالوں کو صاف کر کے حب الوطنی کا ٹھہکانا
دیں آپ کو اور آپ کے ملک کو صرف اور صرف آپ
کے گھرے جذبوں کی ضرورت ہے۔“



گلاب بردن خوبصورت

مکمل تحفظ مکمل تازگی



facebook.com/GirlTalk.by.Butterfly

Butterfly

BREATHABLES

READING
Section

Downloaded From
Paksociety.com

مُحَلِّ تَاوِل

ساترہ رَضَا

حُجَّتِ سَیِّدِ کَا تَم

ہو جاتا تھا۔

جب دل و دماغ شدید انتشاری کیفیت میں آجاتے
تو جسم کے افعال پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اٹھتے کہیں اور
پڑتے کہیں جیسے قدم۔

ان کی خاموشی کو مزاج کہہ کر سالوں پہلے چھوٹ
دے دی۔ الگ تھنک انداز کو جھجک کے خانے میں

اتنے سال سے ایک ساتھ رہنے کے باوجود وہ کتنی
الگ دکھائی دے رہی تھیں۔ اجنبی کٹھور۔ وہ سمجھ
نہیں پارہے تھے ان کے جملوں نے زیادہ تکلیف دی
تھی یا ان کی آنکھوں سے جھلکتی اجنبیت نے دل کو
توڑا تھا۔ اتنے سال۔ کتنے سال وہ غیر ارادی طور پر
انگلی کی پوروں پر حساب جوڑنے لگتے پر سب خلط طوط

ماہنامہ شعاع مارچ 2016 162

READ
Secti



Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section



ڈال دیا، مگر یہ تو نہیں سوچا تھا۔ وہ خاموش اس لیے رہتی تھیں کہ اپنے آپ سے گفتگو کی عادی ہو چکی تھیں اور الگ تھلگ اس لیے تھیں کہ انہوں نے ان سب کو اپنا کبھی سمجھا ہی نہیں تھا۔

اور ایسی ہی کیفیت کے زیر اثر بڑی امی بھی تھیں مگر این کی سوچ تھوڑا آگے جا کر ایک سوال پر اٹک گئی تھی۔ انہیں پہلی بات کا زیادہ دکھ ہوا تھا یا دوسری کا۔ یا تیسری کا۔ انہوں نے تیز تیز پلکیں جھپکیں، کہیں آنسو چھلک نہ جائیں حالانکہ یہ خواہش بے وقوفی تھی۔ کوئی اندھا بھی بتا سکتا تھا۔

وہ انسان نہیں لگ رہی تھیں۔ مجسم آنسو جیسے۔ موم بتی کی طرح جسے خود کبھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہے۔ پانی ہوتے ہوتے بھی اپنی ہی روشنی پر نازاں رہتی ہے ہوش تن آتا ہے جب بجھ چکی ہوتی ہے۔

لیکن نہیں۔ انہیں تو پتا لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے ختم ہو رہی ہیں۔ ان کی نگاہیں بیٹے پر ٹک گئیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ ہاں وہ ہو گا اتنا بہادر مگر وہ نہیں تھیں۔ ان کی بھری سوالیہ نگاہیں شوہر کی سمت اٹھیں وہ بھی مسکرا رہے تھے۔

”امی! چائے“ وہ وہ چونک کر مڑیں۔ یہ ان کی بیٹی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ کمال ہے مسکراتا کیا اتنا آسان ہے۔

”بااوب با ملاحظہ ہو شیار شنزادی صاحبہ۔ اپنی پہلی تنخواہ لے کر حاضر ہیں۔“

ان کی سوچوں کا سراپھوٹ گیا۔ کھکتی آواز پر سب چونک کر متوجہ ہوئے تھے آتش گللی روٹھا قیصر کے ہمراہ سفید جوڑی دار پاجامہ ڈر اس ہیل والی سیاہ جوتی۔ خوب صورت ہینڈ بیگ۔

”شنزادی۔ یہ تم نے اپنے لیے کہا ہے؟“ معید کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”ہاں!“ اس نے دانت پیسے اور ساتھ ہی اپنا بیگ اس کے کندھے سے لگرا دیا۔

”تم تمہارا جملہ ہونا چاہیے تھا جل کڑے۔ میں

خود کفیل ہو گئی ہوں۔“ وہ چستلی آنکھوں سے سب کو دیکھتے ہوئے اپنا بیگ کھول رہی تھی۔ ”اس میں اتنے نوٹ ہیں اتنے نوٹ۔“ سفید لفافہ نکال کر اسے ہاتھوں میں تولا کہ اس کا وزن دیکھو تم۔ وہ دھپ سے گرسی پر بیٹھی۔ لفافہ اچھال رہی تھی اوہ۔ اس کی جھولی میں نوٹ گر گئے کچھ زمین پر گرے۔

”ہائے۔“ اس نے سب کو شرمندگی سے دیکھا۔

”اوچھے جٹ کٹورا بھیا، پانی پی پی اچھریا۔“ معید اس سے زیادہ فی البدیہہ اور کیا ہوا؟ (تندیدے جٹ کو پیالہ ملا اس نے پانی پی پی کے پیٹ پھلا دیا)

”یہ تم نے مجھے کہا ہے۔“ وہ نوٹ سمیٹتا بھول کر اب سے گھورنے لگی۔

”دیکھ رہے ہیں آپ سب لوگ؟“ اس نے باری باری سب کی صورتیں دیکھیں اور تب ہی وہ چونکی۔

”کیا بات ہے ایسے جب کیوں ہیں؟ کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ کیا ہوتا ہے۔“ سب ایک ساتھ ایک جیسے جملے بول پڑے پھر جب نظریں آپس میں ملیں تو نگاہیں چرا گئے۔

(سب کچھ تو ہو گیا تھا بچا کیا تھا بچھے)

”کوئی بات ہوئی ہے امی!“ وہ پُرسکون چہرے لیے بیٹھی ماں کی سمت گھولی۔

”نہیں کیا ہوتا ہے؟“ انہوں نے اس کے گل پر

شفقت سے ہاتھ رکھا تھا۔

”نہیں۔ مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے آپ لوگ کچھ چھپا رہے ہیں۔“

”نہیں بیٹا! بس حیران ہیں اتنے بہت سارے نوٹ پہلے نہیں دیکھے تے۔“ بڑے ابو نے بھول پن سے جتایا۔

”سے ناں!“ وہ فوراً خوش ہو گئی۔ ”بہت سارے ہیں نا۔ تین مہینے کی تنخواہ ہے یہ۔“

”ماشاء اللہ“ امی نے کہا۔

”آپ کچھ نہیں بول رہیں امی! آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔“ وہ اس کی تھی تھی باتوں کو سر لہا کرتی تھیں تو اب ایسے کیوں۔

”جوش سے زیادہ حیران ہیں۔ پہلی تنخواہ کی اتنی قدر افزائی ماشاء اللہ۔“ وہ پوچھ بڑی امی سے رہی تھی صفائی ان کی بیٹی کی جانب سے آئی۔ اس نے سمجھ کر لبہا سا بس بھرا اور ہنس دی۔

”کیا کروں اتنے نوٹوں کی عادی نہیں بنا۔ تو یہ سمجھ میں نہیں آتا میں اتنے سارے پیسوں کا کروں گی کیا؟ ہیں تم ہٹاؤ۔ یہ نیازی سے کہتی وہ معیہ کی سمت گھومی جو نوٹ اکٹھے کر چکا تھا اور لگانے میں سلیقے سے بھر رہا تھا۔

”اپنی امی کو دینا!“ بڑے ابو نے نرمی سے کہا۔

”ان کا حق ہے۔“

”ہاں۔“ اس کی نگاہیں ماں کی جانب اٹھیں۔ وہاں بھرے انداز سے ایک حق سے ایک حق سے بیٹھی تھیں۔ ایک مسکراہٹ لبوں پر رقصاں تھی۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا، مگر اک سنجیدگی بھی چہرے پر آئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا۔ ”امی کے حق سے تو انکار نہیں۔“ وہ تین قدم چل کے ان کے نزدیک آئی پھر ماں کی سمت دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھیں، مگر ان کا انداز کچھ عجیب سا لگا۔ ناقابل فہم۔

”میں اپنی پہلی تنخواہ آپ کے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہوں ابو۔“ وہ ذہن پر ان کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ گئی اور لفافہ ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ یہ بالکل غیر متوقع

صورت حال تھی۔ امی کا مسکراتا چہرہ یک دم تن گیا تھا انہیں جیسے اس چیز کی امید نہیں تھی۔ دوسری طرف ابو کو یوں لگا جیسے کسی نے گود میں جلتے کوئلے رکھ دیے ہوں۔ وہ دامن جھٹک کر کھڑے ہونے ہی والے تھے جب نگاہ پھر اس کے چہرے پر ٹپک گئی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ احسان مان محبت ایثار بحق و فرض کی باتیں۔ اس کا ایک ایک لفظ اس کے دل کی سچائی کا منظر تھا اور صرف زبان ہی کیوں۔ اس کا چہرہ اس کی آنکھیں سب اپنے کے ہر لفظ کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ مگر وہیں اس کی امی کا تنا چہرہ۔ اس پر ایک جتنا طے

کی سلوتیں اور استہزاء ایک ناگواری و طیش انہیں یقیناً بیٹی کا یہ عمل پسند نہیں آیا اور وہ سارے خوب صورت جملے بھی جو ان کی بیٹی احسانات کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا امی!“ اس نے یک دم ماں کو پکار لیا اور بڑی امی پہلی بار ششدر رہ گئیں۔ بیٹی کے مخاطب کرنے پر یک دم وہ نفرت بے زاری، طنزیہ تحریر عائب ہو گئی تھی۔ وہ بیٹی کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں بیٹی کے اس عمل سے بہت خوش۔ اور اگر وہ کچھ لمحے پہلے ان کی حقیقت سے واقف نہ ہوئی ہوتیں تو دل کیسے خوشی سے بھر جاتا۔ (وہ انہیں عزت دیتی ہیں؟) ان کا دل بری طرح بے زار ہوا اور دم بھی۔

”نہیں۔ یہ ہم نہیں رکھ سکتے۔“ وہ جگہ سے کھڑی ہو گئیں پھر خود ہی آگے بڑھ کر لفافہ شوہر کی گود سے اٹھا کر اسے تھمایا۔ ”یہ تم اپنی ماں کو دو۔“ اور اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں گئیں۔ کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔

حیرانے بری طرح چونک کر انہیں جاتا دیکھا تھا۔ پھر بڑے ابو کو۔ وہ مسکرا رہے تھے اس نے ان دونوں بن بھائیوں کو دیکھا۔ معیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا جیسے کچھ نہیں ہوا، مگر بھائی کی بن میرا وہاں کے پیچھے چلی گئی تھی پائی پر پڑی چائے کی ٹرے۔

”میں ذرا نماز کی تیاری کر لوں۔“ بڑے ابو بھی کھڑے ہو گئے اسے بھی کھڑا ہونا پڑا۔

تمہاری اپنی لکھی کہانی

فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے



”کیا ہوا ہے سب خیر ہے ناں؟“ وہ اسے دیکھنے لگی جو جھک کر تپائی کے نیچے سے ہزار کالوٹ اٹھا کر اسے دے رہا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ اوچائے پیتے ہیں۔“

”نہیں۔“ وہ پوری کی پوری ماں کی سمت گھومی۔
 ”امی! کچھ ہوا ہے نا۔ آپ کو تو آج شاید پھپھو کے گھر جانا تھا نا۔ انہوں نے کچھ کہا۔“ بتائیں نا؟“ اسے بروقت یاد آیا۔ اپنی خوشی میں اتنی بڑی بات بھول گئی۔ وہ اسے جواب دیے بغیر کمرے سے چلی گئی تھیں۔ امی نے تو اسے کچھ نہیں بتایا۔ ”کچھ نہیں ہوا۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔“ کہہ کر ٹال دیا۔ وہ سب کچھ جاننے پر مصر تھی، مگر امی کو ایک غائب دماغی کی سی کیفیت میں گھرا دیکھ کر پھر اس نے مزید سوالات کا ارادہ ترک کر دیا۔

سیرا امی سے پوچھے گی۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ ڈھیلا ڈھالا رنگ برنگ سوٹ اور کمرے سے بھاگی۔ برس یونہی کھلا پڑا تھا اور تنخواہ والا لٹافہ کسی فالٹو کاغذ کی طرح اس نے لاپرواہی سے ڈال دیا تھا۔ آج امی اس کی لاپرواہی اور بے نیازی پر کچھ بولی نہیں تھیں۔ نجانے ان کا دھیان کدھر تھا۔ سیرا ڈھیلے انداز سے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اسے اندر آنا دیکھ کر وہ بلاوجہ بیڈ کی درازیں کھولنے لگی۔ بڑی امی کے ہاتھ میں تسبیح۔ نظر ملنے پر اس نے دیکھا ان کی آنکھوں میں اتنی ویرانی تھی کہ دل کانپ جائے، مگر انہوں نے ترنت تاثرات بدلے تھے اور تسبیح سے دانے گرانے شروع کر دیے تھے۔

”اب کوئی مجھے بتائے گا کہ کیا معاملہ ہے؟“

”کون سا معاملہ۔ کوئی معاملہ نہیں ہے۔“ سیرا مسکرائی تھی۔

”وہی معاملہ جو چھپایا جا رہا ہے جبکہ سب جانتے ہیں مجھ سے کچھ بھی چھپایا نہیں جاسکتا۔“

”بالکل درست۔ ساری زندگی میری امی اور تمہاری خود کی امی کھانے پینے کی چیزیں چھپا چھپا کر رکھتی رہیں، مگر تم چوبیہا کی طرح کترنے پہنچ ہی جاتی

تھیں۔“ وہ چونک کر آواز کے تعاقب میں گھومی۔
 ”اوہ۔“ اس نے ہاتھ کمر پر ٹکائے۔ معید بھی کمرے میں موجود تھا کونے والے صوفے پر بیٹھا ہوا۔

”بڑی امی نے مجھ سے کبھی کوئی چیز چھپا کے نہیں رکھی۔ ہاں میری امی ضرور ایسے کام کرتی تھیں، وہ بھی اس لیے کہ انہیں خدشہ تھا میں موٹا بم بن جاؤں گی۔“ اس کی صاف گوئی پر بڑی امی کا ہاتھ رکا تھا۔

”ہاں انہوں نے ہمیشہ اسے اپنی اولاد کی طرح چاہا تھا، مگر کیا واقعی اس نے اس چیز کو تسلیم کیا تھا۔ یا وہ بھی ماں کی طرح اداکارہ تھی۔ اداکار۔“ ان کا ذہن الجھا ”منافقت کو اداکاری کہنا شاید صحیح نہیں۔“ اداکار تو خوش کرتا ہے واہ واہ پر مجبور کر دیتا ہے جبکہ منافق۔ وہ کیا کرتا ہے ہاں اداکار اور منافق میں بڑا پارٹیک فرق ہے۔ اداکاری کے بارے میں ہم جانتے ہیں یہ جو کچھ کہہ رہا ہے کر رہا ہے یہ بر ملا کسی کروار کو بتا رہا ہے جبکہ منافق کے بارے میں ہم جانتے نہیں ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ اداکاری ہے۔ اس کے دل میں کچھ اور ہے اور زبان پر کچھ اور۔“

”سچ اگر بڑی امی مجھے چھپا چھپا کر کھلاتی پلاتی نہیں۔ تو میں نے تو واقعی میں مرجانا تھا اور دیکھو میں کوئی موٹی ہوئی؟ بالکل بھی نہیں۔“ اس نے اپنی قمیص کا سرا پکڑ کر ذرا سا گھوم کر دکھایا۔ معید کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑی۔ اونچی بندھی پونی کی وجہ سے اس کی پتلی لمبی گردن نمایاں ہو رہی تھی منہ دھو کر آئی تھی چہرے کا ٹکڑا پن ماحول کو تروتازہ کر رہا تھا۔

”دراصل امی فطرتاً ایک وہی عورت ہیں۔“ اس نے بڑا سرار راز اور رازانہ انداز اپنایا۔

”کاش وہی عورت ہی ہوتی۔“ بڑی امی کا دل بولا۔

”وہ چاروں قل پڑھ کر پھونک مار دیتیں۔ تعویذ بنوا لائیں۔ دل بدل جاتا، لیکن دھوکے کا علاج نہیں ہوتا۔ نفرت کا مرض بھی لا علاج ہے۔ جوڑ توڑ کرنے والے کبھی خزانوں کے مالک نہیں بنتے بس اس خوش فہمی میں جیتے ہیں۔ ہم جمع کر رہے ہیں اندھا دھند، انہیں یہ بھی پتا نہیں لگتا جن سکوں کی حفاظت میں عمر گلائی وہ

”امی پلیز۔“ معید کے دو لفظوں میں گہری تادیب تھی۔

”ہاں امی پلیز۔“ سمیرا کے تین لفظ بھائی کی گزارش کی سفارش تھے۔

”کیا ہو گیا۔ کوئی بات ہے؟“ پہلی بار اس کی آواز میں لرزش تھی۔ بہت ٹوٹے لفظ۔ ”میں نے کچھ کروا کیا؟ کوئی مجھے بتائے تو۔“ وہ جست بھر کے بڑی امی کے عین سامنے آگئی۔ اب منہ موڑ کر دکھائیں۔

”بتایا اسے جاتا ہے جو انجان ہو۔“
”مجھے واقعی کچھ نہیں معلوم۔ صبح آفس گئی تھی اور ابھی آگئی ہوں۔ آپ بتائیے تو۔“ اس نے لجاجت سے کہتے ہوئے ان کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ ”مگر۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹکا دیا تھا۔ حمیرا عبدالمجید کا ہاتھ بڑی امی نے؟

”اوہ۔“ اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔
”کچھ نہیں ہوا حمیرا! تم جاؤ۔“ سمیرا اپنی جگہ سے اٹھ آئی۔

”کیوں نہیں کچھ ہوا۔“ بڑی امی نے تسبیح رکھ دی۔
”میں نے محبت اتنا مان بھروسا مخلص سب پر پھیر دیا۔ ان مال بٹی نے۔ کون سی کی چھوٹی تھی ہم نے محبت میں اور کبھی صلے کی امید نہیں رکھی۔ دونوں ہاتھوں کو دینے والا بنا دیا۔ کچھ سوچا بھی تو بھلے کا سوچا جہاں لگا غلط ہو جائے گا۔ خود بخود پیچھے ہٹ گئے اس کا باب قطع تعلق کر کے گیا تھا۔ کوئی خیر خبر نہیں رکھی۔ اس گھر سے اپنا حصہ لے گیا۔ اپنی الگ دنیا بسائی۔ تمہارے باپ نے اس پر بھی اعتراض نہ کیا اور پھر اس کے مرنے کی خبر سن کر کیسے اس نے منٹوں میں فیصلے کیے، کسی سے نہ پوچھا نہ بتایا اور میں نے ایک اچھی بیوی ہونے کے ناتے ان کے ہر فیصلے پر سر تسلیم کیا۔ تمہارے باپ نے کہا ”آج سے اس گھر میں حمیرا کا وہی حصہ ہے۔ جو عبدالمجید کا حصہ تھا۔“ میں بے ساختہ بولی۔ ”عبدالمجید کا حصہ گھر میں، مگر وہ تو اپنا حصہ لے چکا ہے تو ہوتا ہے وہ کیا بولے۔“

کب کے متروک ہو چکے۔ وہ بھروسے کے چرنے پر محبت کا دھاگہ کاٹی رہی اور وہ صفیہ دھوکا بیتی رہیں تھان کے تھان۔ ڈھیر لگا دیے۔ ایک ہنائی الٹی ایک سیدھی ایک تار بغض کا ایک بدگمانی کا ایک حسد کا۔ نفرت کی چادر مکمل ہوئی تو ہوا میں اچھل کر سب پر اوڑھا دی۔ سارے منظر دھندلے ہو گئے۔ انہیں حمیرا مجید کا بے ریا چہرہ بھی گدلا دکھائی دینے لگا۔ شک میں پڑ گئیں جو اسے دیکھے گئیں جو چمکتی آنکھوں مسکراتے لبوں کے ساتھ مسلسل بول رہی تھی۔ نجانے کون سے قصے۔ اور معید کیسے انہماک سے اسے سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر وہی خوشی تھی جو ہمیشہ اس کی جانب دیکھنے سے پیدا ہو جاتی تھی اور سمیرا جو گم صم ہو گئی تھی شام سے۔ وہ بھی اس کو سننے میں ایسی محو ہو چکی تھی سب بھول بھال گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے کیسی قیامت ٹوٹی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ زور سے ہنس دی تھی اور اس کی ماں بھی ایسے ہی ہنستی تھی یاد جو اس کے کہ وہ بہت کم ہنستی تھی۔ انہیں لگا حمیرا نہیں ہنس رہی۔ یہ اس کی ماں ہنس رہی ہے۔ ہاں یہ صفیہ ہنس رہی تھی ان پر۔ ان کی گرفت تسبیح پر سخت ہو گئی۔ حمیرا کا ہنستا چہرہ زہر لگنے لگا۔ ہنسی کی آواز کہہ۔

”اس سے کہو معید۔ چپ ہو جائے۔“ وہ چلا اٹھیں اور وہ تینوں بری طرح چونک پڑے۔
”امی! سمیرا کی آواز میں اچھبھا تھا۔“

”اس سے کہو سمیرا! اپنے کمرے میں چلی جائے فوراً۔“ ان کا ہاتھ دروازے کی طرف لبا ہوا اور چہرہ مخالف جانب مڑ گیا جیسے وہ صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔

حمیرا بے یقینی سے چکرا اٹھی۔ اس نے دونوں بہن بھائیوں کو دیکھا۔ شہادت کی انگلی اپنے سینے پر رکھ کر جیسے تصدیق چاہی۔ ”کیا میں؟“

”آپ مجھے نکل جانے کا کہہ رہی ہیں؟“ وہ چند قدم ان تک بڑھ آئی پر یہ کیا بڑی امی کی گردن مزید گھوم

”ای! یہ سب باتیں کیوں کر رہی ہیں۔“ سمیرا ان کے برابر بیٹھ گئی۔

”ہاں ای۔ آپ ہی تو کہتی ہیں کچھ باتیں کبھی نہیں دہراتے۔ خاص طور پر وہ جو فرض سے ہٹ کر احساس کے خانے کا حصہ ہوں۔“

معید نے نرم لہجے میں کہا۔ ماں کا ایسے پھٹ پڑنا اس کے لیے حیرانی تھی انہیں روکنا ضروری تھا ورنہ وہ نجانے کہاں تک جاتیں مانا کہ صدے میں تھیں۔

”لیکن میں دہرانا چاہتی ہوں۔ ابے بتانا چاہتی ہوں کہ اتنے احسانوں کا بدلہ۔“

”ای! احسان کا لفظ استعمال نہ کریں۔“ معید کی نظریں اس کے دھواں دھواں چہرے پر تھیں۔

”مجھے مت روکو، کہنے دو۔“ بڑی امی کے آنسو ٹپک پڑے اور یہ حمیرا کے لیے قیامت کا بل تھا۔ اس نے اٹھیں کبھی روتے نہیں دیکھا تھا کبھی بھی۔ ایسا کیا ہو گیا جو یہ سب ہو رہا تھا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوجا تھا۔

”معید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ احسان کا لفظ مت ادا کریں۔“ سمیرا بھائی کی ہم نوا تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ بڑی امی نے حلق تڑکیا۔ ہتھیلی آنکھ پر بے دردی سے دگر دی۔ ”میں نہیں کہتی احسان کا بدلہ۔ لفظ بدل دیتی ہوں اتنی محبت کا یہ بدلہ۔ یہ صلہ۔“ وہ چپ ہوتے ہوتے رو پڑیں۔

”اوہ خدا۔“ حمیرا کرسی پر مگرنے کے سے انداز میں بیٹھی۔

”میں نے کیا کیا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ پلزم تم لوگ بتا دو کہ۔“ اسے رونا آگیا ”آواز بند ہو گئی۔ آنکھوں میں ہراس۔ شرمندگی اور لاعلمی۔“

”ایسی کوئی خاص بات نہیں۔“

”کیسے خاص بات نہیں۔ بتاؤ اسے اس کی پھپھی نے سمیرا کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔“

”انکار۔“ حمیرا کا جھکا سر اٹھا۔ ”تو اس میں میرا کیا تصور؟“ اس کی آنکھوں سے سوال چھلکا۔ ساتھ ہی اسے غصہ آیا۔

”تو آپ مجھ پر ناراض کیوں ہو رہی ہیں اور پھپھی بھولی کا کیا داغ خراب ہو گیا؟ آپ انہیں ایک پیج مار دیتیں، لٹا خود رونے لگیں۔ میں خود پوچھ کر آتی ہوں کہ طبیعت ٹھیک ہے۔“ وہ سب بھلا کر اپنی جون میں لوٹی تھی۔ اتنی سی بات پر۔

”یہ بھی پوچھ لینا کہ سمیرا کا منع کر کے تمہارا کیوں مانگ لیا۔“

وہ سر پر پلو ڈال رہی تھی ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔

”سمیرا۔“

”ہاں۔ اور ساتھ ہی اپنی ماں سے بھی سوال کر لینا کہ۔“

”ای! بڑی امی کا جملہ ادا ہو رہا گیا۔ سمیرا نے اپنا ہاتھ ان کے ہونٹوں پر رکھ دیا تھا۔ حمیرا نے چونک کر اس عمل کو دیکھا۔

”کیا ابھی کچھ اور بھی باقی تھا مگر کیا؟“ اس نے باری باری تینوں کو دیکھا۔

”اوہ۔“ اس نے لہسا سانس لیا۔ اب وہ سب کچھ اور بتانے والے نہیں تھے تو کوئی بات نہیں وہ خود معلوم کرے گی۔ پھپھی کی تو ایسی کی تھی۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی اس کے بارے میں ایسا سوچنے کی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی اس بار پلو سر پر ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

پھپھی کے گھر پر اساتالامنہ چڑا رہا تھا۔

پانچا پھپھی گاؤں روانہ ہو گئی تھیں ان کے سسرال میں کسی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے پٹا بھی ہمراہ تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ واپس تو گھر ہی آتا ہے نا۔“ اس نے دروازے پر لگے بڑے سے تالے کو پکڑ رکھا تھا۔

”پھر دیکھو میں کیا کرتی ہوں۔ سمیرا کے لیے انکار کر دیا پہلے اس سوال کا جواب لوں گی اور پھر پوچھوں گی کہ میرا نام کس منہ سے لیا بلکہ اتنی ہمت کہاں سے پیدا کی کیا پھپھی جانتی نہیں کہ میں تو۔“ وہ گھر کی جانب مڑی۔



پھپھی کا رشتہ سے انکار اور ساتھ اس کا نام لینا

محبت چھیننے کا خدشہ روگ لگا رہتا ہے۔ تو سمیرا روگی؟
 دنیا چھوڑ دینے کا دل کرتا ہے۔ تو کیا سمیرا جوگی؟
 نہیں نہیں۔ اللہ نہ کرے جو وہ ایسے دنیا ہارے؟
 دل کا ہار جانا بھی تو دنیا ہار دینے کے مترادف ہوتا ہے۔

اس کو ٹوٹ کر سمیرا کے منتے چہرے پر پیار آیا۔
 جست لگا کر اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ ایک ہاتھ
 اس کے شانے پر پھیلا لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا
 ملائم ہاتھ تھام کر اپنی ساری محبت، خلوص جیسے گرفت
 کی گرمائش میں سمیٹ دی۔
 ”بس تھوڑا سا صبر۔ ایک بار پھبھی بھولی تشریف
 لائیں پھر تم دیکھو ارے مجھے کوئی زبردستی اٹھا کر لے
 جائیں گی۔ دنیا میں کوئی مائی کالا ایسا نہیں جو میری
 مرضی کے خلاف کچھ کر سکے، کس میں اتنی اہمیت ہے
 جو حیرت انگیز ہے۔“

”صافیہ چچی۔“ سمیرا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی
 تھی۔
 ”کیا صافیہ چچی؟“ اس نے سر کو جھٹکادیا تھوڑی بھی
 ہلائی۔

”صافیہ چچی نے پھبھی بھولی کو ”ہاں“ بھی کہہ دی
 ہے۔“ سمیرا آدھے جملے پر اٹکی، مگر پھر اس نے بات
 مکمل کر دی۔ یوں لگا جیسے کانٹے نکل لیے ہوں۔
 ادھر اس کے ہاتھوں کی گرفت اتنی ڈھیلی ہو گئی
 جیسے دم نکل گیا ہو۔

”ہاں۔“ اسے اپنی آواز خود سنائی نہیں دی۔
 ”صافیہ چچی۔ مطلب امی نے کیا کر دی؟“

”پوری دنیا کو چھوڑ کر تمہاری ماں کو بھیجا تھا میں
 نے۔“ بڑی امی ساری نقاہت بھول بھال کر اٹھ گئی
 تھیں ”کہہ بھولی آتا سے کہے اب تو وہ اپنی چاروں
 بیٹیاں بھی بیباہ چکی گھر بھی بنا لیا۔ سجالے کرے۔ بیٹے
 کی بری کے لیے ہار بندے اور چوڑیاں بھی بنوا کر گھر
 گھر دکھادیں تو دن تاریخ طے کرنے میں کس چیز کی دیر
 کرتی ہے۔ بیٹی کی ماں اپنے منہ سے کہتی اچھی نہیں

لگتی، مگر شرم، جھجک کے نام پر اس کی عمر کیوں ضائع
 کروں۔ پہلے ہی اللہ کی طرف سے دیر ہو گئی لیکن،
 بڑی امی نے ایک سانس میں طویل بات کر کے
 سانس بھری تو یوں لگا جیسے سسکی ہوں۔

”دونوں نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ بھولی نے
 انکار کر کے اور صافیہ نے اقرار کر کے۔“
 ”امی کیسے اقرار کر سکتی ہیں۔“ وہ پھونچکی رہ گئی
 تھی۔

”سارا قصور ہمارا ہی ہے۔ خلوص محبت کے
 سارے قصے کتابوں میں رہ گئے۔ میرا بھروسا ٹوٹ گیا
 اور وہاں سے ٹوٹا جہاں سے امید بھی نہیں تھی۔“ اس
 کے سفید چہرے پھٹی آنکھوں کو مکمل طور پر فراموش
 کے وہ خود سے ہم کلام تھیں۔ ٹوٹا لہجہ۔ متورم
 آنکھیں۔

اس کی نظریں سمیرا اور معینہ پر گئیں۔ وہ دونوں غیر
 مرئی نقطوں کو گھورتے ہوئے صاف لگ رہا تھا ماں
 کے ہم خیال ہیں۔ اسے پہلی بار صورتِ حال کی
 گہیرا کا اندازہ ہوا۔ انہونی کا احساس یہ سب اس
 نے کیا سنا تھا یقیناً ”کوئی غلط نہیں ہی ہوگی۔“



”پھبھی بھولی کو چھوڑیں ان سے تو کچھ بھی توقع کی
 جاسکتی ہے پر آپ۔ آپ نے کس لیے ہاں کہی۔ کس
 چیز کی ہاں۔ میرا رشتہ اور اے ڈی ریاض سے؟“
 وہ خطرناک حد تک سنجیدہ مسلسل بول رہی تھی
 جبکہ صافیہ بے حد سنجیدہ تاثرات کے ساتھ جس میں
 سکون اور قطعیت کا عنصر نمایاں تھا۔ اسے سن رہی
 تھیں۔ وہ زچ ہو گئی۔ ”آپ کچھ بولتی کیوں نہیں
 ہیں؟“

صافیہ نے ایک طویل سانس بھرا۔ ”تم نے جو کچھ
 سنا ہے وہ صحیح ہے۔“
 ”مطلب؟“

صافیہ نے جواب نہیں دیا۔ بیڈ پر کچھ دھلے کپڑے
 پڑے تھے، انہیں تہہ کرنے لگیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”امی!“ وہ ان کے عین سامنے آگئی۔ ”میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔“
 ”تو میں نے بتا دیا تھا۔“ وہ ہاتھ سے شرٹ کی سلوٹس دور کر رہی تھیں۔

”پچھلے بھولی نے سیرا کے لیے منع کر دیا؟“
 ”ہاں۔“

”اور میرا رشتہ مانگ لیا؟“
 ”ہاں۔“

”اور آپ نے ہاں کر دی؟“ اس کے ضبط کی انتہا تھی۔

”ہاں!“ نگاہیں اٹھا کر بے خوفی سے اسے دیکھا۔
 (کو جو کہنا ہے، گرو جو کرنا ہے)

”امی۔“ وہ دھپ سے ان کے سامنے بیٹھی۔
 ”آپ کو اندازہ ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اور آپ کیا کر آئی ہیں۔“

صفیہ نے جواب نہیں دیا۔ کپڑے اٹھا کر الماری کی طرف بڑھ گئیں۔

”میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں امی۔“ وہ پیچھے سے بولی۔ اس کی آواز بلند تھی۔

”میں تمہارا بھلا چاہتی ہوں حمیرا۔ بلکہ یاد رکھو، اس پوری دنیا میں میں واحد ہوں جو تمہارا اچھا برا پورے خلوص سے سوچ سکتی ہوں۔“ اس کے چہرے کی سرخی پر نظر ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
 ”میرا بھلا چاہنے کے لیے آپ کسی اور کا بیڑہ غرق کرویں گی۔“

”حمیرا کے لیے انکار بھولی تانے خود کیا ہے۔“
 ”تو آپ نے انہیں سمجھانے کے بجائے بڑھاوا دیا۔“

”بڑھاوے کی کیا بات ہے۔ اتنے اچھے رشتے کو کون باگل ماں منع کرے گی۔“

”لیکن باگل بیٹی منع کر سکتی ہے ناں۔“
 ”تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی حمیرا۔“ صفیہ نے الماری سے تلوےب کی۔

”امی! سیرا کا رشتہ زمانوں سے طے ہے۔ اے ڈی

بھائی کے ساتھ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ بڑی امی ساری تیاریاں کیے صرف لڑکی کی ماں ہونے کی جھجک میں پچھلی سے سوال نہیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے آپ کو بھیجا اور آپ نے۔“ اس کے کنبے میں تاسف آمیز شرمندگی نمایاں تھی۔

”کیا آپ نے۔۔۔ میں نے تو بھولی آپ سے نہیں کہا، آپ سیرا کو منع کر کے حمیرا کو لے لیں۔ یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ مجھے مناسب لگا تو میں نے قبول کر لیا۔“
 صفیہ کے انداز کی بے پروائی قابل دید تھی۔

”یہ میرے زسری پرپ کے اسکول کی چوائس کا معاملہ نہیں ہے امی۔ میں چھوٹی بچی نہیں ہوں۔ آپ میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ یوں بالائے بالائے کر رہی ہیں او خدا۔“ اس نے گردن اٹھا کر جھت دیکھی۔

”بڑا ہونے کا مطلب ہے نافرمانی۔ تعلیم نے زبان چلانا سکھا دیا۔ صفیہ نے بیٹی کی دلیل کو رتبے کے لحاظ سے دباننا چاہا۔

”زبان نہیں چلا رہی امی۔ یاد کروا رہی ہوں۔ جو آپ بھول گئی ہیں۔ بجائے اس کے آپ پچھلی کو دو ٹوک جواب دیتیں۔ بلکہ انہیں چارنا کر آتیں کہ ان کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ سیرا کے لیے انکار کریں۔ اتنے سالوں کی معافی۔ خود چار بیٹیوں کی ماں ہوتے ہوئے وہ کسی کی بیٹی کا یوں تماشا کیسے بنا سکتی ہیں اور ہاں۔“ اسے کچھ یاد آیا۔ ”بھائی ریاض کدھر تھے۔ انہوں نے منہ پر بند نہیں باندھا ہاں کے۔“

”بھولی کے آگے کس کی چلتی ہے؟“ صفیہ نے خود کو نئے ضروری کام میں مصروف کر لیا تکیے کا غلاف بدلنے لگیں۔

”آپ کے کہنے کا مطلب ہے یہ سب بھائی ریاض کی رضامندی سے کیا انہوں نے؟“ وہ پہلی بار ٹھنکی۔
 صفیہ نے جواب نہیں دیا۔ بدستور لگی رہیں۔

”ہو ہی نہیں سکتا۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پریسین انداز سے گردن لگی میں ہلائی۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

وہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے اور یہ کوئی

محبت کی لازوال داستان نہیں تھی۔ مگر محبت تو تھی۔ پسندیدگی، وابستگی، روشنی، خوشبو، ہوا، بادل، محبت کے استعارے، مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کن اکھیوں کی چوری جسے ہر ایک پکڑ بھی لے اور انجان بن جائے۔ تو پھپھی کو کیا سوچیں۔ اوہ پھپھی کو تو چھوڑو۔ ”وہ اچھلی اے دوسرا ہم نقطہ یاد آیا۔ جو اس کی زندگی سے جڑا تھا۔“

”سمیرا“ اے ڈی کے معاملے کو تو چھوڑیں۔ آپ نے پھپھی سے یوں کیوں کہا کہ آپ راضی ہیں۔ آپ کیسے راضی ہو سکتی ہیں۔ آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں بھائی ریاض سے شادی کروں گی۔“

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ مجھے مناسب لگا“ میں نے ہاں کر دی۔ ”صفیہ کالج بے تاثر تھا۔ حمیرا کی آنکھیں حیرت سے پھلنے لگیں۔ عجیب سے تاثرات۔ وہ نئی میں سر ہلا رہی تھی۔“

”یہ شادی تو کبھی نہیں ہو سکتی۔ میں بھائی ریاض سے شادی کر ہی نہیں سکتی۔“

”کیوں؟“ اس کے قہقہے سے بھرپور انداز پر صفیہ پہلی بار چونکی تھیں۔ مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ حمیرا کی نگاہوں میں سوسا تاثر گہرا ہونے لگا۔

”ہاں بولو۔ اے ڈی سے نہیں کرنی تو کس سے کرنی ہے؟“ وہ ڈسٹ کر پوچھ رہی تھیں۔

”آپ تو ایسے پوچھ رہی ہیں۔ جیسے جانتی نہیں۔“ اس نے شاک کی نگاہ سے دیکھا۔

”ہاں بیٹا۔! میں واقعی نہیں جانتی کہ تم نے کس سے شادی کا ارادہ باندھ رکھا ہے۔“ صفیہ کے لہجے کا طنز بہت چبھتا ہوا تھا۔ مگر حمیرا کو زیادہ تکلیف اس مصنوعی لاعلمی کے مظاہرے سے ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر بازو لپیٹ کر ماں کی آنکھوں میں بغور جھانکا۔

”آپ واقعی بھول رہی ہیں یا میرے منہ سے اگلاواتا مقصود ہے۔“

”اے منہ سے ہی بتا دو۔ جب آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی ہمت آگئی ہے۔ تو یہ بھی کر لو۔“ ان کے جملے سے ناراضی ہویدا تھی۔ ”کیا دفتر میں کسی کو

پسند کر لیا۔ یا پھر کلچر یونیورسٹی کا کوئی۔“

”ہی۔ ہی۔ ہی۔! وہ سناٹے میں آگئی۔“

”کیا آپ واقعی بھول گئیں کہ مجھے کس سے شادی کرنی تھی۔ بلکہ سچی کیوں؟ کرنی ہے عنقریب کر لوں گی۔“ اس کے الفاظ کا چتاؤ غیر سنجیدہ لگ رہا تھا مگر وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ صفیہ نے چونک کر دیکھا۔

”کون ہے وہ؟“ ان کا سوال بے ساختہ تھا۔ حمیرا کی نگاہیں بھی بے ساختہ ماں پر جم گئیں۔ اور اس پر تب ہی یہ انکشاف ہوا۔ صفیہ قطعاً ”بن نہیں رہی تھیں وہ واقعی لاعلم تھیں اور جان لینے کی عجلت میں بے چین بھی۔“

”معیذ“ اس کے لب وا ہوئے اور ایک سکون کا احساس بھی ہوا۔ جبکہ صفیہ۔ ان کا چہرہ بے یقینی سے ایسے بگڑا جیسے کوئی رندا پیر گیا ہو معیذ؟

”ہاں معیذ۔ آپ تو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہیں جیسے جانتی نہیں۔ یاد نہیں، تایا ابو نے کیا کہا تھا۔“ وہ ماں کو تایا کے الفاظ بتانے لگی۔ مگر صفیہ کچھ نہیں سن رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا۔ ٹرین کے ان کے اوپر سے گزر گئی۔

☆ ☆ ☆

بے حد کالی سناٹے والی رات وہ بے پاؤں گزر رہی تھی، نیند ماں اور بیٹی دونوں کی آنکھوں سے عائب تھی۔

بیٹی ماں کی حالت سے بے پرواہ بول رہی تھی۔ نجانے کیا۔ ماضی۔ باتیں، وعدے، احسان و احساس، محبت و عقیدت۔ وہ دھیرے دھیرے ہوش میں آرہی تھیں۔ سارے تقریری عنوانات۔ ایقائے عمد خلوص و مروت۔

بیٹی کو اچھا تھا ماں کی یادداشت اتنی کمزور ہو گئی کہ اسے کچھ یاد نہ رہا۔ اور ماں کی بے یقینی حد سے سوا تھی۔ اتنی کم عقل۔ بے وقوف، بلکہ پاگل۔ ہاں پاگل والی مثال درست تھی اس نے پاگلوں والی بات ہی تو کی

تھی۔
 کہاں حمیرا عبد الجبید ایک بڑی افسر۔ اعلا تعلیم یافتہ
 اور کہاں سعید اور پھر صفیہ کا منہ کھلا تھا اور زبان چل
 پڑی تھی۔
 منہ کا کھلنا جیسے گڑ کا ڈھکن اٹھایا ہو۔ تعفن۔ سوچ
 کی تنگی۔ دل کی تنگی۔ دونوں چیزیں مل کر کیسے زندگی کو
 تنگ کر دیتی ہیں۔

اور زبان کا چلنا۔ اوہ ہو۔ جیسے اناڑی کے ہاتھ تلوار
 لگ جائے پھر جائے پناہ کہاں۔ حمیرا کو لگا وہ کٹ کٹ
 کر گرتی ہے۔ تلوار نوکے میں بدل گئی۔ اس کے کیئے
 گلڑوں کا قیر بننے لگا۔ اور بنانے والی کون اس کی اپنی
 ماں۔

اسے انکار کا دکھ تھا؟ نہیں۔ اسے ماں کے
 اظہارِ رائے نے ختم کیا تھا۔ اولاد ماں باپ کو بے عیب
 سمجھتی ہے۔ اور اس پر ماں کی زبان کے عیب کھلے
 تھے۔ وہی جیسے گڑ کا ڈھکن کھلا تھا۔

کوئی کسی کے لیے اتنے بڑے الفاظ بھی استعمال
 کر سکتا ہے۔ اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا۔

وہ بستر سے اٹھ کر باہر برآمدے میں آگئی۔ سرخ
 اینٹوں والی دیوار پر زرد بلب روشن تھا۔ بلب سے کچھ
 فاصلے پر چھری ٹاگ میں بیٹھی سولی چھپکی۔

دیوار پر ایک بلی چوکتی بیٹھی تھی۔ اور اسے گھور رہی
 تھی۔ ہاں وہ محل ہوئی تھی۔ بلی کی نگاہ دیوار کے ساتھ
 لگے درختوں کے پیچھے بنے چوہے کی بل پر تھی۔ اس
 نے برآمدے کی چالی سے ٹاگ چپکائی۔ وہ چھپکی کی
 محتاط پیش قدمی کو دیکھ رہی تھی۔ اور بلی کے بے آواز
 قدموں کو بھی۔

موقع پرست۔ موقع شناس جانور۔ انسان بھی۔ تو
 کل کو لوگ ہم ماں بیٹی کو بھی اسی نام سے یاد کریں
 گے۔

سانپ کو دودھ پلاتے رہو۔ پلاتے رہو مگر وہ دس لیتا
 ہے۔

(وہ حمیرا کے پیٹھ میں چھرا گھونپ کر کیا۔ سنہنی
 کھلائی۔ نہیں)

بچھوید اہوتا ہے ماں کو کھا جاتا ہے۔ تایا ابو نے اس
 پر جو برسائی تھی مانتا جیسی وہ (شفقت ہی تو تھی۔ یعنی وہ
 بچھو ہو جاتی۔ کبھی نہیں)۔
 اس کا سر نئی میں ہلا۔

رات نہیں تھی سیاہ چادر تھی۔
 خاموشی نہیں تھی موہن جو داڑو تھا۔ (مردوں کا

ٹیلا)

اسے اندھیرے سے ہول آنے لگا۔ اس نے اٹھ کر
 برآمدے کا بڑا بلب روشن کر دیا۔ مگر یہ کیا؟ دل کو قرار
 آنے کے بجائے وحشت مزید بڑھی۔

یہ کیسا سنا تھا۔ سانس روک دینے والا۔
 یہ ہمارا گھر تو نہیں لگ رہا۔ اور یہ رات کب ختم

ہوگی کہ آسمان نیلا ہو جائے اور روشنی پھیل جائے اور
 انسانوں کی آوازوں سے اندر یا باہر بھر جائے ابھی تو یہ
 ایک اداسی وحشت سی ہے۔

کیا کہتے ہیں وہ اسے کچھ یاد آنے لگا۔
 روح اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔

پتا نہیں۔ اس کا پہلا مصرعہ کیا تھا۔ اور حمیرا نے
 اسے منع کیا تھا۔ ایسے منحوس شعر پڑھنے کی ضرورت
 نہیں۔

اور وہ فوراً "ہاں" بھی گئی تھی۔ مگر اس کا پہلا مصرعہ
 تھا کیا پہلا مصرعہ۔

وہ ذہن پر زور ڈالنے لگی۔ مصرعہ تو یاد نہیں آیا۔
 اسے وہ ہنستا مسکراتا وقت یاد آنے لگا جو اس نے گزارا
 تھا۔

وہ خوب صورت صبحیں دوپہریں اور شامیں بے
 معنی ہنسی بے تماشائہنسی۔ فضول باتیں مگر انمول
 باتیں پر وہ مصرعہ کہا تھا؟

وہ مصرعہ جو اس وقت اس گھر پر برس رہا تھا۔
 یہ گھر جو اس مصرعہ کی عملی تفسیر و تشریح لگ رہا
 تھا۔

وہ برآمدے سے ہٹ کر کھڑکی میں آگئی۔ تایا ابو کا
 پورشن کیسی جان لیوا اداسی اور سناٹے میں گھرا ہوا تھا۔
 اوہ وہ مصرعہ۔

ہمارے گھر کی دیواروں پر۔ ہمارے گھر کی دیواروں پر۔ ہمارے۔

حمیرا چھت پر زور زور سے جھاڑ دیتے ہوئے مسلسل ایک ہی مصرعہ دہرائی تھی۔

”یہ کیا بڑبڑا رہی ہے۔ یقیناً مجھے کوس رہی ہوگی۔“ دھلے کپڑے تار سے اتار کر وہیں کھڑے کھڑے تمہ کر کے رکھتی سمیرا نے پوچھا۔

”بڑبڑ۔ کونسا۔ حمیرا کے ہاتھ رکے۔“ اوہو۔ رکتا نہیں ہے۔ ہاتھ چلاتی رہو۔ چچی جان کے کان جھاڑو کی آواز پر ہی لگے ہوں گے۔

سمیرا اپنے نچسے ملائم ہلکے رنگوں کے کپڑے ماسی سے نہیں دھلواتی تھی خود ہی شب میں سرف ڈال کر بیٹھ جاتی تھی۔ ہلکے ہلکے ہاتھوں سے مسل کرتا پر پھسلاتی جاتی۔ حمیرا کی خراب قسمت۔ چچی نے کپڑوں کا گٹھڑا اٹھا کر اور جاتی سمیرا کو دیکھ لیا۔ بری طرح

چونکیں۔ انہیں پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا۔ حمیرا کو بکارا۔ اور میلے کپڑوں کی باسکٹ سے تمام کپڑے الگ کر کے اسے تھما دیے۔

”آج سے اپنے تمام کپڑے تم خود دھوؤ گی۔“

”میں خود۔“ حمیرا بے شکل تمام کپڑوں کے ڈھیر کو بازوؤں میں سنبھالے کھڑی تھی۔ حیرت کی زیادتی نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ ڈھا۔ سارے کپڑے نیچے

صفیہ کو اندازہ تھا۔ فوراً ڈھیر سمیٹا اور دوبارہ حمیرا کی گود میں زبردستی بھر دیا۔

”جی ہاں۔ کپڑے دھونا بھی ایک ورزش ہے۔“

”میں ڈنڈ بیٹھک کر لوں گی امی۔ یہ ظلم نہ کریں۔“ اس کی تو آواز ہی سہنے لگی۔

”وہ بھی کر لیتا۔ اچھا خیال ہے مگر پہلے کپڑے۔“ صفیہ اپنے ارادوں سے کب باز آئی تھیں۔

”دکھتا برا لگے گا نام میں ہل ہل کر کپڑے دھوؤں۔“ اس نے بڑی امی کو ہم خیال بنانا چاہا۔ وہ سرلاتے ہوئے مسکرائیں۔ حمیرا کی ہمت بڑھی۔

”یہ تو تمہارے اپنے اوپر ہے بیٹا۔ تم نہ ملنا۔“

”بڑی امی!“ اس کی نگاہیں شکوہ کنناں ہو گئیں۔

”سمیرا بھی تو دھوتی ہے ناں۔“ صفیہ کے پاس مثالیں بہت ہوتی تھیں۔

”اس کے اور میرے کپڑوں میں فرق ہے۔ وہ ایک بار پننے کو سرف سے نکالتی ہے جبکہ میرے تو سارے کپڑوں میں برش لگانے پڑتے ہیں۔“

”تو بیٹا جی۔ اتنے میلے نہ کیا کرو ناں۔“ صفیہ نے جیسے مسکرا کر دکھایا۔ پھر فوراً سخت ہوئیں ”آج کے بعد اپنے کپڑے تم خود دھوؤ گی۔“

”اور سمیرا! کپڑوں کے بعد چھت کو دھوئے گی بھی حمیرا اور وائپو بھی کرے گی۔“

سمیرا نے جھٹ اثبات میں سر اٹھایا۔

”یہی کیوں ہاپ نہیں تو چھت اکھیڑ کر نیا لینٹرو ڈال دوں۔“ وہ کپڑے اٹھائے پیر پختی سیرا ہیاں چڑھنے لگی۔ بڑی امی زور سے ہنس دیں۔ جبکہ صفیہ نے مسکراہٹ کا کلا کھونٹا۔

واشنگ مشین لگانے سے سمیرا انکاری ہو گئی۔ لان کے کپڑے کون مشین میں دھوتا ہے۔

اور اب چھت کا جھاڑو پوچھا۔ ہوا چل رہی تھی نسخ ہی نہیں بیٹھتا تھا۔

”آہستہ۔ کرو مت اڑاؤ کپڑوں پر چکے گی۔“ سمیرا نے ٹوکا۔ بروہاں تو پھر وہ مصرعہ پر اٹک گئی تھی۔

”ہمارے گھر کی دیواروں پر۔“

کون سی ادسی دیکھ لی اٹھ نہ کرے۔ عروج ناصر صاحب یاد آگئے۔ ”اس سے پوچھ لیا۔“

”ناصر۔ کون۔؟“ حمیرا چونکی یعنی الزام تراشی۔

جھاڑو سمیت ہاتھ کمر پر ٹکا کر وہ سچ سچ کی ماسی بہتو لگنے لگی تھی۔

”ناصر کا ظلمی بہنا۔ مشہور شاعر۔ تم نے اردو کا پیر کیسے پاس کر لیا؟“ سمیرا کی نگاہوں میں شکوک و شبہات تیرنے لگے۔ اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھوٹ گئی۔

”یہ ناصر کا ظلمی کا مصرعہ ہے۔ میں تو سمجھی مجھے

اچانک مصرعہ ہو گیا ہے۔ میں تو دہرا دہرا کر دو سرا بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تو یعنی مجھے مصرعہ ہوا نہیں تھا۔ یوں ہی یاد آ گیا تھا۔ اس کا تو جیسے صدے سے دم نکل جانے والا ہو گیا۔

”جی ہاں!“ میرا نے کھینچ کر کہا۔ ”تھوڑی کوشش کرو تو دو سرا بھی موزوں ہو جائے گا۔“ اس نے دانت میسے تھے۔

”تم نے ٹوک دیا۔ دو سرا بھی سمجھو ہو ہی گیا تھا۔“ حیرانے بھاڑوں کی گانٹھ والا چمٹا حصہ ٹھوڑی کے نیچے نکایا۔

”اواسی پال کھولے سو رہی ہے۔“ اس کے منہ سے دو سرا مصرعہ بھی ادا ہو گیا۔

”واہ۔“ میرا کی بے ساختہ تعریف پر حیرا کا چہرہ چمک اٹھا۔ اتفاق سے یہ دوسرے والا بھی ناصر کاظمی کا ہی ہے۔

”ہیں۔“ حیرا کے ہاتھ سے جھاڑو چھوٹ گئی۔ وہ دھپ سے چارپائی پر بیٹھی پھر زیر لب مکمل شعر دہرایا۔ ”ہاں واقعی یہ تو ناصر کاظمی ہی کا شعر تھا۔ تو پھر اسے کیوں اتنا اپنا اپنا سا لگنے لگا؟ کمال ہے۔“ اس نے سر پکڑ لیا۔

”نئے ڈرامے کی ضرورت نہیں۔ خدا کے لیے اس جھاڑو کو بنالو۔ مختصر سی چھت صاف کرنی تھی۔“

”ذاتی اسٹیڈیم کا ٹھیکہ نہیں دیا گیا تم کو جو۔“ ”جو میری امی کا حال ہے نا۔ وہ ٹھیکہ بھی لے دیں گی۔ اور مائیں بچوں کی صحت مندی پر نظر کاٹیکا لگاتی ہیں اور میری ہاں۔ آہ۔“

میرا نے حیرا کو بغور دیکھا۔ وہ کسی بھی زاویے سے موٹی نہیں تھی۔ پتا نہیں چچی کیا چاہتی تھیں۔ تربیت کرنا اور بات ہے۔ حیرا کی لاپرواہی اور بے ڈھنگے پن کی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ مگر یوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جانا۔ اس کی نظریں لے حد

آرزو (مصنوعی آرزوگی) نظر آتی حیرا پر جم گئیں۔ اس کے دو لفظ تو بنتے تھے۔ مگر منہ کھلنے سے پہلے کن

کھل گئے۔ سارا دھیان پلٹ گیا۔ اس کے قدم کسی سحر میں جکڑے گئے۔ آواز کے تعاقب میں اٹھا ہی چاہتے تھے۔ مگر حیرا نے بازو پکڑ کر روک لیا۔

”اب جاتی کدھر ہو۔ جب مجھ جیسی تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والی لڑکی سے جھاڑو پوچھا کروایا جائے گا تو یہی حال ہوگا۔“ اسے اپنا غم پڑ گیا۔ چارپائی پر ڈھے گئی۔ آنکھیں موند لیں۔ لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے آہ۔

میرا نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور بے قدموں سے سرسری انداز اپنانے چھت کی چھوٹی دیوار تک چلی آئی۔ اس کی سماعتوں نے دھوکا نہیں دیا تھا۔ وہ ستون کی آڑ میں ہو گئی۔ وہی تھا۔ بائیک اشارٹ کیے اپنی ماں کی بات بغور سن رہا تھا۔

دل یک دم خوشی سے بھر گیا۔ تین دن پہلے دیکھا تھا۔ جب وہ کلج جا رہا تھا اور یہ اسکول وین میں بیٹھی تھی۔ راستے ایک ہو گئے تھے۔ مگر یوں اس طرح چپکے سے دیکھنے کا بھی ایک الگ لطف ہے۔ مگر کیا ہوا۔ سنگل بند ہو گیا وہ بائیک پر تھا زن سے نکل گیا۔

”کہتے ہیں نگاہ کا ارتکاز شیشے کو توڑ دیتا ہے۔ اسے کیوں نہیں پتا چلتا تھا۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ یا وہ پتھر ہے۔ نہیں خیر پتھر تو نہیں ہے۔ اسے اپنی الزام تراشی پر خود ہی انیسوس ہونے لگا۔

ماں کی بات ختم ہوئی اور وہ زن سے بائیک اشارٹ کر کے یہ جا۔ اور۔ وہ گلی سے بھی نکل گیا۔ ساری خوشگوار ست ہوا ہو گئی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا۔ امی مجھ سے کروانا کیا چاہتی ہیں۔“ حیرا کی دہائی پر وہ چونکی۔

”آں۔ کیا کہا تم نے؟“ ”ہیں! تم ہو کہاں؟ میں نے ساری رات زلیخا کی اور تم کہتی ہو، مرد تھی کہ عورت۔“

حیرا کا ہاتھ اپنے گل پر پڑا۔ میرا نے سر جھٹک کر خود کو حاضر کیا۔

”ہاں تو کون تھی زلیخا۔ مرد یا عورت؟“ ”ہیں!“ حیرا کا گل پر نکا ہاتھ منہ پر جا پڑا۔ پھر اسے

تب چڑھ گئی۔ وہ اس سے اپنی امی کے مظالم سے بچنے کے لیے مشورے مانگ رہی تھی اور اسے ہوش تک نہ تھا۔

”زلخا نے کون ہوتا ہے۔ بڑی نیک بچی تھی۔ پیدا ہونے سے پہلے اس کی ماں مر گئی۔ اور پیدا ہونے کے بعد وہ خود بھی مر گئی۔“ وہ لفظی کہانی۔ اس نے ہونٹ پھیلائے۔ جیسے ہسی ہو۔

”کیا بکواس کر رہی ہو۔ پیدا ہونے سے پہلے ماں کیسے مر سکتی ہے۔“

”صرف ماں کیوں۔ اس کی نانی کا بھی بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔“

”رہنے دو۔ تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔ جارہی ہوں میں نیچے۔“ منٹ بھر میں وہ سارے زمانے سے خفا لگی۔ ادھر حمیرا جو زلخا کے قصے کو طول دے کر اگلی سات نسلوں تک لے جانے والی تھی۔ سخت بد مزہ ہوئی اور پھر حیران بھی۔

”یہ بیٹھے بیٹھے موڈ کیوں خراب ہو گیا؟“ اس نے سمیرا کو بغور دیکھا۔ وہ ڈھیلے ہو جانے والے بالوں کو کلب میں جکڑتے ہوئے باقاعدہ پھولا غبارہ لگنے لگی تھی اور پھر اس ناراض تاثر کے ساتھ نیچے جانے لگی۔

”ارے! یہ سوکھے کپڑوں کا ڈھیر بھی تو گنتی جاؤ۔“

”تم لے آنا۔“

”ہر میں تو صفائی کر رہی ہوں۔“

”تو یہیں رہنے دینا۔“

”ہیں ابھی تو ٹھیک ٹھاک تھی۔“ حمیرا نے چاروں جانب دیکھا۔ ”تو موڈ آف کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“ وہ منڈیر تک چلی آئی۔

وہی صدیوں پرانی گلی۔ سامنے والوں کی کھڑکی کا دو سال سے ٹوٹا شیشہ۔ پڑوسیوں کے پرانے آم کے درخت پر چڑیوں کا آنا جانا۔

ان کے ساتھ والے گھر کی ٹنگی حسب معمول ٹپک رہی تھی دیوار پر لکیر کی صورت سبز کائی کا نشان۔

سب کچھ تو جوں کا توں ہے پھر اس اچانک بد مزاجی و

ہاں بابا غفار کی چھبے والی دکان اور حسب معمول چوتھے برہنہ بابا اور جو اس کی حرکتیں تھیں تو اوہ۔“

حمیرا نے سکھ کا ساٹس لیا۔ وہ حرکتیں یقیناً ”ایسی تھیں جو کسی بھی انسان کا موڈ تباہ کر سکتی تھیں اور پھر سامنے سمیرا جیسی نفیس طبع، نازک اندام، نازک مزاج لڑکی ہو تو۔

اسے شرارت سو گئی۔ ادھر ادھر دیکھا جیسے کچھ بکوج رہی ہو۔ پھر یک دم آنکھیں چمکیں۔ چوٹی سے

ریزیٹنڈ نکالا۔ زمین پر پیر کی کھٹکھٹلی پڑی تھی ریزیٹنڈ کو دو انگیوں میں پھنسا کر کھٹکھٹلی بیچ میں پھنسانی۔

ذرا سا سر نکال کر بابا کو دیکھا۔ گڈ۔

نشانہ باندھا اور ہاتھ ڈھیلا چھوڑ کر جھٹ نیچے ہو گئی۔ تین دو ایک۔ یہ بابا کی آواز کو کیا ہوا۔ یہ تو کسی موٹر سائیکل کی عجیب سی آواز تھی۔ اس نے ذرا سا سر اٹھایا۔

”ہائے میرے اللہ یہ تو بھائی ریاض تھے پچھسی بھولی کے اکلوتے تخت جگر اور کوئی لمحہ جاتا تھا جب پچھسی

بھولی میدان میں آجاتیں ان کا بیٹا کسی اندھی گولی۔ اونہوں کسی کھٹکھٹلی کا نشانہ بن گیا تھا۔

نر ایسا پھر بیٹھے مصیبت۔ اللہ میاں جی۔ وہ رکوع کی حالت میں بیچے کی جانب بھاگی تھی۔

نیچے پہنچ کر وہ زیادہ تیزی سے بھاگتی اندر آئی۔

یہ کیسی آواز تھی۔ شور سا۔ اوہ یہ تو پچھسی بھولی کی آواز ہے۔ وہ چپکے سے کھڑکی تک چلی آئی پر وہ ہٹا کر

دیکھا منظر حسب توقع تھا۔ جمعہ گھٹالگ چکا تھا۔

”یہ تو پچھسی بھولی کی آواز ہے۔ ہے نا۔“ سمیرا چوکی۔

”ہاں ان ہی کی لگتی ہے اس نے تجھال برتا۔“ لگتا ہے کوئی بڑا جھگڑا ہو گیا ہے۔“ سمیرا کھڑکی کی جانب بڑھ رہی تھی۔

”ارے یہ تو رے۔ آ رہیں اور یہ ان کے منہ کو کیا ہوا؟“ لگتا ہے کوئی بڑا زخم آ گیا ہے۔ اوہ اللہ۔“

کیں۔ ”مجھے تو چھوڑو میری ماں کے جمنے کی مٹھائی سب سے پہلے تو نے ہی ڈکاری ہوگی اور آج میں پھپھی ہو گئی۔“

بیبا غفار پھپھی ہو گیا سارا مجمع ہنس پڑا تھا۔
”او بھولی عمروں میں کیا رکھا ہے۔“

”لو چل رہن دے۔“ پھپھی نے ہاتھ نہچایا۔ ”میں ہی پاگل ہوں جو تجھ سے پوچھ بیٹھی۔ تو نے ساری حیاتی بدٹیوں کو ماڑنے کے علاوہ کیا کیا ہے۔“

پھپھی بھولی نے بیٹے کا ٹائی سے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے۔ جو تکلیف سے نہیں ابھرا تھا یہ عرق نہ امت تھا۔ مجمع میں کئی پروفیسر صاحب کے شاگرد بھی تھے۔

”بھولی تو حد سے گزرنے لگی ہے۔“ بیبا غفار نے توند سے سرک جانے والی دھوتی اوپر چڑھائی (گرایا لڑنے کی تیاری کی)

پروفیسر ریاض نے سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کتنی شرمندگی ہو رہی تھی پر اب ماں کو کیسے روکے۔ اماں بھولی پجاری والدہ ماجدہ۔ تو ترکھان کے دھاگے کا گولا تھیں ایک بار ہاتھ سے چھوٹ گیا تو کھلتا چلا گیا۔ دور تک پہنچ گیا اسی طرح صلواتیں سنائی۔ اماں بھولی اب دور تک جانے والی تھیں بات تو تو میں میں سے بڑھ کر باپ داوے تک جانی بھی گڑے مروے اکھڑ جانے تھے۔

ماں کو کیسے روکے۔ اوہ۔ بھگتی نظریں سامنے والی کھڑکی پر آن رکھیں آگے سمیزا کا چہرہ۔ جو کہتا تھا۔ وقت مٹھم جائے دنیا بولتی رہے۔ بھلے سے جھگڑتی رہے۔ مز بھی جائے۔

مگر اب۔ پروفیسر ریاض نے نگاہیں پھیر لیں۔ ایک دنیا اسے دیکھ رہی تھی کوئی جو اس کے دیکھے کو دیکھ لیتا۔ ماں نہیں۔ بری بات۔

میرا کو بھی اسی چیز کا احساس ہوا۔ دوسرے پھپھی بھولی کی آواز ان کے کونے اب دل دہلانے والے ہو گئے تھے۔ میرا کیکپانے لگی۔ کھڑکی بند کر دینی چاہیے نہ آواز آئے گی نہ دل دہلے گا مگر یہ سیر۔ یہ زیر لب کیا کہہ رہی تھی۔ میرا نے کان لگائے۔

میرا کے تو پیروں میں بجلی دوڑ گئی جھٹ پٹ دوپٹا شانے پر نکایا۔ بھاگنے ہی والی تھی۔ ”میرا نے فوراً“ روکا۔

”ارے رکو کہاں جا رہی ہو۔ کلی میں اتار ش ہے۔ تیا ابو غصہ کریں گے اتنے مجھے میں ہمارا کیا کام۔ شا۔ شام۔ کو چلیں گے۔ پھپھی بھولی کے گھر جا کر حال پوچھیں گے۔ یوں بھی ہم تو رشتے دار ہیں۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ میرا کو آئیڈیا دل سے بھایا۔ دوپٹا کھڑکی کے ساتھ جا کر چپک گئی۔ رش بہت زیادہ تھا مگر ان کا گھر اونچا تھا سب صاف نظر آ رہا تھا۔

پھپھی بھولی دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر بدوعائیں دے رہی تھیں۔ بدوعائیں اردو پنجالی کا مکسچر تھیں مگر بدوعائیں کا اصل تاثر صوتی تھا پھپھی بھولی کا رنگ جلالی لہجہ۔

”س کے ہاتھ ٹوٹیں۔“
”اے مرسام ہو۔“
”نہیں۔ اللہ ماں جی! میرا نے سر پکڑا۔“
”اے خارش لگے کھانے پینے سے رہ جائے جس نے میرے بچے کو مارا۔“

”بچہ۔!“ میرا نے ذرا سی گردن اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ پینٹ سفید شرٹ میروں و سیاہ استراج کی ٹائی اور پھپھی بھولی اپنے دوپٹے سے بیٹے کا چہرہ پونچھ رہی تھیں۔ یہ بچہ تھا اونچے پورے قد کا بھائی ریاض۔ پروفیسر ریاض۔

ہنہ۔

”ہاں بھئی۔ بابے غفار تو بتا۔ میرے پتر سے کس نے دشمنی نکالی۔ تو ہی سارا دن لوگوں کے دروازے تاڑتا ہے۔ کیا فیدا تیری اس نگرانی کا۔ تجھے نہ پتا چلا۔ کس نے میرے بیٹے کے آنے جانے کے ٹیم کی خبر رکھی۔ ہائے دشمنوں کے کلبجے سڑتے تھے میرا پروفیسر صاحب۔“ پھپھی نے سینے پر دو ہتھ ڈمارے۔

”بات یہ ہے پھپھی بھولی۔“ بیبا غفار اتنی عزت افزائی پر آگے آیا۔

”پھپھی۔ بھولی! ماں میں کس رشتے سے تیرے پھپھی ہو گئی؟“ پھپھی بھولی نے فوراً آستینیں اوپر

”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ سمیرا نے اس کا بازو دبوچ کر کمر کے پیچھے کر کے موڑا۔

”بابے ریاض۔ آئی۔ میرا مطلب ہے پروفیسر غفار۔ آئی آئی آئی۔“ ہر غلط لفظ پر پشت پر کھڑی سمیرا بس ہاتھ کا دباؤ ہی تو بڑھا رہی تھی۔

”میرا مطلب ہے۔“ سمیرا کے سینے چھوٹے ”بابے غفار کو مار رہی تھی۔ اللہ جانے کہاں سے بھائی رے۔ یا۔۔۔ ز آگئے۔“ جملہ کھل ہوا۔

سمیرا نے دانت پیسے تھے اور ساتھ ہی جھٹکا دے کر ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”مگر آنکھ پر لگ جاتا تو۔“

”لگا تو نہیں نا۔“ سمیرا اپنا بازو سہارا رہی تھی۔ سمیرا نے باہر جھانکا۔ مجمع چھٹ گیا تھا۔ بیٹا ماں کو سہارا دیے لے جا رہا تھا اتنا بول بول کر وہ تھک چکی ہوں گی نا۔

کون سے کبخت شاعر اور لکھاری کہتے ہیں۔ نظموں میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ پشت پر بھی محسوس ہو جاتی ہیں اب کوئی اس ریاض کو دیکھتا۔

اس کا دل بچھ سا گیا اور یہ دل کبھی کبھی ضدی بچھ ہو جاتا ہے۔ نا فرمان سل۔ کان پڑوا دو۔ اٹھک۔ بیٹھک کروالویا بھلے سے مرعابناؤ پر ہٹ جاتی نہیں۔

یا پھر میں زیادہ مجبور ہوں۔ میرا خود کا دل میرے مد مقابل ڈٹ جاتا ہے۔

اور ریاض اپنا آپ کتنی مشکل سے ظاہر کرتا ہے یا وہ محتاط اور برویار ہے لہذا شوں سے ڈرتا ہے یا دنیا سے یا پھر؟

اس نے خود سے سوال کیا تھا اگر سمیرا سے پوچھتی تو وہ صاف کہتی اپنی ماں سے۔



سمیرا بالکل بھی نہیں جانا چاہتی تھی اور سمیرا کیلے جا نہیں سکتی تھی بڑی امی اسے کبھی بھی نہ اجازت دیتیں۔ سمیرا کا بس چلنا تو وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے لباس و انداز بدل لیتی وہ بلا

اگلے ہی منٹ وہ ڈھے گئی۔ پچھپی بھولی کی ہر دو عا پر وہ بڑے خشوع و خضوع سے آمین، تم آمین کہہ رہی تھی۔ حمیرا نے تیزی سے اٹھ کر سمیرا کا شانہ دبوچا۔

”کیا بول رہی ہو تم؟“ حمیرا نے اس کی بددعا ہٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ۔ پچھپی کی بددعاؤں پر آمین کہہ رہی ہوں اور کیا کہوں گی۔“

”تم آمین کہہ رہی ہو۔“ حمیرا کی آواز پھٹ سی گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سمیرا کے شانے تھام کر دبوچ لیے۔ ساتھ میں زور زور کے جھٹکے بھی لیے۔

”تمہارا کلیجہ نہ کلپا سمیرا۔ میرے مرجانے کی بددعاؤں پر آمین کہتے ہوئے۔“

”تمہارے مرجانے کی بددعاؤں؟“ سمیرا نے دہرایا۔ یہ حمیرا کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ تو اس بندے کو کوس رہی تھی جس بد بخت نے۔

پاہر سے پچھپی بھولی کلپا کو سنا جاری ہوا۔

”نہ صرف ہاتھ تو میں اس بد بخت کے بلکہ دونوں ٹانگیں بھی کسی گڈی کے نیچے آ کر کٹ جائیں اور ساتھ ہی کمر میں کب لگے اور۔“

سمیرا کے منہ سے پھر آمین نکل گیا۔ حمیرا نے جھٹکا دے کر اسے بیڈ پر پٹا اور اپنے دونوں ہاتھ لے کر کے دکھائے۔

”تمہیں ذرا دکھ نہیں ہو گا جب میرے ہاتھ ٹٹ جائیں گے۔ یعنی میں حمیرا ٹنڈی۔“ اور میں۔“ اس نے جیسے جھری جھری لی۔ میں حمیرا کبڑی۔ ہائے میرے مولا۔“ ساتھ ہی اسے عیش آگیا۔ سمیرا کے دائیں جانب لڑھک گئی۔

”تت۔۔۔۔۔ تم نے۔۔۔ یعنی کہ تم نے ریاض کو مارا۔۔۔۔۔“ وہ حلق کے بل چلائی تھی۔ حمیرا کے دیوتا کوچ کر گئے یعنی خود۔ بقلم خود اپنے منہ سے اعتراف جرم۔

اس نے اپنا سیدھا ہاتھ ہونٹوں پر رکھا۔ پھر الٹا ہاتھ مگر کیا فائدہ۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

کی جامہ زیب تھی۔

جبکہ حمیرا بھاٹسا منہ کھولے اسے تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ تیار ہونا اور مزید چار چاند ٹانگنا سمیرا کی فطرت تھی جبکہ وہ حمیرا۔ صفیہ کبھی سلیقے کی چوٹی باندھ بھی دیتیں تو بی بی حمیرا جھٹک جھٹک کر ڈھیل کر لیتی۔ دو چار لٹین مانتے سے نکل کر دائیں یا میں گرا لیتی۔

”امی تو میرے پل یوں کس دیتی ہیں کہ پہلی نظر میں سنجھی دکھائی دیتی ہوں۔“ یہ کسامنہ جیسے جیسے موڑا گھٹنا۔ جیسے پانی میں پڑا وہی بڑے کا بڑا۔ گول اور پھولا پھولا سا۔

سو جب دونوں گھر سے نکلیں۔ فرق واضح تھا۔ سمیرا نے آسانی اور انگوری رنگ کا نفیس سالان کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ براؤن دوپٹی۔ اس وقت ناخن نیل پالش سے پاک تھے، مگر پھر بھی بہار دکھا رہے تھے صاف سحرے ترشے گلانی گلانی سے۔

حمیرا نے دل سے تعریف کی اور خود تاپا ابو کی گیارہ نمبر سولٹی پیروں میں پھنسا کر چڑک چڑک کی آواز کے ساتھ سمیرا کے پیچھے لگی۔

بڑی امی باخبر تو ہو چکی تھیں۔ پروفیسر اے ڈی ریاض کو کسی نے پتھر مارا تھا پھسی بھولی چھچھاڑ ڈالیں اور پتہ نہ لگے یہ ممکن نہیں۔ صفیہ عصر کی نماز کے بعد جائے نماز پر خاموش بیٹھی تھیں حمیرا نے سمیرا کو اشارہ کیا کہ وہ صفیہ کو جا کر بتا دے۔

”ہاں عیس کہہ دیتی ہوں۔ تم امی کو بتا آؤ۔“ حمیرا تیزی سے بڑی امی کے کمرے کی جانب آئی وہ سونف صاف کر رہی تھیں۔

”ہم پھسی کے گھر جا رہے ہیں۔ بھائی ریاض سے کچھ پوچھتا ہے۔“

ذرا سامنہ نکل کر اطلاع دی اور دروازہ جھپاک سے بند کر دیا۔

بڑی امی کا کھانا منہ۔ بند ہو گیا اب کیا پکارتیں۔ دوسری طرف صفیہ کی نگاہیں سمیرا پر اٹھیں تو واضح

حسن پر سجاوٹ و بناوٹ کا تزکہ اللہ اللہ۔ کیا فوق پایا تھا اس نے۔ دو روپے گز کا کپڑا بھی تن پر سج کر انمول ہو جاتا۔ نرم ہاتھ پیر۔

اور خود ان کی صاحب زادی۔ اسے کہاں توفیق ہوئی ہوگی کپڑے بدلنے کی وہی کل صبح کا پہنا ہوا پرنٹڈ گہرے رنگ کا سوٹ جو پسندیدہ تھا۔

”جی اس پر لگے داغ دھبے نظر نہیں آتے۔“ اور جوتے کی چڑک چڑک کی آواز۔ صفیہ کو لگا، دانتوں میں ریت آرہی ہو۔ دل تو چاہا آواز دیں، مگر اس قضیحت خانم براثر ہوتا تھا بھلا۔

صفیہ نے سر کے خفیف اشارے سے منظر کھڑی سمیرا کو گویا اجازت دی اور منہ پھیر لیا سمیرا دھڑبے سے پلٹ گئی۔

”حسن بھی ناقابل برداشت ہو سکتا ہے؟“ اندر سے اٹھنے والے سوال نے صفیہ کو چونکا دیا وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

اول سوال۔ مشکل سوال تھا اور ”انداز“ سے اٹھا تھا۔ خود کو انسان کیسے ٹالے؟

”ہاں۔ حسن بھی ناقابل برداشت ہوتا ہے۔“ جواب آیا۔

اگر دوسروں کی ملکیت ہو (اور ہم تنگ نظر اور تنگ دل ہوں)

اور دروازے پر کھڑی حمیرا۔ سمیرا خوش تھیں۔ کیسے اپنی اپنی ماؤں کی نظروں میں آئے بغیر نکل آئی تھیں۔

یہ مائیں بھی نا۔ ایک کو سنگھار پر تشویش ہونی تھی اتنی تیاریاں۔

اور دوسری نے اتنی گندی بیٹی کی ماں ہونے پر یا تو بیٹی کو مار دینا تھا یا خود کو۔

چلو جانے دو۔ بچت ہو گئی۔



پھسی بھولی کے گھر کا منظر ویسا ہی تھا جیسا سمیرا حمیرا

بچپن سے دیکھ رہی تھیں۔ بعض دفعہ تو گمان ہوتا۔ یہ کوئی تصویر ہے۔ بس یہ کہ پہلے پچھسی جوان ہوتی تھیں اور اب بڑھی۔ کالے بال سفید ہو چکے تھے۔ مگر سب کچھ جوں کاتوں تھا۔ صاف ستھرا اپنی جگہ پر۔

بائیں جانب امرود کا پڑ تھا۔ نیچے کچھ پھولوں والے پودے کیاری میں لگے تھے۔ باقی سارا دھنیا پونونا تھا اور ہراسن۔ سارا سل یہ ننھی سی فصل ہری بھری ہی رہتی کبھی۔ کبھی ہری پاز بھی ہوتی تھی۔ سرخ فرش چمک رہا تھا۔ پوچھا لگا لگا کر کھوری اینٹوں میں بھی چمک آچکی تھی۔

آنکھ کے بیچ و بیچ دو چار پائیاں ہمیشہ سے پڑی رہتی تھیں۔ چار پائیوں کے پیچھے برآمدہ تھا۔ برآمدے کے پیچھے لائن سے تین کمرے بنے تھے جن کے دروازوں کھریوں پر جالیاں لگی تھیں۔ ایک لوہے کی جالی چوروں سے محفوظ رہنے کے لیے دوسری پلاسٹک کی چھلکی والی مچھروں سے محفوظ رہنے کے لیے۔

برآمدے کی ایک تنگی چارپائی پر دھلے پرتن اور چاندی سی منجھی پتیلیاں اوندمی پڑی رہتی تھیں اوپر جالی کا کپڑا۔

دیوار گیر الماریوں میں سجے ہوئے سالوں پرانے ڈیکوریشن بیسن پتا نہیں ڈیکوریشن ہیں کھلائے جانے کے قابل بھی تھے یا نہیں۔ کم از کم سو سال پرانی خاندانی سرمہ دانی۔ ہاشت بھر کے فاصلے پر پلاسٹک کا اسٹینڈ والا گول شیشہ اس سے ہاشت بھر آگے اے ڈی ریاض کے ابو کی وہی تصویر بڑی کروا کے لگا رکھی تھی جو ان کے شناختی کارڈ پر لگی تھی۔ (ان کا شناختی کارڈ بھی لوہے کی الماری پر اوپر کر کے چسپاں تھا)

دوسرے خانے میں تبت اسنو کی سفید شیشی۔ ساتھ میں بلیک کیٹ پاؤڈر اور دو خلی بول پر فوم کی بھی رکھی تھیں۔ پچھسی بھولی کے ہاتھ سے بنی اونٹی ٹوکری میں گنگھیاں نیل کٹڑ جیسی چیزیں رکھی تھیں۔

باقی سارے خانوں میں پہلے پچھسی بھولی کے ہاتھوں کی خیریں سجائی جاتی تھیں پھر ان کی چار پٹیوں کا سلیقہ

وہ ہنر بھی دکھائی دینے لگا۔ کوئی ٹی۔ کپڑے کے گڈے گڑیا۔ موتیوں کے گل دان اور نجائے کیا کیا۔

دھلے دھلائے پردے۔ کارنس پر کڑھے ہوئے سفید پردے۔ ایک تصویر سا سجا ہوا گھر۔ بڑی امی کو اس ساگت سے منظر سے وحشت ہوتی تھی۔

”بھولی نے ساری زندگی صحن کی چارپائی پر گزار دی۔ گھر بکھرتے ہیں بیٹھتے ہیں اس میں خوب صورتی ہے زندگی ہے۔ گھر اور روڈ میں فرق ہونا چاہیے۔ یہ آنے کا راستہ یہ جانے کا رک جاؤ چل پڑو۔

ذرا چوکے سار جنٹ پکڑ لے گا کوئی سار جنٹ تو بند مٹھی میں نوٹ کی کڑ کڑا ہٹ محسوس کر کے چھوڑ بھی دیتا ہے بھولی پر یہ بھی نہیں چلے۔ آگے بیٹیاں بھی ماں کا پر تو۔ بس وہ اللہ و تار ریاض ہے جو۔“

”اے ڈی ریاض امی۔“ سمیرا اگر پاس ہوتی تو تصحیح ضروری سمجھتی۔

”ہاں ہاں۔ اے بی سی ڈی۔ جو بھی۔ اسے ذرا سی گنجائش سے نوازا گیا ہے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ پڑھا لکھا ہے یا پھر یہ کہ اکلوتا ہے۔ بلکہ چھوڑو۔ اپنے پیسوں سے کرتا ہے تبت بھولی نہیں بول پاتی ہنہ۔“

واقعی اے ڈی ریاض کا کمرہ اس بانی گھر سے قطعاً میل نہیں کھاتا تھا۔ دو سال پہلے تک یہ ایک فضول سا اسٹور نما کمرہ تھا جسے ریاض نے گرا کر دوبارہ اونچی چھت اور زیادہ جگہ گھیر کر تعمیر کروایا۔ کمرے کے بالکل درمیان میں گولائی کٹ دے کر کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کروایا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ڈرائنگ روم محسوس ہوتا اور گولائی کے اس طرف بیڈ روم ایک جانب اسٹڈی ٹیبل اور دیوار گیر شیشے کی الماریاں بنا کر دنیا جہان کی کتابیں بھی سجا دیں۔ دیوار پر نمنے اور انعامات لیتے وقت کی تصاویر۔

پچھسی بھولی نے تو فوراً ”سفید کپڑا فریم میں چڑھا دیا۔ نئے کمرے کے کارنسوں کے لیے پردے اور خصوصاً ”کپیوٹر کے لیے کڑھائی والا کور۔“

اے ڈی ریاض نے ماں کو کیسے سمجھایا۔ یہ الگ

داستان تھی۔ بات بڑی مشکل سے صوفے کے کٹن پر آکر رکی۔
 ”باقی آپ کچھ نہ کریں۔ مجھے ایسے ہی کمرہ چاہیے۔“

اس نے نیا خوب صورت فرنیچر بھی خریدا۔ ایک دروازہ کمرے سے باہر گلی میں نکالا تاکہ دوستوں خصوصاً شاگردوں کو آنے جانے میں آسانی رہے۔

شروع کے چند دن تو پچھپی بھولی نے برداشت کیا۔ خیر ہے، نیا کمرہ ڈالا ہے دوست وغیرہ دیکھنے آئیں گے ہی، مگر جب شام کے بعد سے یہ روئین دیکھا اور پتا لگا کہ یہ شاگرد ٹیوشن لیں گے ان سفید صوفوں پر بیٹھ کر۔ اس کا دم حلق میں اٹک گیا۔ آنکھیں گویا اٹل پڑیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

نیا ٹکڑ کمرہ اور اس پر نہانے بھر کے گندے مندرے لڑکے وہ بھی روزانہ۔

”میں کہتی ہوں پروفیسر اے ڈی ریاض۔ تعلیم ہی دینی ہے نا تو اوسر ڈیڑے میں پلاسٹ (پلاسٹک) کی کرسیوں پر بٹھالے۔ یہ کیا کمرے میں گھسایا؟“

”اماں جی۔! وہ دو سری تیسری کے بچے نہیں ہیں۔ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو خود بھی یونیورسٹی ٹیچرز ہیں اور ایم فل پی ایچ ڈی وغیرہ کی ڈسکشنز کے لیے آتے ہیں میں نے اسی وجہ سے تو یہ کمرہ بنوایا ہے۔ کچھ بے چارے تو دوسرے شہروں سے بھی آجاتے ہیں وہ ٹھہر بھی سکیں۔“

”کیا؟“ پچھپی بھولی بھونچکی رہ گئی۔ ”میں نے تو سوچا، تو نے اب کمرہ بنوایا ہے تو تیری شادی کا بھی سوچوں اور تو نے اتنے پیسے ان ہڈ حراموں کے آرام کے لیے لگا دیے۔“

اے ڈی ریاض مسکرا دیا۔ اماں بھولی نے ریاض سے چھوٹی چار بہنوں میں سے دو کو بیاہ دیا تھا اور دنیا جانتی تھی۔ نیچے والی دو کو بھی بیاہے بغیر وہ ریاض کو سرے کی دکلن کے پاس سے بھی گزرنے نہیں دے گی۔

کمرہ تیار دکھ لیا تو ہوشیاری۔

مگر کمرے کا مقصد ہی اور تھا۔ اے ڈی ریاض انگلش کا پروفیسر تھا۔ بے حد قابل، گولڈ میڈلسٹ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کے بعد اس نے دو تین ماسٹرز اور بھی کر لیے تھے۔

ایم اے پولیٹیکل سائنس۔ تاریخ مشرق اور مغرب میں بھی دسترس حاصل کر لی۔ (وہ بھی انگلش کے ساتھ) تھوڑی قومی حمیت جاگی تو ایک ایم اے اردو میں بھی پھڑکا دیا۔

مگر قسمت۔ سارے ایم اے شیم اے۔ اماں بھولی کے آگے پانی بھرتے تھے۔ اماں بھولی کے اپنے نظریات تھے، اکلوتے بیٹے کو اس نے بہت خوشی خوشی اسکول داخل کروایا تھا۔ مسجد بھی خود چھوڑ کر آئی تھی۔ اللہ و تاحافظ قرآن ہو جائے۔

اللہ و تاذہین تھا۔ اس نے بہت جلد قرآن مجید پڑھ لیا بہت سی سورتیں یاد کر لیں، مگر اس کی ذہانت کو رس کی کتابوں سے زیادہ جھلکتی تھی۔

اسکول ماسٹر تعریف کرتے۔ اماں بھولی خوش ہو جاتی۔ قرآن حفظ کروانے کے حوالے سے اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی حافظ قرآن کے والدین کے لیے جنت کی ہوتی ہے۔

اب اسکول میں لائق بچے سے ماں باپ کو کیا فائدہ۔ اتنے چھوٹے بچے کو کمر میں بھی نہیں بیٹھا سکتی تھی۔ مسجد کون سا سارا دن لگتی تھی تو بہتر ہے وہ بچپن کے کچھ سال اسکول میں گزار لے پھر باپ سے ہنر سیکھ لے، مگر باپ سے ہنر سیکھنے کا مرحلہ ہی نہ آیا۔ اماں بھولی بیوہ ہو گئی۔

اے ڈی ریاض کا باپ ریاض جو کہ اصل ریاض تھا، اپنی تھوڑی سی زمین پر کھیتی باڑی کرتا تھا، اچھا گزارا ہو رہا تھا، مگر جب مال چلانے والے ہاتھ نہ رہیں تو زمین بانجھ ہو جاتی ہے۔

اماں بھولی جی دار تھی، مگر چھوٹی سوئی سے پھول ٹانگے بنانے والی کے ہاتھوں میں پھلوڑا کیسے ساتا۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پریشان حال نے بیٹے کو دیکھا۔ وہ ہے ناس کا اکلوتا سپوت۔ جسے اس نے

بڑی مرادوں سے مانگا اور منتوں سے پالا۔ وہ بسائے گا اپنی زمین، مگر یہ کیا اماں بھولی کے سر پر جیسے کسی نے ڈنڈا مارا۔ قلم تھامنے والے ہاتھ۔ اہل چلانے کے اہل تھے ہی نہیں۔ اللہ و تارياض زمین کھودنے کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔

”ہائے“ اماں بھولی کا بس چلتا تو سر میں مٹی ڈال کر گلی گلی چکراتی۔

”ہائے! مجھے کیا پتا تھا۔ اسکول والے میرے پتر کو نامرود ہی کر دیں گے۔ ہائے کسان کا پتر ہو کر اسے گوڈی کرنی بھی نہیں آتی۔ ہائے ماسٹر تیرا بیڑہ غرق ہو جائے“ میرے پتر کو بریاد کر دیا۔ ہائے میں یہ وہ تو اپنی روٹی پانی کر لوں گی۔ ہاتھ میں ہنر ہے، سارے کے سارے ٹانگے آتے ہیں پر اندے بنا لیتی ہوں چنگیریں چھایاں تک بتانی آتی ہیں میرے بے ہنرے پتر کا کیا ہوگا۔

”بہت قابل اور ذہین بچہ ہے۔ تھوڑا صبر کرو۔ خام سونا ہے، بھٹی میں تپے گا تو ڈھلے گا۔ شکل نکل آئے گی۔“

”میرے سامنے پڑھوں لکھوں والی باتیں نہ کریں ماسٹر جی۔ کون سا سونا اور کون سی بھٹی ماسٹر جی۔ ٹڈ سے زیادہ آگ کسی اور چیز میں نہیں ہوتی ساری ذہانت اور لائق۔ ناک سے باہر نکل جاتی ہے جب پیٹ روٹی مانگتا ہے۔“ اماں بھولی نے اپنے پیٹ پر دو ہاتھ مار کے دکھائے۔

”اور آپ جس تعلیم کی بات کرتے ہیں وہ میں پوری کہاں سے کراؤں گی۔ آنھویں تک تو ادھر پنڈ کے اسکول سے پڑھ لیا۔ ناپایا نا۔ میں روٹی کی فکر سے مری جاتی ہوں“ آپ کہتے ہیں ساتھ بیٹھا بھی رکھ لو۔“

اماں بھولی کا سر زور زور سے نفی میں ہل رہا تھا۔ ”پانچ جی (پانچ انسان) چھوڑ کر مرا ہے اللہ و ما کا پیو۔ میں کہاں سے پورا کروں گی۔ ایک بات بتائیں ماسٹر جی۔“ اماں بھولی کو رونا آنے لگا، مگر آواز کو پوری کوشش سے صاف رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”یہی یہ مرد عورت کو کسی کام کا نہیں سمجھتے۔ اس

کی عقل مت کو جتنی کے تھلے سے جوڑ دیتے ہیں۔ کسی معاملے میں پوچھتے نہیں۔ بولنے نہیں دیتے صاف کہتے ہیں۔ چپ رہ مجھے کیا پتا۔ پر جب مرنے لگتے ہیں۔ سارا سپایا اس عقل کی اپنی کے سر پر پا کے یہ جاوہ جا۔ اب میں کیا کیا دیکھوں۔“

”غلط بات بھولی۔ کوئی بھی اپنی مرضی سے نہیں مرنے۔“ ماسٹر جی کو ترس آنے لگا۔

”ٹھیک ہے ماسٹر جی!“ اماں بھولی نے آنسو پونچھے۔ ”نکل سے فقہے لوہار کے پاس بٹھا دوں گی۔ تھوڑے ہاتھ پیر سخت ہوں گے جان بنے گی۔ آپ کے قلم شریف نے تو میرے پتر کو مجھوڑنا ہی بنا دیا۔ یہ اس کے ہاتھ ہیں۔ مردوں کے ہاتھ کوئی ایسے ہوتے ہیں نرم گرم۔ اس کے پو کے ہاتھ آپ نے دیکھے نہیں۔ یہ سخت جیسے پتھر اللہ بخشے میرے پر کبھی ایسا ناراض نہیں ہوا کہ مارنا، مگر گھروں میں اونچ نیچ ہو بھی جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ کا ایک پھڑکی مجھے بے ہوش کر دیتا تھا۔ ست ست دن منہ سو جا رہا تھا اور یہ۔“

اماں بھولی کو جہاں شوہر کی یاد نے سرشار کر دیا وہیں مجرم بنے بیٹھے خاموش بیٹے کو دیکھ کر غم ہرا ہونے لگا۔ ماسٹر صاحب بھونچکے تھے۔ کیا یاد تھی کیا کسک واہ بھولی۔

انہوں نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ پر بمشکل قابو پایا۔ ماں کی پھنکار سنتے اللہ دما کو دکھا۔ انہیں ترس آ رہا تھا۔ ماں پر بھی اور بیٹے پر بھی۔

”میری بات سنو بھولی عورتوں سے تمہارا بیٹا بہت لائق ہے“ اسے پڑھے دو۔ ”یہاں کا اسکول آنھویں تک ہے آپ شہر شفٹ ہو جاؤ۔“

”شہر۔“ اماں بھولی یوں اچھلی جیسے پھوٹے ڈنک مار دیا ہو۔

”ہاں شہر۔“ ماسٹر جی شروع ہوئے پھر بول بول کر منہ تھک گیا۔

”زمین ٹھیکے پر دے دیں۔ سال کے دانے لے لیے جائیں اتنے چھوٹے سے گاؤں میں کون خریدے گا کڑھائی بنائی کے نمونے کہ ہر کسی کو تو آتا ہے یہ کام

کرنا اور سب بڑھ کر اللہ و تہا کی تعلیم جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔

”پر شہر کون سا؟ کون سا شہر۔ ہاں ان کا چچا زاد بھائی عبد العزیز اور عبد المجید۔ وہ شہر میں رہتے ہیں وہ کچھ نہ کچھ بندوبست کر سکتے ہیں اور یہ بھی تو طے ہو گا نا جو کرنا تھا اب ماں بھولی کو خود کرنا تھا ماں بھولی نے سوئی پکڑ لی اور اللہ و تہا نے فلم۔ ماں بھولی نے بیٹے کو تو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا مگر بیٹیوں کے معاملے میں کوئی رسک نہ لیا۔

عبد العزیز نے اپنی گلی میں آٹھ مرلے کا پلاٹ لے دیا تھا دو کمرے بھی ڈل گئے۔ ماں بھولی کے پاس بڑا زیور کام آیا۔ دو کمروں کے گھر کو سجایا۔ ایک بھینس بھی رکھ لی اور صحن کے بیچ وچ ڈال دیں دو چار پائیاں۔ اس پر بیٹیوں کو لے کر بیٹھ گئی۔

اللہ و تہا کے شدید زور پر بیٹیوں کو اسکول بھی داخل کروا دیا مگر سارا زور کڑھائی سکھانے پر تھا اور یہ بھی کہہ دیا تو نے جتنی اپنی مرضی کرنی تھی کرنی۔ اب کڑیوں کے معاملے میں نہ بولنا۔

حمیرا سمیرا کی نگاہیں اس وقت ان ہی چار پائیوں پر تھیں۔

حمیرا اور چڑھ کے چو کڑی بار کے عطیہ کے کندھے سے منہ نکال کر اس ٹانگے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی جو وہ کاڑھ رہی تھی۔ یہ ایک شعوری کوشش مخفی رہنے کی بھی تھی۔

ریاض عین سامنے کرسی ڈال کر بیٹھا تھا۔ گل کی بڈی پر چوٹ لگی تھی اور حمیرا نے شکر ادا کیا تھا، آنکھ بیچ گئی، ٹیکن اس وقت وہ یہ بھی سوچ رہی تھی۔ چوٹ اتنی بڑی بھی نہیں تھی جتنا بڑا ہلدی کالیپ پھپھی بھولی نے کر دیا تھا۔

پھپھی وہی سارا قصہ دہرا رہی تھیں اور اپنے عزائم بھی جو کہ وہ پہلے گلی میں کھڑے ہو کر سنا چکی۔

”اب اتنا بھی کچھ نہیں ہو اماں! جتنا آپ کہہ رہی ہیں۔“ ریاض نے اپنے تئیں ماں کو بڑ سکون کرنا چاہا تھا پر کہاں پھپھی بھولی دوبارہ شروع ہو گئیں۔ ساتھ وہی

کوئے حمیرا نے تڑپ کر شاکی نگاہوں سے سمیرا کی کوئی کھار سمیرا عبد العزیز کو پروٹھیسراے ڈی ریاض کے علاوہ کچھ اور کب دکھائی دے رہا تھا۔

ڈھیلے ٹراؤزر اور شرٹ میں سانولا سلونا بلا کا پرکشش مرد۔ اوپر سے مدھم لہجہ بگبھییر آواز، الفاظ کا چناؤ اس قدر خوب صورتی سے کرتا تھا حتیٰ و تشریح میں عمر گزار دے، وہ کتار ہے کوئی سنتا رہے اور کوئی کیوں سمیرا عبد العزیز سن ہی تو رہی تھی۔

”کیسی غدار ہے، اتنا نہیں ہو رہا پھپھی کو ٹوک دے۔ بس کریں اتنا کبھی کیا کوسنا۔ شام ہونے کو ہے اگر کوئی ایک کوسنا بھی پورا ہو گیا تو کیا وہ باقی کی زندگی حمیرا ٹڈی بن کر گزارے گی۔“ اسے جھرجھری آئی۔

”آپ کے اسٹوڈنٹ نہیں آئے آج۔“ سمیرا پوچھ رہی تھی۔

”آئے تھے۔“ ریاض ہنسا۔ ”ماں نے دروازے ہی سے چلا کیا۔“

”تو اور کیا۔ نظر نہیں آ رہا، کتنی چوٹ لگی ہے بولنے سے منہ اور دکھے گا۔“ پھپھی نے تائید طلب انداز میں بتایا۔

حمیرا نے آ نکھیں چندھی کر کے بغور دیکھا۔

”میرا کی چھوٹی سی کھٹلی ہی تھی بھائی ریاض۔ کوئی بنا تو نہیں تھا جو اتنی امیر جیسی لگادی۔“

ریاض زور سے ہنس دیا۔ ”یہ بات تم اماں کو سمجھا دو۔“

”اے حمیرا! تجھے کیسے پتا، میرا کی کھٹلی لگی تھی۔“

اماں بھولی۔۔۔ صرف نام کی بھولی تھی۔ حمیرا کے ہوش اڑ گئے۔ باجی نگاہ سے سمیرا کو دیکھا۔ جو بھائی ریاض کو دیکھ کر ویسے ہی خوش تھی اور ابھی جبکہ وہ ہنس رہا تھا۔

دنگش مردوں کو ہنسنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس کے دل سے صدا اٹھ رہی تھی۔ وہ دل کی سن کر سردھن رہی تھی۔ حمیرا کس مصیبت کی لپیٹ میں آنے والی تھی۔ اسے کیا خبر۔

حمیرا نے اس کی عدم توجہی پر ایک خفیہ چٹکی کائی اور آنکھوں میں اپنی صفائی دینے کی التجا کی۔

سیرا نے ہوش میں آکر پھپھی کے سوال اور حمیرہ کے تبصرے کو دوبارہ سننے کی درخواست کی (کوئی پوچھے بی بی تمہارا انادھیان کدھر ہے)۔
 ”جی وہ گلی میں بچے کہہ رہے تھے۔ کھٹلی تھی بتاتا نہیں۔“

”ہاں وہی تو لوگوں کے خمیٹ بچے۔ پھپھی بھولی فوراً ”من گئیں“ یہ آج کل کی باتیں خود دوسروں کو گھوڑے گدھے بیچ کے سو جاتی ہیں اور بچے گلی میں چھوڑ دیتی ہیں اب وہ جو مرضی بتا ہی ڈالیں۔“
 ”گھوڑے گدھے بیچ کر۔ بزنس دو من کرے۔“
 مگر یہ ہیں کون کون سی؟“ سیرا چوکی۔

”مخاورہ بولا ہے پھپھی نے۔“ سیرا نے صبح ضروری سمجھی۔

”اچھا۔ تم لوگ باتیں کرو میں دو کپ چائے لے آتی ہوں۔“ پر عطیہ باتوں میں لگ کر بھول نہ جانتی یہ قیاس آج ہی پوری کرنی ہے جلتے جلتے بیٹی کو تنبیہی نگاہوں سے گور بھی لیا۔ عطیہ نے بھی سمجھ کر سر ہلا دیا۔ باتیں کرنے والی پیش کش اس کے لیے صرف سننے تک محدود تھی۔

”اور ذکیہ۔!“ پھپھی بھولی نے ذرا دور زمین پر اڑا لگا کر بیٹھی بیٹی کو پکارا۔ وہ ہواش روم جانے کے لیے اٹھی تھی۔ ”پالک بوالی نوکری اٹھا کر ان دونوں کے آگے رکھ دے۔“

پھر روئے سخن ان دونوں کی جانب کیا ”ایسے فارغ رہ کر باتیں مٹھارنے سے کیا فائدہ۔ پالک ہی صاف کر دے۔ میں ہانڈی چڑھا لوں گی ہیں۔؟ ٹھیک ہے نا۔“

”جی۔ جی۔ پھپھی۔۔۔“ سیرا نے جھٹ آستہ نہیں موڑ لیں۔ جبکہ سیرا کی نگاہیں اپنے نکھرے مکھن ہاتھوں پر جم گئیں۔ نازک سا برسلیٹ۔ مسور کی وال جتنے سفید موتی والی نازک انگلی تھی۔ وہ پالک کاٹے یہ کچھ جتا نہیں۔ ”سیرا نے بھی کچھ کہے سنے بنا پوری نوکری اپنے آگے دھری۔“

پھپھی بھولی چائے رکھ کے آئیں تو لہسن پیاز اور

سیرا بھائی ریاض سے ان کے اسٹوڈنٹس کے حوالے سے بات چیت کرتی رہی۔ اور وہ اس سے اس کے اسکول کے بارے میں بات کرنے لگے۔

تب ہی سیرا چوکی۔ پھپھی بھولی چھری کے دستے سے اس کا کھٹنا ہلا رہی تھیں۔ سیرا کی سوالیہ نگاہوں پر۔ لہسن بھری پلیٹ اس کی گود میں رکھ دی۔

”دیر ہو رہی ہے ہانڈی کو یہ لہسن چھیل دو۔“
 ”میں۔۔۔ میرا مطلب ہے میرے ناخن خراب ہو جائیں گے۔ میں یہ پالک صاف کر دیتی ہوں۔“ سیرا کا انداز گھبرایا ہوا تھا۔

”اوہاں! پھپھی نے سر پر ہاتھ مارا۔“ میں تو بھول ہی جاتی ہوں، میری اس بیٹی کو کہاں عادت ہے ایسے کاموں کی۔“ پھپھی کا انداز محبت سے بھرپور تھا۔

”ایسے گورے چٹے چمکتے ہاتھ بھلا ان کاموں کے لیے تھوڑی بنے ہیں۔ یہ تو ہم جیسوں کے کام ہیں۔“ پھپھی نے اپنی دونوں ہتھیلیاں پھیلا دیں۔ کھردرے سخت محنت کش ہاتھ۔

سیرا نے اس تبصرے کو اعزاز کی طرح وصولا اور نزاکت سے پالک کے تے چننے لگی۔ جیسے بائیں بلغ میں کوئی ترک شراوی پھول چننے آئی ہو۔

حمیرا اونچی آواز سے عطیہ کو سٹائے گئے اپنے لطیفے پر خود ہی ہنس رہی تھی اس کے ہاتھوں میں بہت تیزی تھی۔ (پھوڑنا اپنی جگہ مسلم)

گلی کا بچہ پیغام لایا تھا۔ ”سیرا باجی! آپ کی امی بلا رہی ہیں۔ کہتی ہیں بہت دیر ہو گئی ہے۔“

سیرا سنتے ہی کھڑی ہو گئی۔ امی کو اے ڈی کی موجودگی میں سیرا کا جانا کبھی پسند نہیں رہا تھا۔ وہ سرعت سے گیٹ پار کر لینا چاہتی تھی۔ جب جھٹکے سے کھینچتی چلی گئی۔ اس کا ہاتھ اے ڈی کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کے رویہ۔

”یہ کیا؟“ اس کا اشارہ اس جرات پر تھا۔

”تمہارا ہاتھ ہے۔“ شوخ جواب حاضر۔

”آپ نے پکڑا کیوں ہے؟“ اس کی نگاہیں حمیرا پر تھیں جو الوداعی گفتگو کر رہی تھی۔

غصیلی پھنسی آواز صفیہ کی تھی۔

”کیوں۔۔۔ اہ۔۔۔ سولٹی۔۔۔“ وہ تو حمیرا کے پیروں میں تھی۔

”اتنی سی بات پر آپ اتنا گھبرا گئے تیا ابو۔۔۔“ اس نے جلدی سے جو اتارا ”آپ کے پاس اور سولٹی نہیں ہے؟“ انداز ڈپٹا ہوا ساتھ۔

”تمہارے پاس اور سولٹی نہیں ہے۔“ انہوں نے التا سوال کر دیا۔

”ہے نال۔۔۔ مگر جو مزو اسے پہن کر۔ آتا ہے وہ کسی اور میں کہاں۔“

وہ کرسی پر گر کر لمبی سانس لینے لگی۔ اللہ جانے پھپھی نے اتنی ڈھیر پالک ہفتہ بھر کھانی تھی۔ کراکڑ مٹی۔

”اور یہ تمہارے ہاتھوں کو کیا ہوا ہے؟“ بڑی امی کی تشویش بھری آواز پر صفیہ جو نکلیں چونک تو حمیرا خود بھی مٹی یہ کیسے ہاتھ تھے سبز سے سیاہ سے۔

”اوہ!“ اگلے منٹ وہ سمجھ گئی۔ ”پھپھی بھولی کے ساتھ پالک بنواری تھی۔“

”جاؤ جلدی سے دھو آؤ۔ نشان سارہ جاتا ہے۔“ بڑی امی نے تاسف سے سر لایا۔ گہرے رنگ کے سوٹ پر بھی ہیرالی کے وجھے محسوس ہو رہے تھے۔

صفیہ کی نگاہیں سیرا پر ٹک گئیں۔ وہ بریلیٹ اتار رہی تھی۔

”اس نے تو نہیں مدد کروائی مگر یہ ان کی اپنی بیٹی حمیرا عبد الجید۔“

”اول ہوں۔۔۔ زیادہ تیز قدم اٹھانا ٹارگٹ نہیں ہے۔ بس تم نے چال کو سیدھا رکھنا ہے۔“

”اوہ۔۔۔!“ وہ ٹھٹھکا ”لنگڑا ہٹ محسوس ہونے لگی تھی؟“ اس نے باپ سے پوچھا۔

”ہاں بیٹا۔۔۔ تم یہ سمجھو کہ تم ایک سال کے بچے ہو اور چلنا سیکھ رہے ہو۔ دھیرے دھیرے چھوٹے قدم۔“

”میں ایک سال کا نہیں ہوں ابو۔۔۔“ اس کے منہ سے پھسلا پھروہ شرمندہ ہو گیا۔ اس کے جملے میں مایوسی تھی اور بے حد پر امید و پر یقین باپ کے لیے یہ لہجہ و جملہ کسی زہر میں بچھے نیزے کی طرح تھا۔ ابو کے چہرے کا رنگ اڑا تھا مگر وہ فوراً ”سنبھلے تھے۔“

”میں جانتا ہوں مگر یاد رکھو، تمہیں دوبارہ جینے کا موقع ملا ہے۔ ہر چیز کو دوبارہ سیکھنے کا۔ ایک زندگی میں دوبارہ جینا ”سیکھنا“ سمجھنا ہر ایک کے لیے نہیں ہوتا۔ اللہ کبھی وہ حکم نہیں دیتا جس کے بارے میں جانتا ہو کہ اس کا بندہ پورا نہیں کر سکے گا۔“

ان کے جملے ان کے پختہ ایمان کی ترجمانی کر رہے تھے۔

”آپ ہمیشہ سے اتنے پر یقین تھے یا اب ہو گئے ہیں؟“ اس کے لبوں پر ہلکا تبسم تھا۔

”اب ہو گیا ہوں۔“ وہ مسکراتے لگے دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

دھیرے دھیرے۔۔۔ ویسے قدم۔

ڈاکٹر نے ہدایت کی تھی۔ اب اسٹک چھوڑ کر خود سے چلنے کی پریکٹس کرنی ہے۔ وہ انکار کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا باپ اور پھر ماں۔۔۔ دونوں ڈاکٹر کو بغور سن رہے تھے۔ انہوں نے بیٹے کے چہرے کے رنگ بھی دیکھے۔

آنکھوں سے جھلکا خوف و بے یقینی وہ اسٹک کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

اس کی ماں نے اس کے کچھ لڑش زہ ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔ یہ اسٹک چھوڑوے گا۔“

”مگرا می۔۔۔!“ وہ خوف زہ سا ہو کر۔ ان کی شکل دیکھنے لگا۔

”بیٹا! ڈاکٹر صاحب کو بتاؤ کہ تم اسٹک کو چھوڑ سکتے ہو۔“ ماں کے فیصلہ کن اعلان پر اس نے باپ کی طرف امید سے دیکھا تھا۔

مگر وہ تو کچھ اور ہی بولے۔

وہ ڈاکٹر صاحب کو بتا رہے تھے یا اس کو۔ کہ وہ کر

سکتا ہے، وہ کرے گا اور ان کے لہجے کے یقین پر، آنکھوں کے عزم پر حیران ہونے کے باوجود اس کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔

”ہاں وہ کرے گا۔ ابو کہہ رہے ہیں تو وہ کر لے گا۔“ اور اتنے دنوں بعد سہی۔ بہت مشکل سے سہی۔ بہت تکلیف کے ساتھ۔ وہ اسٹک چھوڑ چکا تھا۔ اب بغیر اسٹک کے چلتا تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا۔ چال سیدھی رکھنی ہے۔ کمر سیدھی اور تنی ہوئی۔ کہیں خم نہیں کھانا۔ کچے ٹوٹے قدموں کے ساتھ ہی سہی۔ مگر وہ جو چال اپنالے گا وہی مستقل ہو جائے گی اور وہ چلتا تھا اور ابو اس سے چند قدم پیچھے رہ کر اس کی چال پر نظر رکھتے تھے۔

بیٹا جوان ہو جائے تو باپ کو چال چلن پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی۔ ورنہ بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کا بیٹا جوان ہوا تھا اور بگڑا تو قطعاً ”نہیں تھا“ لائق قاتل بیٹا“ فرماں بردار مگر پھر بھی انہیں اس پر نظر رکھنی پڑ گئی تھی۔

”آہ۔“ وہ چند قدم پیچھے چلتے تھے اس لیے آنسو چھپانا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ بیٹے کے رویہ آتے تو مسکراتا، پر عزم، باہمت چہرہ ہی ہوتا تھا۔ اب دونوں ہم قدم چل رہے تھے۔ دھسی چال۔ صبح کی سیر۔ نماز کے بعد آسمان کے سارے سرمئی شیڈز دکھانا ایک دلچسپ کام تھا۔ سیاہی سے سفیدی کے سفر میں وہ درمیانہ رنگ۔ بتانا تھا ایک دم کچھ نہیں ہوتا۔ دھیرے دھیرے۔ مبرے۔

دونوں باپ بیٹا۔ آسمان پر نگاہیں جمائے بیٹھ جاتے ہیں۔ خاموشی کے ساتھ آسمان کو دیکھنا، صبح ہوتی تھی۔ جیسے کسی راز سے پردہ ہٹا ہو، چپکے سے سفید رنگ پر سیاہی جلدی چڑھتی ہے۔ لیکن اگر سیاہ کو سفید رنگ دینا ہو مشکل بہت مشکل۔ مگر ناممکن تو نہیں۔

ہاں یہ ہے کہ وقت زیادہ لگ جاتا ہے۔ تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ بیٹے کی بحالی صحت کا خواب، خواہش، ضرورت، سیاہی سے سفیدی کے سفر جیسی ہی

تو تھی۔ سفید بولوغ۔ بے عیب کاملیت۔ تو جیسے صبح کی سیاہی غیر محسوس طریقے سے رنگ بدلتی ہے۔ سرمئی اندھیرا اور پھر سرمئی اجالا اور آخر میں روشن سویرا۔

تو سیاہی گزر چکی تھی اور سرمئی اندھیرا بھی ڈھلنے کو تھا۔ (اسٹک چھوٹ رہی تھی) یعنی سرمئی اجالا۔ اور پھر روشن صبح۔ آہ مالک۔ جیسے پہ ہر سو روشنی پھیل گئی ہے تو ایسے ہی ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ان کی آنکھ میں نمی تیرنے لگی تھی۔ ”تو آپ نے بتایا نہیں ابو؟“ وہ چلتے چلتے رک گیا تھا۔

”کیا۔۔۔؟“ انہوں نے تیز تیز پلکیں جھپکیں۔ ”یہی کہ۔۔۔“ وہ دن کی جانب گھوم گیا۔ ”آپ ہمیشہ سے اتنے پر یقین تھے یا اب ہو گئے ہیں۔“ وہ مسکراتے لگے۔ مسکراہٹ کی چمک نمی کو پٹی گئی تھی۔

ان کی نگاہیں چہار سو دیکھنے لگیں۔ چمک وار دن۔ شہر اس۔

اپنے دوپٹوں کو کستی آگے پیچھے بھاگتی بدر سے کی بچیاں۔ دن کی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔ جیسے چڑیاں چچھا رہی ہوں۔ باپ بیٹے کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”میں نے بالکل صحیح دیکھا اور اڑھا ہے۔ ایک بھی بلبل دکھائی نہیں دیتا۔“

”جی نہیں۔۔۔ وہ دیکھو، کلن کے پاس سے نظر آ رہے ہیں۔“ دوسری نے چڑایا اور بھاگ گئی۔

پہلے والی نے خطلی سے اسے دیکھا اور رک کر دوبارہ اڑھنے لگی۔ رنگین اڑھنیاں اور ادھر نشین کی اڑھنی بزم تھی۔ بزم کے سارے شیڈز۔

لائٹ اینڈ ڈارک کے کنٹراسٹ۔ واہ مولا تیرے رنگ۔

انہیں شان کریمی یاد آنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا تھی۔ وہ کچھ زیادہ دور تک چل کر آگئے تھے۔ بیٹے کو واپس

جانے میں مشکل ہوتی۔ وہ یک دم مڑ گئے۔ اسٹک بیٹے کو پکڑا دی تھی۔ ڈاکٹر نے ابھی صرف اسٹک چھوڑ کر خود سے چلنے کی مشق کے لیے کہا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں ہی سے سسی مگر وہ چلنے لگا تھا۔ مگر گھر تک جانے کے لیے اسٹک چھوڑنا بے وقوفی تھی۔ جسم ایک دم اتنا دباؤ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔

مگر وہی امید۔

”ابو۔۔۔“ وہ چونکے۔ بیٹا منتظر نگاہوں سے جواب

چاہتا تھا۔

”جب میں نے تمہارے ایک سیڈنٹ کی خبر سنی تو میری زندگی کی بھیا تک ترین خبر تھی۔ میں جیسے اندھا ہو گیا۔ اسپتال آنے تک میں نے خود کو کسی بھی بری خبر کے لیے تیار کر لیا تھا۔ میں سوچ چکا تھا۔ لوگ یوں ہی مجھے بہلا رہے ہیں۔ زخمی بتا کر لارہے ہیں۔ جبکہ حقیقت میں۔۔۔“

اس وقت کی یاد حلق میں کرجیوں کی طرح چھتی تھی۔ اب بھی خراشیں پڑنے لگیں۔ مگر وہ بول رہے تھے۔

”پتا ہے، میرے قدم ایمر جنسی کے بجائے کہیں اور اٹھتے تھے، میں نے تمہیں مر وہ سوچ لیا تھا۔ اور صبر کا بھی سوچ لیا تھا۔ مگر جب میں نے تمہیں زندہ دیکھا۔ اتنے بڑے حادثے کے بعد زندگی فقط وہم رہ جاتی ہے، جب تمہاری کراہ سنی۔ تم نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور لاچار سے میری طرف ہاتھ اٹھایا۔ آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی مگر تمہارے ہلتے لب ابو کہہ رہے تھے۔ تب یک دم میرے دل سے سارے خدشات دور ہو گئے۔ سارے برے خیال میں نے خود سے دور جھٹک دیے۔ اتنی بڑی تباہی کے بعد تم زندہ تھے دیکھ رہے تھے نیکار رہے تھے تو میں نے خود سے کہا۔ میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہو گا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

میں ٹوٹا تھا مگر میں نے ان ہی قدموں اپنے ٹکڑے سمیٹ کر خود کو کھڑا کر دیا۔

میں نے سوچا جس نے وہاں بچا لیا وہ اب بھی

READ
Secti

بچائے گا۔ زندگی شرط ہے۔ مشکلیں تو آئی جانی ہوتی ہیں۔ یار! بہادر تھا نہیں۔ مگر ہو گیا۔ وہ مسکرا رہے تھے اور وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

”ابو۔۔۔!“ پھر بے ساختہ ان سے لیٹ گیا۔ ان کے

قد اور نچا بیٹا۔ دونوں گھر کی طرف چلنے لگے۔

ابو نے لاڈ سے اس کے شانے پر بازو نکالیا جیسے

اتھتے دوست۔ پکے والے

”مارنے والے سے چوک ہو گئی۔“ بڑی امی نے

اپنے دکھتے سر کو بری طرح محسوس کرتے ہوئے بے

ساختہ سوچا۔ ”نشانہ بھولی ہونا چاہیے تھی، کتنا بولتی

ہیں بھولی آیا اف۔۔۔“

انہیں نہیں دوسرے دن شام میں وقت ملا کہ وہ جا

کر اللہ وہ ریاض کی خیریت معلوم کر آئیں۔ عبدالعزیز

صبح کام پر جاتے ہوئے پوچھتے گئے تھے۔ صنفیہ بھی چکر

لگا آئی تھیں۔

”سارا شہر مل کر چلا گیا بس ایک میری بھابھی کو اب

وقت ملا۔“

یہ استقبالی جملہ تھا۔ بڑی امی نے مجبور سا چہرہ بنا لیا۔

”آپ کو پتا تو ہے میری مصروفیات۔۔۔“

جواب میں پھپھو بھولی نے اپنی مصروفیات کی کہانی

چھیڑ دی۔ بات شروع ہوئی تو خاتمے کا راستہ بھول گئی۔

ان کا جمائیاں روک روک کر جبراً دکھ گیا۔

اللہ وہ ریاض کی چوٹ پس منظر میں چلی گئی۔ دنیا،

اخلاق، معاشرت، منگائی، تربیت و سلیقہ، بد حالی، بے

عقلی دنیا کی نئی احمقانہ روش۔ وہ کون سا موضوع تھا

جس پر پھپھو نے سپر حاصل گفتگو نہ کی ہو۔ بلکہ گفتگو

تو دو افراد کے بیچ ہوتی ہے۔ انہیں تو ایک لفظ بھی کہنے کا

موقع نہ ملا۔ تائیدی ہوں ہاں کی بھی گنجائش نہیں۔ وہ

بس چہرے کے تاثرات سے ایکشن دیتی رہیں لہذا

اسے پھپھو بھولی کا خطاب کہنا زیادہ مناسب تھا۔

اور سے وہ جب اٹھنے کی کوشش کرتیں۔ پھپھو

ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتیں۔

پھر اللہ دینے ریاض کا منہ اپنے ہاتھوں سے اوپر کر کے دکھایا۔ جیسے قربانی کے جانور کے دانت دیکھنے کے لیے اس کے منہ کو جکڑ لیا جاتا ہے۔ ذرا اسی چوٹ تھی۔
”اللہ کا شکر ہے۔“ بڑی امی نے کہا۔

”ہیں بھابھی۔ میرے پتر کو چوٹ لگ گئی اور آپ شکر کہتی ہیں۔“ پھپھو بھولی نے تڑپ کر کہا۔

”ہاں شکر ہے، ذرا اسی چوٹ ہے۔ آنکھ سچ گئی۔ باقی چھوٹے موٹے زخم تو جان کا صدقہ ہوتے ہیں۔ اللہ سے قریب کرتے ہیں۔ اللہ کی پہچان کروا دیتے ہیں۔ اور اللہ کی حد نگاہ اور پہنچ تک کون پہنچا ہے۔ وہ پہچانا جا ہے تو شیر خوار موسیٰ کی نوکری نسل پار کر جاتی ہے مگر شی عمار کے آگے جالابن دیتی ہے۔ عیسیٰ پیدا ہوتے ہی ہم گلام ہو جاتے ہیں اور پکڑنا چاہے تو لوگ کیلے کے چٹکے سے بھی پھسل جاتے ہیں۔“

بڑی امی کی آواز میں لرزش آگئی۔ پھر خود ہی خود پر قابو پا کر مسکرانے لگیں۔

”اسی لیے میں نے شکر کہنے کی عادت ڈال لی ہے۔ ولی اللہ نہیں ہوں آپا! پکی دنیا دار ہوں مگر میں یہ سوچ لیتی ہوں۔ جو ہوا ہے۔ اس سے بڑا بھی ہو سکتا تھا۔ سو آپ بھی کو سنا چھوڑ کر صدقہ دیں، بیٹے کی بچت ہو گئی۔“

”یہ تو تم نے ٹھیک کہا بھابھی۔“ پھپھو بھولی بہت کہنا تھی تھیں۔

”میں تو پہلے ہی کہتی ہوں، میری بھابھی بہت عقلوں والی ہے۔ ہمت والی، دل والی۔ کیسے سلیقے سے بچے پالے۔ گھر سنبھالا۔ یتیم بچی کو اولاد سے بڑھ کر رکھا۔ عبدالعزیز نے کوئی نیکی کی ہوگی جب ہی اسے ایسی باری عقل والی بیوی ملی۔“

پھپھی کو بولنے کا نیا موقع مل گیا۔ وہ تعریف و توصیف والے ٹریک پر چڑھ گئی تھیں۔ اب وہاں تک جاتیں جہاں تک پہنچی جاتی۔

مگر شکر ہوا، اللہ دینے ریاض کے کوئی کو لیگ آگئے تو انہیں اٹھنے کا موقع ملا مگر تب بھی تماشا ہو گیا۔



READI
Section

”آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟“ حمیرا کی انگلیاں کھلے منہ پر ٹنگ گئیں۔ فریج سے پانی کی بوتل نکالی۔ حمیرا فریج بند کرنا بھول کر ماں کو دیکھے گئی۔ صفیہ کے عام طور پر بے تاثر رہنے والے چہرے پر حیرت نمودار ہو گئی۔

ماں کے پیچھے داخل ہو تا معید بھی ہکا بکا ہو گیا۔ اتنا بڑا گلابوں والا بکے انہوں نے دونوں ہاتھوں میں یوں اٹھا رکھا تھا جیسے ایک صحت مند شیر خوار بچہ۔
”ہر رنگ کے گلاب۔“ حمیرا نے مسحور ہو کر لمبا سانس کھینچا۔

حمیرا زوریک آگئی۔ سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ کئی بار کا پہنا ہوا کرمی برنڈ چکن کا جوڑا۔ دھلا دھلا یا منہ۔ مگر بڑی امی کو سٹکار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ حمیرا عبدالعزیز کی والدہ ماجدہ تھیں۔ حمیرا نے سارا حسن ان سے چڑایا تھا۔ بھلا آگیا تو کیا ہوا۔

حمیرا تو بچا لگ دیا کہتی تھی۔ اگر فٹنی پلس کا مقابلہ حسن ہو بڑی امی بونہوں کی۔

”مگر حسن بے پناہ کا یہ مطلب تو نہیں۔ انہیں اتنے شدید قسم کے حسین گلابوں کا بکے دے دیا جائے۔ مگر کیا کس نے۔۔۔؟“ وہ سخت مشکوک نگاہوں سے ان کے گرد چکر لٹنے لگی۔

”اے موقعوں کے لیے ایک فلمی ڈانسیلا گ بڑا فٹ ہوتا ہے۔“

اس نے اپنی کٹیشی بھائی حمیرا اور معید دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔ انہیں کوئی ڈانسیلا گ یاد نہیں تھا۔
”ہاں۔۔۔!“ چکر پورا ہونے پر حمیرا بڑی امی کے رویہ آگئی۔ سخت چیختی ہوئی نگاہ۔ تفتیشی کڑا انداز۔

”کہاں سے آئے ہیں یہ پھول۔؟“

”کہا؟“ دلخ تو پھپھی بھولی خالی کر چکی تھیں۔ سوال سر سے گزر گیا انہیں خود اپنا آپ اتنا عجیب لگ رہا تھا، اتنا بڑا جمبو بکے پکڑ رکھا تھا۔ حسن اپنی جگہ شوہر کی چیتتی بھی تھیں مگر انہوں نے بھی کبھی ایک کلی بھی نہیں دی تھی۔ ان کا بکے پکڑنے کا تجربہ ہی نہیں تھا۔

ابھی گلی سے گزرتے ہوئے بھی اتنی شرم سی آرہی تھی۔

”کس نے دیے ہیں یہ پھول؟“ سمیرا کا لہجہ متعجب تھا اس نے جھک کر ایک طویل سانس کھینچا۔

”سمیرا! بڑی امی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔“ یہ بھی کوئی طریقہ ہے کوئی ماں سے یوں سوال کرتا ہے۔“ شرم کی سرخی۔ غصے کی لالی میں بدلنے لگی۔ وہ کچھ بولنے لگی تھیں۔ مگر جملہ منہ میں رہ گیا۔ معہد ان سے لپٹ گیا تھا۔

”میں بالکل نہیں پوچھوں گا“ کیوں دیے ہیں یہ پھول۔؟ کیونکہ میری امی ہیں ہی اتنی پیاری کہ انہیں کوئی بھی پھول دے سکتا ہے۔“

معہد نے گال بھی چوم لیا۔ محبت کے اس مظاہرے پر سب کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مگر حمیرا نے آنکھیں سمھائیں۔

”تم ہو گے اتنے لبرل۔“ اس نے ہاتھ نیچایا۔ ”مگر میں اپنے تایا ابو کو جا کر رہوں گی کہ آج اس گھر میں ہوا کیا ہے۔ اتنا بڑا بکے اور بڑی امی نے کیسے گود میں لے رکھا ہے جیسے آٹھ ماہ کے معہد کو اٹھاتی ہوں گی۔ یعنی کہ غضب خدا کا۔“

”بد تمیز لڑکی۔! بڑی امی نے معہد کو خود سے دور کیا۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ ہی نہیں۔ جو منہ میں آیا بول دیا۔ لو پکڑو اپنے آٹھ ماہ کے لاڈلے کو۔“ انہوں نے بکے اس کی طرف اچھال دیا۔

”ہائے۔! حمیرا بمشکل گرنے سے بچا پائی منہ سے بے ساختہ نکلا۔“ ماں صدقے۔!“ سمیرا اور معہد کی ہنسی بے قابو ہو گئی۔ صفیہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بڑی امی تخت پر بیٹھ رہی تھیں سر پکڑ کر۔ وہ بھی ہنس دیں۔

سب کو استاد دیکھ کر حمیرا چونکی پھر اپنے جملے اور انداز کو یاد کر کے وہ بھی تخت پر ڈھے گئی۔ بکے اپنے چہرے پر ڈال لیا۔ لبا سانس بھر اور ہنستی چلی گئی۔

”سیدھی ہو جاؤ۔ سارے پھول مسل دیے تم سمیرا نے بکے اٹھا کر اپنے چہرے سے جوڑا۔“

حمیرا اٹھ بیٹھی۔

”سوال اب بھی وہیں ہے۔ یہ پھول کہاں سے آئے ہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، آپ تو بھائی ریاض کی خیریت معلوم کرنے گئی تھیں تو بکے لے کر جانا تو سمجھ میں آتا ہے لے کر آتا۔ کیا انہوں نے آپ کے پھول قبول کرنے سے انکار کیا یا آپ کو پھول پیش کیے ہیں۔“

حمیرا نے گھر پر ہاتھ رکھا۔ سمیرا نے چونک کر کہاں کو دیکھا اور پھولوں کو۔ غیر ارادی طور پر غیر محسوس طریقے سے بکے کو اپنے بازوؤں میں کس سالیاتھا۔ معہد کا دھیان نہیں تھا۔ حمیرا کو عادت نہیں تھی دھیان دینے کی۔ مگر صفیہ نے سمیرا کے رنگ کی سرخی کو محسوس کیا تھا۔ بڑی امی اپنا دوپٹا تہہ کرنے لگیں۔

”بتائیے بتائیے۔ اب آپ چپ کیوں ہیں۔“

”ناظرین! یہ خاموشی؟ کیا وجہ ہے اس کی۔ کیا اس بات میں کوئی بات ہے؟ تو وہ کیا بات ہے ناظرین آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ خانوں کچھ بھی بولنے سے انکاری ہیں۔“

حمیرا نے ہاتھ کا مکا بنا لیا۔ وہ اچانک نیوز رپورٹر ہو گئی تھی۔

”امین حفیظ کا لیڈی بورڈن۔“ مائیک بڑی امی کے منہ سے جوڑ دیا۔ انہوں نے منہ موڑا۔ اس کا مائیک بھی رخ بدل کر سامنے۔

”آپ دیکھ رہے ہیں ناظرین یہ جواب دینا نہیں چاہتیں یہ کچھ چھپا رہی ہیں۔ یہ سچ رہی ہیں۔ یا کسی کو بچانا چاہتی ہیں۔ یہ۔۔۔“

”ہٹاؤ۔“ بڑی امی نے مائیک پر ہاتھ مارا۔ مائیک کی ایسی کی تیسری ہو گئی۔

”ہائے۔! مائیک کی آہ نکل گئی۔“

”بس کرو حمیرا۔! سب سے زیادہ بے زاری صفیہ کو ہوئی تھی۔ وہ پھلیاں کٹ رہی تھیں۔ ورنہ کب کی جا چکی ہوتیں۔“

”ایسے کیسے بس کروں۔ آخر ہمیں بھی تو ہتا لگے۔“

یہ ہو کیا رہا ہے۔ مجھے تو آج تک کسی نے پھول نہ دیا۔ پھول چھوڑو، پیڑی بھی نہیں دی کہ چلو جاؤ اپنے گلے میں لگا لو۔ پھول ہی پھول۔ اور مجھے تو چھوڑو۔ سمیرا کو کسی نے پھول نہیں دیے حالانکہ یہ تو وہ ملکہ ہے۔ جس کے نام باغ لگوادینا چاہیے۔ ہے ناں سمیرا۔ کیوں معید؟

”ہاں ہاں بالکل۔“ معید سیدھا ہو بیٹھا۔ اس نے پیار سے بڑی، بہن کو دیکھا۔ اتنے سارے پھولوں کے ساتھ۔ وہ پھولوں سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔ صفیہ کے دال جھنڈے ہاتھ بھی رکے تھے۔ اپنی تعریف پر کچھ جھینپ کر مسکرائی۔ کھنی مڑی پلکوں کی باڑ کے پار۔ مین کٹورے جھلسا ہٹ سی۔ غمناک آدیا۔ شکر حسن کو دوام نہیں۔

اور شکر کہ ایسا حسن عام نہیں۔ شکر چہرے اللہ خود گھرتا ہے۔

ورنہ زندگی الزام تراشیوں میں گزر جاتی۔ جھینڈے میں ختم ہو جاتی۔ آئے دن لوگ چہرے بدلتے۔ خود گو سنوارنے سجانے میں دوسرے کی گردنیں بے چہرہ کر دیتے۔ ہر انسان سر کٹا۔ شکر اس نے انسان کو اس کی اوقات میں رکھا، ورنہ یہ انسان۔“

صفیہ کا ہاتھ چھری کے دستے پر اتنا سخت ہو گیا۔ کہ اپنے خود کے ناخن پھیلی میں دھنسنے کی تکلیف سے چونک اٹھیں۔

”ہے ناں امی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔“

”آں ہاں۔“ صفیہ نے اپنا ہاتھ دھیرے سے مسلا۔ ”ہاں ماشاء اللہ۔“ مسکرا کر سمیرا کو دیکھا۔ کیسا بخت کر دینے والا جاو اثر جملہ تھا۔ مزید کہنے سننے کی گنجائش ہی رہتی۔ صفیہ کی جان چھوٹی۔ باقی سب مطمئن ہو گئے۔ واہ اللہ تیرے رنگ کیسے تو بچا لیتا ہے۔

”کس نے دیے ہیں پھول؟“ لے کر کھڑے کھڑے پورا خبر نامہ بنا لیا۔ ”بڑی امی نے پھیلوں کی چنگیر اپنی طرف کھسائی۔“

”اللہ دتہ ریاض کے کولیک اور اسٹوڈنٹ وغیرہ آئے تھے۔ یہ گلہ سہ ساتھ لائے۔ وہ بے چارہ چائے کا کہنے آیا۔ پندرہ سولہ لوگ تھے۔ ماں کو گلہ سہ پکڑا کر بولا ”چائے بنا دیں۔“ بھولی آیا کو پٹنگے لگ گئے۔ پہلے بولیں ”عمیادت اور پُرسے کے گھر چائے پانی نہیں پینا چاہیے۔ میں تو ہول گئی۔“ اللہ رحم کرے، پُرسے کی کیا بات ہے، چائے کیا ہے بیٹھا گھر مپانی۔“

”دودھ پتی بھول گئیں بھابھی۔“ پھر اللہ دتا کی طرف گھومی۔ ”یہ پھول کیوں لائے ہیں؟“

”اماں جی۔۔۔ نیک تمناؤں کے ساتھ دعائیں پھول لے کر ہی جاتے ہیں۔“ اللہ دتہ نے تمیز داری سے بتایا۔ ”یہ عمیادت کا سب سے خوب صورت طریقہ ہوتا ہے۔“

”کیا خوب صورت طریقہ۔ نرمی فضول خرچی۔ مت ماری گئی ہے ساروں کی۔ بندہ عمیادت کے لیے جائے کوئی سیب لے لے، کوئی آم کیلا۔ مرہ۔۔۔ دودھ ڈبل روٹی، اٹھے یہ پھول کیا سر میں مارنے ہیں۔ لو بھابھی۔ یہ پھول تم لے جاؤ۔ تمہاری سمیرا کو اچھے لگتے ہیں یہ پھول شول۔ شعرو شیریں۔ گلاں باتاں۔“ اور انکار کا موع دیتی ہے تمہاری پھولی بھولی۔ پھول میری گود میں پھینک، پیر پختی چائے بنانے اندر چلی گئی۔ میں لے کر آئی۔

بڑی امی کا لہجہ و انداز جتنا جلا کٹا تھا، ان تینوں کے قہقہے اتنے جان دار تھے۔ حمیرا حسب عادت دوہری ہو گئی تھی۔ ہنستے ہنستے صفیہ کی گود میں جا پڑی۔ بیٹی ایسی بے ساختہ ہنسی ہنستی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ اللہ اسے ایسے ہی شادیاں رکھے مگر اتنی بڑی گود میں کیسے گھسیڑتیں بمشکل اس کا ترو ز پیچھے دھکیلا۔

”واہ پھولی بھولی۔ تیرا بھی جواب نہیں۔“ معید گھٹنے پر ہاتھ مار کے ہنس رہا تھا۔

”سمیرا نے پھولوں کو خود سے کچھ اور قریب کر لیا۔“

خوشبو، ملائمت، احساس، اے ڈی ریاض۔

”السلام علیکم۔“ یہ عبد العزیز کی آواز تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ سب چونکے۔ کورس میں

جواب آیا۔ صغیہ نے دوپٹا درست کیا۔ سمٹ کر بیٹھیں۔ سیرانے بکے خود سے لگائے لگائے باپ کو واسکٹ اتارنے میں مدد دی۔ پھر واسکٹ اپنے کندھے پر رکھ لی۔ حمیرا کی نگاہیں ان کے ہاتھ میں پکڑے شاپرز پر تھیں۔

”یہ کیا لائے ہیں؟“
 ”خود ہی دیکھ لو۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔
 ”پہلے پانی تو پوچھ لو آتے ہی تفتیش۔“ صغیہ نے ٹوکا۔

عبدالعزیز نے ہاتھ کے اشارے سے صغیہ کو کچھ نہ کہنے کی تائید کی۔ حمیرا اشارہ کھول چکی تھی۔ وہ جوڑی سوٹھی۔ پھر یہ کہ دونوں ایک جیسی۔
 ”دونوں ملائے۔ معید تو دوسرے اشائل کی پسند کرتا ہے۔“ بڑی امی نے شوہر کا منہ دکھا۔
 ”یہ میرا نمبر بھی نہیں ہے۔“ معید کا نمبر دکھا یہ دونوں گیارہ۔

”معید کی نہیں ہے۔“ عبدالعزیز موزے اتارنے میں محو تھے۔ نگاہ اٹھا کر سب کو دکھا۔
 ”ایک میری ہے اور دوسری۔“ اب نظریں حمیرا پر تھیں۔ ”دوسری حمیرا کی ہے۔“
 ”میری۔“ حمیرا کی حیرت بھری جیج سب سے نملیاں تھیں۔
 ”میری کیوں؟“

”تم ہی نے تو کہا تھا تمہیں میری سوٹھی پسند ہے۔ اس لیے میں نے دونوں ایک جیسی لے لیں کیوں پسند نہیں آئی۔“
 ”خاک پسند آتی ہے۔“ حمیرا نے منہ پھلا کے ڈبا پرے کیا۔ ”مجھے الگ سے سوٹھی نہیں لینی۔ مجھے تو وہی پہنتی ہوتی ہے جو آپ پہنتے ہیں۔“
 ”وہی۔“ اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔
 ”کیوں؟“

”بس میری مرضی۔“ وہ بالکل خفا ہو گئی۔ ان کے اتارے موزے بوٹوں میں گھسیڑ کر اندر رکھنے چلی گئی۔
 ”بڑا جباری تھی۔“ گھر میں پہننے کوئی فرمائش کی تھی واپس

کر دیں۔ مجھے الگ سے نہیں لیتی۔ اپنی پہنتے نہیں دینا چاہتے تو صاف منع کر دیتے۔ مجھے نہیں آئی پسند آپ کی یہ حرکت۔ صاف صاف بتا رہی ہوں ہاں۔“

واپس آکر پانی کا گلاس رکھتے ہوئے اس نے منہ بھی پھلا لیا تھا۔ عبدالعزیز سب کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ ایسا کون سا غلط کام کر آئے تھے سوٹھی ہی تو۔
 ”آپ نے تو کہا تھا میری ہر چیز تمہاری ہے۔“

”مگر سوٹھی تو سب کی الگ ہوتی ہے۔“ عبدالعزیز نے سب کو تائید طلب نگاہوں سے دکھا۔
 ”جی نہیں۔ ہر چیز میں یہ بھی آتی ہے۔“
 ”مت بھولو یہ ہمارے ابو ہیں۔“ حمیرا نے دو

تین پھلیاں اٹھا کر اس کی جانب پھینکیں۔
 ”اوہ۔“ وہ دانت نہیں کر چھپے مڑی۔ ”وہ تو ان کی مجبوری ہے۔“
 ”کیا مطلب۔۔۔؟“ سیرا چونکی۔ معید کا منہ بھی کھل گیا۔

”بھئی وہ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ آپ کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے اب ہو گیا ہے تو ہو گیا۔ مجھے تو کیا ابو نے خود پسند کر کے کہا۔ آج سے حمیرا میری بیٹی ہے۔ تم تو جسے بھی ملے انہیں رکھنا بڑا۔ جبکہ مجھے انہوں نے چنک۔“ اس نے گرون اکڑائی۔
 معید اور سیرا تو کیا خود عبدالعزیز کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
 ”یعنی۔ یعنی کہ اب۔“

بڑی امی نے ہنس بڑی تھیں۔ صغیہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ مگر وہ حیرت سے سوچ رہی تھیں کیا مضبوط رشتہ بنا چکی تھی وہ اپنے تایا عبدالعزیز کے ساتھ۔

کیسا مان۔ غور۔ لاڈ اور حق تھا۔
 جبکہ وہ۔۔۔ آج تک۔ ان کے اپنے اندر کی اجنبیت اتنے عرصے کے بعد بھی برقرار تھی۔



”میں ہمیشہ سے ایک قناعت پسند انسان رہا ہوں مگر

اب نجانے کیوں کبھی کبھی سوچتا ہوں، وہ فقیروں کی پادشاہوں کے لیے سات سات بیٹوں والی دعا درست ہی ہوتی تھی۔

”سات سات بیٹے۔“ اس نے بات کے الفاظ زیر لب دہرائے ”کیوں؟“

”جب تمہیں اس حال میں دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں، ایک اور کندھا بھی ہونا چاہیے تھا۔“ وہ اپنی سوچوں کے ہی زیر اثر تھے۔

”ہاں پھر آپ کو میرے لیے اتنی مشقت نہ اٹھانی پڑتی۔ ایک اور بیٹا ہوتا۔“ پتا نہیں وہ بدگمان ہوا تھا یا اس کا دل چھوٹا ہو گیا تھا۔

”کیا؟“ وہ ایک دم سے چونک گئے۔ بیٹے کے الفاظ کو ذہن میں دہرایا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا دیے۔

”ہاں ایک کندھا اور ہوتا جس پر سر رکھ کر میں اپنا دکھ بانٹ سکتا۔“ ان کی آواز میں تھراہٹ سی آئی۔ تو یہ پتا چلا، بے چارگی سے بھی بدگمانی بڑھتی ہے۔ اور

اپنی جلدی معنی اخذ نہیں کرنے چاہئیں۔ اور یہ کہ اس نے کتنی جلدی سوچ لیا کہ باپ کے چہ بیٹے اور ہوتے تو اس کے لیے معذور ہو جانے والے بیٹے کو نظر انداز کرنا آسان ہو جاتا۔

”سوری ابو۔!“ وہ یہی کہہ سکا۔ ابو کی نگاہیں اس کی جانب اٹھیں۔ ان میں اٹھنا شکوہ معدوم ہو گیا تھا۔

”دل آزاری بھی گناہ اکبر ہے۔ معافی مانگ لینے سے دل ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ معاف کر دینے سے۔“

معاف کر دینے سے دل۔۔۔ دل نہیں رہتا اللہ کا گھر ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے گھر سے برہہ کر جائے امان کہاں؟ جائے پناہ کون سی۔

”میں نے ایک بات سوچی ہے یار۔“ ابو نے دوستانہ انداز سے اس کی پشت پر ہاتھ مارا۔ ”تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو تمہاری شادی کروں گا۔“

”شادی!“ وہ بری طرح چونکا۔ ابو کی شکل دیکھی۔ وہ کہیں پہنچے ہوئے تھے۔

”وہ کہتے جاتے تھے اس کی سوتلی مین پوائنٹ پر رک گئی۔“

”جلدی جلدی چہ سات بچے۔ اکٹھے۔“ وہ بھونچکا رہ گیا۔

”ارے یار!“ ابو بد مزہ ہوئے ابھی تو وہ شروع ہی ہوئے تھے، ٹوک دیا۔ ”ٹوکتے نہیں ہیں۔“ ابو کو شاید بچوں کو نظر لگ جانے کا اندیشہ تھا۔

”گھر میں ہاپنل مچ جائے گی۔ چیاؤں پیاؤں۔ پھل پال۔۔۔“ ایک ادھر دو سر ادھر۔

”چیاؤں پیاؤں تو ملی کے بچے کرتے ہیں ابو۔!“

”میلی کے۔۔۔ تم نے پھر ٹوک دیا۔“

”میں نے تصحیح کی ہے ابو۔“

”میں کب تم سے اصلاح لینے آیا تھا؟“

اس نے بھنویں اچکائیں اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ٹھیک سے پھر جاری رکھیے۔ اپنی چیاؤں پیاؤں۔

”یار! انسان کے بچے بھی تو ملی کے بچوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔“

”میلی کے جیسے۔ وہ پورا کا پورا ابو کی جانب گھوم گیا۔“

”اوہو۔!“ ابو ہنس دیے۔ ”میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا، دونوں پیدا ہوتے ہیں تو لاچار ہوتے ہیں محتاج۔۔۔ بند آنکھوں والے بے بس۔ پتا ہے، ملی اپنے نوزائیدہ کو منہ میں لے کر سات گھر بدلتی ہے۔“

”کیوں؟“ اسے یہ بات پتا نہیں تھی۔

”حفاظت کے خیال سے۔۔۔ مطمئن ہی نہیں ہوتی۔ ہر ایک پر شک کرنی ہے۔ ہر کوئی دشمن نظر آتا ہے۔“

”تو پھر ایسا ملی کے ساتھ ہی کیوں؟ چڑیا بھی تو بے باں و پر بچوں کے لیے ایسے ہی مشقت سے دانہ و نکا لاتی ہے۔“ اس نے بچپن میں کتنے درختوں کے اونچے تنوں پر چڑھ کر گھونسلوں کے اندر جھاتی لگائی تھی۔

”ہاں چڑیا بھی۔ ملی کے بھی۔ اور انسان کے تو لازمی۔ گائے بکری کے بچوں کو دیکھا ہے؟ وہ پیدا

ہونے کے آدھے گھنٹے میں بیٹھنے، چلنے، بھاگنے کے مرحلے طے کر لیتے ہیں۔

”ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ قائل ہو گیا۔ ”پتا نہیں ایسا کیوں ہے؟“

”مجھے پتا ہے۔“ ابو کچھ ٹھک گئے تھے۔ دونوں آج پھر چلتے چلتے بہت دور نکل آئے تھے، وہ اب بغیر سارے کے زیادہ چلتا تھا۔ جاوٹے نے دونوں کو قریب کر دیا تھا۔ پہلے اچھے باپ بیٹا تھے۔ مشفق باپ۔ فرماں بردار بیٹا۔ وہ اب دوست تھے۔

”میں اب چیزوں کو غور سے جانچنے لگا ہوں۔ ماہیت، تغیرات و جوہ کیوں اور کیسے کے سوال و جواب۔“

”پھر کیا ملا؟“ اس نے اسٹک پر دباؤ بڑھاتے ہوئے بیروں کا وزن منتقل کیا۔

”یہی کہ جن جانوروں کو انسان کی خوراک بننا ہو۔ وہ جلدی اور آسانی سے پروان چڑھتے ہیں، ان کی بلاں کو کشت نہیں اٹھانے پڑتے۔ گائے بچہ دے کر قاصد بچہ چند دنوں میں گھاس پر چلا جاتا ہے۔ سارا دودھ انسانوں کے لیے۔ عیش کرو۔“

ابو کی آنکھوں میں چمک نمودار ہو گئی تھی۔ اس کا حیران چہرہ دیکھ کر انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

”کیوں بھئی غلط کہا میں نے۔“

”نہیں۔۔۔ وہ چونکا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنے ہاتھ میں گرجوشی سے دیا۔

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ کمال ہے، میں نے کبھی ایسے نہیں سوچا۔“ اسے افسوس ہونے لگا۔

”تو سوچا کرو بھئی۔ قدرت کے اسرار سمجھنا مشکل ہے، ناممکن نہیں۔ بس تیسری آنکھ کھولنے کی ضرورت ہے۔ لیکن انسان نے دو آنکھوں کو ہی سب سمجھ لیا ہے۔“

پتا نہیں ان کی آواز بھرا کیوں گئی تھی۔ شاید یہ خیال آیا تھا۔ وہ بھی تو دنیا کو دو آنکھوں ہی سے دیکھتے تھے۔ تاؤ قنیک۔

”آپ ٹھک گئے ہیں ابو۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ باتوں میں پتا ہی نہیں چلا۔ ہم پھر بہت آگے تک آگئے۔“

”نہیں۔۔۔“ اس کا لہجہ ہچکچایا ہوا تھا۔ ”میری بیماری نے آپ کو تھکا دیا ہے۔“

ابو چونکے ”پوچھ رہے ہو کہ تار ہے ہو۔“

”جو آپ کو مناسب لگے۔“ اس نے خود کو بری الذمہ کر دیا گیندان کے کورٹ میں ڈال کر۔

ابو کی نظریں اس پر ٹک گئیں۔ ”ایسی فضول باتیں سوچتے ہو۔“

”سوچوں بر اختیار نہیں ہوتا ابو۔۔۔“ اس کے لہجے میں بے بسی کھل گئی۔

”تمہارے جسم کی ٹوٹ پھوٹ سے زیادہ تکلیف مجھے تمہارے لہجے کی ٹوٹ پھوٹ سے ہوتی ہے بیٹے۔“

ابو دکھی ہو گئے تھے۔ وہ شرم سار ہو گیا۔ وہ یہی تو نہیں چاہتا تھا۔ وہ مزید دکھ نہیں۔



سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کب سے قصور وار کہے امی کو۔ جنہوں نے اس کے ممکنہ موٹاپے میں جتلا ہونے کے خدشے کے پیش نظر اسے بڑی امی کے ہمراہ بازار بھیجا تھا کہ گھر سے نکلے گی، مینے بھر کے راشن کے لیے

دکان دکان گھومے گی۔ تھیلے اٹھائے گی تو کیلوریز برن ہوں گی۔ کچھ ایکسرسائز سے وزن بھی کم ہو سکتا ہے۔

خوبی پچھلے گی یا پھر خود کو کو سے جس نے سلمان کی لسٹ کھودی تھی اور اب یادداشت کے زور پر سلمان بدمعہ قیمت لکھنے کی مصیبت میں گرفتار تھی۔

بڑی امی سارے اخراجات کا اندراج بڑے سلیقے سے ایک ڈائری میں کرتی تھیں اور بڑے بھروسے سے اسے لسٹ تھماتی تھی۔ وہ ذہین تھی مگر مسئلہ یہ تھا، کچن

میں استعمال ہونے والے مسالوں وغیرہ کے نام نہیں آتے تھے۔ دالوں تک کو کلر کے حساب سے یاد رکھا تھا۔ پیلی والی (حنے کی) اور بیج والی (مسور کی)

”اف۔۔۔ گھر میں داخل ہوتے معینے اسے سر

”اف۔۔۔ گھر میں داخل ہوتے معینے اسے سر

”اف۔۔۔ گھر میں داخل ہوتے معینے اسے سر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

پکڑے دیکھا تو نزدیک چلا آیا۔

”یہاں سب ظالم ہیں“ اس کے پوچھنے کی دیر تھی۔ وہ تو بھری بیٹھی تھی۔ پھٹ پڑی ”ایک ظالم میری اپنی خود کی ماں جس نے مجھے اس شاپنگ میں پھنسیا۔ آلو پیاز خریدنا بھی کوئی شاپنگ ہے۔ دوسری تمہاری امی جنہوں نے مجھے لسٹ پکڑائی اور اب کہتی ہیں۔ ڈائری میں سب لکھ کر قلمی پیسوں کا حساب کروں۔ اور ایک وہ لاڈلی سیرا ہے ہوگی اپنے کمرے میں آرام کرسی پر دراز۔ کوئی بک ہاتھ میں ہوگی مطالعہ سے شوق فرمایا جا رہا ہو گا اور ادھر میں۔“

”آپی امی کے پیروں پر مالش کر رہی ہیں۔“ معید نے گردن اچکا کر دیکھا۔ گھڑکی سے اندر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

”اوہ۔“ اس نے اپنے پیر دیکھے۔ دھوئے تک نہیں تھے۔ تھکن ہی اتنی تھی۔

”مالش کی ضرورت تو میرے پیروں کو بھی ہے۔“
”تم آپی سے مالش کروانے کا کہہ رہی ہو؟“ معید اپنی بہن کا احترام کرتا تھا۔ یہی شروع دن سے نام سے پکارتی تھی۔ حالانکہ معید سے بھی چھوٹی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے لو اپنے شانے اچکائے۔
”تم کوئی آسمان سے آتری ہو جو آپی تمہارے پیر دبا میں گی۔“

”ہاں!“ اس کا انداز اور بے نیاز ہوا۔ ”میرے ابو کہتے تھے مجھے آسمانوں سے گلابی پری انہیں دے گئی تھی۔“ وہ پیار سا مسکرائی۔

”اوہ۔“ معید نے بے ساختہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”والدین بچوں کو ایسے ہی بہلایا کرتے ہیں۔ تم نے یقین کر لیا۔“

خود پر فخر کرتی وہ بری طرح چوکی سے گھورا۔
”اپنی شکل دیکھی ہے۔“

”ہاں الحمد للہ۔“ وہ بے پروا تھا۔
”تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے حساب لکھنے دو۔“ وہ کٹھور ہو گئی رخ بدل لیا۔

”میں تمہاری سیلاب کر سکتا ہوں۔“

”ضرورت نہیں۔ جب میری اپنی ماں مجھے ایسے کاموں میں پھنسا کر چلی گئی تو اب کس سے فریاد کروں۔ یہاں کوئی میرا نہیں۔ اتنی نا انصافی۔“ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر دہائی دی۔
”کیسی نا انصافی۔؟“

”دیکھو“ شام ٹھنڈی ہے۔ اس ہلکے اندھیرے میں میں آگلی تن تنہا صحن میں بیٹھی ہوں۔ ادھر سامنے واوا کے زمانے کے درخت کھڑے ہیں۔ ان پر سلیہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور بڑی امی مجھے ان حسابوں میں لگا کر خود اپنی بیماری بیٹی کے ساتھ اندر مالش کے مزے لے رہی ہیں۔ یتیم ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھے انسان ہی نہ سمجھا جائے۔ میں ادھر ٹھنڈ میں کلب رہی ہوں اور ادھر۔“ اس نے کپکپاتا شروع کر دیا۔ دانت بھی بچ رہے تھے۔

کوئی اور ہوتا تو اس دل گیر انداز و بیان اور رقت پر کندھا پیش کر دیتا مگر سامنے بھی معید تھا۔ اس نے دانت پس کر اسے دیکھا اور تائیدی انداز سے بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

”ماتا کہ تایا ابو کے مجھ یتیم پر بڑے احسانات ہیں۔“ اس نے ہنسی بھری اور معید کو دیکھا۔ معید نے اثبات میں سر ہلا کر اسے گھورا۔

”احسان فراموش نہیدی لڑکی۔!“
”مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مجھ سے اتنے بڑے بڑے حسابات کروائے جائیں۔“

”حسابات؟“ معید چونکا۔ ”ایک سو زی یہ کسی ملک کے خزانے کا حساب نہیں ہے۔ چند افراد پر مشتمل ایک چھوٹے سے خاندان کے نسخے سے بچن کی بنیادی ضرورتوں کی چیزیں ہیں۔ زیرہ اور دھنیا اور

کالے کالے دانے۔“ معید کی نظریں ان ہی لفظوں سے ٹکرائیں ”یہ کالے کالے دانے کیا ہیں؟“

”یہ تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔“
”کلو گھی ہوگی بے وقوف۔“ معید نے کہا۔
”اوہ ہاں۔ ہاں ہاں بالکل۔“ تمیرا نے فوراً ”صحیح

کی۔

”ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟“

”کسی نا انصافی کا ذکر تھا۔ ٹھنڈی شام۔ گرم کمرے وغیرہ۔“

”ہاں۔۔۔ وہی تو۔۔۔ اگر مجھے ٹھنڈ لگ جائے تو میری بیوہ ماں کہاں کہاں لے کر گھومے گی مجھے اس عمر میں“

”گھومنے کی کیا ضرورت ہے ہم تمہیں ان ہی دادا ابو کے زمانے کے درختوں کے سائے میں گاڑ دیں گے۔ قبر رو دیا جلانے کی مشقت سے بھی جان چھوٹے گی وہاں آل ریڈی بلب موجود ہے۔“ آخر معیذاتنی الزام تراشیاں کب تک برداشت کرتا۔

”میرے بعد میری ماں کا کیا ہو گا معیذ۔؟“
”وہ سکھ کا سانس لے گی۔ تمہارے جیسی نکمی اولاد کے والدین ہی ہوتے ہیں جن کے بارے میں ماں کہتی ہے۔“ ہائے بے مینوں پتا ہوندا توں اے ہو جی نکلیں گی جمدے ہی ساہ کب بندی۔“

”کیا۔۔۔؟“ حمیرا نے ڈائری سنی۔ ”تم میرے بارے میں ایسا کیسے کہہ سکتے ہو۔“
”میں نہیں کہتا تمہاری امی کہتیں۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“ تم اپنے اندر کی جلن نکال رہے ہو۔ میں ابھی تیا ابو کو بتاتی ہوں۔“ اس نے پیرے بچے کیسے
”اچھا جی۔ تم جو مرضی کہتی رہو اور ہم سچ بھی نہ بولیں۔“

”یہ سچ تھا؟“

”ستمبر کے مہینے میں ٹھنڈی شام۔۔۔“ اس نے دانت کچکپچائے ”میتیم بیٹی پر ظلم ارے تمہارے لاڈ اپنے باپ کے ہاتھوں دیکھ دیکھ کر تو کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میتیم تم نہیں میں ہوں اور وہ جو تم۔“

”معیذ۔!“ ڈھیٹ پن سے مسکرا کر سختی حمیرا نے بری طرح چونک کر ٹوک۔ ”دوبارہ یہ بات مت کہنا۔“

”کون سی بات۔۔۔؟“ معیذ کو ٹوک کے جانا پسند نہیں آیا تھا۔

”یہ کہ تم میتیم ہو۔ خدا نخواستہ تیا ابو کو میری عمر لگ جائے۔ انہیں گرم ہوا نہ چھوئے۔ میتیمی سے بڑا دکھ کوئی اور نہیں ہوتا اور یہ بات مجھ سے بہتر اور کوئی نہیں جانتا۔“

وہ جو کچھ دیر پہلے کی اداکاری تھی۔ معیذ کو چڑانے کی کوشش۔ وہ شریر انداز سب غائب ہو گیا۔ اس کا چہرہ غم کی تصویر بن گیا۔ خاموشی اور ملال۔ آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔

”میں مذاق کر رہا تھا حمیرا! ابو سب سے زیادہ پیار تم سے کرتے ہیں۔ آپی اور مجھ سے بھی زیادہ۔ اور ہم سب نے کبھی تم سے کوئی زیادتی نہیں ہونے دی۔ ہم سب چچا جان جتنا پیار یقیناً نہیں کر سکتے۔ مگر کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اگر ابو ابھی تمہارا یہ ٹوٹا لہجہ سن لیں تو اندازہ ہے ان کو کتنی تکلیف ہوگی۔ تمہیں کوئی شکایت ہے تو کہو۔“

”مجھے کوئی شکایت نہیں۔“ حمیرا نے اپنا لہجہ بٹاش کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔ تم ایسے بھی نہیں بولیں۔ آج میتیمی کیوں یاد آگئی۔ ابھی تو ساری زبان کی دھار مجھ پر استعمال کر رہی تھیں۔ میں جواب دینے لگا تو لڑکھوشنل بلیک میلنگ پر اگر میرا منہ بند کروانے کا حربہ تھا تاں یہ۔۔۔ معیذ نے مسکرا لے دیکھا۔

حمیرا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں معیذ! مجھے آج واقعی ابو یاد آرہے تھے۔“

”سوال یہی ہے کیوں؟“
”ٹریفک جام میں پھنس گئے تھے آج ہم۔ میں اور بڑی امی۔۔۔ جب بازار گئے تو۔۔۔“

”ہاں ہاں آگے بولو۔“ معیذ کو یکدم کچھ اندازہ ہوا۔

”وہاں۔۔۔ ابو کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔“

”اوہ۔!“ معیذ نے سارا معاملہ سمجھ لیا۔ حمیرا کے ابو کے انتقال کے بعد ان کے قرض کا بوجھ اتارنے کے لیے معیذ کے ابو عبد العزیز نے ان کی ہائی ایس وین بیچ دی تھی۔ مرحوم بھائی کا قرضہ اتارنا بہت

ضروری تھا۔ حمیرا کی دین سے جذباتی وابستگی تھی جب
 ہونے وہ گاڑی خریدی تھی سب سے پہلے حمیرا کو آگے
 بٹھایا تھا اور پھر وہ اسے اسکول چھوڑتے تھے۔ سات
 سال کا عرصہ گزر گیا۔ وہ گیارہ برس سے اٹھارہ برس میں
 آگئی۔ مگر ابو کی ہانگی ایسے جب بھی دیکھ لیتی اس کی
 حالت ایسی ہی ہو جاتی تھی۔ ہنستے مسکراتے ہوئے
 سب کے درمیان رہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ ایسا کہہ
 جاتی جو گھر کے ہر فرد کو تارتا۔
 ”آج کچھ ہوا ہے۔“

تو وہ جو سلمان کی لسٹ کہیں گرا دی اور حساب
 کرنے میں جو جھنجھلاہٹ تھی۔ ساری لن ترانیاں
 اسے کم کرنے کی کوشش تھی۔ وہ جو کہاں کے قصے
 کہاں جوڑ رہی تھی۔ ہوتا ہے ایسا بھی۔ کبھی کبھی
 انسان بہت سارا فضول بول کر اندر کی گفتگو کے شور کو
 کم کرنا چاہتا ہے۔

زندگی کے امتحانی پرچے کا ہر سوال حل کرنا پڑتا
 ہے۔ مگر بعض دفعہ خالی جگہ پر کرنے والے سوال کے
 لیے کوئی لفظ موزوں نہیں ہوتا یا ”یہاں تک کہ زندگی
 ختم ہو جاتی ہے۔“

نصاب کی کتاب میں تراویف جنملے ہوتے ہیں۔
 مگر زندگی کی کتاب میں ماں اور باپ کے بعد دوسرا
 لفظ ”دوسرا رشتہ کوئی نہیں ہوتا۔ جہاں باپ لکھتا ہو
 وہاں اور دوسرا کوئی نام نہیں لکھا جاسکتا۔“
 ”میں ایسے ہی تمہیں تنگ کر رہی تھی معیہ۔!“
 حمیرا نے سر جھٹک کر جیسے ساری کیفیت سے چھٹکارا
 پانے کی کوشش کی تب دیکھا معیہ سر نیہواڑے مجرم
 سا بیٹھا ہے۔

”کیا بات ہے تم دونوں اتنی دیر سے کون سی
 کہانیاں کہہ رہے ہو۔“ ”میرا تیل کی پیشی لیے غسل
 خانے کی طرف جا رہی تھی۔“

”اور حمیرا۔ امی ڈائری مانگ رہی ہیں۔“
 ”ہاں پتا ہے مجھے۔ خود اپنی بیٹی کو تو کچھ کہتیں
 نہیں مجھ سے ہی کام کرواتی ہیں۔“

”وہ نہیں کروا رہیں۔ تمہاری امی ہی نے کہا ہے۔
 پیاری حمیرا امتحان دے کر فارغ ہے، اسے کسی کام
 سے لگایا جائے۔“
 ”تو کیا یہ ضروری ہے کہ مجھے راشن خریدنا سکھایا
 جائے۔“ ”میرا کام گھر چلانا ہے، راشن خریدنا مردوں کا
 کام ہے۔“
 ”ہو سکتا ہے، تمہیں کوئی ٹکٹو مل جائے۔“ معیہ
 نے ٹکڑا لگایا۔

”ہاں تمہارے جیسا۔“ ”ترنت جواب دیا مگر اگلے
 ہی پل معیہ کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھ کر زبان
 دانتوں تلے دالی۔“

”سوری۔ میں نے تمہیں نہیں کہا تھا۔“
 ”ہاں تو میں نے کب کہا، تم مجھے کہہ رہی ہو۔“
 معیہ مسکرایا۔ چہرہ تلکین ہو گیا۔
 حمیرا نے پرسکون سانس لی۔ ایک بات طے ہے۔
 سوچ سمجھ کر ابو کو رو دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔ اس نے
 حمیرا کو دیکھا۔ بالکل گیس کے اشتہار کے انداز میں
 گالوں پر جھاگ مل رہی تھی۔
 ”میں تمہیں لسٹ بتاؤں گا۔“ معیہ نے چپکے
 سے کہا۔

”تم کیسے؟“
 ”یار! سارا راشن ابھی تھیلوں میں ہی پڑا ہے۔ تم
 مجھ کو کھاتی جانا میں تمہیں بتاؤں گا۔“

”مجھے قیمتیں یاد ہیں۔“ ”حمیرا کالجہ مزید دھیما ہوا۔
 ”مگر جو چیزیں تمہاری امی نے خریدی ہیں یاں ان کے
 نام نہیں آتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ بڑی امی
 نے کچن سنبھالنا ہے کہ پسناری کی دوکان کھولنی ہے؟“
 ”میری امی کی برائیاں کرنی ہیں۔ اس کا مطلب ہے
 تمہیں مسئلہ حل نہیں کروانا۔“ معیہ ہتھ سے
 اکھڑا۔ ”بڑی امی کے سامنے جی امی۔ جی امی اور اکیلے
 میں تمہاری امی۔“ یہ ساری شکایتیں تم امی کے سامنے
 کیوں نہیں کرتیں ڈرتی ہو؟“

”میں کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتی معیہ۔
 مگر تمہاری امی میری امی کو بتا دیتی ہیں۔“ اس نے

ہونٹ لٹکائے۔

”اوہو۔۔۔“ معید ہنس دیا۔ ”یعنی جو کسی کے باپ سے بھی نہ ڈرے وہ اپنی ماں سے تو ڈرتا ہی ہے۔“
”ماؤں سے ڈرنے میں کوئی حرج نہیں۔“ اس نے عالمانہ انداز اپنایا کیونکہ امی کی پٹی لگتی بڑے زور کی ہے۔

معید زور سے ہنسا۔

”تم ہنسو۔ تمہیں کبھی پڑیں نہیں ناں۔“

حمیرا کو یہ دیکھ بھی بروقت یاد آیا۔

”اویار۔۔۔!“ معید جگہ سے اٹھا۔ ”ہمیں جتنی پڑنا تھیں ایک بار ہی پڑ چکی ہیں۔“

حمیرا نے نظریں اٹھا کر بے ساختہ اسے دیکھا۔ بیسن کے سامنے لگے آئینے میں سمیرا کا جھاگ سے چھپا چہرہ تھا۔ اس نے بھی معید کے جملے پر چونک کر ہاتھ روک دیے تھے۔ معید اپنی کہہ کر اب مسکرا رہا تھا۔

حمیرا کی آنکھوں میں تنبیہ ابھری۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کوئی تسلی دلاسا بھلاوا جھوٹ بعض دفعہ خوب صورت نام بھی اپناتا ہے۔“

”اول ہوں۔“ معید نے انگلی اٹھائی۔ ”چلو کچن میں۔ امی اونگھنے لگی ہیں۔ اور چچی جان بھی آئی ہوں گی۔ ان کے آنے سے پہلے ہی۔“

حمیرا نے کچھ بھی کہنے کا ارادہ بدل دیا۔ اس کے پیچھے کچن تک چلی آئی۔ اور جس کام کو بہت مشکل سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کی ہر ایسی میں منٹوں میں نبٹ گیا۔

”کیا فائدہ۔ امی کل مجھے پھر کسی کام میں پھنسا دیں گی۔ پورے گھر میں جھاڑو پھو اکر سکون نہ ملا تو اب چھت کی صفائی کا حکم بھی دے دیا ہے۔ ہفتے میں دوبار۔“ اسے نیا دکھ یاد آیا۔ ”کچھ ایسا کرو میں امی کو ہر وقت کام کرتی نظر آؤں۔“

”تو کام ہی کر لیا کرو۔“ معید نے مزے سے کہا۔
”تم سب لوگ آپس میں ملے ہوئے ہو معید۔!“
وہ منہ پھیر کر ناراض ہو گئی۔ چنگیر کے نیچے ڈائجسٹ

اوندھا ہڑا تھا اسے اٹھالیا۔

”تم کہانیاں لکھنے لگو۔“ معید نے کہا۔
”پڑھنے امی دیتی نہیں ہیں۔ لکھنے دیں گی۔“ اسے آئیڈیا بالکل نہیں بھلایا۔

”اویار۔۔۔ امیں کیا پتا چلے گا۔ انہیں تو تم بس پڑھتی لکھتی دکھائی دو گی۔“

”گڈ آئیڈیا۔ مگر کہانی کہاں سے لوں۔“

”یہ مسئلہ ہے۔“ معید سرچ میں پڑ گیا۔

”اپنی ہی لکھ لو۔“

”اپنی کہانی۔ میری بھلا کیا کہانی۔“ حمیرا نے ہونٹ پین سے کہا۔

”وہی۔۔۔ جو مجھے ابھی سنا رہی تھیں ایک بے بس یتیم لڑکی۔ اپنی تائی کے ظلم سہتے ہوئے۔“ معید نے کہنا شروع کیا۔ ساتھ ہی اس کی نظریں حمیرا کے بے یقین کھلتے منہ پر تھیں۔
”تایا کی بے اعتنائی۔“

”کیا؟“ یہ سراسر الزام تھا۔ جھوٹ تھا اور گناہ تھا ایسا سوچنا۔ حمیرا نے فوراً ”تو کتنا چاہا۔ پر معید نے ہاتھ اٹھالیا۔

”کہانی کے ہائی پوائنٹس دے رہا ہوں۔ چپ چاپ نوٹ کرو۔“

”بے چاری بچا کچھ کھاتی ہے اور سارے گھر کے کام بھی کرتی ہے۔“

”ہا میں کب۔۔۔“ ابھی دوپہر ہی میں تو جبویر گریڈی ابی نے کھلایا تھا اور گھر کے لیے شوارہ لے کر دیا تھا۔ 250 ایم ایل کی ایک کولڈ ڈرنک بھی چھپا کر رکھنے کی ہدایت کے ساتھ لے دی تھی (حمیرا کی امی کو اس کے موٹاپے کی بڑی فکر رہتی تھی۔ ان کا بس چلتا تو اس کا کھانا پینا بھی بند کر دیتیں)

سارے گھر کے کاموں کا ذمہ بھی امی ہی کی خواہش تھی۔

”بے چاری کے سارے کپڑے پھٹ چکے ہیں۔ پیوند لگا کر پہننا چاہتی ہے تو سوئی تک نہیں ہے۔“ معید نے نجانے کسے دیکھ رکھا تھا۔ حمیرا نے خود کو دیکھا۔ وہ

اس وقت لان کے ڈیرائنو سوٹ میں ملبوس تھی۔ جو بڑی امی نے خود خریدا تھا۔

”تایا کے بچے اسے مارتے ہیں اس کی چیزیں چھین کے بھاگ جاتے ہیں۔“ معید کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔

”کب؟“

”برتن بھانڈے دھونے سے اس کے ہاتھ لکڑی کے ہو چکے ہیں، ناخن ٹوٹے ہوئے بے چاری چھپ چھپ کے روئی ہے کیونکہ تایا کے بد تمیز بچے اور ظالم تائی اسے سب کے سامنے خود پر ہوئے مظالم ظاہر نہ کرنے دینا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ۔“

معید کے چہرے پر ہنسی چمکی۔ اسے کوئی اور جملہ سوچا تھا۔ مگر حیرا کا ضبط ختم ہو گیا۔

”معید کے بچے تم کتنے بڑے جھوٹے ہو۔ اتنی لمبی کہانی بن لی کھڑے کھڑے۔ اللہ نہ کرے جو میرے تایا ایسا کریں۔ وہ تو مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ وہ تو میری خاطر۔“

حیرا شروع ہو گئی۔

”تم دوسری کہانی لکھ سکتی ہو۔“ معید نے ہاتھ اٹھایا۔

”ایک تایا۔ جوانی یتیم بچتی کے لاڈ میں آکر اپنی بیوی بچوں سے زیادتی کرتے ہیں اور۔“

”ہاں۔“ حیرا نے کھلے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ”تم کتنے بڑے جھوٹے تمکار اور ڈرامے باز ہو معید۔ میں تایا ابا کو بتاتی ہوں۔ صبر کرو۔“

وہ کچن سے باہر بھاگی۔ معید کی ہنسی بھر پور تھی۔



امی نے دودھ میں کیا گھول کر لائی تھیں اور اسے پلانے پر مصرب۔ ابھی تو دسی گئی والی روٹیوں کے ساتھ دسی بھنے مرغ کا ذائقہ بھی لیوں سے چکا ہوا تھا اور اس سے یہ مزید ستم۔ وہ کچھ کتنا چاہتا تھا۔ مگر امی نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی چہرے کے تاثرات سخت کر رکھے تھے۔ ناراضی اور ابھن بھی نمایاں تھی۔

READING
Section

اس نے مدد طلب نگاہ سے ابو کو دیکھا وہی کوئی راہ بچائیں۔ مگر وہ اسے آنکھ بند کر کے پی لینے کا مشورہ دے کر باقاعدہ منہ پھیر کے بیٹھ گئے یہ اشارہ تھا وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ امی باپ بیٹے کے اشاروں کی زبان کے معنی بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ مگر دودھ کا گلاس والا ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے لائیے۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر دودھ پکڑ لیا مگر امی واپس جانے کے بجائے وہیں کھڑی تھیں۔

”ابھی پیو۔“ وہ قطعیت سے بولیں۔

”سوتے وقت پی لوں گا امی۔“ اس نے درخواست کی۔

”نہیں۔ سوتے وقت تو میں نے تمہیں دو چمچ پے باوا دینے ہوتے ہیں۔“

”امی۔“ اس کی آواز میں اس بار مدد کی پکار تھی۔ اور ابو تو پہلے ہی اجنبی بنے بیٹھے تھے۔ اوپر سے امی کے پتھریلے تاثرات۔ اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک سانس میں چڑھا گیا۔ امی کو آرام سے کہنے کی مہلت بھی نہیں دی۔

امی کا چہرہ مطمئن ہو گیا وہ کھڑا ہو گیا۔

”اب کہاں جا رہے ہو؟“ امی نے تیزی سے پوچھا۔

”ڈھنسنے۔“ اس کے منہ سے بمشکل نکلا، وجہ ڈکار تھی۔ وہ سخت بد مزہ ہو کر دروازے سے نکل گیا۔ پر امی پر اس ناراضی کا اثر نہیں ہوا، ان کا کام ہو گیا تھا ان کے تاثرات مطمئن سے زیادہ فاتحانہ تھے۔ گلاس اٹھا کر جانے لگیں۔ شوہر سے نظر ٹکرائی۔

”یہ زیادتی ہے۔“

”کوئی زیادتی نہیں ہے۔“ وہ ان کا اشارہ سمجھ گئیں۔ گلاس واپس رکھ دیا۔ کرسی تھپٹ کر بیٹھ گئیں۔ ”الحمد للہ بہت ریکور کر لیا۔ اب تو اسٹک بھی چھوٹ گئی ہے مگر جسم جان کیوں نہیں پکڑتا۔“ ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ انہیں مورد الزام ٹھہرائی ہوئی ہیں۔

”تم نے اسے پہلوان بنانا ہے؟“ انہوں نے

سرسری لہجہ اپنایا۔
 ”نہیں۔“ وہ چمکتیں ”بات پہلوان کی نہیں ہے۔
 یاد نہیں کیسا کسرتی جسم تھا، ہڈی ہلڈنگ کرتا تھا۔ یہ
 گوشت سے پر شانے۔ چوڑا سینہ، گالوں سے خون
 ٹپکتا تھا۔ یہ اونچا لہجہ شیر جوان۔ اور اب صرف لہجہ
 گیا ہے۔ اس کے اپنے کپڑے مانگے کے کپڑے لگتے
 ہیں جسم پر صرف کھال ہے جو ہڈیوں پر منڈھی لگتی
 ہے۔ کپڑے جھولتے ہیں جوڑے کا ساڑھ تک کم ہو گیا
 ہے۔ بیٹھ کر ہڈیاں گن لو بس۔“
 ”یہ سب مجھے بتا رہی ہو۔ کیا مجھے نظر نہیں آتا؟“
 انہوں نے سوال کیا۔

امی کی بولتی بند ہو گئی۔ ہاں وہ کے سارے تھیں۔
 ”ہاں وہ ایسا نہیں تھا۔ مگر یہ کیوں نہیں سوچتیں۔۔۔
 کہ وہ ہے ہم دونوں کے بیچ جیتا جاگتا۔ کیا یہ کافی
 نہیں ہے؟“ وہ انہیں کچھ یاد کروا رہے تھے۔
 وہ حادثے کی دوپہر۔ وہ زندگی کے ختم ہو جانے کا
 یقین۔۔۔ جیسے سینے سے سانسیں نکل جائیں۔ اس نے
 پینٹ شرٹ پہنی چھوڑ دی تھی۔ کتنا عجیب لگتا
 ہے۔“

”تو تم اب زور مت دینا۔“
 ”وہ بہت پتلا ہو گیا ہے۔“
 ”یہ سب باتیں میں جانتا ہوں ناہید۔“
 ”تو اسی لیے تو میں اس کی صحت پرانا چاہتی ہوں۔
 صحت بخش غذا کھائے گا تو جسم پر بونی چڑھے گی ناں۔“
 انہوں نے بھی اصل سبب بتانا ضروری سمجھا۔
 ”تو صحت بخش طریقے ہی سے کھلاؤ ناں۔“ وہ
 مسکرائے ”ایسے ٹھونسنے کا کیا طریقہ ہے۔“

رات بستر میں چھپ کر شوارا کھاتے اور کولڈ
 ڈرنک پیتے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ معید کی باتیں
 یاد آ رہی تھیں تو ہنسی بھی آ رہی تھی۔
 ”تو بس۔ کتنی آسانی سے اتنے سارے جھوٹ گھڑ
 لیے۔ وہ بھی دو مختلف نوعیت کے جھوٹ۔ اور کہتا
 ہے اس پر کہانی لکھ لوں۔ میں کوئی باگل ہوں جو اتنا
 سارا جھوٹ لکھ دوں۔ نرا گناہ مجھے لکھنا ہی ہو گا تو سچ

کیوں نہ لکھوں۔ ایک بالکل سچی سی سیدھی ساوی
 کہانی۔ کہتا ہے تیا تائی ظلم کرتے ہیں۔ بچی مجبور
 بے کس ہوں۔ اسے زور سے ہنسی آئی۔
 ”کس بات پر ہنسی آ رہی ہے حمیرا۔“ امی کی نیند
 میں ڈوبی آواز ابھری۔

حمیرا بری طرح چونکی ”ہنس تو نہیں رہی، میں
 کھانس رہی ہوں امی۔ آنکھوں۔۔۔ آنکھوں۔۔۔ ہوں۔“
 ”یا اللہ! امی نے دانت کچکچائے تھے۔“ جس لڑکی
 کو کھانسنے کی تمیز نہ ہو۔ اس سے اور کیا امید رکھی جا
 سکتی ہے اب اٹھ کر پانی پی لو۔“

”جی۔۔۔ جی پی رہی ہوں۔“ اس نے اسٹرا سے ایک
 لمبا گھونٹ کھینچا۔

”بستر میں لیٹے لیٹے کیسے پی لیا پانی۔“ امی کے نقطہ
 اعتراض میں کتنا دم تھا۔
 ”میرا مطلب ہے پینے لگی ہوں۔“

”ارے بستر پر جے جے۔ کیسے پینے لگی ہوں۔
 اب یہ خواہش ہوگی پانی بھی ماں ہی اٹھ کر دے
 دے۔“ امی اٹھنے لگی تھیں کیا۔

”ارے نہیں۔“ حمیرا اچھل کر بیٹھی۔ ”میں لے
 رہی ہوں امی آپ تکلیف نہ کریں۔“ اس سے پہلے
 کہ وہ اٹھ جائیں اور اس کے نزدیک آجائیں اور کوگ
 اور شوارا نظروں میں آجائے۔ لو خدا۔۔۔ ایسے برے
 وقت سے پہلے ہی اٹھ جانا بہتر تھا اور تھوڑی دیر پہلے ہی
 جب امی نماز کے بعد تسبیح لے کر پانی پر آئیں اور
 آنکھیں بند کر کے ورد کرنے لگیں تب یکدم انہوں
 نے ناک چڑھا کر جیسے کچھ محسوس کرنا شروع کر دیا۔

”کیا ہوا امی؟“ اس نے شوارا کے بڑے نوالے کو
 تیزی سے نگلا۔ ہونٹوں پر ہاتھ بھی پھیر لیا۔
 ”خوشبو سی آ رہی ہے۔“

”ہاں۔۔۔!“ حمیرا تکیے سے لپٹ سی گئی۔ مسحور ہو
 گئی ہو جیسے ”رات کی رانی کی ہے۔“
 ”یہ پھول پتیوں کی خوشبو نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے
 نان کی خوشبو ہے یا برگر یا پھر۔“
 ”وہ۔۔۔!“ اس نے فوراً حیرت کا اظہار کیا۔ نان یا

برگرمیں کہاں۔
 ”ہے بھئی۔“ اسی تسبیح چھوڑ کر کھڑی ہونے لگیں۔ ”دار چینی کی تیز اسمبلی ہے۔“
 ”اوہ امی! حیرانے اپنا تکیہ درست کیا۔ شوارا تو چھپ گیا تھا۔ بوتل کا کیا کرے۔ ڈھکن بھی نہ جانے کہاں چھپ گیا اور امی سر پر پہنچنے والی تھیں۔“
 ”مجھے لگتا ہے امی۔ یہ معیہ ہے۔ چھپ کر کچھ کھا رہا ہے۔“

”لو اسے بھلا چھپ کے کھانے کی کیا ضرورت۔۔۔“
 ”وہ بڑی امی کہتی ہیں نا۔ صحت مند غذا ایت بخش کھانے کھانے کو۔“

”اوہ۔! امی فوراً پرسکون ہو گئیں۔ واپس جگہ پر چلی گئیں۔ ان کی نگاہیں کھلی کھڑکی پر جم گئی تھیں۔“
 ”ماں سے چھپ کر کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔“
 امی اپنا تکیہ درست کر رہی تھیں۔
 ”جی یہ۔ تو آپ نے بالکل صحیح کہا۔“ حیرانے اپنے تکیے کے نیچے سے شوارا نکالا۔ ایک بڑا لقمہ کاٹا۔ ہم۔

”سوری معیہ۔! اس نے کروٹ بدلی۔ اب خطرہ ٹل گیا تھا۔“ میں نے تم پر سارا الزام دھروا کر تم فکر نہ کرو۔ امی نے کون سا ہماری شکایت بڑی امی سے لگا دینی ہے۔ امی ریے بھی کم بولتی ہیں۔ شکایت کا تو سوال ہی نہیں اور دوسرے اگر تھام بھی دیں گی تو بڑی امی کو تو پتا ہے نا۔ شوارا انہوں نے مجھے لے کر دیا تھا اور میں۔۔۔“ وہ ہنسی۔ ”میں کھانے کی چیز کسی کو کبھی نہیں دیتی اور یہ بھی سچ ہے کہ تمہارے اس گھر سے مجھے ہمیشہ ملا ہی ہے۔ دینے کی نوبت ہی نہیں آئی اور یہ بھی ہے کہ میرے پاس ہے ہی کیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ یہ چھت۔ یہ بستر۔ یہ زمین۔ یہ لباس۔ میرے چاروں طرف میری خود کی خریدی کوئی چیز نہیں ہے۔ سب تیا ابو کی خریدی ہوئی چیزیں۔ وہ چیزیں جو انہوں نے میرے لیے محبت سے لیں۔ ہاں صرف ایک میرا وجود ہے یہ جسم۔ اس پر ملکیت کا حق میرا ہے لیکن احسانات اور تشکر کا احساس ذہن و دل پر غالب ہوتا ہے۔

جسم بھی پر لیا ہو جاتا ہے مجھے لگتا ہے میں تم سب لوگوں کی محبت کی قرض دار ہوں۔ جسم کا رواں رواں قرض میں جکڑا ہوا ہے مگر یہ جکڑا تکلیف دہ نہیں ہے۔ بعض دفعہ ہم خود۔ خود کو پیش کر دیتے ہیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان محبتوں کا احسان اتار نہیں سکتی۔ مگر احسان اتارنا ضروری بھی نہیں۔ فقط احسان کا احساس بھی کافی ہوتا ہے۔ احساس انسان کے ضمیر کو زندہ رکھتا ہے اور ضمیر کی زندگی شاید جسم کی زندگی سے بھی زیادہ ضروری ہوتی ہے۔

میں حال میں جیتی ہوں۔ مستقبل کی اچھی امید کے ساتھ۔ مگر ہر شخص کا ایک ماضی بھی تو ہوتا ہے نا۔ اچھا یا برا۔

برا تو نہیں تھا بہت اچھا تھا۔ سب کچھ بہت اچھا تھا۔ وہ۔ امی۔ ابو۔ نکلون کے تین کونے۔ مگر ایک کونہ ٹوٹ گیا۔ زندگی کی شکل بگڑ گئی۔ کرائے کا گھر تھا۔ اسے پہلی بار پتا لگا۔ گھر میں رہنے کے پے بھی دینے ہوتے ہیں۔

”یہ تو ہمارا گھر ہے امی! تو یہ انکل کس بات کے پے مانگ رہے ہیں۔“ وہ کبھی ماں کا چہرہ دیکھتی تھی۔ کبھی مالک مکان کا۔ جو کہہ رہا تھا۔

”میں بھی غریب آدمی ہوں ماں۔ گھر کو آدھا کر کے پورشن اس لیے بنایا تھا کہ خرچ میں کچھ سہولت ہو۔ نیچے پڑھانے ہیں۔ آپ کو تو سب پتا ہے نا۔“

”مجھے کچھ دن کی مہلت دے دیجئے۔“ امی نے چہرہ آڑ میں کر رکھا تھا۔ نظریں زمین پر گڑھی تھیں۔

مالک مکان جو کل تک اس کے دوستوں کے ابو تھے۔ آج اسے کتنے برے لگنے لگے تھے۔ جن کے جانے کے بعد امی ساری رات روتی رہیں۔ پھر پتا نہیں امی نے کہاں سے انہیں کرایہ ادا کروایا۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلتے بنے۔

وہ گیارہ برس کی بچی تھی۔ نہ بہت چھوٹی نہ بہت بڑی۔

مگر عمر بھی ہر کسی پر اپنے انداز سے جھلکتی ہے۔
مزدور پیشہ غریب بچہ۔ گیارہ سال میں گیاہ
صدیاں جی لیتا ہے۔ مگر مدرسہ ہو جاتا ہے۔
جیسے جس دنیا کو میلی آنکھ سے دکھتا ہے اور بے رحمی کے
ڈنڈے سے کوٹتا ہے۔

وہ مزدور پیشہ بچہ نہیں تھی مگر اپنے مزدور باپ کی
رانی ضرور تھی۔ اکلوتی شہزادی۔ دنیا اس کے لیے
دھنک رنگ تھی۔ خوشیاں ابو کی مٹھی میں بند تھیں
اور اپنے کاندھے پر اسے سوار کروا کے وہ اسے ہمیشہ
بلندی اور بے فکری دکھاتے تھے۔ اسے کیا خبر کہ دنیا
باپ کی آنکھوں سے دیکھنے میں کتنی بھلی تھی اور اب
جب اپنی آنکھ کھول کر دیکھی تو کیسی بھدی۔

ابو کی ہائی ایس وین اب کوئی ڈرائیور چلانے لگا تھا۔
وہ روز شام کو پیسے دیتا مگر اتنے کم کیوں۔ اور یہ گاڑی
اچانک اتنا خرچا کیوں مانگنے لگی تھی۔ حالانکہ نئی گاڑی
لگوائی تھی ابونے۔

اور گاڑی کا اپنا بھی ایک حساب کتاب تھا۔ قسطیں
بھی بھرنی تھیں۔

اور ایڈوانس رقم جو گاڑی لینے کی مد میں قرض لی گئی
تھی۔ قرض خواہ دروازہ بجانے لگے تھے۔ دو افراد کے
اتنے خرچے یقیناً نہیں تھے مگر گاڑی اتنا کہا نہیں رہی
تھی، جتنا کھا رہی تھی۔ امی کو ڈرائیوروں کی چالوں کا
بخوبی علم تھا مگر اس چال کا علم نہیں تھا۔ جس سے ہم
پلٹی جاسکتی۔ بساط سمیٹی جاسکتی۔ یہاں تو زندگی سمٹ
رہی تھی۔ خواہشیں، خواب کو دور چھوڑ کر بات
ضرورت تک محدود ہو گئی تھی اور ضرورتیں کتنی بھی
کم کر لی جائیں۔ پیٹ رولی اور جسم کپڑا مانگتا ہے۔
”اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاؤ صفیہ!“ مالک
مکان کی بیوی ہمدرد تھی۔ امی زخمی ہوتی ہی نہیں دیں۔
”آپ بھی اچھا مذاق کرتی ہیں بھابھی!“

”مذاق کیوں۔ میں بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہی
ہوں۔ عبدالجید کے مرنے پر وہ آئے تھے دیکھا تھا میں
نے انہیں۔ سب بہت سلجھے ہوئے لوگ تھے۔

تمہاری امی منہ سے تو کچھ نہ بولیں مگر منہ پر دوپٹا رکھ کر
مسلل روتی رہی تھیں۔“

”وہ میری بیوی پر نہیں روتی تھیں۔“ صفیہ کی
نگاہوں میں کٹ تھی۔ ”اس بات کا رونا آ رہا ہو گا۔
زندگی میں کبھی دوبارہ مجھے نہ دیکھنے کا جو عہد کیا تھا وہ
ٹوٹ گیا۔ نجانے کس دل سے آئی تھیں۔“

”ماں میں زیادہ دیر خفا نہیں رہتیں۔ اکیلی عورت ہو،
بچی کا ساتھ ہے۔ آج تمہاری جوانی مشکل مرحلہ ہے۔
کل کو بیٹی نے تمہارے قدم سے اونچا ہو جانا ہے۔ پھر کیا
رکھو گی تن تنہا۔“ وہ صفیہ کو حقیقت سے آنکھیں
چماتے دیکھ کر رہ نہ سکی تھی۔

”آپ کو کرایہ ٹائم پر مل رہا ہے ناں بھابھی! آپ
میری فکر میں مت کھلیں۔“

”بدگمان ہونا ابھی سیکھا ہے یا پرانی عادت ہے۔“ وہ
مسکرا دی۔ صفیہ نے جواب نہ دیا، وہ کیا کہہ کر ماں کا درد
کھٹکتا تھا، ان کا منہ ہی بچی کے ساتھ تھا، وہ دنیا کو نظر آ
رہا تھا۔ آگے والا وقت۔ وقت نہیں خطرہ۔

ان کی ماں کو خیال نہ آتا ہو گا۔ وہ جس شخص کے
ساتھ زندگی بھر کا ساتھ جانے لگی تھیں۔ اس سفر کے
آغاز ہی میں قضا نے جکڑ لیا۔

جب ماں کو کوئی ہول نہیں اٹھا۔ تو وہ کیسے درد
جگاتیں۔

”تمہارے سسرال میں بھی تو ایک جیٹھ ہیں ناں بھابھی
مالک مکان کی بیوی کو صبح و شام اس کی فکر رہتی
تھی۔ وہ واقعی درد مندی سے سوچا کرتی تھی۔“

”سات سال سے آپ کی کرایہ دار ہوں بھابھی۔
سب آئے گئے سے آپ واقف ہی ہیں۔ کسی کو آیا گیا
وہ دیکھا کیا؟“ صفیہ کے لہجے میں تعفر کھل گیا۔

”تم نے انہیں اطلاع کی تھی؟“
”اطلاع کیسے کرتی۔ ایک نمبر تھا اسے ملایا تھا کئی
بار۔ مگر وہ نمبر بند تھا۔“

”صفیہ! ان کا حق تھا کہ انہیں خبر ہو جاتی کہ پیارا
بھائی دنیا سے چلا گیا۔“

”اس سے کیا ہوتا؟“ صفیہ کے انداز میں ہٹ

دھری تھی۔

”تمہارے پاس کوئی ایڈریس وغیرہ نہیں ہے؟“
مالک مکان کی بیوی ہر پہلو سے سوچ رہی تھی۔
”مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں ہے۔“ صفیہ نے
بے زاری سے کہا۔

”جو بھی۔۔۔ جیسا بھی یاد ہے۔ مجھے لکھوادو“ میں
تمہارے بھائی سے کہہ کر پتا کرواتی ہوں۔“
صفیہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر مالک مکان کی بیوی
ٹھان چکی تھی۔ اسے آدھی اودھوری داستان ماضی کی
خبر تھی۔ صفیہ اور مجید۔۔۔

مجید اپنے بھائی عبدالعزیز کی نسبت تعلیم سے بھاگا
ہوا تھا۔ اسے گاڑیوں، جیپوں سے دلچسپی تھی۔ وہ ریس
میں حصہ لے گاڑیاں بھگائے مگر یہ امیروں کے شوق
تھے۔ علی شیخ جب چولستان شکار کے لیے آتے تو وہ
گاڑی کو ریتلے ٹیلوں پر بھگائے پھر تباہا ہر ڈرائیور تھا۔
مگر اپنی فور وہیل خریدنے کا خواب اودھورا رہ گیا۔
ریتلے ٹیلے سے جیب الٹ گئی۔ جیب کا کچھ بھی نہ
بگڑا۔ مگر عبدالعزیز کے بائیں ہاتھ میں گیس کوئی کسر رہ
گئی۔ جو صرف اسے ہی محسوس ہوتی تھی۔
اب وہ شیخوں کے ہمراہ شکار پر جانے کا اہل نہیں رہا
تھا۔

اس نے کچھ عرصہ حالت سوگ میں رہنے کے بعد
بس اڈے پر جا کر دوست کی ہائی ایس وین ایک شہر سے
دوسرے شہر چلانا شروع کر دی۔

مگر کہاں وہ اونچے نیچے خطرناک ٹیلوں والے
راستے۔ اور کہاں سیاہ تار کول کی سیدھی سڑک۔۔۔
ملتان سے بھاول پور۔ بھاول پور سے ملتان۔

اتنی سیدھی لکیر جیسی زندگی۔۔۔ عبدالعزیز جو شیلا
تھا۔ چیلنجز کا سامنا کرنے والا۔ اور۔۔۔ اور صفیہ
چیلنج ہی بن گئی۔

وہ وین کی مسافر تھی۔ بیک و پور سے دکھائی دیتی
اور سائیڈ مرر سے بھی پھر ایک وقت ایسا آیا۔ مرر کے
بغیر بھی ہر جگہ نظر آنے لگی۔
مالی کے گلاس میں عکس جھلکنے لگا۔

اور دل ہاتھوں میں آکر دھڑک اٹھا۔ اس کے لیے
گاڑی چلانا مشکل ہو گیا وہ خیالوں میں بسنے لگی
تھی۔ اس لیے بے دھیانی کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔
سامنے لا کر بٹھائی جاتی تو اتفاقہ ہو سکتا تھا۔ عبدالعزیز
بھائی عبدالعزیز کے سامنے پہنچ گیا۔

”شادی تو بہت اچھی بات ہے۔“ وہ خوش ہو گئے
”مگر کس سے؟“

مجید نے جھٹ نام لے دیا۔ تفصیل بھی گوش گزار
کر دی۔ عبدالعزیز خوشی خوشی رشتہ لے کر پہنچ گئے مگر
اودھ سے صاف انکار۔

انکار کوئی جرم نہیں تھا مگر بے عزت کیوں کیا گیا۔
ایک بڑھا لکھا خاندان ایک ڈرائیور کو رشتہ کیسے دے
سکتا تھا، جبکہ ان کے بانی داماد اور بیٹے باہو والی نوکری
کرتے تھے۔ انہیں عبدالعزیز بہت اچھے لگے۔ بھائی
عبدالعزیز پسند نہیں آیا۔

عبدالعزیز نے ساری صورت حال کو جمل سے دیکھا
اور جانچا۔ لڑکی کے والدین غلط نہیں کہہ رہے تھے۔
انہیں وہ سب لوگ اچھے لگے تھے۔ سلجھے ہوئے
تمیز دار، اسکول کالج کے بڑھے ہوئے مگر اس کا کیا
کہ جیسے کہ اس خاندان کی بیٹی نے ”عشق اسکول“
کا مینڈل گلے میں ڈال لیا تھا۔ اس نے اتنی محنت
سے ڈگری حاصل کی اور کوئی اسے ماننے کو تیار نہیں۔
اس کی ڈگری کوئی جعلی تھوڑی تھی کہ تسلیم نہ کی
جانی۔



عبدالعزیز نے شدید حیرت سے سینہ تان کے
کھڑے عبدالعزیز کو دیکھا اور اس کے عقب سے ذرا
سادکھائی دیتی صفیہ۔

عبدالعزیز نے صرف فلموں، اخباروں میں لڑکی
بھگا کر لے آیا، جیسے جیلے سے پڑھے تھے۔ یوں اپنے
سامنے دیکھا کبھی نہیں تھا۔

”ہیں تمہیں انڈر آنے کی اجازت نہیں دے
سکتا۔“ عبدالعزیز کو صفیہ کے والدین یاد آرہے تھے

سارا گھرانہ۔ کیا بتی ہوگی بیٹی کے اس قدم سے اس خاندان پر اور بیٹی کو اتنی اہمیت دینے والا کون تھا۔ ان کا اپنا بھائی عبد المجید۔

عبد العزیز ابھی چار روز پہلے ہی تو بیٹی کے باپ بنے تھے۔ دل گداز تھا اور بیٹی کا باپ ہونا کیسی ذمہ داری ہے اس کا احساس بھی نیا نیا تھا۔

اگر کل کو سمیرا عبد العزیز بھی ایسا قدم اٹھا لیتی۔ عبد العزیز نے آج ہی تو بیٹی کا نام رکھا تھا۔ فقط سوچ کر ہی جھرجھری آگئی۔ صغیہ کے لیے دل میں نفرت ابھری اور عبد المجید کے لیے شدید نفرت اور غصہ۔

”اس گھر پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا۔“ عبد المجید نے کہا۔

”تھک ہے۔“ عبد العزیز کا لہجہ تحمل کی حد کو چھوتا تھا۔ ”میں گھر سے نکل جاتا ہوں تم رہو۔“ عبد المجید بھونچکا رہ گیا۔ اس کے پاس اور جملے رہے ہی نہیں۔



صغیہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ گاڑی سے ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ڈرائیور فرار اور گاڑی تھانے کے اندر۔ روز شام کو طے والے تھوڑے بہت لمبے کب سے بند تھے۔ مکان کا کرایہ۔ اسکول کی فیس۔ بلنہ یہ تو ادا کرنے ہی تھے۔

پچھلے مہینے وین ورکشاپ بھی گئی تھی۔ صغیہ بل ادا نہیں کر سکی تھی۔ وہ رقم بھی ڈبل ہو چکی تھی اور مالک مکان کی مجبوریاں بھی بالکل جائز تھیں۔ اس نے اللہ نام کو گھر کرائے پر نہیں دیا تھا۔

آمدنی کا ذریعہ گاڑی تھی۔ قرض خواہ جب دل کرتا دروازہ بجا دیتے تھے۔ گاڑی بیچ کر قرضہ اتار دوں۔ باقی مہینے سے خرچ چلاؤں مگر ایسے وہ کب تک پیسہ کھا سکے گی۔

حمیرا لاڈوں پلی بچی تھی مگر باپ کی موت نے اسے ایک دم بڑا کر دیا تھا۔ ماں اسے لاکھ نہ بتائے۔ اسے سب نظر آنے لگا تھا۔ وہ سوچنے لگی تھی اس کی شوخی

سجیدگی میں ڈھلنے لگی تھی۔ اس کا بچپن ختم ہو رہا تھا۔ ”بھائی صاحب سے کہیں کسی طرح گاڑی چھڑوا دیں بس۔“ صغیہ کا واحد حل گاڑی تھا۔

”وہ لگے ہوئے ہیں گوشوں میں۔ مگر۔“ مالک مکان کی بیوی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ”بہت مشکل کام ہے۔ پیسہ لگاناڑے گا اور وہ بے نہیں۔“

صغیہ کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ کیا کرے۔ بھائی کو فون کر کے دیکھ لیا تھا۔ وہاں سے وہی جواب ملے جو اسے پہلے سے معلوم تھے۔

”کل ہی کی تو بات تھی۔ جب تم اپنی محبت کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ڈال کر چلتی بنی تھیں۔ ہم آج تک دوبارہ کھڑے نہیں ہو سکے۔ لولی لنگڑی زندگی گزارتے ہیں صغیہ! تمہیں سارا کیا دیں گے۔“

”مجھ سے افسانوں والی باتیں نہ کریں بھائی جان۔ میرا بھی حق ہے اس گھر پر۔“ صغیہ نے تنک کر دیا دلایا تھا۔ بھائی زہر خند ہو گیا۔

”جو فرض ادا نہ کرے اسے حق کا سوال نہیں کرتا چاہے صغیہ۔ ہماری عزت سنبھال کر رکھنا تمہارا فرض تھا۔ ہم تمہارا برا نہیں چاہتے تھے۔“

بھائی نے فون رکھا۔ پھر بند بھی کر دیا۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ روئے کی دھوئے گی تو بھائی کہے گا۔ ”میں آ رہا ہوں لینے“ مگر یہ کیا۔ وہ سناٹے کی کیفیت میں گھر گئی۔

اور پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ معاشی مسائل کھلے زخم کی طرح تھے بڑھتے گئے۔ بگڑتے گئے۔ یہاں تک کہ کھانے کے لالے پڑ گئے۔ مالک مکان کی بیوی بھی آگئی۔

”تمہارے بھائی کہتے ہیں، ہمیں اچھے کرائے دار مل رہے ہیں۔“ (یعنی تم اپنا بندوبست کر لو۔)

”میں کہاں جاؤں گی بھابھی۔“ بہت دنوں سے چھتھی لکڑی ٹوٹ گئی۔ وہ بے دم ہو گئی۔ حمیرا کو خود سے لپٹا کر روتی چلی گئی۔

”والدین کا دل توڑنے والوں کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔“ اس کے باپ نے کہا تھا۔ تب اس نے سوچا۔

”کیسا ظالم باپ ہے، نکلتے نکلتے بددعا دے رہا ہے۔“
 باپ نے بددعا نہیں دی تھی۔ بس بتایا تھا۔
 ”مکمل نے اس ہفتے میں گھر خالی کرنے کا کہا ہے
 امی۔“

”ہوں۔“

”ہمارا کیا ہوگا۔ ہم تو۔“ حمیرا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔
 دروازہ بچ رہا تھا۔ صغیہ نے سہم کر صورت دیکھی۔
 قرض خواہ ہوں گے۔ وہ جن کا لوجہ بھی بدل گیا تھا اور نظریں بھی۔

”دیکھو۔ کون ہے۔“ حمیرا ناچاہتے ہوئے اٹھی۔
 ابو کے کچھ دوست اب عجیب طرح سے دیکھتے تھے۔
 بارہ برس کی بچی کو دنیا اپنا نیارنگ دکھا رہی تھی۔ اس نے ناچاہتے ہوئے دروازہ کھولا اور خود پیچھے ہی رہی۔
 ”عبدالعجیب۔ عبدالعجیب کا گھر ہی ہے؟“ کرز شہزادہ کچھ جالی پچالی سی آواز۔ بھلا کس کی؟ وہ بری طرح خوش تھی۔

”یہ عبدالعجیب ڈرائیور کا گھر ہے۔ اب کی بار آواز میں بے تالی کا عنصر زیادہ تھا۔
 ”یہ آواز۔“ حمیرا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔
 ”یہ تو۔“

اس نے دھاڑ سے دونوں پٹ کھول دیے۔ ”ہاں۔ ابو! اس کی چیخ نکل گئی۔ سامنے ابو کھڑے تھے۔ ہل وہ ابو ہی تھے۔

اور ہاں وہ انہیں چھ ماہ بعد دیکھ رہی تھی۔ تو وہ تھوڑا بدل گئے تھے۔ بس تھوڑا سا۔ انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ سامنے سے بال کچھ کم اور سفید زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ تھوڑے بدل گئے تھے مگر وہ اسی کے ابو تھے۔

”ایسے ہی لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ کہ مرنے کے بعد کوئی واپس نہیں آتا۔“ اس نے ایک چیخ ماری۔
 ”امی۔ امی۔ دیکھیں ابو آگئے۔“

وہ ابو سے لپٹ گئی۔ اوہ اللہ۔ وہی بھینی بھینی سی خوشبو۔ وہی چوڑا سینہ۔

”ہو! ابو! اس کی چیخوں سے صغیہ باہر آگئی۔ کیا

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال لاکھاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور ہلکا کرتا ہے
- مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے
- کامیاب ہے
- ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 212 سی سی بکسوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا ہر بوتلی مقدار میں جاتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدنا جا سکتا ہے ایک بوتل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے دوسرے شہروں میں اسے آڈر بھیج کر دفتر پارسل سے منگوا لیں اور معزنی سے منگوانے والے مٹی آڈر اس حساب سے بھجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آرڈر بھجئے کے لئے ہمارا پتہ:

پوٹی بکس، 53- اورنگز سہارکٹ، بیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
 دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں
 پوٹی بکس، 53- اورنگز سہارکٹ، بیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
 فون نمبر: 32735021

حمیرا کا دل غلط گیا تھا نہ جانے کس کو۔
 ”اوپ“ صفیہ کے قدم ٹھم گئے۔ سامنے کھڑا
 شخص۔۔۔ ہاں وہ ہو، وہ عبد الجبید تھا مگر۔۔۔ وہ صفیہ کا شوہر
 عبد الجبید نہیں تھا۔ پر وہ حمیرا کا باپ ضرور تھا۔ تپا
 عبد العزیز نے کسی کے بھی بتائے بنا حمیرا کو خود میں بھیج
 لیا۔ اس کے حیران، بھیگی پلکوں والے چہرے کو ہاتھوں
 میں اٹھا کر چوم لیا۔

”یہ تمہارے ابو نہیں ہیں حمیرا۔ یہ تمہارے تپا
 ہیں۔“ صفیہ کی آنکھوں سے سرد مری جھلکتی تھی۔
 دونوں نے ایک دوسرے کو بس ایک ہی بار دیکھا تھا۔
 اس رات جب وہ اور عبد الجبید پہلی بار گئے تھے اور لوٹا
 دیے گئے تھے۔

”نہیں۔ یہ میرے ابو ہی ہیں۔“ حیرت سے ماں
 کے جملے کو سننے کے بعد حمیرا ذرا دور ہوئی تھی۔ اس
 نے خور سے دیکھا۔ عبد العزیز دور نزدیک دونوں
 صورتوں میں عبد الجبید ہی دکھائی دیتے تھے۔ پر ای کیا
 کہہ رہی تھی۔

”میں نے فون کیا تھا۔۔۔ آپ کا نمبر بند تھا۔“
 ”میرا موبائل کھو گیا تھا۔ تم مجھے پیغام بھجوا
 دیتیں۔ میرا بھائی کیسی کمپرسی میں۔“ عبد العزیز کی
 آواز گھٹ گئی۔ صفیہ بے تاثر چہرے لیے کھڑی رہی۔
 ”تمہیں گھر آنا چاہیے تھا۔“
 ”وہ گھر جس کے دروازے کبھی آپ نے کھولے
 ہی نہیں۔“

”میں غصہ میں تھا۔“ عبد العزیز کو صفیہ کا نام تک
 بھی معلوم نہ تھا۔
 ”آپ کو کیا لگتا ہے، غصہ صرف آپ کو آتا ہے۔“
 ”میں تو سوچتا تھا وہ خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے
 تو۔“

”ہاں خوش ہی تھا۔ ہم تینوں خوش تو تھے۔“ صفیہ
 کرسی پر ٹک گئی۔

”مجھے ملا تھا ایک دو بار۔ میں نے سوچا میں بڑا
 ہوں اسے میرے پاس آنا چاہیے۔“

”اور وہ یہ شکوہ کرتا رہا کہ بھائی نے مجھے بلایا تک

نہیں۔“ صفیہ کا لہجہ کٹ دار تھا۔
 حمیرا کو یہ گفتگو نہ لہجے سب برے لگ رہے تھے۔
 وہ ماں کو روکنا چاہتی تھی۔
 ”میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“
 ”کہاں۔؟“ صفیہ بری طرح چونکی۔
 ”گھر لے جانے کے لیے۔“
 ”گھر۔ کون سا گھر۔؟“

”میرا گھر۔ ہمارا گھر۔ میری بیٹی کا اصل گھر تو وہ
 ہے نا۔“ انہوں نے حمیرا کے شانے پر ہانڈ پھیلا
 دیے۔

”نہیں۔ ہم کہیں نہیں جا رہے۔ ہم اپنے گھر
 میں خوش ہیں اور ایک دوسرے کے لیے کافی ہیں۔“
 عبد العزیز کی نگاہیں چاروں جانب بھٹکنے لگیں۔ اچھا
 خوب صورت مکان تھا۔

ہاں وہ اپنا گھر کیوں چھوڑ کر جائے مگر وہ بھائی کی
 بیوہ اور بیٹی کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ دو الگ شہروں کا
 فاصلہ ہے بیچ میں۔

”اسی غلط کہہ رہی ہیں یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔
 کرائے کا گھر ہے اور اس ہفتے خالی کرنے کا نوٹس ملا
 ہے اور ابو کی گاڑی تھانے میں بڑی ہے اور ابو پر بہت
 زیادہ قرضہ بھی تھا۔ سب لوگ مانتے آجاتے ہیں
 او۔“

حمیرا نے چند جملوں میں سب کہہ دیا۔ صفیہ کو
 روکنے کا موقع تک نہ ملا۔

”پنا سامان باندھ لو۔ ہم اپنے گھر جائیں گے۔“
 عبد العزیز نے اپنی واسکٹ اتار دی۔ حمیرا نے
 جھٹ پکڑ کر کھونٹی سے ٹانگ دی۔ وہ صحن میں پھٹی
 تنگی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ حمیرا بھاگ کر تکیہ اٹھا
 لائی۔ چادر بھی بچھانا چاہتی تھی۔ انہوں نے ہاتھ کے
 اشارے سے منع کر دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے
 بٹھالیا۔

”کون سی جماعت میں پڑھتی ہو؟“ رونے سے ان
 کی آواز بھاری ہو چکی تھی۔ وہ تو اپنے کسی کام سے اس
 شہر میں آئے تھے۔ بس اڑے پر اترے تو شکل کی شدید

مشابہت کی بنا پر کسی نے عبد المجید کہہ کر آواز دی۔
عبد العزیز نے بس مڑ کر یہ کہا ”وہ عبد المجید نہیں
عبد العزیز ہیں۔ عبد المجید ان کا چھوٹا بھائی ہے۔“
تب بیکارنے والے نے بتایا ”جیسے نہیں۔
تھا۔“ آگے کی کہانی تو فضول تھی۔ اصل بات یہ تھی
اکلوتے بھائی نے ہے سے تھا کاسٹرز بھی طے کر لیا اور وہ
بے خبر۔

سر پر خاک ڈالتے یہاں تک آئے تھے آدمی
کہانی بس اڑے پر پتا لگی تھی ”آدمی یہاں۔“
”جھا بھلا بیٹھا تھا سب کے پیچ۔ چائے پی بس
ایک دم کہنے لگا ”دل گھبرا رہا ہے پانی پلایا پٹکھا جھلا کر
وہ تو جی آنکھیں بند ختم ہو گیا۔“

عبد العزیز کا دھیان حیران سے ہٹ گیا۔ ناراضی کو
انتہا نہیں بردھنا چاہیے کہ ناراضی برقرار رہے اور زندگی
ختم ہو جائے۔ ناراضی زندگی کا ایک رویہ ہو سکتی ہے مگر
زندگی تو نہیں۔ ناراضی، نفرت، لاتعلقی، محبت، فکر،
توجہ لوگ نفرت کو قبر تک بھاتے ہیں۔ جبرنی لاشوں کو
نکل کر سڑکوں پر روندتے ہیں مگر کچھ لوگ محبت کو
مرنے کے بعد بھی بٹھا رہے ہیں۔ تلخ محل بنا دیتے
ہیں یادگار۔ نفرت کو بھانے والا ایک نہ ایک دن
پچھتا تا ہے۔ محبت کو بھانے والے محبت کو پوجتے
والے کبھی نہیں پچھتاتے اور دوسرے غلطیاں
سدھارنے میں کتنا بھی وقت گزر جائے۔ دیر بھی
نہیں ہوتی۔

عبد العزیز نے چھتی نگاہ سے خود کو مسلسل دیکھتی
صفیہ کو دیکھا تو ہاتھ کی گھڑی کی طرف اشارہ کر کے دیر
ہو جانے کا خدشہ پایا۔

”تیار کر دو چھوٹی بھابھی! گھر جانا ہے۔“
”مگر میں کیسے۔؟ وہ گھر تو آپ کا ہے۔ عبد المجید
نے تو اپنا۔“ عبد العزیز نے گھبرا کر ہاتھ اٹھا دیا۔ وہ
نہیں چاہتے تھے صفیہ اپنا جملہ پورا کرے
”وہ گھر ہمارا ہے حیرانیٹی کا اصل گھر وہی ہے۔“



”راتوں کو چھپ کر پینے والے دن کو یوں ہی پکڑے

جاتے ہیں۔“ معید نے اختیار چہرے کے سامنے
پھیلاتے ہوئے جیسے کسی خبر پر بھروسہ کیا تھا مگر حیران کے
آگ لگ گئی۔

”تم مجھے شرابی کہہ رہے ہو۔ تمہیں شرم نہیں
آتی۔ اپنے گھر کی لڑکی کے بارے میں ایسی بات کہتے
ہوئے تمہیں ذرا لحاظ نہ آیا معید۔ تمہارا ذرا دل نہ
کلپا۔“

”اور تمہیں اپنی بوڑھی ماں کو دھوکا دیتے ہوئے ذرا
لاج نہ آتی۔ ذرا دل نہ کلپا۔“ معید نے اخبار زور سے
بند کیا۔

”میں صرف کولڈ ڈرنک پی رہی تھی۔“ حیران نے
ایک ایک لفظ کو چبایا۔

”چھپ کر گیا جانے والا کلام جرم ہوتا ہے۔“
معید کا جواب ترنت آیا۔

”یہ کس کا قول ہے؟“ حیران نے ابرو سیٹھے۔
”ظاہر ہے۔ ایسے سہرے الفاظ میں ہی کہوں گا،
یہاں اور کون اس قائل ہے۔“

”سہرا تو پتیل بھی ہوتا ہے۔“ حیران نے اسے
چڑایا۔

”ہم تو جس حال میں ہیں خوش ہیں اور شکر ہے
سونا نہ ہوئے۔ تم جیسی ناک کلن میں لٹکا کر گھومتی۔“
”میں اور تمہیں۔“ حیران نے جیسے شدید حیرانی اور
تاسف سے شہادت کی انگلی اپنے سینے پر رکھ کر تصدیق
چاہی۔

”جیسی زندگی میں چار پیسے آگے تو میں تو جھانچر
بھی سونے کی بناؤں گی۔“ اسے فوراً اپنی پرانی
خواہش یاد آگئی۔

”دیکھا! اسی لیے میں نے کہا۔ شکر ہے ہم سونا نہ
ہوئے۔ ورنہ تم تو پھولوں میں رول دیتیں۔“ معید نے
کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے تمہاری اتنی خود شناسی پسند
آتی معید عبد العزیز ورنہ سجانے والیاں تو ٹیکا جھومر
بنا کر اتنے پر بھی سجاتی ہیں مگر افسوس۔“

وہ جیسے تاسف میں گھرنی۔ معید کچھ نہ بولا۔

مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

”اب بولتے کیوں نہیں۔“

”کیا بولوں۔؟“ معینہ نے اخبار دوبارہ کھول لیا۔
”خود شناسی تکلیف سے بچا جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں
حمیرا رنگ آنر چکا ہے۔ کوئی مجھ سے کاجھومر بیٹھا کر
نہیں سجائے گا۔ اور ماتھائی کیوں۔ میرے اندر تو اتنی
چمک بھی باقی نہیں رہی کہ کوئی جوتی کا پھول بنا لے۔
جانے دو حمیرا عبد الجبید مجھے ہسپتال ہی رہنے دو۔“
ایسے رلا دینے والے جملے اس نے مسکرا کر کہے
تھے۔ حمیرا کا سانس اٹک گیا۔ وہ اسے گھور رہی تھی اور
آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔

”دیکھا۔“ اس نے اس کے کندھے پر اخبار کا
رول مارا۔ ”گردیا نا تمہیں لا جواب۔“ آنسو چھلک نہ
جائیں۔ اس ڈر سے اس نے پلکوں کے چھپکنے کو
قصداً روک رکھا تھا۔

”لا جواب کے بچے۔ میں تلیا ابو کو بتاتی ہوں جا کر
تم گندی باتیں کر رہے ہو۔ بلکہ بڑی امی سے بھی تمہارا
علاج کرواؤں گی۔“ حمیرا کی نگاہیں بچن سے آتی بڑی
امی پر پڑیں۔

”شکایتی ٹٹو۔ پہلے اپنا بندوبست کرو۔ تمہاری امی
کے قدم برآمدے میں پڑھی چکے ہیں اور ان کا پر پڑھتا
قدم تمہاری شامت لا رہا ہے۔“

”ہائے۔“ حمیرا کو سب بھول بھال کر اپنی فکر
پڑی۔ ”وہ انو۔“ ان کے ہاتھ میں کوک کی وہی خالی
بوٹل تھی جو رات وہ بستر میں چھپ کر شواریا کے ساتھ
پی رہی تھی۔ چہرے کی بے پناہ سنجیدگی ان کے غصے کا
مظہر تھی۔

حمیرا اور معینہ کے درمیان پلاسٹک ٹیبل پڑی
تھی۔ اسی پر بوٹل رکھ دی۔ بچے ہوئے شواریا کے
آخری قسم۔ (یہ بھی نہ جانے کیسے بچ گیا تھا۔ منہ
میں جانے سے۔)

حمیرا کی نگاہیں امی کے چہرے پر تھیں۔ کیسی
لا تعلقی سی تھی۔ دل میں طوفان۔ جوار بھالنے
”کھانے سے پہلے چیزیں چھپا کر رکھی تھیں تو انہیں

ٹھکانے لگانے میں بھی تو احتیاط لازم تھی مگر رات وہ
خیالوں میں ماضی کے سفر پر نکل گئی۔ آنکھ نہ جانے
کب لگی۔ رات یادوں کی بارات میں اشکوں کے
پھول سجے تھے۔ اس کی آنکھیں کچھ سوچی سوچی
تھیں۔ چغتل خوری کرتی سی۔ وہ آنکھ کھلتے ہی اس چیز
کو محسوس کر کے سر پٹ غسل خانے کی جانب بھاگی
تھی۔ کوئی روٹی آنکھوں پر سوال نہ کر دے۔ ٹھنڈے
پانی کے چھپاؤں نے بچت کر دی مگر آہ۔ جب وہ
تولیے سے منہ پونچھتی باہر نکلی۔ صفیہ اس کے بیڈ کی
دائیں جانب کھڑی تھیں اور زمین پر بے یقینی سے دیکھ
رہی تھیں۔

ماں کے تاثرات اتنے عجیب سے تھے کہ حمیرا
جھٹ ان کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ حمیرا نے ماں کو
دیکھا۔ ماں نے حمیرا کو۔ اور وہ نظریں کیا نظریں
تھیں۔ سانوچراغوں میں روشنی نہ رہی۔

زمین پر کوک کی بوٹل اونڈھی بڑی تھی اور ایک
براؤن سی ٹیکسٹ میں مغللوں جم سا گیا تھا۔ شواریا کی تھیلی
بھی تھی۔

”بھاگ حمیرا۔“ اس کے اندر کا وارننگ الارم
درست بجائے سر پر ہورکھ کر بھاگی۔ تو برآمدے میں
آکر پناہ لی۔

”معینہ راتوں کو چھپ کر برگر شواریا کھاتا
ہے؟“ صفیہ نے خلیسی نظر ڈالی۔ معینہ بری طرح
چونکا۔

”ہیں۔“ اس نے بے ساختہ تصدیق چاہی۔
”چھا الزام مجھ پر لگایا تھا۔“ اس کی گردن حمیرا کی سمت
گھومی۔ حمیرا نے بے ساختہ سر نگی میں ہلایا۔ پھر نظر
صفیہ پر پڑ گئی۔ گردن اثبات میں تھی۔

صفیہ کے ضبط کا خاتمہ ہوا۔ وہ شروع ہو گئیں۔
”کام کالج کوئی کرنا ہے نہیں۔ پہلے چلو کتابیں
کھول کر پڑھنے کا ڈراما چل جاتا تھا۔ وہ چھپی پرچے ختم
ہو گئے تو کتابیں اٹھا کر طاق میں رکھ دیں۔“

”ڈراما۔ طاق۔ یعنی اس کا پڑھنا ڈراما لگتا تھا امی
کو۔ نہیں نہیں نہیں۔“

اس کے چہرے سے حل دل عیاں تھا۔ اوپر سے یہ معید اس کی بے عزتی کس قدر محو ہو کر عزت سے سن رہا تھا۔ جیسے امی خطبہ دے رہی ہوں۔ لیکن عورتیں خطبہ تو نہیں دے سکتیں۔ یاد دے سکتی ہیں۔ پتا کرنا پڑے گا۔

اس نے ایک بار پھر معید کو دیکھا۔ دونوں بازو سینے کے گرد لپیٹے وہ کتنا مودب لگ رہا تھا۔ صفیہ کے ہر ہر لفظ سے اتفاق کرتا ہوا۔ حمیرا نے قصداً نگاہیں ادھر ادھر گھمائیں۔ اوہو۔ کھلی گھڑکی سے سمیرا دکھائی دے رہی تھی۔ حمیرا نے وال کلاک دیکھا۔ ہاں اس کا اسکول جانے کا ٹائم ہو چکا تھا۔ ابھی یہ باہر آئے گی اور امی کلابہ مزید اوپر چڑھ جائے گا۔

”اُورے اسی طرح کھاتی رہی تو ہم بن جائے گی ہم۔ رنگ بھی بس گزارا ہے اس پر چربی کا پھاٹ۔“
 ”اونہہ! اچھا خاصا رنگ ہے۔ مجھے کشمیری سیب ہو کر کیا کرنا ہے۔ میں پنجاب کی جٹی ہوں امی جٹی۔ مجھے گندم کی بالی جیسا سنہرا سنہرا لگنا چاہیے۔ کیوں معید۔؟“

سمیرا کمرے سے باہر تشریف لا رہی تھی۔ اسے ایسا کچھ بولنا تھا جس سے امی پوری کی پوری اس کی طرف متوجہ ہو جاتیں مگر کہاں سمیرا کے ملبوس سے اشقی و حسی و حسی مسک امی کی گردن بے ساختہ گھومی۔
 ”ہاں بالکل ٹھیک۔ گندم سا سنہرا سنہرا لگنا چاہیے۔ مگر اس فصل میں تو لگتا ہے۔ آگ لگ گئی ہے۔“ معید اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
 ”تم! اس نے جڑے پیچھے۔“

”ہائے سمیرا۔“ وہ معید کو چھوڑ کر سمیرا کی جانب متوجہ ہوئی۔ اپنا بیگ نزاکت سے رکھ کر وہ چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔ بسکٹ دو انگلیوں کے بیچ پھنسا اپنی قسمت پر نازاں تھا۔ گلابی نرم ہاتھ پر پیچ رنگ کی نیل پاش سچی تھی۔ اس کا سوٹ بھی پیچ اور براؤن کنٹراسٹ میں تھا۔

حمیرا نے بطور خاص نیچے ہو کر اس کے پیرو دیکھے۔ براؤن انگوٹھے والی چپل اور پیچ نیل پالش۔ پرائسوس

امی بھی وہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے پیرو چھپانے کی کوشش کی مگر یہ کہاں ممکن تھا۔ نایا ابو کی رف جوئی گیارہ نمبر۔ امی کے تاثرات مزید بڑھے۔ اس نے ٹانگیں اوپر کر کے کرسی پر جو کڑی ہار لی تھی۔

”نہ بیٹھنے کی نمیز۔ نہ چلنے پھرنے کی۔ کوئی ایک گن ہو تو شکر مناؤں۔“ اُورے کل کو میرے ہی گلے پڑ جانا ہے۔ کیسے کروں گی اگلے گھر کا۔ نہ طور طریقہ۔ جسم پھیل کر ہالیوڈ بن جائے گا۔“

”ہالیوڈ! معید کو اچھو لگ گیا۔“ یعنی کہ ہالیوڈ۔ کوہ ہالیوڈ۔“ اس نے حمیرا کا کھلامنہ دیکھا۔ جو خود بھی بھونچکی رہ گئی تھی۔ امی کم بولتی تھیں مگر یہ نئی اختراع خصوصاً اس کے موٹاپے کے لیے۔

معید نے اپنے دونوں گال دانتوں میں کس لیے مبادا نہی صفیہ اور حمیرا دونوں کو تیا دے۔ صفیہ کا تو دھیان نہیں تھا۔ حمیرا کو نظر آ رہا تھا مگر اس وقت امی کیسے چپ ہوں گی۔

”میرے پاس کون سے نوٹ جڑے ہیں کہ دان چیز کالاج دے کر کسی کو روکوں گی۔“

”مجھے لالچی کینوں سے شادی کرنی بھی نہیں۔“

حمیرا نے منہ بسورا۔
 ”لالچی بھی کمینہ بھی۔“ معید حیران ہوا۔
 ”جو لالچی ہوتا ہے وہ دراصل پہلے حد درجہ کمینہ ہوتا ہے اور بعد میں صرف بے غیرت رہ جاتا ہے۔“
 حمیرا نے ذرا جھک کر سرگوشی کی۔



گھر کی دلچسپی

رنگ بک

قیمت - 300 روپے

”کوہ!“ معید فوراً قائل ہوا۔ ”کیا کہنے۔“
 ”باپ بھائی بھی سر پر نہیں ہے کہ کوئی آسرا
 رہے۔ تم نے میرے سینے پر مونگ دلنا ہے پتا ہے
 مجھے۔“ صفیہ کی آواز میں غصے کے ساتھ لرزش بھی
 آئی۔ حمیرا چونکی۔ معید نے بھی سنجیدگی اختیار کی۔
 حمیرا کو گھور کے اشارہ کیا کہ وہ سو رہی کرے۔

”کتنی بار کہا جائے گا چھوٹی بھابھی۔ باپ نہ
 ہونے کا ڈر اداچی کو نہ دیا کرو۔ تمہیں میں نظر نہیں
 آتا۔“ حمیرا کے اٹھنے سے پہلے یہ تلیا ابو کی آواز تھی۔

صفیہ چونکی تھیں اور چہرے کے تاثرات ”فورا“ منٹا
 لیے تھے۔

”تلیا ابو۔“ حمیرا فوراً اٹھ کر ان سے لپٹ گئی،
 سراسر مصنوعی انداز۔

”بیٹیوں کے نصیب لوٹوں سے نہیں دعاؤں سے
 سجتے ہیں اور میری ساری دعائیں اپنے بچوں کے لیے
 ہیں۔“

”سن میں سے ایک پھونک مجھے مار دیں ابو۔“
 حمیرا وہ پٹا سیٹ کر کے آئی۔ وہ اسکول جانے کے لیے
 گھر سے نکل رہی تھی۔

ابو نے مسکرا کر اسے دیکھا اور خواہش پوری
 کر دی۔ ”حمیرا! لہجہ تو لے جاؤ۔“ حمیرا کی امی بکن سے
 باہر آئیں۔ صفیہ جب بھی بیٹی کے ساتھ اٹھ رہی
 ہوتیں وہ قصداً منظر سے ہٹ جایا کرتیں۔ وہ گھر کی
 بڑی بھی تھیں اور ماکن بھی۔ مگر صفیہ نے بہت پہلے
 ہی کہہ دیا تھا۔ وہاں بیٹی کے بچ نہ بولا کریں۔

”اس کے کھانے پینے کو مت ٹوکا کرو۔ ابھی اس کی
 عمر ہی کیا ہے۔ یہی تو کھانے پینے کے دن ہیں۔ ابھی کا
 کھایا پوچھنے میں کام آتا ہے اور دوسرے لکھنے پڑھنے
 والے بچوں کو یوں بھی زیادہ غذا سیت کی ضرورت ہوتی
 ہے۔ ابھی تو بے چاری امتحانوں سے فارغ ہوئی ہے
 اور تم اب اس قدر سنانے لگی ہو۔“ صفیہ خاموش
 رہیں۔

گور سب سے اہم بات یہ کہ تم ہر وقت اس کی

شکل کے بارے میں کیا کہتی ہو۔ کیا کمی ہے میری بیٹی
 میں سلاکھوں میں ایک ہے گلاکھوں میں۔“
 صفیہ واپسی کے لیے مڑ گئیں۔ انہیں گری ہوئی
 کولڈ ڈرنک پر پوچھا گیا تھا۔

اور یہ سچ تھا، حمیرا میں کوئی کمی نہیں تھی مگر یہ کیوں
 تھا کہ حمیرا میں ہر چیز کی زیادتی تھی۔ حسن کی زیادتی،
 نزاکت کی زیادتی۔

وہ سر سے پیر تک حسن تھی۔ اس کے چلنے
 پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے ہر شے سے آوا
 جھلکتی تھی۔

جبکہ حمیرا وہ قطعاً ”کوئی موٹی بوٹی نہیں تھی۔ گندی
 بے داغ رنگت والی قدرے بھرے جسم کی لڑکی۔
 اپنی عمر کے حساب سے اس پر یہ جسم بچتا تھا مگر اس کا کیا
 کرینے کہ صفیہ اسے ہمیشہ حمیرا کے تقابل میں دیکھتی
 تھیں۔ حمیرا کے لیے دل میں رشک و حسد پیدا ہوتا تو
 حمیرا کے اوپر غصہ اترتا۔

حمیرا فطرتاً ایک بے نیاز لڑکی تھی۔ مست
 مکن۔ ہستی مسکرائی جسے اپنی شخصیت پر اعتماد تھا۔
 اپنے وجود پر نانا۔ وہ خود شناس بھی تھی اور سب سے
 مزے کی بات یہ تھی کہ اسے خبر تھی۔ صفیہ دراصل
 حمیرا کے حسن کے آگے حمیرا کو دیکھ کر تڑپ
 اٹھتی ہیں۔

اور یہ صفیہ کی سراسر بے وقوفی تھی۔ حمیرا حمیرا
 اپنی اپنی جگہ دو الگ مگر مکمل شخصیت تھیں۔ ان کا
 تقابل نرا حتمانہ بن تھا مگر یہ بات صفیہ کو کون سمجھاتا۔
 ”وہ ناراض ہو گئی ہے۔“ بڑی امی ان دونوں کے بیچ
 آکر بیٹھ گئیں۔ ”میں نے لاکھ دی تھیں تا تم کو وہ
 چیزیں۔“

”آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا امی!“ معید نے
 کہا۔ بڑی امی نے سر ہلایا۔ حمیرا معید کو گھورنے
 لگی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

میں کوئی گلابی ہوں

میں ایک قاری ہوں۔ ڈائجسٹ آنے کا میں ہر مہینے دن کن کن گن کر انتظار کرتی ہوں اور ڈائجسٹ ملنے ہی اس پر یوں جھپتی ہوں جیسے چار روز کا بھوکا کھانے پر نذیروں کی طرح جلد سے جلد پورا رسالہ پڑھ لیتا میرا نصب العین ہے۔ آخر پڑھنے کے بعد تبصرو بھی تو کرنا ہے۔

یوں تو تبصرو میں ہر مہینے کرتی ہوں لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہر مہینے چھپتا نہیں۔ ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی میں سب سے پہلے خطوط میں اپنا نام تلاش کرتی ہوں جو اگر مل گیا تو کیا کہنے۔ خوشی سے پورے گھر میں بھنگڑے ڈال کر نئے سرے سے ایک بہت ہی شاندار تعریفوں بحر اخط لکھنے کی تیاری۔

اور جب تبصرو نہ چھپے تو اب میں ایک ناخوش قاری ہوں۔ نقص نکالنا میرا فرض ہے۔ اب بہت برے دل سے ٹائٹل کو دکھلا

”ٹائٹل گرل کے ایک کلن میں بندا ہے دوسرے میں نہیں ہے۔“

اب ایسے تبصرے برمدیرہ پوچھنا تو شاید یہ چاہتی ہوں کہ اس کے دو بٹے کے پیچھے آپ کو کلن کا بند نظر آجھی نہیں سکتا۔ لیکن ظاہر ہے وہ قاری نہیں برمدیرہ ہیں سو بہت شائستگی سے جواب دیتی ہیں۔

”ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے قارئین ایسی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا خیال رکھتے ہیں۔“ یا پھر غصہ یوں نکھلا

”کیا آپ ہر مہینے ٹائٹل پر دلہن کو بٹھا دیتی ہیں کچھ تو تبدیلی لائیں۔“

اب جلنے کی بو تو صاف آرہی ہے اور برمدیرہ کو بتا بھی ہے کہ جب ان محترمہ کی شادی ہوگی تو سب سے زیادہ دلہن کے ٹائٹل کی فرمائش بھی یہ ہی کریں گی ان آؤٹ کے اندازے کے لیے۔

لیکن پھر بھی وہ بہت تحمل سے کہتی ہیں۔

”ہمیں افسوس ہے آپ کو ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ کوشش کریں گے آئندہ آپ کی پسند پر پورا اتنے“ (اتنے ہزاروں لاکھوں میں سے کس کس

کی پسند؟
اب انٹرویوز پر نظر ڈالی۔ ہماری فورٹ سیلیسٹی ہو
تو کیا کہنے اور نہ بے زاری کا یہ عالم کہ سلسلہ ہی بند
کرنے کا مشورہ دے آتے ہیں۔

اب پکوان کی باری سے اگر روایتی ڈشز ہوں تو ”کیا
آپ بریانی، قورمہ، ٹنڈے کی ترکیب دے دیتی ہیں یہ تو



سب کو ہی بتانا آتا ہے، کچھ نیا سکھائیں۔ ” اگر کاٹی نیشنل ڈشز ہوں تو بھی نقطہ اعتراض یوں اٹھاتے ہیں۔ ” ہمارے پاس ایلون ہے اور نہ ہی کریم چتر اور ریگانو پارسلے ٹائپ اشیاء خریدنے کے پیسے سو پلینز ہم غریبوں کا دل نہ لچائیں اور ایسی سادہ تراکیب دیں جو ہم بنا سکیں۔ ”

مستقل سلسلوں پر غصہ تو ہم محض خط کے چھپنے نہ چھپنے کے نتیجے میں نکالتے ہیں لیکن کہانیوں کے بننے اور پڑنا تو ہم پر ہر مہینے فرض ہے۔

”متاع جاں ہے تو۔“ چلی تو ہم نے فرحت کے ترلے کر ڈالے۔ ”پلینز فرحت! آئی کو واپس لے آئیں نہ ماریں آئی کو پلینز فرحت آئی۔“ اور اگر ہمارا مشورہ فرحت مان لیتیں اور عباد عذیر زندہ ہو جاتا تو بھی سب سے پہلا خط ہم نے ہی لکھنا تھا۔ ”کیا انڈین ڈرامہ بنادیا آپ نے پلینز کہانی کے معیار کا خیال رکھیں۔“

سلسلہ وار ناول پر غصہ بھی بہت لکھتا ہے۔ ”و صفحات آجاتے ہیں ہر مہینے کہانی آگے بڑھتی نہیں کیا مذاق ہے یہ۔ بہتر ہے کہ آپ اسے بند کر دیں۔“ اب رائٹر کی شان میں بے لاگ بھرے کرتے ہوئے یاد ہی نہیں رہتا کہ کچھ عرصے پہلے تک یہی رائٹر ہماری فیورٹ تھیں ان کی ہر کہانی پر تعریف کی بھرا اور مقصدیت اور جامعیت کی دریافت ہم نے ہی کی تھی۔ اب اگر کسی حساس موضوع پر سنجیدہ سی کہانی پڑھ لیں تو ضرور ٹوکیں گے۔

”پلینز زندگی پہلے ہی بہت مشکل ہے یہ تمام حقائق ہم حقیقت میں بھگتتے ہیں سو کہانیاں تو ہلکی پھلکی لکھا کریں تاکہ تھوڑی دیر کو ذہن ٹینشن سے آزاد ہو۔“ اب اگر کوئی ہلکی پھلکی لائٹ موڈ میں تحریر آئی تو بھی اعتراض۔

”ایسا کہاں ہوتا ہے۔ کچھ ذہن کی لڑکیوں کو بلاوجہ حقیقت سے دور کہانیاں لکھ کر خواب نہ دکھائیں پلینز۔“

اب ایسے تبصرے جو ہر مہینے بدل رہے ہوتے ہیں، ان پر رائٹر اپنے دل نہیں پادیرہ دیوار سے ٹکراتیں یہ ہمارا مسئلہ

نہیں۔ اتنی مختصر آزادی کے تو ہم قائل ہیں ناں! ایک عم ہمارا یہ بھی ہے کہ عام سی صورت والی ہیروئن کو بھی اماں ابا شادی کے لیے اتنی چوائس دے دیتے ہیں اور ہم تو پھراتے جاؤں نظر اور سے ہیروئن کے تپے سیدھے بال سے متاثر ہو کر اسٹریٹ نر (Straightner) بھی خرید لیا اور پاؤں کو چھوتا لبا مغلنی فراک بھی سلوا لیا، خوب تیار تیار ہو کر شادی میں شرکت کی لیکن ہیرو تو دور کی بات ہمارے تو گھر والوں نے بھی نوٹس نہ لیا۔ بھائی نے تو اتنا مذاق اڑایا۔

”اس ڈریس کے لیے چار ہزار لیے تھے۔ موٹی بیٹنس لگ رہی ہو۔“ ”اف! اب ہمارا غصہ تو بنتا ہے ناں! اب آپ یہ ہی دیکھ لیں ہیروئن ہر سال ٹیل ہوتی ہے لیکن جب انار پرات آئی ہے تو ایسے دل لگا کر محنت کرتی ہے کہ ماسٹرز میں پوزیشن سے کم پر بات نہیں کرتی۔ اور ہم ہر سال عزت سے اچھے بھرے کر پاس ہو جانے والے یونیورسٹی آتے ہی پہلے سمسٹر میں لڑھک گئے (اصل میں تو ہم ابھی یونیورسٹی کی کینٹین اور ڈھابوں سے ہی تعارف حاصل کرتے پھر رہے تھے۔ لیکن ہماری اماں ان کو تو یہ نہیں بتا سکتے ناں سو انہوں نے ہمارے رزلٹ کی وجہ ڈائجسٹ قرار دے کر ان پر بین لگا دیا۔ خالی بیٹ تین بجے تک ہم اب یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھ کر ڈائجسٹ پڑھیں گے اور بھرے لکھیں گے تو وہ ایسے کڑوے کسیلے تو ہوں گے ناں۔

لیکن ایک بات ہے کہ سلام ہے مدرہ پر آتے لوگ اپنے حالات کی تلخی قلم کے ذریعے انہیں منتقل کرتے ہیں پھر بھی اتنی خوش دلی سے جواب دیتی ہیں اور سلام تو ان تمام قارئین کو بھی جو ہمارے جیسے نہیں۔ بہت اچھے اور باذوق تبصرے لکھنے والے کہانی کی گہرائی میں اترنے والے ہیں، لیکن ایک بات ہم بتادیں چاہے ہم اتنے ادبی اور اعلیٰ قسم کے قاری نہیں بھی ہیں لیکن اپنے ادارے، رسالوں اور لکھاریوں سے محبت آپ سب سے بہت زیادہ کرتے ہیں۔



ام ایمان قاضی

دُعائے حیرتوں

کر آنکھیں موند لیں گویا گاڑی میں سرے سے اور کوئی موجود ہی نہ ہو۔ دعا جو گرمی اور انتظار کی کوفت سے پہلے ہی ناک تک بے زار بیٹھی تھی ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

”کیا مطلب؟ تمہارا پہلے تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اگر تھا بھی تو مجھے بتانا چاہیے تھا تاکہ میں پوائنٹ سے گھر چلی جاتی یا فروا سے کہتی وہ مجھے ڈراپ کر دیتی۔“

”اب بتا دیا ہے اب چلی جاؤ۔“ آنکھیں موندے موندے ہی کمال اطمینان سے جواب آیا تھا۔ مقصد دعا کو پانا ہی تھا جس نے بہت شے سے اس کی

اس دفعہ اوائل اپریل ہی سے آئندہ ہونے والی گرمی کی شدت کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ گاڑی آئی تو تھی دونوں کو یونیورسٹی سے پک کرنے پر ہمیشہ کی طرح عین وقت پر ہشتمین کا موڈ پھپھو کی طرف جانے کا بن گیا۔ وہ جائے بھاڑ میں اسے چنداں پرواہ نہیں تھی۔ وہ اس سے پہلے آکر گاڑی میں بیٹھ چکی تھی جب دس منٹ بعد ہشتمین کی تشریف آوری ہوئی۔

”ڈرا ہیور! جلدی کرو۔ مجھے پھپھو کی طرف چھوڑ دو۔“ اس کی طرف دیکھے اور دھیان دے رہے بغیر اس نے بیٹھے ہی حکمہ انداز میں کہا اور سیٹ بیک سے کمرٹکا

مکمل ناول

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

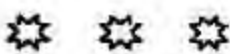
Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

اسے تو یونیورسٹی گیٹ سے ہی گاڑی مڑوائی اس نے۔ ”امی تازہ روٹیاں بنانے کے لیے فریج سے آٹا نکال رہی تھیں۔ وہ بھی وہیں آگئی اور کچن میں پڑی چھوٹی ٹیبل کے گرد پڑی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ چاہتے ہوئے بھی وہ امی کو یہ نہ بتا سکی کہ صبح اس نے ہشفین سے کہا تھا کہ وہ ایک بجے ہی گاڑی میں پہنچ جائے امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے تو وہ آج کارپیکٹیکل اینڈ نہیں کرے گی، لیکن ہمیشہ سے ایک بجے گاڑی میں پہنچ جانے والی ہشفین نے جان بوجھ کر آدھا پون گھنٹہ تو لگا ہی دیا تھا یا ہر آنے میں۔

”اتنی دیر۔ میں پرکیکٹیکل میں ہی شریک ہو جاتی۔“ وہ کلس کر سوچتی رہی اور ہشفین کے موبائل پر ٹیل دیتی رہی جسے دوسری طرف بڑی کر دیا گیا تھا۔

”آپ رہنے دیں میں کرتی ہوں۔ یہ بتائیں طبیعت کیسی ہے اب آپ کی۔“ اس نے زبردستی ہاتھ پکڑ کر ان کو کرسی پر لا بٹھایا۔ وہ کہتی رہ گئیں کہ تم ٹھیک ہوئی آئی ہو۔ کل سے ہی ان کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کسی بھی سٹیشن کا نہ لینے کا کہہ کر ریسٹ بھی بتایا تھا، مگر اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ کبھی بھی گھر کے کاموں سے ہاتھ نہیں روکتی تھیں۔ اس کا آج ضروری ٹیسٹ نہ ہوتا تو وہ چھٹی کرتی پر وہ اس کی بڑھائی کے حوالے سے نرم اور شفیق امی سے ہٹ کر تخت گیریاں بن جاتی تھیں۔ دونوں ماں بیٹیوں نے مل کر کھانا کھایا۔ بلا تو شام کو ہی آتے تھے۔ چائے پینے کے بعد نماز پڑھ کر امی کو سونے کے لیے چلی گئیں جب کہ اسے باوجود کوشش کے نیند نہیں آئی۔



”آہ۔۔۔ آج تو بڑے بڑے لوگوں نے ہمارے غریب خانے کو رونق بخشی ہے۔“ سلمان چمک کر بولا ساتھ ہی متلاشی نظروں سے اس کے پیچھے بھی نگاہ کی کہ شاید وہ بھی کہیں نظر آجائے پر مایوسی ہونے پر دل کی بات زبان پر لے ہی آیا۔

طرف دیکھ کر ڈرائیور کو دیکھا جو بیک مرر میں سے یہ سارا تماشا دیکھتے ہوئے انتظار کر رہا تھا کہ آیا گاڑی گھر جانے والی سڑک پر ڈالے یا مخالف سمت میں جانے والے پھپھو کے گھر کے رستے پر لے جائے حالانکہ گاڑی میں موجود تینوں نفوس یہ بات جانتے تھے کہ آخری حکم ہشفین کا ہی مانا جائے گا کہ وہ دنیا میں منوانے کا حق لے کر ہی پیدا ہوئی تھی اور یہی ہوا۔ دعا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی بغیر کچھ کے۔ اس کے گاڑی کا دروازہ ٹھک سے بند کرنے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ نے ہشفین کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

”چلو ڈرائیور! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔“ سیدھی ہوتے ہوئے اس نے ڈرائیور سے کہا اور گاڑی کے چلتے ہی سڑک کی سائیڈ میں نظر جھکا کر تیزی سے چلتی

دعا کو دیکھ کر سکون سا اپنے اندر اترتے محسوس کیا۔ وہ تیزی سے چلتی عین روڈ تک پہنچنے کے لیے دل ہی دل میں ہشفین کو ہزاروں صلواتیں سنارہی تھی جب ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رکی۔ عذیرہ دانی کو گاڑی سے اترتے دیکھ اس کی کوفت و بے زاری میں ہزار گنا اضافہ ہوا تھا۔

”آئیے دعائے خیر آپ کو چھوڑ دوں۔“ نہایت سنجیدگی سے کہا گیا۔

”نہیں جی شکریہ! میں چلی جاؤں گی۔“ کہتے کہ ساتھ ہی اس نے قدم بھی آگے بڑھا دیے تھے۔ وہ یاسیت سے دیکھا کہ جب کہ ہشفین کی گھٹیا چال کو سمجھتے وہ تقریباً ”ڈیرہ گھنٹے بعد گھر پہنچ پائی تھی۔ عموماً“ وہ دونوں آدمی گھنٹے میں ہی پہنچ جایا کرتی تھیں۔ امی نے اس کا دھوپ سے اور غصے سے لال بھجھو کا چہرہ دیکھا۔

”ہشفین نہیں آئی؟“ کچن میں جاتے جاتے انہوں نے صوفے پر آڑھی تر چھی پڑی دعائے خیر سے پوچھا تھا۔

”نہیں! اپنی پھپھو کی یاد ستانے لگ گئی اچانک

”یونورٹی سے آرتی ہونا ہٹنی! تمہاری وہ آدم بے زار بن نہیں ہے تمہارے ساتھ۔“
 ”تمت بلایا کرو اسے میری بن۔ کتنی بار کہا ہے۔“ اس کے سرسری پوچھنے پر بھی وہ بھڑک کر بولی۔
 وہ تو شکر ہے پھپھو کے آنے پر یوسفین ان کی طرف متوجہ ہو گئی تو وہ بات تو ہیں پر ہی رہ گئی۔



غصے سے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی دماغ کی کوئی شریان ضرور پھٹ جائے گی۔ ان کے ٹکڑوں پر پلنے والی وہ معمولی شکل و صورت کی مالک ساتھ جس نے ہمیشہ اس کی اترن پسنی تھی اس کا جھوٹا کھایا تھا وہ زندگی کے سب سے بڑے امتحان میں اس کے مقابل آن ٹھہری تھی۔ آخر کچھ تو اس نے بڑھاوا دیا ہو گا علی احمد کو اپنے لیے سے اپنی نظروں سے یا الفاظ سے کہ وہ اپنی سنگی چچا زاد بچپن کی منگیتر کو بھول کر اب اس کا نام لے رہا تھا۔ ٹھلنے سے بھی غصہ کم نہ ہوا تو وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اماں برآمدے میں بیٹھی کسی گہری سوچ میں تھیں۔
 ”کہاں ہے وہ بذاتہ میں کہے دے رہی ہوں اماں آپ کو۔ بس بہت ہو گئی ہمدردی۔ دیکھ لیا آپ نے محبتیں لٹانے کا انجام اس آوارہ پر اور اس نے جو انعام دیا ہے اس کا وہ بھی دیکھ لیا۔“ غصے سے بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا۔

”بس کرو بیٹا! اس میں بھلا اس غریب کا کیا قصور۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی نہیں پتا۔“
 ”ارے واہ! کیسے نہیں پتا اس کو۔ اس کے کسی اشارے کے بغیر ہی علی احمد دیوانہ ہوا جا رہا ہے اس کا۔ اماں بہت بھولی ہیں آپ۔ اب آپ کا زمانہ نہیں رہا جب لڑکیاں پردے کی بوہو ہوتی تھیں۔ اتنی بھولی بھالی کہ کسی بات کا پتا ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ کھنی میسنی لڑکی صرف اوپر اوپر سے ایسے دکھتی ہے ورنہ گنوں کی پوری ہے۔ آپ کو کیا پتا روز کلج جانے کے بارے میں کہاں کہاں کی خاک چھانتی ہے۔ وہیں راستے

میں کہیں پھنسا لیا ہو گا ورنہ علی احمد تو میرے گن گاتے نہ تھکتا تھا۔“
 ”چھاتم بیٹھو۔ میں بات کروں گی ساتھ سے وہ آجائے۔“ اماں نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے پاس بٹھانا چاہا۔ اس بات پر وہ الٹا بھڑک اٹھی۔
 ”بات نہیں کریں گی نکال دیں گی اس کو اس گھر سے۔“

”ایسے کیسے نکال دوں پچی! میرے مرے بھائی کی نشانی ہے وہ پھر جوان جہان۔ علی احمد کی طرف سے ہوا ہے پسندیدگی کا اظہار۔ ساتھ بے خبر ہے اس سارے معاملے سے اور اب تو علی احمد کے بھی تو میں تمہاری شادی اس سے ہرگز نہیں کرنے والی۔ میری بیٹی کوئی اتنی گری پڑی نہیں ہے کہ ایک دفعہ کوئی اس کے لیے ماں کروے پھر ہزار ٹاک رگڑے بھی تو میں کبھی نہ دوں رشتہ۔“ اماں کی ذہنی رود و سرری جانب مڑ گئی جب کہ سبیلہ شاکد بیٹھی اماں کو دیکھے گئی۔ جن

ابن انشاء کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر
 ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کا تحریر کردہ مقالہ

ابن انشاء

احوال و آثار



قیمت: 1200 روپے
 ڈاک خرچ: 50 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 37، اندر بازار، کراچی

فون نمبر:
 32735021

جانے لگی تھیں اماں نے تو مسجدیہ کو بھی بہت کہا کہ وہ بھی ساتھ کے ساتھ ہی نویں میں داخلہ لے لے، دونوں ساتھ جائیں گی تو انہیں تسلی رہے گی پر مسجدیہ جس نے بمشکل پردھائی سے جان چھڑوائی تھی اب دوبارہ اس جھیلے میں بڑنے کی۔ نہیں تھی سو اماں نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ زندگی کا سفر جاری رہا۔ ساتھ اب ایف اے کے امتحان دینے والی تھی۔ مسجدیہ کے بھائی شاہ نواز کا یونیورسٹی میں آخری سال تھا جب کہ علی احمد کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد شہر میں ایک اچھی جاب مل گئی تھی جب چچا چچی اماں کے پاس رشتہ کی بات کرنے کے لیے آئے تھے۔ مسجدیہ کی نہیں بلکہ ساتھ کی۔

کے دل پر ساتھ کی محبت کے نقوش اتنے گہرے تھے کہ وہ اس کی جانب دھیان دینے بغیر سارا تصور علی احمد کا گردان رہی تھیں۔

ساتھ نویں جماعت میں تھی جب اماں کے بھائی اور بھانج ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اماں کی محبت نے جوش مارا اور وہ ڈری سہمی بیٹی کو شہر سے اپنے ساتھ گاؤں لے آئیں مسجدیہ کی ہی ہم عمر وہ خوب صورت سی لڑکی تھیں دن اس صدمے سے نہ نکل سکی کہ اس کے اوپر جان چھڑکنے والے ماں باپ اسے چھوڑ کر چائے ہیں۔ مسجدیہ نے خود آٹھویں کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا جب کہ اس سے بڑا بھائی شہر میں کالج میں زیر تعلیم تھا۔ مسجدیہ کے والد کی پانچ سال پہلے ہی وفات ہو چکی تھی، لیکن اچھی خاصی زمین واری تھی سو گھر کو چلانے کے لیے اماں کو کسی مسئلے کا سامنا نہیں تھا۔



اس وقت وہ سارا شرارتی ٹولہ ہی پھیلے گراؤنڈ میں موجود تھا۔ حسن اور تقی کراڈ ڈرنگس اور سموسے لینے گئے تھے۔ اور سیرا کسی کتاب پر جھکی کوئی سوال ڈسکس کر رہی تھیں جب کہ عذیر ان کے پاس ہی بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ وہ آج صبح دعا کے ساتھ ہونے والی ڈبھیڑ کو سوچ رہا تھا جب اچانک اسے لاجپوری میں وہ بہت ساری کتابوں میں گہری نظر آئی تھی۔ موقع غنیمت جان کر وہ اس کے پاس جا کر کہنے کھار ا تھا اور اس سے وہاں بیٹھنے کی اجازت طلب کی تھی پھر اس نے دعا کا چونکنا اور بیٹھنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی جلدی سے کتابوں کو میٹھا بھی لوٹ کیا تھا۔

مسجدیہ کی بات شروع سے ہی اس کے چچا زاد علی احمد سے ملے تھی۔ یہاں کے رواج کے مطابق بچوں کے رشتے بہت بچپن ہی میں طے کر دیے جاتے تھے۔ علی احمد کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اگلو تے بیٹے کی خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے چچا کی فیملی شہر منتقل ہو گئی تھی تاکہ علی احمد کے شوق کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ آڑے نہ آئے۔ یہاں مختلف مواقع جیسے عید بقر عید پر چچی چچا تحائف سے لدے پھندے آتے اور باتوں باتوں میں اپنے اس عہد کی تحدید کر جاتے تھے جو برسوں پہلے علی احمد اور مسجدیہ کے رشتے کی صورت میں ہوا تھا۔

”پلیز مس دعا! بیٹھ جائیے۔ آپ کا میرے ساتھ ایسا رویہ مجھے بے حد شرمندگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یقین کریں میں کوئی ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں صرف آپ کے دو منٹ چاہئیں۔ تسلی سے میری بات سن کر بے شک چلی جائیے گا۔“ اس کے بے حد شائستگی سے کہنے پر وہ بے ساختہ ہی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”فرمائیے۔“ انداز میں بے حد ریگائی لیے اس نے پوچھا۔ وہ اپنی عمر اور وقار کے حوالے سے بہت محتاط

علی احمد بہت کم آتا تھا کہ اس کی اپنی تعلیمی مصروفیات ہی بہت تھیں۔ مسجدیہ کو اپنے کم گو اور سنجیدہ سے کزن کا ہر انداز ہی پسند تھا۔ رفتہ رفتہ ساتھ اپنے غم کے حصار کو توڑ کر جب باہر نکلی تو اس کی اپنی پھوپھی سے پہلی فرمائش یہی تھی کہ وہ آگے پردھائی جاری رکھنا چاہتی ہے۔ اماں کو چنداں اعتراض نہ ہوا کہ نزدیکی قصبہ میں اب گاؤں کی بہت سی لڑکیاں ٹانگوں پر اسکول اور حال ہی میں اپ گریڈ ہونے والے کالج میں

لڑکی تھی۔ اس نے عذیر ہمدانی کے لیے وانداز میں اپنے لیے بہت کچھ محسوس کیا تھا اور گزشتہ کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہ رہا ہے۔ سو آج اس نے اس کی بات سن کر اس قصے کو نپٹانے کی ٹھانی تھی کہ دل چاہتا بھی تو وہ ہرگز بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتی تھی اس کے ہر عمل کو اس کی ماں کے تاظر میں دیکھا اور ٹولا جاتا پھر ان کے ناکرہ گناہوں میں ایک اور جرم کا اضافہ ہو جاتا۔

دعاے خیر نے عذیر ہمدانی کی بات نہایت خاموشی سے کسی بھی تاثر کے بغیر سنی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ چونکہ یہ ان کا آخری تعلیمی سال ہے اور وہ امتحانات کے بعد اپنے پیپا کا بزنس سنبھال لے گا۔ وہ اس کے لیے چونکہ دل میں اچھے جذبات رکھتا ہے اس لیے اس کے گھر یا ضابطہ طور پر رشتہ لے کر آنا چاہتا ہے۔ اپنی بات مکمل کر کے اب وہ پر شوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گویا کسی خوب صورت سے اقرار کا منتظر تھا۔ دعاے خیر نے ایک نظر اس کو دیکھ کر نظر حالی پھر نیل پر رکھی کتابوں کو دیکھتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا کہ اپنی بات کے بعد اس کا تاریک چہرہ دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں عذیر“ لیکن دنیا میں ہر چیز ہر انسان کے لیے نہیں ہوتی نہ ہی انسان کی ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں رشتے صرف اپنی ذات برادری میں ہی کیے جاتے ہیں۔ مزید کچھ کہہ کر مجھے شرمندہ مت کیجئے گا کہ میں یا ہماری فیملی کا کوئی بھی فرد اس سلسلے میں کسی ایسے شخص کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکال سکتا جو ہماری برادری سے تعلق نہ رکھتا ہو۔“

اسے بے چینی سے پہلو بدلتے اور کچھ کہنے کی کوشش میں منہ کھولتا دیکھ وہ تیزی سے کہہ کر اٹھی اور اللہ حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ عذیر ہمدانی نے بہت بے بسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔



پتہ دن ہو گئے تھے اس دنیا سے بے زار لڑکی کو

دیکھے ہوئے اس عرصہ میں ہشفین نے تو گھر کے تین چار چکر لگا ڈالے تھے جب کہ وہ مہما سے گھبراتی تھی اس لیے ان کے ہاں آنے سے گریز کرتی تھی سو دل پر بہت قابو پانے کی کوشش کو ناکام جانتے ہوئے اس نے گاڑی کا رخ ماموں کے گھر کی طرف کر دیا۔ خاموش اور پروقاری مایا جی آج کچھ زیادہ ہی خاموش لگیں اسے تاہم خاصی گرم جوشی سے ملی تھیں ہشفین اور دعائے خیر کے پارے میں سرسری سے استفسار پر اسے دل ہی دل میں یہ جان کر بے حد خوش ہوئی کہ ہشفین کسی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں گئی ہوئی ہے جب کہ دعائے خیر حسب معمول اپنی برتھالی میں مصروف تھی اور ماموں جان اپنے بزنس کے سہیلوں کو پارے تھے۔

”بیٹھو بیٹا! میں چائے بنا تی ہوں۔“ مایا جی کی شفقت بھری آواز پر وہ چونکا پھر شاید اس کی دلی مراد بر آئی کہ بے حد سادہ سے حلیمے میں وہ وہاں آئی تھی۔

”بیٹھیں امی آپ ان کے ساتھ میں چائے بنا لیتی ہوں۔“ سنجیدگی سے اس کو سلام کرنے کے بعد دوسری نظر ڈالے بغیر وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوئی۔

”ارے نہیں دعا تم بیٹھو میں لے کے آئی ہوں چائے۔“ وہ خاموشی سے آکر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

سلمان نے بغور اسے دیکھا ملگجے سے حلیمے میں سر پروٹھا اوڑھے۔ وہ بالکل سامنے، نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے خود ہی کھنکھار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

سلمان اس سے اس کے مضامین، روزمرہ زندگی میں اس کی دلچسپیاں اور اس کی پسند، ناپسند کے حوالے سے چھوٹے چھوٹے سوالات کرتا رہا تھا جس سے اس کی جھجک تو کم نہیں ہوئی تھی پر پہلو والی کوفت اور بے زاری نہیں تھی۔ تاہم امی کے چائے لے کر آنے پر وہ اپنی چائے لے کر مناسب الفاظ میں معذرت کرتی وہاں سے اٹھ گئی تھی کہ اسے جا کر ابھی بہت سا پرہنا تھا۔

شاہ نواز کے توسط سے آیا تھا، کے لیے بھی ہاں بھری تھی۔

سجیلہ نے ایک شرط پر اس رشتہ کو قبول کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ ساتھ کاشوری کے بعد اس گھر سے رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے اور خلاف توقع اہل اس کی یہ شرط مان گئی تھیں۔

”کچھ فیصلے انسان سے وقت کرواتا ہے جو کہ حالات کا رخ دیکھ کر انسان کو کرنے پڑتے ہیں، چاہے مرضی ہو یا نہ ہو۔ تمہاری علی احمد سے شادی اور اس گھر سے ہمیشہ کی دوری ایسے ہی فیصلے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تمہیں ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دوں پر اب میں بہت کمزور پڑ گئی ہوں بیٹا! میرا کہنا مان کر مجھے میری نظر میں سرخو کرو۔“ انہوں نے ساتھ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کی رخصتی کے وقت کہاں تھا اور پھر اس گھر سے یکے بعد دیگرے دو لڑکیاں الگ الگ احساسات کے ہمراہ دوں ہوئی تھیں۔



”آپ کچھ بھی کہیں مجھے آپ کا یہ فیصلہ قطعی پسند نہیں آیا۔ میں مانتی ہوں کہ جائیداد میں آپ دونوں بھائی برابر کے حصہ دار تھے مگر اس بزنس کو پھیلایا تو آپ نے ہے اپنا اتنی وقت محنت بچوں اور گھر والوں سے دوری برداشت کی تب کہیں جا کر یہ وقت آیا ہے کہ آج ہم سوسائٹی میں اہم مقام رکھتے ہیں تو آپ یہ سب کچھ اٹھا کر ایک ایسے شخص کی نذر کرنا چاہتے ہیں جس کا نہ تو کوئی خاندانی بیک گراؤنڈ ہے نہ سوشل۔ میرے بیٹے کا حق ہے اس ساری جائیداد پر۔ آپ کو ایسا کچھ کرنا بھی ہے تو چند لاکھ پکڑائیں اس کے ہاتھ میں بس۔“ بیگم حسان تیز تیز چلتے ہوئے صوفے پر اخبار بڑھتے ہوئے حسان صاحب کے پاس آکھڑی ہوئیں مگر ان کو اپنی بات کے جواب میں مسلسل اخبار کی جانب متوجہ دیکھ کر دوبارہ کمرے میں چکر لگانے لگیں۔

”آپ نے اپنی بات عمل کر لی ہو تو میں کچھ

انسان جتنی بھی چاہے تدبیریں کر لے لڑے، جھگڑا کرے، انسانوں سے حالات سے اپنے آپ سے، تقدیر سے کبھی بھی نہیں لڑ سکتا۔ جو اس کے بخت میں رقم نہیں ہے وہ ساری دنیا بھی مل کر اسے نہیں دلا سکتی۔ یہی بات اگر انسان سمجھ لے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے، یہی بات سجیلہ بھی نہیں سمجھ سکی تھی اور اپنی ضد پر اڑ گئی تھی کہ علی احمد ساری دنیا میں چاہے جس لڑکی سے بھی شادی کر لے، مگر وہ ساتھ ہرگز نہیں ہونی چاہیے پر علی احمد بھی اسی کا کزن تھا۔ اس نے حقیقتاً ان کے گھر کی دلہیز گھر ڈالی تھی۔

وہ شادی جیسے زندگی کے سب سے بڑے معاملے میں ہرگز کھپو واپز کا حامی نہیں تھا نہ ہی وہ بچپن میں کیے گئے رشتوں پر یقین رکھتا تھا۔ ہر بار جب علی احمد پیغام بھیجتا، سجیلہ ساتھ کے لیے گھر کی زمین تنگ کر دیتی تھی جیکہ وہ بے چاری تو خوب سارا قصہ سن کر حیران پریشان تھی اس کی سیدھی شادی زندگی میں اس قسم کی الجھنوں کے لیے ہرگز جگہ نہیں تھی۔ لہذا وہ تو سجیلہ کی امی کی جی جان سے ممنون تھی کہ اس نفسا نفسی کے دور میں انہوں نے اس بیگم بچی کو گھرا کر نہ صرف رکھا تھا بلکہ اس کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی پوری کرنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی حالانکہ برادری کے ایک دلوگوں نے اعتراض بھی کیا تھا۔

”یقین کرو سجیلہ! میں نے تو سوائے ایک دو دفعہ کے تمہارے اس کزن کو دیکھا تک نہیں ہے پھر تم کیوں میرے ساتھ ایسا کر رہی ہو۔“

ہر بار طعنوں اور تحقیر بھرے جملوں کے بعد رو بڑتی تھی۔ پر پتا نہیں کیا جی میں آئی تھی اماں کے کہ جس نے سناؤنگ یہ کیا کہ انہوں نے ساتھ کے لیے علی احمد کو ہاں کر دی تھی۔ خود ساتھ اور سجیلہ کے احتجاج کو خاطر میں لائے بغیر۔ صرف یہی نہیں ان ہی دنوں سجیلہ کے لیے بھی ایک معقول رشتہ جو اس کے بھائی

کہوں۔ ”جب بیگم حسان بول بول کر اپنی جلن اور بھڑاس نکال چکیں تب انہوں نے بے حد اطمینان سے اخبار لپیٹ کر ٹیبل پر رکھا اور بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔ بیگم حسان تکیے چتون سے ان کو دیکھتی سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھ گئیں تاہم کچھ کہنے سے گریز کیا کیونکہ اپنے گھر میں پچھلے ہفتے سے چھڑے اس مسئلے کا حتمی اور مرضی کا حل چاہتی تھیں۔

”میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں آج آخری دفعہ بتا رہا ہوں اس کے بعد میرے پاس کوئی اعتراض سننے کی گنجائش نہیں ہوگی۔“ اب کے ان کے لہجے میں ہلکا سا غصہ بھی در آیا۔

سز حسان بھی تن کے بیٹھ گئیں۔ چہرے کے نقوش کے زاویے مزید بگڑ گئے۔ شوہر کی اٹل اور دو ٹوک فیصلے کرنے والی عادت سے واقف تھیں۔

”بھائی جی نے اپنی مرضی سے کسی غریب خاندان کی مسکین شریف لڑکی سے شادی کی تھی اور اباجی نے انہیں اپنی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ بھائی جی دل برداشتہ ہو کر شہری چھوڑ گئے۔ اباجی اپنی ضد میں اور بھائی اپنی انا کی جنگ میں یکے بعد دیگرے زندگی کی بازیاب پار گئے لیکن اباجی نے مرنے سے پہلے مجھے وصیت کی تھی کہ جو غلطی انہوں نے کی تھی وہ میں ہرگز نہ دہراؤں بلکہ بھائی جی سے فوری رابطہ کر کے ان کا حق ان تک پہنچاؤں۔ پتا نہیں ہم لوگوں کو اپنی زیادتیوں کا احساس عمر کی نقدی ختم ہونے وقت ہی کیوں ہوتا ہے۔“ وہ آزرہ ہو کر بولے۔ ”میں نے اپنے ہر ممکن ذرائع استعمال کرائے تو پتا چلا کہ بھائی جی تو اباجی سے بھی پہلے تین سال قبل روڈ ایکسپلنڈ میں جان کی بازی ہار گئے ہیں۔ ان کی بیوی اور اکلوتا بیٹا ملک سے باہر تھے جب میں نے ان لوگوں سے رابطہ کیا تھا۔ شاہ میر تو اس جائیداد کا نام بھی نہیں سنتا چاہتا تھا جو اس کے باپ کے کام نہ آسکی تھی۔ وہ تو میں مسلسل بھابھی کو مجبور کرتا رہا اور وہ میرے کہنے پر شاہ میر کو

اور اب پچھلے ہفتے ہی بھابھی کی طویل بیماری کے

بعد ہونے والی موت کے بعد شاہ میر نے روتے ہوئے مجھے فون کیا کہ اس کی والدہ کی آخری خواہش اور وصیت تھی کہ وہ اپنے رشتہ داروں اپنے اصل کی طرف لوٹ جائے۔ میں نے اور والا پورشن اس کے لیے سیٹ کر دیا ہے۔ وہ اب نہیں رہے گا۔ جیسے سلمان ہمارا بیٹا ہے ویسے شاہ میر کو بھی اپنا بیٹا سمجھو۔ میرے بھائی نے ایک طویل عرصہ انہوں سے جدائی کا بن باس کاٹا ہے اب اس کے بیٹے کو دنیا کی ہر آسائش دے کر شاید میں اس غلطی کا کفارہ کرنے کی ہلکی سی کوشش میں ہی کامیاب ہو جاؤں جس میں اباجی کے ساتھ ساتھ شاید میں بھی برابر کا شریک تھا۔“ وہ آبدیدہ ہو گئے۔

بیگم حسان جو تیسری بار یہ جذباتی کہانی الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ سن رہی تھیں۔ حجاز ہو کر پہلو بدل کر رہ گئیں۔

”جہاں تک میں اسے سمجھ پایا ہوں وہ بہت خوددار اور سلف میڈ لڑکا ہے اور صرف اپنی ماں کی وصیت کی خاطر یہاں میری پاس آنے پر آمادہ ہوا ہے ورنہ اسے ہم میں یا ہماری جائیداد میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا کوئی بھی عمل یا بات اسے ہم سے بدظن کرے تو آج آخری دفعہ تفصیل سے سمجھا دیا ہے۔“ ان کی اس بحث کے دوران سلمان نہ جانے کب آکر ان کے درمیان بیٹھ گیا تھا اور غور سے باپ کی ساری باتیں سن رہا اور ماں کی پُربہشکن پیشانی دیکھ رہا تھا۔

”میری سمجھ میں تو یہ نہیں آ رہا بلکہ اس سیدھی سیدھی بات میں آپ کے اعتراض کا کیا پہلو لگتا ہے بلکہ میں تو کسی حد تک ایکسپینڈ بھی ہوں کہ میرا کزن میرا بھائی جس سے ہم ایک عرصہ بعد ملیں گے اور حیران تو بہت ہی زیادہ ہوں کہ آج کل کے اس قدر فاسٹ زمانے میں ایسی اسٹوریز دیکھنے کو متی ہیں پسند کی شادی پر جائیداد سے عاق کرنا اور اگلے بندے کا بھی اتنا شریف ہونا کہ بجائے اپنا حق تن کے کھڑے ہو کر ماتنگے کے ملک ہی چھوڑ کے ہی چلا جائے۔ حوا اٹس

امیزنگ؟ اور پاپا! میں تو یہ سوچ کر بھی حیران ہوتا ہوں کہ آپ جیسے اسٹریٹ فارورڈ انسان نے بھی دادا کو کبھی ان کی غلطی کا احساس نہیں دلایا نہ ہی تایا جی سے کوئی رابطہ رکھا؟“ وہ آج کے دور کا پڑھا لکھا باشعور انسان اپنی ذہنی سطح کے مطابق سوالات کر رہا تھا جب کہ بیٹے کو بھی باپ کی حمایت میں بولتا دیکھ کر مسز حسان مزید کڑھ کر رہ گئیں۔

”ہو نہہ! باپ سیر ہے بے وقوفی میں تو اولاد سوا سیر ہے۔“ وہ بڑبڑا کر بولیں۔

”آپ کے دادا جی بہت اصول پسند اور اپنی روایتوں کے حوالے سے بہت سخت جاگیر دار تھے سلمان! کسی کی بھی نہ سننے اور نہ ماننے والے۔ میں تب خود اسٹورنٹ تھا جب یہ بات ہوئی۔ ایک دو دفعہ ابا جی سے بات کرنے کی کوشش بھی کی تو ان کی اس بات نے ہی چپ کرا دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو بھی بھائی کی حمایت میں بولے گا ان کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ میں فطری طور پر بڑول تھا یا ابا جی کی جائیداد اور آسائشات سے دوری کی دھمکی ہی ایسی تھی کہ دوبارہ بھائی جی کے حق میں آواز نہ اٹھا سکا۔“ پاپا نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ گویا اپنی غلطی پر پچھتا رہے ہوں۔

”ہاں۔ یہ میری غلطی ہے کہ ابا جی سے چھپ کر سہی ان سے رابطہ تو رکھ سکتا تھا ان کا ہٹاؤ ہونڈنا اتنا مشکل نہ ہوتا میرے لیے اگر جو میں کوشش کرتا تو۔ ریکریکل لائف شروع کرنے اور شہر میں بزنس کے جھمیوں نے پھر فرصت ہی نہیں دی کہ کسی اور طرف دھیان جاسکے۔ تمہارے دادا جی ساری زندگی گاؤں میں ہی رہے۔ سال دو سال بعد میں چکر لگا آیا کرتا تھا۔ پھر گزرتے وقت نے ان کی ضد کی دیوار میں دراڑیں ڈالنا شروع کیں تو وہ بہانے بہانے سے بھائی جی کا ذکر چھیڑ بیٹھتے۔ ایک بار تو وہ رو ہی پڑے تھے یہ کہہ کر کہ میرے بیٹے کو ڈھونڈ لاؤ حسان! میں تھک گیا ہوں اپنی ضد کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے۔ میں باپ تھا اگر غصے میں کہہ کر بھی دیا تھا تو وہ تو بیٹا تھا میرا۔ منالیتا مجھے آکر

اک بار۔“ آخر کار جب ضد اور انامقابلے پر تن کر کھڑے ہو جائیں تو پھر حدائیاں اور رو رہی مقدر بنتے ہیں۔ ان کا ٹوٹا لہجہ اتنی اذیت لیے ہوا تھا اپنے اندر کہ میں اندر کہیں دل میں بے حد شرمندہ ہوا کہ باپ بیٹے کی اس جنگ میں میں نے کب ایک بھائی کا فرض نبھایا تھا۔“

”اٹس اوکے پاپا! جو ہو گیا اس پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ نے جو بھی فیصلے کرنے ہیں فوجر کے حوالے سے کریں۔ شاہ میر کو سپورٹ کرنے کے معاملے میں میں ہر قدم پر آپ کے ساتھ کھڑا ہوں۔ یقین کریں آپ کی یہ باتیں سن کر مجھے اپنے ان دیکھے کزن سے بہت محبت محسوس ہو رہی ہے۔“ وہ ان کے ہاتھ گرم جوشی سے دباتا ہوا بولا تو احسان صاحب کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔

”تھینک یو۔ تھینک یو مائی سن۔ آٹم پر اوڈ آف یو۔“ انہوں نے فرط جذبات سے سلمان کو گلے سے لگالیا۔



آج بہت دنوں بعد وہ کھانے کی ٹیبل پر موجود تھے سوامی ملازمہ کے ہوتے ہوئے خود حرکت میں تھیں۔ دعائے خیر نے کہا بھی تھا کہ وہ ان کی مدد کرا دیتی ہے بلکہ کچن میں گئی بھی تھی پر وہ اسے ”نہیں تم جا کر بیٹھو۔ میں بس ابھی آئی ہوں۔“ کہہ کر کوئی چوتھا چکر کچن کا لگا رہی تھیں حالانکہ ہر چیز موجود تھی پر مجازی خدا کے مزاج کے سب ہی رنگوں سے واقف تھیں سو جب وہ گھر میں ہوتے وہ بوکھلا سی جاتی تھیں پھر ہشیفین کی چالبازیاں جو وہ دعائے خیر اور ان کو باپ کی نظر میں گرانے کے لیے کیا کرتی تھی سے خاصی گھبراتی تھیں۔

”فائنل ایگزیمز کب ہیں آپ لوگوں کے؟“ سب جب ٹیبل پر بیٹھے کھانے میں مصروف تھے تب انہوں نے ہشیفین سے سوال کیا تھا۔

”دو ماہ بعد پاپا! کیوں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

بشفین نے باپ سے پوچھا جب کہ وہ دونوں ماں بیٹیاں ان کی گفتگو خاموشی سے سن رہی تھیں۔

”بشفین کے لیے تو سب جملہ نے کہہ رکھا ہے پر اس کے لیے ایک دو لوگوں سے میں نے کہہ رکھا ہے۔ ویسے بھی میں مزید اس کو اس گھر میں رکھ کر کسی بھی بدنامی کو اپنے گلے لگانا نہیں چاہتا۔ ابھی پچھلی بات کو دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ محض چھ ماہ اور اب آپ کی بیٹی کا ایک اور طلب گار میرے آفس میں ملنے آگیا تھا۔ کوئی عزیز ہمدانی تھا ہر شرط پر اس سے شادی کرنے کو تیار تھا۔ میں کہتا ہوں جب دونوں ساتھ کالج یونیورسٹی جاتی ہیں تو میری بیٹی سے کیوں ایسی کوئی بات منسوب نہیں ہوتی۔ ہر بار یہ ہی کیوں کارنامہ سرانجام دیتی ہے۔ تو دعائے خیر زور نکت لیے بس یک ٹک ان کے چہرے کو تگے جا رہی تھی۔ جو بات تو اپنے مخصوص دھمے انداز میں کر رہے تھے پر الفاظ اور لہجہ اس کے لیے اس قدر تحقیر لیے ہوئے تھا کہ اس کا دل چاہا وہ یا تو زمین پھٹے اور اس میں سما جائے یا دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائے۔ وہ اس کے لیے ہمیشہ اس اس یا لڑکی کا لفظ ہی استعمال کرتے تھے۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دعائے خیر بھی تو آپ کی بیٹی ہے وہ کبھی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی جس سے آپ کی عزت پر حرف آئے اگر وہ لڑکا آپ کے پاس رشتہ لے کر آیا بھی تھا تو یہ پہلو کہاں سے لکھتا ہے اس میں کہ دعائے خیر اس کو جانتی ہوگی یا اس کی مرضی بھی اس میں شامل ہوگی۔“ دعائے خیر کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کر ہی امی نے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

”وہ اس کی کلاس میں ہی پڑھتا ہے اور اس کی مرضی سے ہی میرے سر میں دھول ڈالنے آیا تھا۔ آپ کو اپنی پار سا بیٹی کا یقین نہیں آئے گا سو یہ ثبوت بھی دیکھ لیں۔“ دفعتا انہوں نے سامنے ٹیبل پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا اس کے چند مین پریس کر کے بشفین کی طرف بڑھایا۔

”یہ دو ان کو دکھاؤ۔“ بے حد سنجیدہ انداز میں انہوں نے سیل فون بشفین کو پکڑایا جس نے ایک نظر

تصویر پر ڈالی اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر امی کو دیا۔ جنہوں نے نا سمجھی سے فون پکڑ لیا اور اس پر نظر ڈالتے ہی ایک پل کو ان کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا۔ تصویر میں ایک خوب رو لڑکا اور دعائے خیر ایک ہی ٹیبل پر آئے سامنے بیٹھے تھے۔ دعائے خیر نظریں جھکائے جیسے تھی جب کہ وہ لڑکا ذرا آگے کو جھک کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ تصویر اگرچہ بہت دور سے بنائی گئی تھی تاہم اس میں موجود لوگ واضح تھے۔

”یہ آپ کو کہاں سے ملی اور دعائے خیر کسی کلاس فیلو کے ساتھ بیٹھ کر کچھ اسٹڈیز کے حوالے سے بھی ڈسکس کر سکتی ہے اس سے یہ کہاں۔“

”بس ساتھ بیگم! بس میں یہاں آپ کی تقریر سننے نہیں بیٹھا۔ میں نے آپ کی بیٹی کو پہلے بھی سمجھایا تھا کہ یہاں میرے گھر میں رہنا ہے تو شرافت سے رہے برا چھا صلہ دے رہی ہے یہ میری عنایات کا۔“ اسی لمحے دعائے خیر کی نظر اپنے بالکل سامنے بیٹھی بشفین کے چہرے پر پڑی جس کے چہرے پر موجود استہزائیہ مسکراہٹ اور تصحیک آمیز نظروں نے اسے ایک لمحے میں ساری بات سمجھا دی تھی۔ وہ اس لڑکی کی مکاری سے کبھی بھی جیت نہیں سکتی تھی۔ سو جھٹکے سے کرسی کو گھسیٹ کر اٹھی اور امی پر برستے پاپا کو ویسے ہی چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

یونیورسٹی کے سال اول میں جب دعائے خیر نے حسب معمول اپنی ذہانت سے کلاس میں نمایاں حیثیت اختیار کر لی تھی اور امی نے پاپا سے بھی ذکر کیا تھا کہ پروفیسر اس کی ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ یقیناً ”ٹاپرز میں شامل ہو جائے گی اگر ایسے ہی محنت اور لگن سے کام لیا اس نے تو پاپا کے چہرے کے نقوش کا کرختگی سے نرمی میں بدلنا اور دعائے خیر کو نرمی سے ایک دو دفعہ مخاطب کرنا بشفین کے دل کو آگ ہی لگا گیا۔ اس نے اگلے دو تین دنوں میں ہی اپنی مہم کا آغاز کر دیا تھا جو دعائے خیر کو پاپا کی نظر سے گرا دینے کے لیے تھی۔

وہ جب دیکھتی پاپا گھر آگئے ہیں تو اپنے سیل سے کسی

نمبر کو مہسج کر دیتی اور اس کے بعد لینڈ لائن نمبر وقتے وقتے سے بجتا ہی رہتا۔ کچھ دنوں میں گھر کے سب لوگوں کے ہی نوٹس میں یہ بات آگئی تھی کہ وہ رائگ نمبر ہر کسی کی آواز سن کر فون بند کر دیتا سوائے دعائے خیر کے جس سے اس نے کہا تھا کہ وہ محبت کی اس راہ میں اسے اکیلا کیوں چھوڑ گئی ہے، پلیز لوٹ آئے۔ وہ تو ہکا بکا رہ گئی پھر اس کو بے نقط ستائی بھی تھیں مگر مجال ہے جو اس ڈھیٹ شخص پر اثر ہوا ہو۔ امی کے فون اٹھانے پر اس نے یہی کہا تھا کہ پہلے تو دعائے خیر اس سے ملتی رہی ہے۔ گفتس وغیرہ بھی ہو رہی رہی ہے، مگر اب وہ ناراض ہے تو وہ اسے منانا چاہتا ہے، لیکن اس کا سیل نمبر بھی بند ہے۔ اب لینڈ نمبر پر بات کرنے سے بھی انکاری ہے۔ اس کے اس قدر بیگنی انداز پر تو ایک دفعہ امی خود بھی شک میں پڑ گئی تھیں مگر اگلے ہی پل دعائے خیر کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ان کو اپنی سوچ پر افسوس ہوا تھا۔

اور آخر کار ہشفین کے اتنے دن کی محنت رنگ لے ہی آئی۔ وہ پاپا کے ساتھ بیٹھی تھی جب موقع قیمت جان کر اس نے ٹیکسٹ کیا اگلے ہی منٹ میں لینڈ لائن نمبر بجنے پر اس نے کل اٹینڈ کی پھر اگلے دس منٹ میں اس نے ہی تین بار کال اٹینڈ کی۔

”پتا نہیں کون ہے اور کس سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ کال ایک کرو تو خاموشی۔“ وہ جھجھلاتی ہوئی پھر پاپا کے اس آگریٹھنے ہی والی تھی کہ اس بار پاپا نے بیل بجنے پر اسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر خود فون اٹھالیا۔ ہشفین نے بے اختیار ایک آسودہ سی سانس باہر نکالتے ہوئے دل ہی دل میں آگے پیش آنے والی صورت حال کا سوچ کر جیسے مزہ لیا تھا۔ امی پکن میں اور دعائے خیر اپنے کمرے میں تھی۔ دوسری طرف کی بات سنتے ہوئے پاپا کے ماتھے کی شکنیں گہری ہوتی جا رہی تھیں اور چہرے کا رنگ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

”آئندہ یہاں بھی فون مت کرنا کیونکہ اس نام کی کوئی لڑکی یہاں نہیں رہتی۔“ انہوں نے بے حد غصے سے بیور ٹھک کر کے کریڈل پر پٹچا اور امی کو آواز

دی۔

”کیا ہوا پاپا! کون تھا؟“ ہشفین کے بے حد بھول پن سے پوچھنے پر انہوں نے کوئی جواب دیے بغیر سامنے سے آئی امی کو دیکھا۔

”ہر گزرتے دن کے ساتھ تمہاری بیٹی مجھے یہ احساس دلارہی ہے کہ میں نے تمہیں اور تمہاری بیٹی کو عزت اور حفاظت دینے کا جو قدم اٹھایا تھا، وہ بے حد غلط تھا۔ میری زندگی کی سنگین ترین غلطی تھی۔ ابھی میٹرک میں تھی کہ اس کے نام کے لو لیسٹر یہاں آنے لگ گئے تھے۔“ اس بات پر بھی ایک کمینٹی سی مسکراہٹ ہشفین کے چہرے پر پھیل گئی۔ ”میں اس کی شادی کر دیتا چاہتا تھا تب تم ہاتھ پیر پڑنے لگیں کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہو گا اگے پڑھنے دیا جائے۔ اس کی پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر۔ مگر اب یہ جو ٹرنک کالز کا تانتا بندھا ہے گھر میں جس نے سب کا سکون اڑایا ہوا ہے۔ اس کے سرے بھی اسی سے جا کر مل رہے ہیں۔ بے غیرتی کی حد دیکھو کہ گھر کا نمبر تک دے دیا ہے کسی لڑکے کو، میں پوچھتا ہوں میرا گھر ہے یا کلب بھول رکھا ہے میں نے۔“

”وہ تو کوئی رائگ۔“ ابھی بات امی کی زبان سے پوری نکلنے نہیں پائی تھی کہ وہ ایک بار پھر دباڑے۔ ”تمہاری بیٹی کا عاشق خود کہہ رہا ہے کہ اسے یہ نمبر تمہاری بیٹی نے دیا ہے۔ آج کل کوئی ناراضی ہے ان کے بیچ۔ بس رہنے دو یہ پڑھائی کے ڈرائے اس سے کہو بلائے اسی لڑکے کو ہمیں اگلے ہفتے ہی اسے رخصت کرنا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ بے حد غصے میں وہاں سے چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہشفین بھی ایک جتنا ہی نگاہ ان پر ڈال کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ پریشان حال امی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”امی! آپ آج تک اس مکار لڑکی کی سازشوں کو نہیں سمجھ پائیں جنہیں یہاں پہلا قدم دھرتے ہی میں نے اس کی آنکھوں میں پینتے دیکھ لیا تھا۔ وہ آج تک ہماری اس گھر میں آمد کو قبول ہی نہیں کر پائی، لیکن آپ فکر نہ کریں۔ تعلیم مکمل کر کے میں اپنے پاؤں پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

کھڑی ہو جاؤں تو۔ میں خود ہی یہاں سے کسی ہاسٹل میں شفٹ ہو جاؤں گی۔ جتنی تکلیف وہ سازشی لڑکی مجھے یہاں دیکھ کر محسوس کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ تکلیف کا احساس مجھے پھیرے رکھتا ہے کہ میں کیوں ہوں اس جگہ پر۔ مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے اور اگر سوچا جائے تو شاہ نواز صاحب بھی حق بجانب ہیں۔

ان کو تو وہی نظر آتا ہے جو ان کو دکھایا جاتا ہے پھر ایسے فیصلے تو صادر کرنے ہی ہیں انہوں نے۔ آپ بس مجھے دو سال کی مہلت لے دیں ان سے۔ یقین کریں میری زندگی میں شادی اور مردوں جیسی باتوں کی کوئی گنجائش اس وقت تک نہیں ہے جب تک معاشرے میں میری اپنی ایک مستحکم حیثیت نہ ہو۔“ اس نے ہشتمین کی شخصیت کا اور فطرت کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کر کے امی کو بتا دیا تھا۔ وہ اب بھی ہوتی نظروں سے اسے بس دیکھ کر وہ گئی تھیں پھر انہوں نے دعائے خیر کے ناکرہ گناہوں کی معافی اپنے مجازی خدا سے مانگ کر ان کو منا ہی لیا تھا کہ دعائے خیر کو اس کی تعلیم مکمل کرنے دی جائے وہ غصہ بھی ہوئے تھے ان کو سنائی بھی تھیں پر بیٹی کے مستقبل کا معاملہ تھا سو مہربہ لب سب کچھ سن کر کسی کڑے کھونٹ کی مانند اپنے اندر اتار لیا تھا۔

اور اب جب امتحانات میں صرف دو ماہ کا عرصہ باقی تھا، کوئی عذر بہدانی نامی دعائے خیر کا کلاس فیلو اس کا طلب گار بن کر بقول ان کے اسی کی شہ پر پاپا کے آس آپنچا تھا اور گھر میں ایک بار پھر وہی الفاظ و حالات دہرائے گئے تھے۔



علی احمد کی ہمراہی اور خوب صورت رفاقت نے اس کے اس احساس ندامت کو ختم کر دیا تھا کہ اس نے مسجد کے حق پر اپنا تسلط جمایا ہے۔ وہ جان گئی تھی کہ نصیبوں کے کھیل میں انسان ایک بے بس پچھی کی مانند ہے جو لاکھ کوشش کر لے اپنے مقدر کے لکھے کو نہیں نہیں سکتا تھا۔ علی احمد کا ساتھ اس کی قسمت میں

لکھا تھا سوسل کے رہا اور پھر مسجد بھی بنا تھا اپنے گھر میں خوش تھی۔ پچھو نے اس پر اپنے گھر میں کبھی نہ قدم رکھنے کی جو پابندی لگائی تھی وہ اس پر پوری طرح عمل پیرا تھی پر برادری خاندان ایک تھا سو کسی نہ کسی موقع پر وہ ان کو دیکھ ہی لیتی جو نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر نظریں پھیر لیتی تھیں۔

اس کی خوشیوں کے دن بے حد مختصر ٹھہرے تھے جو ایک رات علی احمد شہر سے گاؤں واپسی پر ایک ایک سیٹلٹ میں جاں بحق ہو گیا۔ دعائے خیر ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ ابھی تو انہوں نے اپنے بچے کے حوالے سے بہت کچھ سوچنا اور بہت کچھ کرنا تھا ہر انسان اپنے آنے والے کل سے بے خبر ہے۔ غم کی اسی جان لیوا کیفیت میں اس نے بے حد کمزور سی بچی کو جنم دیا تھا۔ اس دن اسے ایسے لگا تھا جیسے علی احمد آج ہی مرا ہو۔ وہ معصوم بچی اس بات سے بے خبر کہ پیدا ہوتے ہی وہ باپ کی شفقت سے محروم ہے، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر رو رہی تھی۔

پھر بیٹے کے غم کو سینے میں چھپائے، جیسے ہی اس کی عدت پوری ہوئی تھی ایک دن اس کی ساس نے بھی زمانے کے غموں سے دامن چھڑا کر زندگی سے منہ موڑ لیا تھا۔ ایک بار پھر عمری دنیا میں اپنی بد قسمتی اور معصوم بچی کے ہمراہ اسی رہ جانے والی بچی کی ڈھال پھینچ دی بن کر آئی تھیں اور بیٹی کی ناراضی کو بھلا کر اسے سینے سے لگا لیا تھا، مگر ساڑھ بر بد قسمتی کے ابھی بہت سے وار باقی تھے، پچھو کے بیٹے شاہ نواز نے جس کی رشتہ کی تلاش پچھو اور مسجد شوق سے کر رہی تھیں اس نے ایک بار پھر ساڑھ کو کٹھرے میں لاکھڑا کیا جب اپنی ہمراہی کے لیے ساڑھ کا نام لیا۔

”ہاں! ویسے تو آپ اپنی یتیم بھتیجی کے غم میں بہروں کڑھتی نظر آتی ہیں، مگر یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ اسے بوہنا کر اس کے غم سے بھی آزاد ہو جائیں گی اور نیکی بھی کمالیں گی۔“

”خبردار، جو کوئی ایسی بات منہ سے بھی نکالی ہو۔“

ارے سے جملہ بے چاری کہتی رہ گئی کہ اس لڑکی کے پھن ایسے ہی ہیں منٹوں میں معصوم بن کر مردوں کو رجمایتی ہے کم بخت۔ پہلے تو میں کبھی نہیں مانی تھی پر آج مان گئی ہوں۔ کیسے میرا فرماں بردار جی حضوری کرنے والا بیٹا اس کے لیے میرے منہ کو آگیا۔ مجھ غریب کو کیا پتا تھا کہ یتیم یہ وہ بیٹھی کو نہیں فساد کی جڑ کو اٹھا کر گھر لارہی ہوں جس نے پہلے میری بیٹی کے حق پر ڈاکا ڈالا تھا اور اب میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئی ہے۔“ وہ لاکھ سمجھاتا رہ گیا کہ اس بے چاری کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہے وہ تو خود ہی اس کے ذہن میں آگیا کہ وہ خوب صورت شریف اور پڑھی لکھی لڑکی اپنی شریک سفر کے طور پر چاہتا ہے تو یہی خصوصیات ساتھ میں بھی تو موجود ہیں تو مضائقہ کیا ہے۔ اس سارے قضیے سے بے خبر ساتھ گزرے وقتوں کی بازگشت میں کھوئی ہوئی تھی۔

”پتا ہے ساتھ! میرا دل کرتا ہے کہ ہمارے ہاں پہلے بیٹی پیدا ہو۔ میری کوئی بہن نہیں تھی تو میری ہمیشہ سے ہی ایک بہن کی خواہش رہی ہے۔ وہ تو پوری ہوئی نہیں مگر اب مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ مجھے بیٹی ہی دے گا۔ میں اس کا نام دعائے خیر رکھوں گا۔“

”لیکن مجھے بیٹے کی آرزو ہے۔ جس طرح آپ بہن کو ترسے ہیں اس طرح میں نے پیش بھائی کی کئی محسوس کی ہے۔“ اس کی اپنی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”اوپ یہ تو پھر مسئلہ ہو گیا۔ ایسا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حضور ٹونز کی درخواست پیش کرتے ہیں۔“ اس کے شرارت بھرے لہجے پر کچھ کھلکھلا نہیں تھیں جن کا عکس اس وقت اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔



بہت دیر ہو گئی تھی انہیں شاہ میر پر نظر نکائے ہوئے وہ بنا بنایا بھائی جی تھا۔ ویسا ہی رنگ و روپ، ویسی رنگت ویسا ہی بولنے کا انداز، لیکن وہ بھائی جی

READ Secti

سے زیادہ سنجیدہ اور کم گو تھا۔ اس کے آنے پر انہوں کتنی ہی دیر اسے سینے سے لگائے رکھا۔ احساس زیاں نے اندر دور کہیں سر اٹھایا تھا کہ کیا ہوتا جو وہ یہ قدم بھائی جی کی زندگی میں اٹھالیتے پر ہر کام کا قدرت نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ کسی انسان کی کیا مجال جو اس سے آگے یا پیچھے کچھ کر سکے۔

انہوں نے مسز حسان کو بھی اپنے رویے کے حوالے سے خصوصی تاکید کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خوش نہیں تھیں تو ناخوش بھی نہیں تھیں۔ حسان صاحب نے شاہ میر کو مستقل اپنے ساتھ رکھنے پر ہیار بھرا اصرار کیا تو وہ چپ رہ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے آفس کی ٹین برانچ کا کام شاہ میر کو سونپ کر فیلڈ ورک سلمان کے حوالے کیا تھا۔ ان کی اتنی عنایتوں پر مسز حسان دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھیں۔



آخری پیر دے کر آتے ہوئے اسے عذیر ہمدانی نظر آیا تھا۔ پیپا کے تحقیر بھرے جملوں کی بازگشت اس کے آس پاس بگھرنی تھی۔

”صفت کرو اس لڑکی کی طرف واری۔ کوئی لڑکا کبھی بھی ایسی جرات اس وقت تک نہیں کرتا جب تک لڑکی کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہوئی گئی ہو۔ تمہاری بیٹی کی شہ پر ہی وہ مجھ سے ملنے آن پہنچا۔“ زلت کا کبرے احساس ہوا تھا کہ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی اس تک آگئی۔ اور آواز دے کر اسے روکا وہ جو گاڑی کالا کھول رہا تھا ایک خوش گوار حیرت کے تحت اس کی طرف پلٹا۔

”ارے زہے نصیب! آج تو میرے مقدر جاگ گئے کہ مس دعائے خیر نے مجھے خود سے آواز دی ہے، پکارا ہے مجھے۔ دل چاہ رہا ہے زمانے بھر کو اپنی خوشی میں شریک کر لوں۔“ ایک تو اسے بہت دن بعد دیکھنے کی خوشی، پھر خود اس کا پکارنا۔ اس کا انگ سرشار ہوا تھا تو وہ چمک کر بولا تھا۔

”کیا ملا آپ کو مجھے یوں ذلیل کر کے۔ میں سمجھی تھی آپ ایک اچھے انسان ہوں گے۔ اس لیے منع کر دیا تھا کہ آپ کی پسندیدگی ایک طرف، کبھی بھی اس مقصد کے لیے میری دلہن پر مت آئیے گا۔ ناکام لو میں گے اور آپ۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”آپ نے کیا کیا۔ میرے باپ کے دفتر پہنچ گئے اپنی محبتوں کی داستان سنانے۔ ایک لڑکی کے لیے اس کی عزت کے سوا کچھ بھی قیمتی نہیں ہوتا، مگر آپ یہ سب جانتے اور سمجھتے ہوتے تو۔ ایسا کبھی نہ کرتے۔ آپ کے ایک غلط قدم نے میری زندگی کو کتنا مشکل کر دیا ہے، آپ کیا جانتیں؟“ آنسو اس کے چہرے پر بہتے چلے گئے۔ عذریہ ہدائی تو جیسے ساکت ہی رہ گیا۔

جائے، مگر اتنی بات یاد رکھیں کہ ایسی صورت میں میری ماں کی مشکل زندگی ایک عنوان کے تحت زیر بحث آجائے گی کہ بیٹی یونیورسٹی جا کر اپنا پر خود ڈھونڈ کر لائی تھی جو کہ میں ہرگز نہیں چاہتی۔ چلتی ہوں۔“ پتا نہیں کیوں اسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بہت کچھ بتا کر فائل کو سینے سے لگائے اس سے دور ہوتی چلی گئی اور وہ چاہ کر بھی اسے نہیں روک سکا۔ یہ سوچ کر ہی اس کے دل کو کسی نے مسل ڈالا کہ وہ اسے شاید اب کبھی نہ دیکھ سکے۔



علی احمد کی ٹھکرائے جانے کی ذلت کی ایک پھانس آج تک سینے میں گڑی تھی۔ عم تو یہ تھا کہ پندرہ بھی کیا تو کسے۔ اس کے اوپر ترجیح بھی دی تو اس سے ہر درجہ میں کم سائہ کو جس نے ہمیشہ اس کی اترن پہنی تھی۔ پھر جب اماں نے بھائی کی ضد کا بتایا کہ وہ بھی سائہ سے اب بیوہ ہو کر ایک بچی کے ساتھ اماں کے گھر پر تھی نکاح کرنا چاہتا ہے، من کر ڈھی شیرینی بن گئی تھی۔

”اور پلا میں سائب کو دودھ تاکہ ایسے ہی وہ آپ کے بچوں کی خوشیوں کو گن گن کر نکلتی رہے۔“ وہ چیخ رہی تھی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی سائہ جس پر ابھی ابھی اس بات کا انکشاف ہوا تھا۔ ہل کر رہ گئی۔ اس نے آنا ”فانا“ ایک فیصلہ کیا۔ اپنے آبائی گھر جانے کا۔ اپنے ابا اور ماں کے آنکھن کو آباد کرنے کا۔

ابا کا مکان ان کی ایک بیوہ پھپھو کے پاس تھا، جو اپنے بیٹے بسو اور پوتے پوتیوں کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ علی احمد کی وفات پر وہ بھی اپنی بسو کے ساتھ آئی تھیں اور کتنی دیر اسے سینے سے لگا کر روتی رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ تھا کہ وہ گھر اس کی امانت ہے وہ جب چاہے وہاں آکر رہ سکتی ہے اور اس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے، مثلاً ”بیچنے وغیرہ کا تو صرف انہیں کچھ دن پہلے بتا دے تب اسے کسی بات کا ہوش ہی کہاں تھا۔ اگلے دن وہ سامان باندھ کر تیار ہو گئی تھی۔

”آپ۔ آپ رو میں مت دعائے خیر۔ آپ یقین کریں میرا مقصد غلط نہیں تھا۔ میں تو بس آپ کی ہمراہی چاہتا ہوں باعزت طریقے سے۔ آپ کے انکار کے بعد شلفین کے بے حد اصرار پر مجھے اسے اپنی پسندیدگی کے بارے میں بتانا پڑا پھر اس کے فوراً کرنے پر ہی میں آپ کے فادر سے ملنے گیا تھا اس نے کہا تھا۔“

”اس نے جو کہا تھا وہ آپ نے کروا لیا اور میں نے جو کہا تھا وہ آپ بھول گئے۔“ شلفین ہی تھی اس کے پیچھے بھی۔ یہ سن کر اس نے بے دردی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

”آپ نے جو کیا تھا وہ میری روح نکالنے کے مترادف تھا دعائے خیر۔ آپ سے دوری روح کا نکلتا ہی تو ہے نا جسم سے اس لیے دانستہ بھولنا پڑا مجھے۔ شلفین نے جو کہا اس میں امید تھی، آرزو تھی، میرے اس خواب کی تعبیر تھی جو آپ تک جاتا تھا اس لیے وہ سب کیا، لیکن نہیں جانتا تھا کہ آپ کو تکلیف ہوگی۔“ وہ پابست سے کہتے اس کے قریب آیا۔ دعائے خیر کی آنکھیں ایک بار پھر جھلملا گئیں۔

”آپ بہت اچھے ہیں عذریہ ہدائی، لیکن میری قسمت ہرگز اتنی اچھی نہیں ہے کہ آپ کی ہمراہی کے خواب دیکھ سکے۔ کوشش کروں تو شاید ایسا ممکن ہو بھی

”میں نے کبھی بھی آپ کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہا پھپھو! خدا گواہ ہے کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ مجھے بس ابا کے گھر تک بھجوا دیجیے اور دعا کیجیے گا کہ مجھ کمزور بے بس پر اس سے بڑی اور آزمائش نہ آئے۔ میں اب ساری زندگی علی احمد کی یادوں کے سہارے جینا چاہتی ہوں۔“ روتے ہوئے جس پل اس نے کہا ”مجھلا تو ہونہ کہہ کر اندر چلی گئی تھی جب کہ پھپھو کا ایک بار پھر دل پکھل گیا۔ وہ اسے ساتھ لگا کر رو پڑیں۔“

”صبر کر بیٹی اللہ بہتری کرنے والا ہے۔“ انہوں نے دلاسا تو دیا تھا پر اسے روک نہ پائی تھیں اور شاہ نواز کے گھر لوٹنے سے پہلے پہلے گاؤں کی ایک عورت بلوا کر اسے کرایہ دیا تھا کہ ساتھ کو متعلقہ جگہ پر پہنچا کرواپس آئے پھر ساتھ کے جانے کے ہفتہ بعد ہی انہوں نے ہتھالی پر سرسوں جما کر بیٹھے کو بیابا تھا اور ہولے آئی تھیں۔

بہت چھوٹی تھی جب اس کا نانا اس گھر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے باوجود اس گھر سے اسے اہل ابا کی خوشبو آتی تھی۔ ملکیت کا گہرا احساس تھا جو اسے طمانیت دے گیا تھا کچھ بوا اور ان کے گھروالے بھی بے حد سادہ اور مخلص لوگ تھے۔ انہوں نے اس احساس کو اپنے انداز اور رویے سے مزید تقویت دی تھی۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی تھی۔ اس حقیقت کو قبول کرنے کے بعد کہ اب اللہ کے بعد اس کا اور اس کی بیٹی کا کوئی سہارا دنیا میں نہیں بچا ہے۔ اسی نے دنیا کے سرد گرم کا مقابلہ کر کے اپنی اور بیٹی کی زندگی کی بقا کی جنگ لڑنی ہے زندگی کو گزارنا شروع کیا تھا۔

بوائے اگرچہ ایک دور تھے بھی بتائے تھے پر وہ اپنے حال پر راضی تھی پھر دعائے خیر کو کسی محبت کون دے سکتا تھا جتنی اس کا ساگاپ ورتا۔ اصل مسئلہ تو تب پیدا ہوا جب بوا کے بیٹے کی نظر ایک بھائی کی نظر سے مروی نظر میں بدل گئی۔ عورت عمر کے کسی بھی حصے میں ہوتے کے کسی بھی تار سے جڑی ہو خود پر پڑی نظر کا

منسوم فوراً ”سمجھ جاتی ہے۔ بوا کے بیٹے کی نظر کا بدلنا دونوں ہی عورتوں نے محسوس کیا تھا۔ اس مرو کی بیوی اپنے مرو کی نظریں بدل جانے پر پھر گئی اور وہ خود ایک دم بوکھلا ہی گئی تھی۔“

مرو جب نیت بدلتا ہے۔ تو ہمارے بھی گھڑ لیتا ہے۔ اس مرو نے واویلا شروع کر دیا تھا کہ چونکہ اس کی تین بیٹیاں ہیں تو اسے بیٹے کے لیے دو سری شادی کی سخت ضرورت ہے اور وہ دو سری عورت ساتھ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ اس کے بوا کے ہاں آجانے کے چار سال بعد کی بات تھی۔ وہ خود پریشان ہو گئی کہ اچھا بھلا بھائی نواز کیوں اس کی بر سکون زندگی کو تہہ و بالا کرنے پر تولا ہے۔ اس کی اپنی پھپھو ”مجھلا“ کی امی جو اب بیٹے کو بیابا کرا اپنی دانست میں ساتھ کی بیٹی سے دور کر چکی تھیں اب پھر سے اس کی خبر گیری کو کبھی کبھار آنے لگی تھیں۔

شاید وجہ یہ بھی تھی کہ جلدی میں ”مجھلا“ اور انہوں نے خود جو ہو ڈھونڈی تھی وہ شروع سے ہی تک چڑھی اور بد زبان قسم کی عورت تھی۔ ایک بیٹی نے جنم لیا تھا اس کے ہاں جو اب ڈھائی سال کی تھی۔ بہو کے برے سلوک نے پھپھو کو یہ وہ بیٹی کی یاد دلائی تو وہ ہفتے میں ایک چکر لگاتی تھی۔ بوا اور ان کی بہو کا بدلا رویہ پھپھو بھی دیکھتی تھیں پر مجبور تھیں کہ بیٹی کو اپنے گھر بھی نہیں لے جاسکتی تھیں۔

بوا کے بر سکون گھر کا ماحول بری طرح سے بگاڑ کا شکار ہو چکا تھا۔ بھائی نواز کی آتے جاتے یہی رٹ تھی کہ وہ اس سے نکل کر لے اور اس دن جب بوا اور ان کی بہو کسی فونگلی میں اور بیچیاں اسکول گئی تھیں۔ دعائے خیر سوری تھی جب بھائی نواز اسے اکیلا پا کر اس کے کمرے میں چلا آیا۔

”تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟“ نگاہ کے ساتھ لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ تین سال اس سے نظر جھکا کے آپ جناب کر کے بات کرنے والا ”آج آنکھوں میں عجیب سی چمک لیے اس سے تم کر کے مخاطب تھا۔“

”میں اپنا جواب آپ کی والدہ کو دے چکی ہوں۔“

آپ جس سے چاہے شادی کریں، لیکن مجھے معاف کریں۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ مرد سے مضبوطی سے بات کرنا اسے حالات نے سکھایا تھا۔

”میں نے تمہاری رائے نہیں پوچھی، صرف بتانے آیا ہوں۔ جمعے کو تیار رہنا۔ نکاح ہے ہمارا اور زیادہ چوں چرا کی تو یاد رکھنا کہ تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو مرد کو کوئی کچھ نہیں کہتا، عورت ہی بدنام ہوتی ہے۔ تمہارے بھلے کے لیے نکاح کا کہہ رہا ہوں ورنہ ایک بات یاد رکھنا۔ بے سہارا عورت کو حاصل کرنا مرد کے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہوتی۔“ عجیب انداز میں اسے دھمکا کر وہ باہر چلا گیا تھا۔

پھر بد کوئی پھپھو کی بہو کی اچانک موت کی خبر نے سب کو ہولادیا تھا۔ وہ دوسری بار امید سے تھی اور بچہ پیدا کرنے سے پہلے ہی کسی پیچیدگی کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ وہ سب اقساں و خیزاں وہاں پہنچے تھے جہاں ایک جوان موت پر صرف ماتم پوچھی تھی۔

بشفین جو دعائے خیر سے صرف آٹھ نوواہ ہی چھوٹی تھی سب کو روتے دیکھ کر بے حد ہراساں نظموں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔



وہ سب مسٹر حسان کی اس درخواست پر حیران ہی تو رہ گئے تھے۔ آج حسان صاحب اپنے خاندان کے ہمراہ سلمان کی شادی کی تاریخ لینے آئے تھے جب ایک انوکھی بات کر کے انہوں نے اپنے گھر والوں سمیت ان سب کو بھی حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

”کیا ہوا؟ میری بات بری لگی ہے کیا آپ کو؟“ ان کی مسلسل خاموشی پر وہ بولے تو پاپا بوکھلا سے گئے۔

”نہیں نہیں حسان! کیسی بات کرتے ہو۔ جب ایک بیٹی دے کر تم پر اعتماد کیا ہے تو دوسری کے لیے کیوں نہ کریں گے ہم۔ کیوں ساہ؟“ گم صم بیٹھی ساہ کی طرف مڑ کر وہ خوش گوار انداز میں بولے تو وہ کسی خواب سے چونکی تھیں۔

READ Secti

حسان صاحب کا سنجیدہ مزاج اور روشن پیشانی والا شاہ میر جو بے حد ادب سے ان سب سے ملا تھا۔ اس کا دعائے خیر کے لیے رشتہ انہیں اپنی ساری عمر کی دعائے خیر کے لیے کی جانے والی دعاؤں کا ثمر ہی تو لگ رہا تھا جب کہ مسز حسان کے چہرے کے نقوش ایک دم بگڑ گئے تھے۔ وہ حسان صاحب کی اسی عادت سے چڑتی تھیں جو وہ حتیٰ اور دو ٹوک فیصلے اچانک کر لیا کرتے تھے۔ ان کو اعتماد میں لیے بغیر اب بھی دل میں تلملا کر صرف اپنے بھائی کے چمکتے چہرے کو دیکھ کر چپ ہو گئی تھیں وگرنہ ساہ کی بیٹی کو وہ دیکھتا بھی پسند نہیں کرتی تھیں کجا کہ بہو بنا کر لے جانا۔ شاہ میر کی بیوی بھی تو ان کی بہو ہی ہوتی۔ حسان صاحب نے ہاں کا عندیہ پاتے ہی دعائے خیر کو بلا کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی آہلی پر پانچ ہزار کالوٹ رکھ کر بات کی کر دی تھی اور دونوں بچوں کی ایک ساتھ شادی پر زور اصرار بھی کیا تھا۔



بہو کے مرنے کے بعد پھپھو نے ایک بار پھر اسے کمزور لہجے میں رک جانے کو کہا تھا، مگر وہ چلی آئی تھی واپس اپنے گھر۔ بھائی نواز کی بہو ایک دفعہ پھر امید سے تھی اور روانے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے اللہ اس بار اپنا کرم کر دے اور بیٹا ہو جائے سو وہ شادی کا خیال چھوڑ دے۔ یوں بظاہر تو بھائی نواز چپ ہو گیا تھا پر اس کی نظریں چپ نہیں رہتی تھیں۔ بولتی تھیں اور ایسا کلام کرتیں جو ساہ جیسی شریف عورت کو ناگوار گزرتا۔

پھپھو نے اس دوران ایک دفعہ چکر لگایا تھا۔ وہ بشفین کے لیے بے حد پریشان تھیں۔ وہ ایک ضدی اور چڑچڑی بچی تھی۔ باپ اسے شرمیں بھی نہیں رکھ سکتا تھا اور پھپھو کے لیے بھی وہ مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ نتیجتاً ”بیجیلہ“ کچھ دنوں کے لیے اسے اپنے پاس شرم لے گئی تھی کہ شاید اس کے بیٹے کے ساتھ بہل جائے۔ ساہ چپ بیٹھی بس سنتی رہی تھی۔

پھر ان ہی دنوں میں ہی پر جوش سی پھپھو نے جلدی سے ایک اور چکر لگایا تھا اس بار وہ اپنی رضا سے اپنے بیٹے کے لیے ساتھ کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔

”دیکھو بیٹا! اللہ گواہ ہے کہ میں نے ہمیشہ تمہارا بھلا ہی چاہا ہے ابھی بھی میں صرف اپنے بیٹے کا نہیں سوچ رہی۔ تمہاری سونی زندگی کا دکھ بھی پہروں رلاتا ہے مجھے۔ کیا عمر ہے بھلا تمہاری، تمہاری عمر کی کئی لڑکیاں ابھی کنواری بیٹھی ہیں اور تم بیوگی کی چادر اوڑھے بیٹھی ہو۔“ وہ ابدیدہ ہو گئیں۔ ”ہشتمین کو اپنا لوگی تو اس یتیم کا بھلا ہو گا پھر تمہاری بیٹی کو بھی باپ کا پیار اور تحفظ مل جائے گا۔ آج ایک نواز کی نظریں بدلی ہیں۔ کل کوئی دوسرا آن کھڑا ہو گا۔ پھاڑ سی زندگی کیسے گزرے گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔“

پھپھو بہت دیر بیٹھی اسے سمجھاتی رہی تھیں اور وہ جو ساری زندگی علی احمد کی یادوں کو سینے سے لگائے تھا ہی زندگی گزارنے کا عہد کیے بیٹھی تھی اس عہد میں دراڑیں پڑنے لگیں۔

بھائی نواز کے نسلے کے بعد بوا کا رویہ بھی روکھا ہو گیا تھا۔ وہ تو گھر اس کا اپنا تھا ورنہ وہ اسے نکال باہر کرنے کو دیر نہ لگائیں پھر کچھ پھپھو کی باتیں دعائے خیر کا مستقبل۔ اس کی عزت کا تحفظ بہت سی باتیں تھیں جس کا سوچ کر اس نے تیسری بار میں پھپھو کو ہاں کا عندیہ دے ہی دیا تھا پھر جس گھر نے اسے پہلی بار بیٹی بنا کر پناہ دی تھی آج ایک بہو کے طور پر اس کے کیے با نہیں وا کیے کھڑا تھا۔



”ساری زندگی جس لڑکی سے آپ نفرت کرتی رہیں اور مجھے بھی یہی سبق دیا۔ آج اسے کس طرح ہو بنانے پر راضی ہو گئیں آپ پھپھو؟ اسے تو میں پیپا کے گھر میں کس مشکل سے برداشت کرتی تھی میں جانتی ہوں۔ اب پوری زندگی کے لیے مسلط کر دیا آپ نے اس لڑکی کو میرے اوپر۔ انکل چھوٹی سے چھوٹی بات آپ سے پوچھ کر کرتے ہیں تو میں یہ مان ہی

READ
Secti

نہیں سکتی کہ آپ کو پتا بھی نہیں تھا اور انکل نے شاہ میر کے لیے اس کا رشتہ بھی مانگ لیا۔ آخر کچھ تو بات ہوئی ہوگی آپ لوگوں کی اس حوالے سے جس لڑکی کو میں نے گھر میں اپنے برابر ڈاکٹنگ ٹیبل پر نہیں بیٹھنے دیا جس کے ساتھ کلاس میں مجھے نہ بیٹھنا پڑے یہ سوچ کر میں نے اپنی پسند کے مضامین چھوڑ دیے کیونکہ وہ اس نے سلیکٹ کیے تھے پھر اب ایک گھر میں کیسے آپ نے اسے میرے مقابل لا کھڑا کیا۔“ وہ شعلہ جوالہ بنی پھپھو سے سوال پہ سوال کیے جا رہی تھی ان کو کچھ بھی کہنے کا موقع نہ رہے بغیر سلمان سے شادی کی ساری خوشی غارت ہو گئی تھی اس وقت جب اس نے انکل کو پیپا کے ہاں کا عندیہ پاتے ہی دعائے خیر کو بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور ہاتھ پر پانچ ہزار رکھتے دیکھا تھا۔ پھپھو البتہ ہر تکلف سے بے نیاز پاتے پر تیوریاں چڑھائے بیٹھی رہی تھیں۔ کچھ دیر قبل گے خوش گوار موڈ کو بھلائے اور اب پندرہ منٹ سے ہشتمین کے کمرے میں بیٹھی وہ بھی ٹاویلیں دے رہی تھیں کہ حسان صاحب نے اچانک ہی یہ بات چھیڑ دی تھی۔ انہیں کسی قسم کا علم نہیں تھا نہ ہی اندازہ تھا کہ وہ ایسی کوئی بات کر دیں گے۔

”اور۔۔ اور مجھے تو اس شاہ میر کا اس لڑکی کو ایسی پر شوق نظروں سے دیکھنا آگ لگائے دے رہا ہے۔ ضرور اس نے کوئی چکر چلایا ہو گا اس کے ساتھ ورنہ امریکا پلٹ کوئی بھی لڑکا اتنا فرماں بردار کبھی بھی نہیں ہو سکتا کہ بغیر دیکھے بغیر ملے صرف اپنے انکل کی بات مان کر شادی جیسی زندگی بھر کی کمٹمنٹ پر راضی ہو جائے۔“ وہ غصے سے کھولتی پھپھو کے پاس آن گئی۔

”ارے نہیں! ایسا کچھ نہیں ہے۔ شاہ میر بیباچہ ہے اور تمہارے انکل کو اپنے باپ کی جگہ پر مانتا ہے پھر وہ تو آفس اور بزنس کے جھمیلوں میں ہی الجھا ہے جب سے آیا ہے تمہارے انکل کے ساتھ ہی ہونا ہے۔ اس نے تو اس لڑکی کو آج ہی دیکھا ہے بس یہ عورتیں ہیں ہی ایسی عمنٹوں میں اپنی معصومیت اور

سے کسی نے پوچھا پھر بھی افاقہ نہ ہو تو؟ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ اس کی مقدار بڑھا دو۔
میری ماں نہیں تھی مجھے ہر گز وقت نے سکھایا تھا۔ اور میں اپنا یہ سنہری گر تمہارے پلو سے باندھتی ہوں۔ وہ نم گجے میں بولیں تو دعائے خیر کو اپنی صابری ماں پر بے حد پیار آیا تھا۔



وہ بیاہ کر آئی تھی اسے پاکر وہ خوش نہیں تو مطمئن ضرور تھا۔ اب ساتھ چاہتی تھی کہ ہشفین کو اس کی پھوپھو کے گھر سے واپس لے آیا جائے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کچی مٹی سے نقوش اپنی مرضی سے ڈھالے جاسکتے ہیں مگر سبجیلہ بہانہ بنا دیتی کہ وہ شہر میں بہترین اسکول میں بڑھ رہی ہے وہاں میں بھلا ایسے اسکول کہاں جب کہ ساتھ نے دعائے خیر کو گاؤں کے اسکول میں ہی داخل کرادیا تھا۔ سبجیلہ نہیں چاہتی تھی کہ ساتھ اس کی بھابھی بنے۔ اس کی اپنی ماں سے جھڑپ بھی ہوئی تھی مگر اس بار اس کی ماں نے بیٹی کی بات نہیں مانی تھی اور بیٹی کو بیاہ کر لے آئی تھیں۔ سبجیلہ کو لگا کہ ساتھ نے اسے پھر ہرایا ہے حالانکہ یہ اس کی اپنی سوچ تھی اور اسی سوچ نے اس کے دلخ میں ایسے زہر بھرا کہ وہ یہ زہر ہشفین کے ننھے دلخ میں بھی منتقل کرنے لگی۔

پھر جب اماں کی وفات کے بعد شاہ نواز ساتھ کو لے کر شہر شفٹ ہو گیا کہ اب تو اماں بھی نہ رہی تھیں جس کی وجہ سے گاؤں میں رکنا پڑتا یا آمدورفت کا سلسلہ جاری رکھنا پڑتا۔ پھر اس کی جاب بھی شہر میں تھی۔ تو اب سبجیلہ کے پاس ہشفین کو روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ مگر وہ اس کے ننھے دلخ میں سوتیلی ماں سوتیلی بہن جو اس کے پیار پر قبضہ کرنے آئی تھی کی نفرت راج کر رہی چکی تھی۔ مسلسل اس گھر میں آتے رہتے اور ہشفین کے وہاں جانے پر نفرت کی پختگی کا یہ عمل مزید پختہ اور دراز ہوتا چلا گیا۔ ہشفین نے پہلے دن سے ہی ساتھ اور دعائے خیر سے بیر رکھا۔ وہ غصہ

ہوتی ان پر چیختی چلاتی تو شاہ نواز ساتھ پر ناراض ہوتے کہ وہ تو اس کی بیٹی کو ہر سہولت دیے ہوئے ہیں تو وہ کیوں ان کی چھوٹی سی بچی کو اپنی محبت سے رام نہیں کر پارہی۔ ساتھ مارے بے بسی کے رو پڑتی۔

سبجیلہ نے ہشفین کے کچے ذہن کو ہی خراب نہیں کیا۔ بھائی کی از رو واجبی زندگی میں بھی ہر ممکن زہر گھولنے کی کوشش کی تھی۔ جب موقع ملتا بھائی کو باتوں باتوں میں باور کرائی کہ علی احمد سے ساتھ کی شادی ایک زوردار افیر کا نتیجہ تھی۔ شاہ نواز تھا تو مروہی کئی کئی دن اس کا موڈ اس بات پر خراب رہتا۔ پھر عمر اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہشفین نے چننا چلانا اور چیزیں توڑنا پھینکنا تو ختم کر دیا مگر ساتھ اور دعائے خیر کو بچ کرنے کے باپ کی نظر میں نیچا دکھانے کے نئے نئے طریقے سیکھ لیے۔

اب تو وہ ان دونوں کی نفرت میں اتنی آگے جا چکی تھی کہ سبجیلہ کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملتا وہ خود ہی منہ پیچھکنڈوں میں ماہر ہو چکی تھی۔ جن کی وجہ سے ساتھ کو پوری زندگی ہی مختلف مشکلات کا سامنا رہا تھا جن میں سرفہرست دعائے خیر سے ہشفین کے باپ کی بے زاری تھی۔ دعائے خیر سے حسد تو بجا تھا وہ ساتھ کو بھی باپ کی بیوی کے طور پر بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوئی تھی۔ باپ کا انکشاف ان کی بیوی سے عام لہجے میں بات چیت اس کے اندر آگ لگا دیتی تھی۔ ایسے میں وہ خود کو نقصان پہنچا کر بھی باپ کی توجہ مکمل طور پر اپنی طرف کروا کر آسودہ ہو جاتی تھی۔ حسد اور نفرت کا یہ سلسلہ جو سبجیلہ نے اپنے انتقام کے لیے شروع کیا تھا ہشفین کے ذریعے جاری و ساری تھا۔ ایسے میں دعائے خیر اگر پریشان تھی تو ٹھیک پریشان تھی۔

”میرے کپڑوں یا جیولری سے ملتی جلتی کوئی چیز اس لڑکی کے لیے خریدی گئی تو میں ہر چیز کو آگ لگا دوں گی۔“ اس نے سلگتے ہوئے کہا تھا۔

”ارے تم فکر ہی نہ کرو ہشفین! وہ لڑکی کسی بھی طرح تمہارے ہم پلہ نہیں ہے تمہارے انکل نے

مجھ سمیت میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ کچھ بولیں گی نہیں۔“ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔

”شاہ میر۔“ اس کے منہ سے اپنا نام بکارا جانا سے بے حد اچھا لگا تھا۔ ”بہت سے حالات مختلف ہوتے ہوئے بھی ہم دونوں ہی بہت سے معاملوں میں ایک جیسے ہیں۔ میں کوشش کروں گی آپ کی ہر خواہش پوری کر سکوں اور آپ کو مجھے اپنی زندگی میں شریک کرنے کے بعد کسی کمی، کسی محبت کی کمی کا احساس نہ ہو۔“ دھیمے لہجے میں اس نے آہستہ سے اس تک اپنا اقرار پہنچایا اور فون بند کر دیا۔

دونوں ہی اس وقت ایک سرشاری کی کیفیت میں تھے۔ مگر شام سے پہلے ہی دعائے خیر کی وہ کیفیت اس وقت ختم ہوئی جب اس نے پھپھو کی طرف سے آیا بری کا سامان دیکھا۔ انتہائی ریشمی بھڑکیے کپڑوں کے ساتھ ستے اور ہلکے زیور است۔ امی بھی بے حد چُپ تھیں۔ کچھ دیر ان چیزوں کو ملاحظہ کرنے کے بعد اس نے امی کو دیکھا تو ایک بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔ کسی کی محبت کا بخشا گیا اعتماد ان مادی چیزوں پر حاوی ہو گیا۔

”چند دن قبل مجھے پرہایا گیا سبق آپ اتنی جلدی بھول گئیں جو اتنی افسردہ بیٹھی ہیں۔ آپ صرف میرے نصیب کے اچھا ہونے کی دعا کریں امی بس مجھے ان مادی چیزوں یا مستایا منگا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ نرمی سے کہتی وہ ان کے پاس آن بیٹھی۔

پھر آنے والے دنوں میں جو جو کام اور چیزیں مردوں کے ذمہ تھیں ان میں دونوں کے حوالے سے ہی برابری کی گئی۔ جیسے ایک شادی ہال میں شادی کا ارنج منٹ تھا۔ ایک ہی پارلر میں ان دونوں دہنوں کی بکنگ تھی۔ پر شادی کے دن ہشتمین دعائے خیر کی سچ دیکھ کر ہی حیران رہ گئی۔ نیک اعمال کی روشنی ہی چروں پر اجالا بن کر چمکتی ہے شاید اسی لیے دعائے خیر کو دیکھ کر نگاہ نہیں ہٹی تھی جب کہ ہشتمین دعائے خیر سے زیادہ خوب صورت تھی۔

ہر چیز کا مختار مجھے ہی بنایا ہے۔ کسی خریداری کرنی ہے کہاں سے کرنی ہے ان باتوں کا مردوں کو بھلا کیا پتا۔ مجھے پتا ہے میری شنزادی کی چوائس کیا ہے اور تم اپنی مرضی سے شاپنگ کرو بیٹا۔ اس لڑکی کی کیا مجالی جو تمہارا مقابلہ کرے۔ بے فکر رہو اس بات سے۔“ انہوں نے اسے پچکارا تو اس کا موڈ بحال ہوا۔



”شاہ میر بات کر رہا ہوں۔“ اس کی گھبیر آواز سے ہتھیلیوں تک میں پینہ اتر آیا تھا۔ ”لو کیوں میں“ آدم بے زار قسم کا بندہ مشہور رہا ہوں۔ کچھ میری طبیعت ہی ایسی تھی کچھ ماں باپ کی تربیت سمجھ لیں کہ مغرب میں رہ کر بھی میں ہمیشہ مشرقی ویلیوز کا حامی رہا ہوں یہی وجہ ہے کہ جہاں انکل نے کہا ان کی پسند پر سر جھکا دیا میں نے۔ مگر آپ کو دیکھنے کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ میری بھی پسندیں گئی ہیں آپ باقی رہی محبت تو میرا ایمان ہے کہ ہر جائز رشتہ میں خصوصاً یہاں بیوی کے رشتہ میں محبت کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اس کو کیسے پھیلانا ہے یہ فریقین پر ڈھینڈا کرتا ہے کیونکہ خالفتا“ اللہ کی رضا سے جوڑا گیا رشتہ ہوتا ہے تو محبت کے سلسلے بھی وہی ڈالتا ہے۔ آپ سن رہی ہیں میری بات۔“ اس نے اپنی بات روک کر پوچھا تو دعائے خیر نے مختصراً ”جی کہا اور خاموشی سے ہتھکسل بولتے اس بندے کو سننے لگی جس کے بارے میں وہ یہ سن چکی تھی کہ وہ کم گو بندہ ہے۔

”دعائے خیر! آپ کا نام بہت پیارا ہے بالکل آپ کی شخصیت سے میل کھاتا ہوتا۔ اجلا“ نرم اور دھیرا۔“ وہ ہلکے سے ہنسا تو دعائے خیر بھی مسکرائی۔ ”میں رشتوں کو ترسا ہوا ہوں دعائے خیر۔ رشتے اور محبتیں بہت کم ملیں مجھے اور وہ بھی بہت جلد اللہ نے واپس لے لیں۔“ دعائے خیر کو لگا اس کا لہجہ کچھ نرم ہوا تھا۔

”سو میں محبتوں کی کمی آپ سے پوری کرنا چاہوں گا۔ میری صرف آپ سے یہی ڈیمانڈ ہے۔ باقی میں“



بشغین کے اندر کا حسد ہی اسے خوش ہونے نہیں دے رہا تھا۔ حسان صاحب نے دونوں جوڑیوں کے ورلڈ ٹور کے ریٹرن ٹکٹ گفٹ کیے تھے مگر شاہ میر نے شائستگی سے منع کرتے ہوئے انہیں روک دیا تھا کہ وہ مغربی ماحول کا پروردہ ہے سو وہ اس خوب صورت موقع پر اپنے پاکستان کو دیکھنا چاہتا ہے۔ انکل حسان مسکرا کر چپ ہو رہے تھے اور اگلے ہی روز شاہ میر اور دعائے خیر شمالی علاقہ جات کی طرف جب کہ سلمان اور بشغین ورلڈ ٹور پر نکل گئے تھے۔

دعائے خیر اور شاہ میر دونوں ہی محبتوں سے محروم افراد تھے مجنہوں نے مل کر ایک دوسرے کو اپنی محبت دی اور ذات کا اعتماد کیا بخشا کہ دنیا جنت ہی بن گئی تھی دونوں کے لیے۔ بیس دن بعد وہ خوشیوں سے چھتے چہرے لیے لوٹ آئے تھے انکل حسان بے حد خوش ہو کر ملے تھے جب کہ پھوپھو سپاٹ چہرے لیے بس کھوجتی نظروں سے ان کا پوسٹ مارٹم ہی کرتی رہی تھیں۔

دعائے خیر کو بھی پیپا نے چیز میں وہی سب کچھ دیا تھا جو بشغین کو مگر بشغین نے کھرا اپنی پسند کا لیا تھا۔ پیپا کو نہیں کہہ سکی تھی کہ دعائے خیر کو وہ سب کچھ مت دیں۔ یا ویسا مت دیں جیسا اس کو دے رہے ہیں بھلا کیا توجیہ پیش کرتی وہ پیپا کو سول کی جلن کو چھپائے چپ رہی تھی۔

دعائے خیر نے اوپر کے پورشن کو اپنی مرضی سے نیٹ کیا تھا۔ کل تو سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے وہ دونوں کھانا کھا کر سو گئے تھے۔ آج حسب معمول نماز کے وقت اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ نماز پڑھنے کی عادت ساتھ نے اسے شروع ہی سے ڈالی تھی سو نماز و تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک مالکانہ احساس کے تحت یہاں وہاں چل پھر کر دیکھنے لگی ایسا احساس جو شاید اس کی شعوری زندگی میں پہلی بار اسے ہوا تھا۔ اس کی ماں کا گھر پایا کا تھا۔ بشغین کا تھا۔ گھر میں ہر سہولت اور ضرورت کی ہر چیز ہونے کے باوجود وہ یوں ڈر ڈر کر ہر چیز استعمال کرتی جیسے چوری کر رہی ہو۔

بشغین کا رویہ بھی اس قسم کا ہوتا۔ ڈانٹنگ

ٹھیل پر جس کرسی پر وہ بیٹھی ہوتی، بشغین اسے اٹھا دیتی۔

”یسا کرو تم کسی اور چیز پر بیٹھ جاؤ۔ مجھے بیٹھنا ہے یہاں۔“ وہ خاموشی سے جگہ چھوڑتی۔ مقصد دعائے خیر کو بچ کرنا ہوتا۔ ساتھ دعائے خیر کی پسند کی کوئی چیز بتائیں تو اس پر اسے اعتراض ہوتا۔

”پنی اولاد ہے آپ کی اس لیے اس کی پسند کی ڈشز بنانا کر سامنے رکھتی ہیں۔ مجھ سے تو کبھی نہیں پوچھا کہ میں بھی کچھ کھانا چاہتی ہوں۔“ وہ طنز بہتی تو ساتھ بے چاری ٹھہرا جاتیں۔

”بیٹا! آپ کی بھی تو ماں ہوں میں۔ ماں سے بھلا کیسی شرم؟ آپ کو بھی جو کچھ چاہیے ہو بتا دیا کریں۔“ وہ نرمی سے کہتیں تو وہ ہونہ کر کے رہ جاتی۔ دعائے خیر کے لیے کھانا کھانا مشکل ہو جانا ایسے حالات میں۔

یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ بلا شرکت غیرے۔ وہ ایک بار پھر اپنے کمرے میں آگئی بے خبر سوائے شاہ کے پاس آکر نرمی سے اس کے ماتھے پر بڑے بالوں کو سلجھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مختصر سی رفاقت میں ہی وہ اس کی اچھائیں اور محبتوں کی معترف ہو گئی تھی۔

”شاہ میر اٹھ جائیں۔ میں ناشتا بناتی ہوں۔“ اس کا باندھلاتی وہ کمرے سے باہر آگئی۔ جانتی تھی کہ وہ اسی کی طرح سحر خیز تھا۔ ابھی اٹھ جائے گا۔ جب تک وہ فریش ہو کر آیا دعائے خیر ناشتا کا چکی تھی۔ کچھ لمحے وہ یونسی ہاتھ باندھ کر اسے دیکھا رہا۔

”کیا ہوا؟“ وہ ابھی۔ ”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ ”کچھ نہیں، ایک عرصہ بعد وہ ماحول دیکھا جو میری ماں کی زندگی میں تھا۔“ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو نمی چھکی پھر وہ چیئر پر آکر بیٹھ گیا۔ اور بازو سے پکڑ کر اسے بھی سامنے والی کرسی پر بٹھا دیا۔

”تو دعا! میری ماما کہتی تھیں کہ نوکر چاکر ہوتے ہوئے بھی جو عورت دل لگا کر اپنے گھر کا کام کرتی ہے تو اس سے پتا چلتا ہے کہ اسے گھر سے کتنا لگاؤ ہے اور

اس کا اپنے ہاتھ سے اپنے خاوند یا بچوں کے کام کرنا اس کی بے تحاشا محبت کا ثبوت ہوتے ہیں۔ آج اچانک کی ان کی بات یاد آگئی تھی۔ لو، ناشتا شروع کرو۔“ نرمی سے کہتا ہوا وہ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

پھر اس روٹین میں ہی ایک ہفتہ بعد پشپین اور سلمان بھی لوٹ آئے تھے۔ وہ شاہ میر کو بیچ بنا کر دیے دیتی تھی کیونکہ پھر اس کی واپسی شام کو ہی ہوتی تھی۔ ملازمین میں سے صرف ایک صفائی والی ماسی کو اس نے کہا تھا کہ وہ آیا کرے بس باقی دو کل وقتی ملازم جو انکل حسان کی طرف سے تھے، کو دعائے خیر نے نرمی سے منع کر دیا تھا۔ دوبارہ ڈرائیور کے ساتھ اور ایک بار شاہ میر کے ساتھ امی کے پاس جا چکی تھی ماسی کے جانے کے بعد وہ ایک آدھا گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ظہر کی نماز پڑھتی پھر اپنے لیے کچھ پلکا پھلکا بنا کر کھانے کے بعد بڑے شوق سے شاہ میر کے لیے کھانا بنانا شروع کر دیتی تھی۔

اس کی پرسکون زندگی میں اس وقت تھوڑی ہلچل مچی جب ایک دن صبح وہ دونوں ناشتے میں مصروف تھے کہ غیر متوقع طور پر انکل حسان اوپر آگئے۔ ”واہ بھئی! یہاں تو بڑی خوشبو میں اڑ رہی ہیں۔ صبح جوان ہے گویا، جب کہ نیچے تو سویا ہوا محل کا سا منظر ہے۔“ وہ خوش دل سے کہتے ہوئے کرسی چھینٹ کر بیٹھے۔

”ہاں بھئی دعائے خیر! آج تو ہمیں بھی اپنے ہاتھ کا ناشتا کھلا دیجیے۔ برسوں گزر گئے خاتون خانہ کے ہاتھ کا بنا کچھ کھائے ہوئے۔“ دعائے خیر سر ہلا کر جلدی سے سامنے بنے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”سچ پوچھو تو شاہ میر! تمہیں اپنے گھر میں مطمئن اور شاد دیکھ کر کیسا سکون دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے شاید تم محسوس نہ کر سکو۔“ وہ حقیقی خوشی سے سرشار تھے۔

”تم سے ایک فائنل ڈیل کے حوالے سے کچھ بات کرنا تھی سو چاکل کر لوں پر دل کیا اپنے بیٹے کا گھر دیکھنے کو بہو سے ملنے کو تو چلا آیا۔“ وہ ناشتے سے بھرپور

انصاف کرتے ہوئے بولے۔

”انکل! آپ کا اپنا گھر ہے آپ بغیر کسی وجہ کے بھی یہاں آسکتے ہیں۔“ شاہ میر نے مسکرا کر کہا۔

”اور انکل میری خواہش ہے کہ تین ٹائم میں کسی ایک وقت کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں تو ہمیں بہت زیادہ خوشی ہوگی کیوں شاہ میر۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”بالکل انکل، دعائے خیر بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔“

”ویسے یہ ہے تو بڑھاپے میں عادتیں خراب کرنے والی بات لیکن میری بہو نے پہلی دفعہ کوئی خواہش کی ہے تو اسے رد بھی نہیں کیا جاسکتا تو سوچتے ہیں کچھ۔“ انکل حسان تو دعائے خیر کی بے تکلف اور سادہ فرمائش پر دل بھر کے خوش ہوئے تھے۔

یہ گھریلو سادہ اور محبت بھرا ماحول ان کو بہت اچھا لگا تھا۔

”یہ لو بہو! اپنے ہاتھ کا کھانا بلکہ ناشتا پہلی بار کروانے پر تمہارا انعام“ انہوں نے اٹھتے سے والٹ سے کچھ کڑکڑاتے نوٹ نکال کر دعائے خیر کی طرف بڑھائے تو وہ جھجک سی گئی اور بوکھلا کر شاہ میر کو دیکھا، جس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔ دعائے خیر نے آہستہ سے شکر یہ کہتے ہوئے وہ نوٹ تھام لیے تھے۔

”ویسے انکل! یہ ناشتا خاصا مزہنگا نہیں پڑ گیا آپ کو۔“ وہ دونوں ان کو میز میوں تک چھوڑنے آ رہے تھے جب شاہ میر نے شرارت سے دعائے خیر کو دیکھ کر انکل کو کہا تو وہ خوشگوار حیرت میں گھر کر شاہ میر کو دیکھنے لگے۔ کم گو سے شاہ میر کا ایسے ملکہ پھلکے انداز میں بات کرنا یقیناً اس بیماری سی لڑکی کی رفاقت کا کمال تھا ورنہ ایک یاسیت کا افسردگی کا احساس شاہ میر کے لہجہ سے ہمہ وقت ٹکا کرتا تھا اور مسکراتے تو انکل نے اس کو شاذ ہی دیکھا تھا جب کہ اب جب سے وہ آئے تھے وہ مسلسل مسکراتے ہوئے ہی بات کر رہا تھا۔

”بیٹا! خلوص اور محبت جیسے انمول خزانوں کے لیے

یہ مادی چیزیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہمیشہ ان کی قدر کرنی چاہیے ورنہ دولت اور پیسہ تو ایک پل ہے تو دوسرے پل اس سے دامن خالی ہو جائے کچھ پتا نہیں۔ بس جذبوں سے دل کو بھرنے رکھو اسے کبھی خالی مت ہونے دو بچتے رہو۔ خوش رہو۔“ ان دونوں کو مسکراتے دیکھ کر انہوں نے جذب سے دعا دی اور نیچے اتر گئے تھے۔



واپس آنے پر دو تین دن تو تھکاوٹ اتارنے میں ہی گزر گئے۔ اگلے روز ہشفین کی آنکھ بمشکل کسی کے جھنجوڑ کر جگائے جانے سے کھلی تھی۔ وہ سلمان تھا۔ نیند کے غلبے کی وجہ سے اسے یہ تو پتا چلا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ پر کیا؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

”ہشفین! اٹھ جاؤ یا ر! کیا ہے؟ کتنی دیر ہو گئی ہے مجھے تمہیں جگاتے ہوئے مجھے آفس بھی جانا ہے۔“

”ہاں تو جاؤ۔ میں نے کب روکا ہے تمہیں۔“ وہ بمشکل اپنے اندر کی ناگوار پھیلائی تھی۔ آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔

”بھئی! شادی کے بعد میرا آفس کا پہلا دن ہے۔ ناشتا بنانے میں دھما دھما کم از کم سی آف ہی کرو مجھے۔ پھر بے شک سوئی رہنا۔“ شرٹ پہن کر ٹائی لگاتے ہوئے اس نے جس فرمائش کا اظہار کیا تھا اس کو سن کر ہشفین کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔

”کیا مطلب سلمان! خانسا ماں ہو گا ناں باہر۔ وہ تمہیں ناشتا دے دے گا۔ یونیورسٹی کے لیے صبح اٹھنا ہی عذاب لگتا تھا مجھے اب تو دل بھر کر سونا ہے مجھے اور ویسے بھی یہ ٹل کلاس چوتھے مجھے کبھی پسند نہیں رہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی اور دوبارہ سے دھم سے تکیے پر سر رکھ دو سرا تکیہ اٹھا کر منہ پر رکھ لیا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور ایک طویل اور گہری سانس لیتا ہوا مڑا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

خانسا ماں کو ناشتا لگانے کا کہہ کر وہ وسیع و عریض ٹیبل کے گرد بیٹھا قنوطیت میں گہرا بہت کچھ سوچتا رہا۔

بہت سال ہاسٹل کی خاک چھائی تھی اس نے۔ پھر کچھ عرصہ ملک سے باہر بھی گزارا لیکن گھر آنے پر بہت سی خواہشات اندر سے پھوٹی تھیں۔ کاش ملا اسے گلے سے لگالیں کاش وہ اس کے دوسرے کئی دوستوں کی طرح اس کے لیے اس کی پسند کے کھانے اپنے ہاتھ سے بنا کر کھلائیں۔

پرچک 32 کی سبھی ساس کے مرنے کے بعد جب شہر آئی تھیں تو ٹل کلاس طور طریقے اور روایات کو خیر یاد کہہ کر آئی تھیں۔ وہ مکمل طور پر۔

شہری زندگی کے اس طرز میں ڈھل گئیں جو پر کلاس کے بعض گھروں کا خاصہ ہے۔ حسان صاحب چونکہ ایک صلح جو شخص تھے کچھ سبھی کے تیز مزاج سے واقف سواس کو اس کے حال پر چھوڑ کر خود کو بزنس میں گم کر لیا۔ یوں ایک احساس محرومی سلمان کے اندر وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا گیا۔ پھر یہ احساس اس وقت پوری طرح ابھر کر سامنے آیا جب وہ مستقل پاکستان میں آ گیا اور اپنی بچپن کی دوست ہشفین جو کہ اس کے ماموں کی بیٹی بھی تھی کی وجہ سے ان کے گھر آنا جانا شروع ہوا۔

ہشفین کی ممی جس سے اس کی ملا ہمیشہ ہی خار کھاتی تھیں اور پتا نہیں کون کون سی نئی باتیں ان سے منسوب کرنے سکتیں گو پہلی بار وہ کہہ کر ہی دنگ رہ گیا تھا۔ بے حد شفیق اور سادہ سی آئی نہ صرف اس سے پہلی بار بہت پیار سے ملی تھیں بلکہ شام کا کھانا جو کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا کھائے بغیر اٹھنے نہیں دیا تھا۔ یہ اس کی اپنے ماموں کی بیوی اور اس کی بیٹی سے پہلی ملاقات تھی۔

ان کی بیٹی دعائے خیر سے وہ پہلی بار کھانے کی ٹیبل پر ملا تھا۔ آئی کی ہشفین اور دعائے خیر کو بار بار کھانے کئی ڈشز پیش کرتے ہوئے کھانے پر اصرار کرتے ہوئے جو پیار جو شفقت ان کے لہجے سے اٹ رہی تھی اس نے اس کو بہت متاثر کیا تھا حالانکہ ہشفین اپنی سوئی ماں اور بہن سے بہت بے زار رہتی تھی اور بر ملا اس بے زاری کا اظہار بھی کر جاتی تھی۔ اب کھانے پر

بھی اس کا وہی رویہ تھا جس نے ہشفین کو تو نہیں البتہ
سلمان کو ضرور اندر ہی اندر شرمندہ کر دیا تھا۔

ماموں خاموشی سے سب دیکھ اور سن رہے تھے
جب کہ دعائے خیر بے حد سنجیدہ اور اس کی امی ہشفین
کی باتوں کا برا ماننے بغیر اسی شفقت سے پیش آتی رہی
تھیں۔ پہلی بار وہ ہشفین سے ملنے گیا تھا۔ اس کے بعد
وہ شعوری کوشش کرتا رہا تھا وہاں جانے کی اس کھل
گھر بلو ماحول میں ہشفین کا رویہ پھولوں میں کانٹوں کی
مثال لگتا۔

ٹیمبل پر برتن رکھنے کی آواز پر وہ خیالات کے ہجوم
سے باہر آیا۔

”پاپا کہاں ہیں؟“ بے دلی سے ناشتا کرتے ہوئے
اس نے مؤدب گھڑے خانہ ماں سے سوال کیا۔

”آپ کو نہیں پتا چھوٹے صاحب۔“
”کیا؟“ سلائس کی طرف بڑھتا اس کا ہاتھ رک
گیا۔

”بڑے صاحب کو بہت دن ہو گئے اوپر شاہ میر
صاحب کے گھر ناشتا کرتے ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے
ہی گئے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ پرسوج انداز میں ناشتا کرتے ہوئے پاپا
کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر کچھ ہی دیر میں پاپا اور شاہ
میر اکٹھے اوپر سے اترتے دکھائی دیے تھے۔ شاہ میر
آگے بڑھ کر اس سے گرم جوشی سے ملا۔ جواباً وہ بھی
سرد مہری نہ دکھا سکا۔ ویسے بھی اپنے اس سنجیدہ مزاج
کزن سے بھائیوں کی سی انیسیت ہو چلی تھی۔ دوپہر
میں اسے ہشفین کی کال موصول ہوئی تھی کہ وہ گاڑی
بھجوا دے۔ وہ اپنے پاپا سے ملنے جانا چاہتی ہے۔

”ٹھیک ہے ہشفین! لیکن انکل تو اس وقت اپنے
آفس میں ہوں گے۔ میں آتا ہوں تو شام میں اکٹھے ہی
چلتے ہیں ناں گھر۔ انکل“ آئی دونوں سے ملاقات
ہو جائے گی۔“ وہ رسن سے بولا جب کہ دوسری
طرف سے آنے والا جواب سن کر بھونچکا ہی رہ گیا۔

”تمہاری آئی سے نہ ملنا پڑے اسی لیے تو میں پاپا
سے آفس میں ملنا چاہ رہی ہوں۔ تم نے آنا ہے تو آسکتے

ہو۔“

”لیکن کیوں ہشفین؟ وہ تمہاری ماں نہیں ہیں
میں جانتا ہوں لیکن تمہاری ماں کی کمی پوری تو کی ہے نا
انہوں نے اور بہت حد تک نبھایا بھی ہے اس ذمہ
داری کو۔“

”تم یہ آئی نامہ رہنے دو سلمان اور بتاؤ کہ گاڑی
بھج رہے ہو یا میں پاپا سے کہہ کر منگواؤں؟“ اس کے
بے زاری سے کہنے پر وہ ایک دم چپ سا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے پندرہ بیس منٹ ویٹ کرو میں ابھی
بھجواتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے سیل کو ایک نظر دیکھا
اور کچھ سوچتے ہوئے ٹیمبل پر رکھ دیا۔ پھر انٹر کام پر گھر
گاڑی بھجوانے کا کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
پھر پاپا کی کال پر اسے سائٹ پر جانا پڑا تھا جہاں شاہ
میر اور پاپا کو اس سے کوئی مشورہ کرنا تھا۔ چار بجے کے
قریب جا کر تینوں وہاں سے مطمئن ہو کر آفس آئے
تھے۔

”کیا خیال ہے گاڑی کسی ریسٹورنٹ کی طرف نہ
موڑ لوں؟ ڈرائیونگ چونکہ وہی کر رہا تھا سو اسی نے
بیک مرر میں سے پاپا اور شاہ کو دیکھ کر سوال کیا۔
”وہ کیوں بھئی؟“ پاپا کے کمال اطمینان پر اسے
حیرت ہوئی۔

”آپ شاید بھول رہے ہیں پاپا کہ مصوفیت میں ہم
نے لنچ نہیں کیا ہے تو بیٹ میں چوہے دوڑ رہے
ہیں۔“ اس کی بات پر شاہ میر مسکرا دیا۔

”ہاں تو چلو ناں آفس تمہیں آج اپنی سوکے ہاتھ
کا کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ ریسٹورنٹ وغیرہ سب بھول جاؤ
گے۔“ اس تھکاوٹ میں بھی پاپا کی خوش دلی عروج
پر تھی وہ نا سمجھی سے ایک بار پھر بیک مرر میں دونوں
کے مطمئن چہرے دیکھ کر رہ گیا۔ لیکن چپ چاپ جا کر
گاڑی آفس کیپاؤنڈ میں روک دی اور واقعی جب وہ
فریش ہو کر آیا تو ٹیمبل پر خوشبو میں اڑا نا کھانا منتظر تھا۔
پھر باتوں کے دوران ہی پتا چلا کہ دعائے خیر پاپا اور
شاہ میر کا دوپہر کا کھانا ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دیا کرتی
تھی۔ پہلے وہ شاہ میر کو ٹفن بنا کر دیتی تھی لیکن جب

سے پتا چلا تھا کہ حسان صاحب بازار کے کھانے کو کچھ خاص پسند نہیں کرتے اور مجبوری میں کھانا بھی بڑتا ہے تو اس نے ایک ہفتہ سے یہ نئی روٹین شروع کی تھی جس سے حسان صاحب بہت خوش تھے۔ سلمان کے اندر جیسے کسی نے زور سے چنگلی لی تھی۔ پیلا ہر ہر لقمے پر واہ واہ کرتے ہوئے ان دونوں سے ایسے داد وصول کرنا چاہ رہے تھے جیسے کھانا انہوں نے ہی تیار کیا ہو۔

شام کو گھر پہنچنے پر بی بی سنوری ہشیفین پر نظر پڑتے ہی کچھ سکون سا محسوس ہوا ہی تھا کہ اس کی اگلی فرمائش نے کلیجہ ہی جلا ڈالا۔

”چلو ناں سلمان جلدی سے فریش ہو کر آؤ۔ میں کب سے وٹ کر رہی ہوں۔ پہلے لانگ ڈرائیو“ شاپنگ اور پھر ڈنر۔ ”وہ چمک کر بولی۔

وہ کہنے ہی لگا تھا کہ وہ بے حد تھکا ہوا ہے سو یہ پروگرام کسی اور دن کے لیے اٹھا کر رکھے لیکن ہشیفین کی تیز مزاج طبیعت سے بھی واقف تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس کی طبع نازک بنا گوارا کرتی تھی سو باہل نحواستہ اٹھ کر فریش ہونے چل دیا۔ جاتے ہوئے ہی بھی خوش قسمتی سے باہر مل گئی تھیں ورنہ عموماً ”ہی وہ کسی نہ کسی پارٹی یا فنکشن میں مدعو ہوتیں۔ نہ بھی ہوتیں تو ان کی ذات کی تسکین کے اور بہت سے جھیلے تھے بہر حال گھر شوہر بچے ان کی ذاتی ترجیحات میں سب سے آخری نمبر پر تھے۔

”ہاں ناں یہی تو دن ہیں تم لوگوں کے گھومنے پھرنے کے جاؤ شاپنگ۔“ ماما نے ان دونوں کو تیار ہی ملی تھیں کہیں جانے کے لیے۔ سلمان کے آہستہ سے جتانے پر خوش دلی سے بولیں۔

رات گئے ان کی واپسی ہوئی تھی۔ اگلے صبح وہ ایک بار پھر ٹیبل پر تھا تھا جب اپنے کمرے میں سے آفس کے لیے بالکل تیار پیلا نکلتے دکھائی دیے ابھی وہ ان کو بلانے ہی والا تھا کہ ان کی نظر سلمان پر پڑی۔ کچھ لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کے قریب آگئے۔

”مجھو ڈویا را! یہاں کیا اتنی بڑی ٹیبل پر اکیلے ناشتا

کرنے کا مزہ آئے گا۔ آؤ! آج تمہیں زبردست سا ناشتا کراتے ہیں۔ کیا یاد کرو گے۔“ خوش دلی سے کہتے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف لے جانے لگے۔

”لیکن پیلا۔“
”لیکن ویکن کچھ نہیں تم چلو تو سہی، عبدل تم لوگ ناشتا کر لو۔ چھوٹے صاحب آج میرے ساتھ اوپر ہی ناشتا کریں گے۔“ سامنے سے ناشتے کی ٹرے لاتے ملازم کو انہوں نے آواز دے کر کہا اور خود سلمان کے ساتھ اوپر آگئے۔

سلمان اگرچہ بے حد خفت محسوس کر رہا تھا لیکن جس گرم جوشی سے شاہ میر نے اسے ویلکم کیا جلد ہی وہ احساس زائل ہوتا محسوس ہوا۔ دعائے خیر بھی اصرار سے ایک کے بعد ایک جڑا اس کی طرف بڑھاتی رہی۔

”سلمان بھائی! یہ پوریاں ٹیسٹ کریں۔ یہ قیمہ شاہ میر کو بہت پسند ہے آپ کو بھی بہت پسند آئے گا۔“
”اور پراٹھا بھی دو ناں سلمان کو دہا! انکل تو مداح ہیں تمہارے ہاتھ کے بنے پراٹھوں کے۔“ شاہ میر جو مسکراتے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا بول اٹھا۔

”اے مناظر بارہا میں نے اپنے تصور میں دیکھے ہیں سلمان! ایک کھل فیملی کا مکمل منظر۔ بہت پہلے میں پیلا اور ماما ہوتے تھے پھر پیلا کی ڈھتھ کے بعد میں اور ماما۔ رشتوں اور محبتوں کی کمی انسان میں بڑے خلا پیدا کر دیتی ہے۔ میں ماما سے بہت بحث کرتا تھا کہ میرے

نانا، نانی، دادا، دادی، گزنز کہاں ہیں۔ وہ روڑتی تھیں اور ان کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ سوانہی ان خواہشات کو دل میں دبا لیتا تھا۔ ایک جوائنٹ فیملی کا وہ ہر ابھرا تصور جو پیلا نے بہت بچپن میں میرے اندر رو دیا تھا۔ اب پھل پھول کر جوان تھا اور میں اس کی تعبیر چاہتا تھا؟ امریکہ جیسے مشینی ملک میں رہ کر بھی۔

آج میں بہت خوش ہوں کہ میرا وہ خواب پورا ہو گیا۔ ساتھ میں دور کہیں اداسی بھی ہے کہ میرے پیلا اور ماما اس احساس کی محرومی لیے چلے گئے۔ آج اگر وہ ہوتے تو بہت خوش ہوتے۔“ وہ خوشی سے بولتے بولتے ایک

پارٹی یا کلب سے تشریف لاتی ہیں میں تھک کے سوچنا ہوتا ہوں۔ صبح جاگنے پر آپ کو ہمیشہ گہری نیند میں پایا ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں آپ اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہی ہیں احسن طریقے سے؟ اپنی آنے والی نسل کو ہم چلنے کے لیے کون سی راہ ہموار کر کے دے رہے ہیں۔

”ساری عمر یہی روٹین رہی ہے اس گھر کی۔ اب آکے پتا نہیں کون پٹیاں پڑھا رہا ہے آپ کو جانتی ہوں میں سب۔ یہ جو ناشتے کے بہانے اوپر کے چکر لگنے لگے ہیں آپ کے تو یہ ان ہی کا نتیجہ لگ رہا ہے مجھے۔“ وہ تخت بدگمان تھیں۔

حسان صاحب تاسف سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔ وہ ہمیشہ سے اپنی غلطیوں کا بوجھ دوسروں پر ڈالنے کی عادی تھیں۔

”میں بحث کو بدھانا نہیں چاہتا۔ بہر حال کل سے سب رات کا کھانا اکٹھے کھائیں گے شاہ میر کی فیملی سمیت۔“ ان کے اسی دو ٹوک انداز سے مسز حسان کی جان جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ ان کی مانتے آئے تھے پر کسی ایک بات پر اڑ جاتے تو پھر ان کو ان کے فیصلے سے ہٹانا مشکل ہو جاتا تھا پھر ہی ہوا۔ طوعاً و کرہاً انہیں نہ صرف خود موجود ہونا پڑا تھا بلکہ بہت کچھ ایسا برداشت بھی کرنا پڑا تھا جس کا وہ خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھیں۔ بہر حال حسان صاحب کی سختی سے کی ہوئی تاکید ذہن میں تھی، کچھ انہوں نے اشارہ بھی کیا تھا جب شاہ میر اور دعائے خیر نیچے آئے تھے جو وہ دل کی کدورت بھلا کر شاہ میر کا حال پوچھ بیٹھیں۔

”کیا حال ہے شاہ میر؟ کیسے ہیں بیٹا آپ؟ اور آپ؟“ شاہ میر کا حال پوچھتے ساتھ انہوں نے دعائے خیر کو بھی بھگتا دیا تھا جب کہ اس سارے ماحول میں اگر مس فٹ تھی تو ہشفین، جس کی نظریں کچھ دیر کو تو دعائے خیر کے چمکتے چہرے سے ہٹ ہی نہیں پائی تھیں۔ شاہ میر کی آسوں مسکراہٹ یقیناً اس کی ہمراہی کا نتیجہ تھی۔ وہ پھپھو کو بتا رہا تھا کہ اس نے ملازمین اس کیسے واپس بھیج دیے تھے کہ دعائے خیر کو اپنے گھر کا

دم بے حد ادا ہو گیا۔ حسان صاحب کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ صرف اس کی دولت اور جائیداد ہی حوالے کر دینے سے وہ بری الذمہ نہیں ہو جاتے تھے۔ ابھی تو بہت سے قرض واجب الادا تھے۔ ان کا بھائی رشتوں کو ترستا مر گیا تھا۔ وہ تلافی میں کرتے بھی تو کیا کرتے۔ ہاں انہوں نے اگلے دن سے حکم دے دیا کہ صبح کا ناشتا وہ سب شاہ میر کے ہاں کریں گے اور رات کا کھانا سب ہی نیچے کھائیں گے، شاہ میر کی فیملی سمیت۔ مسز حسان نے البتہ یہ حکم سن کر کافی ٹاک بھوں چڑھائی تھی۔

”میں نے الگ پورشن میں شاہ میر کو سیٹ کیا ہی اس لیے تھا کہ میرے گھر کے اندر کسی دوسرے فرد کی دخل اندازی ہو نہ مجھے پسند نہیں ہے اور آپ کا بھی جواب نہیں ہے۔ یہ نیا حکم صادر کر دیا۔ میں کبھی ہوتی ہوں کبھی نہیں ہوتی۔ سلمان اور ہشفین کی بھی نئی نئی شادی ہے اب ظاہر ہے وہ گھر توڑی بیٹھے ہیں ہر وقت۔ آپ کی اپنی مصروفیات ہیں گھر کے اچھے خاصے سیٹ اپ کو ڈسٹرب کرنے کی کیا تک ہنتی ہے۔“ وہ جھلا کر بول تھیں۔

”گھر کا آپ سیٹ نظام ہی تو صحیح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ویسے بھی عمر کے اس حصے میں انسان اپنی اولاد کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا پسند کرتا ہے۔ سب ایک ساتھ کھانا کھائیں۔ اس میں بھی یہی مصلحت پوشیدہ ہے کہ گھر کے افراد کم از کم دن میں ایک دفعہ ہی سہی، ایک دوسرے سے مل تو لیں گے نا۔ سلمان، شاہ میر دفتر میں اگرچہ کئی بار ملتے ہیں۔ بات چیت ہوتی ہے۔ کھانا بھی اکٹھے کھاتے ہیں، لیکن سلمان کی دلہن سے ایک آدھ بار سرسری سی ملاقات ہو پائی ہے میری اور آپ۔“ وہ ان کی ماتھے کی تیوریوں کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”آپ کو یاد ہے کہ آخری بار آپ نے میرے ساتھ کھانا کب کھلایا تھا۔ پندرہ دن سے تو زائد ہی ہو گئے ہوں گے۔ رات گئے جب آپ اپنی کسی

ہر کام خود کرنا پسند تھا۔ ایسے میں انکل حسان اور سلمان کی آنکھوں میں اس کے لیے ابھرتی ستائش دیکھنا اس کو اس وقت دنیا کا مشکل ترین کام لگا تھا جب کہ پھپھو نے محض ہنکارا بھرتے ہوئے کھانا شروع کرنے کا اشارہ دیا تھا۔

یہ لڑکی جس سے اس کی نفرت انتہا درجے کی تھی۔ اس کے پیلا کی توجہ اس کی طرف مبذول نہ ہو اس کے پیلا دعائے خیر کے پیلا نہ بن جائیں اسی سوچ نے اس سے بہت دفعہ ایسے کام کروائے تھے جو عام زندگی میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی اور اب وہ لڑکی اس کا سکون توہ و پالا کرنے کے لیے اس کی زندگی میں ایک بار پھر موجود تھی۔ یقیناً وہ کوئی ساتھ تھی جب ہی تو پیلا وقتی طور پر اس سے برگشتہ ضرور ہو جاتے، لیکن امی اور وہ خود کوئی ایسی گیدڑ سنگھی سنگھاتی تھیں کہ وہ پھر سے پہلے جیسے ہو جاتے۔ اور اس کی محنت اکارت جاتی تھی اور اب یہاں؟

پھپھو نے کل ہی اس کو بتایا تھا کہ انکل حسان گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے اور سلمان دو دن سے ناشتا وہیں کرتا ہے اور انکل اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے اور رات کے کھانے کا اکٹھا کھانے کا آرڈر اسی سلسلے کی کڑی ہے وہ کھاتی کم رہی سو جتنی زیادہ رہی تھی۔

سچ کہا ہے کسی نے کہ حسد ایک ایسی بیماری ہے جو سب سے پہلے حسد کرنے والے کو ہی کھاتی ہے۔ اس کے اندر کا حسد ہی تھا جس کی جلن نے اسے بھی خوش نہیں ہونے دیا تھا نہ اپنے باپ کے گھر نہ اب سسرال اور صاف نیت یقیناً ”چہروں پر روشنی بن کر چمکتی ہے جب ہی۔ دعائے خیر ایک خوب صورت سی مسکراہٹ لیوں پر سجائے کھانا کھانے میں مصروف تھی۔ اس کا شوہر اسے بار بار ڈنار ہونے والی نظروں سے دیکھتا۔ کبھی وہ شرمناک جاتی، کبھی مسکرا دیتی۔ ہشامین کے اندر دور تک کہیں ایک سناٹا پھیلا تھا، ایسا ایک ان دیکھا تعلق اس کے اور سلمان کے درمیان میں کیوں نہیں تھا۔ اس نے ان دونوں کے انداز بغور ملاحظہ کرنے کے بعد اپنے شریک سفر کی طرف دیکھا جو اس سے بے خبر کھانے

سے انصاف میں مصروف تھا۔

پھر اس نے کچھ سوچ کر خود کو آسوں محسوس کیا، اسے ایک بار پھر وہی کھیل کھیلتا تھا۔ شاید کہ اس بار جیت اس کا مقدر بنتی پھپھو اور انکل حسان دعائے خیر کی وجہ سے بحث میں مصروف تھے۔ وہ قصداً وہیں پر بیٹھی رہی تھی اور خود کو اپنے سیل فون میں مصروف رکھتے کلن پوری طرح ان کی طرف متوجہ رکھے تھے۔ ”کیا آپ کو نہیں لگ رہا حسان کہ آپ شاہ میر کی محبت میں حد سے گزر رہے ہیں، ہر عورت ہی ماں بننے کے دوران اس فتر سے گزرتی ہے۔ ڈاکٹر تو کہتی ہی رہتی ہیں ایسے۔ اگر بیڑھیاں نہیں بھی چڑھنی دعائے خیر نے اور شاہ میر لگ کر لیتا چاہ رہا ہے تو آپ اسے کیوں زبردستی اپنے ساتھ باندھ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے اوپر کا پورشن دے دیا ان کو۔ چلو میں مان گئی اب پھر نیچے شفٹ کرتا ہے کہ مہارانی کو تکلیف نہ ہو۔ میرے بیٹے کے لیے تو ایسی محبت کبھی نہیں جتانی آپ نے۔“ غصے میں ہاتھ نچاتی وہ کوئی جاہل عورت ہی لگ رہی تھیں اس سے۔

”خدا کے لیے سلمان کی ماں۔ مجھے اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کی تھوڑی سی کوشش کر لینے دو۔ میرے لیے مشکلات پیدا مت کرو۔ میں پہلے ہی پچھتاؤں کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے پھر رہا ہوں۔ وہ بہت خود دار بچہ ہے۔ اس گھر پر اس کا اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا یا تمہاری اولاد کا“ دعائے خیر کو ڈاکٹر نے مکمل رست بتاتے ہوئے کسی بھی بے احتیاطی سے منع کیا ہے۔ شاہ میر تو گھر کے لیے بات بھی فاسل کر چکا تھا اب میرے کہنے پر ہی وہ چپ ہو گیا ہے۔ اس لیے اس معاملے میں میں کچھ نہیں سنتا چاہتا۔ شام سے پہلے پہلے سائیڈ والے دو کمرے ان کے لیے سیٹ گرا دیجئے۔“ دعائے خیر ایک بار پھر اس سے سبقت لے گئی تھی۔

اگرچہ اس کا ارادہ دو تین سال تک فیملی بڑھانے کا نہیں تھا کہ وہ اس جھنجھٹ میں اتنی جلدی نہیں بڑھنا چاہتی تھی، لیکن دعائے خیر کے ماں بننے کی خبر کا سن کر

اس کا دل چاہا کہ پلک جھپکنے سے پہلے یہ شرف اسے مل جائے۔

”ہشفین! ملازمہ سے کہہ کر وائیں سائیڈ والے دو کمرے خالی کروا دو ورنہ شام کو آکر ناراضی کا دورہ پڑے گا تمہارے انکل کو۔“ وہ جھنجھلا تے ہوئے بولیں۔

”اور ہاں۔۔۔ تم کیوں چپ ہو ابھی تک؟“ اس کو بغور دیکھتے ہوئے وہ بولیں تو ہشفین کچھ نہ سمجھتے ہوئے ٹھنک گئی اور نا سمجھی سے ان کو دیکھنے لگی۔ ”مطلب تم بھی کوئی خوش خبری سناؤ اب سلمان کے بچے دیکھنے کی بہت خواہش ہے مجھے۔“ اس کی نظروں کا مقہوم سمجھ کر وہ نرمی سے بولیں تو ایک طویل سانس اس کے حلق سے بے اختیار برآمد ہوئی۔

انگلے روز سے جیسے ہی دعائے خیر کی ناز برداریوں کا سلسلہ شروع ہوا اس نے ایک بار پھر وہی واؤ کھیلا تھا۔ لینڈ لائن نمبر بچتا تو بچتا ہی چلا جاتا۔ پھر گھر کے افراتو کا نوٹس لیتے ہی دوسری طرف خاموشی چھا جاتی اور آخر ایک دن پھپھو کو اس نے دعائے خیر سمجھ کر وہی کہانی دہرا ڈالی کہ وہ کیوں اسے چھوڑ گئی ہے۔ وہ آجائے واپس اس کے پاس ورنہ وہ جان دے دے گا۔ دعائے خیر سے لاکھ عتاؤ سنی مگر پھپھو اتنا تو جانتی ہی تھیں کہ وہ ہلکے کردار کی نہیں ہے ایک بل کو دل دعائے خیر کے حق میں بولا تھا۔ گرا گلے بل ہی جیسے یہ خیال آیا کہ وہ ساتھ کی بیٹی ہے انہوں نے ساری ہمدردی کو بھاپ بنا کے اڑا دیا۔

انہوں نے من و عن وہی جملے ٹیبل کے گرد کرسی گھسیٹ کر بیٹھے بغور سب کے چہرے دیکھتے بظاہر غصے سے سنائے۔ طبیعت کی خرابی کے باعث بندھل بیٹھی دعائے خیر کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا جب کہ ہشفین کے سوا وہاں ہر کوئی سن رہ گیا تھا۔ صبح شام سب نے ہی سنی تھیں فون کی گھنٹیوں۔ کوئی بھی فون اٹھاتا جواب میں لمبی خاموشی۔ اب آج جو بھی تھا اس نے شاید مجھے بھی دعائے خیر ہی سمجھا جو۔۔۔

”بس خاموش۔۔۔ ان کی بات مکمل ہونے سے

پہلے ہی انکل خطرناک سنجیدگی کے ساتھ بولے تھے ”دعائے خیر کیسی نجی ہے ہم سب جانتے ہیں، لیکن اس طرح کی ہلکی بات کون کر سکتا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے، یہ پتا لگانا ہے۔“ انکل یقیناً ”پاپا کی طرح دھوکے میں آجانے والے نہیں تھے۔ وہ بات کی تہ میں اترنے والے تھے تب ہی ہشفین کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے ہی اٹک گیا۔

”اور آپ بیٹا! کیوں رگ گئیں۔ کھانا کھائیں میں سب دیکھ لوں گا۔“ انکل کے تسلی دیتے ہی دعائے خیر نے فوراً ”شاہ میر کی طرف دیکھا تھا۔

”فون جیسی سہولت ایجاد کرنے والوں نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ اسے کبھی ایسے مقاصد اور سستی تفریح کے لیے بھی استعمال کیا جائے گا۔“ شاہ میر کے ہلکے پھلکے انداز پر دعائے خیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

”میں نے کبھی کسی کا برا نہیں سوچا نہ کبھی چاہا۔ پھر بھی لوگ پتا نہیں کیوں کسی کو خوش دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتے اور اوچھی حرکتوں پر اتر آتے ہیں یہ جانے بغیر کہ اللہ بے نیاز ہے وہ کسی کے دل کے حال اور اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ہشفین کا دل دھک سے رہ گیا۔

دعائے خیر یقیناً ”جان گئی تھی کہ یہ اسی کا کیا دھرا ہے ہشفین کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اس کی ذمہ داری بات بھی سمجھ گئی تھی۔

”اسی ہی فون کالز کا سلسلہ ایک دفعہ پہلے بھی شروع ہوا تھا پھر پاپا نے اس شخص کو ڈانٹ دیا تھا تو پھر دوبارہ کوئی کل نہیں آئی تھی۔ پاپا نے تو یہاں تک بھی کہا تھا کہ وہ اگر دعائے خیر کے ساتھ مخلص ہے تو آئے وہ اس سے ملنا چاہتے ہیں، لیکن پھر ہماری شادیاں ہو گئیں ہو سکتا ہے اسی بات کو الٹو بنا کر وہ دوبارہ ایسا کر رہا ہو۔“ اس نے آخری واؤ بھی کھیل ہی دیا تھا۔

اب کے تو شاہ میر بھی چونک گیا۔ لینڈ لائن نمبر پر کالز کے سلسلے سے وہ آج واقف ہوا تھا جب کہ دعائے خیر نے ایک دو دفعہ اس کے موبائل پر آنے والے

میں کھائے تھے جو ایسے ہی فضول پیمائیاں پر مشتمل تھے۔ وہ ہرگز بھی اس کی طرف سے بدظن نہیں ہوا تھا۔ اس کی پریشانی کا سبب اگر تھا بھی تو وہ یہ تھا کہ دعائے خیر اب کبھی کبھی ہی پریشان رہنے لگی تھی۔ اس کی نسلی اور دلاسوں کے باوجود۔

”چھوڑو تم پریشان نہ ہو، ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے چکوتھم کے کوئی رسیاں نہیں ملے گا تو خود ہی پیچھے ہٹ جائے گا۔“ اس کے نسلی دینے پر دعائے خیر بری طرح رو پڑی۔

”آپ یقین کریں شاہ میرا میں ایسی لڑکی نہیں ہوں جیسا یہ میسجوز ظاہر کر رہے ہیں میں نے تو کبھی گھر سے یونیورسٹی کالج جانے کے علاوہ قدم باہر نہیں نکالا۔“ وہ اس کے رونے پر پریشان ہو گیا۔

”تم بالکل پاگل ہو دعائے خیر! ایک شوہر سے زیادہ اپنی بیوی کی پارسائی کا کون گواہ ہو سکتا ہے؟ پھر کروا دو تو ایسی صفت ہے جس کی روشنی چہرے پر نور بن کر چمکتی ہے۔ میں ایک زمانہ باہر رہ کر گزار کر آیا ہوں۔ مجھ سے بھلا زیادہ کون ایک باوفا شریف عورت کی تعریف بیان کر سکتا ہے۔ تمہیں آج یا آئندہ کبھی اس طرح مجھے صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شاہ میر کے ان الفاظ سے وہ اندر تک شانت ہو گئی تھی، لیکن ہشمن کے حسد کی حد دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی، اگرچہ انکل نے آکر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا کہ وہ ان کی بہو نہیں بیٹی ہے، اس پر پورا اعتماد ہے اور وہ جلد ہی ان رائٹ کالز کا بھی حل نکال لیں گے۔ ہشمن نے اسی دن اسی وقت ٹیکسٹ کر کے فی الحال مزید کالز کرنے سے منع کر دیا تھا۔ مجموعی طور پر وہ دن سب کے لیے ناگوار اور بوجھل سا گزرا تھا۔



”مسلمان۔“

”ہوں۔“ وہ لیب ٹاپ پر کوئی کام کرنے میں مگن تھا تب ہی اس کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہو سکا جس نے اس کو مزید بھڑکادیا۔

”میں کہتی ہوں بند کرو اس کو اور میری بات سنو۔“ سلمان نے کسی قدر حیرت سے مڑ کر اس کو دیکھا۔ وہ ناخن چباتے ہوئے کچھ اضطراری کیفیت کا شکار تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے لیب ٹاپ کو ایک طرف کیا اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں نے ایک بہت اچھی گائنا کالوجسٹ سے ٹائم لیا ہے اور کل تم میرے ساتھ چل رہے ہو؟“ اس کے اس طرح کہنے پر وہ حیران ہی رہ گیا۔

”لیکن کیوں؟“ لاسٹ منٹھ تک تمہارے ویوز پانچ سال تک آزاد پھرنے کے تھے بغیر کسی پابندی کے۔“

”ہاں تو خیال بدلتے کون سی دیر لگتی ہے۔ تاؤ آئی وانٹ ٹو بی آندر۔“ اس کے ہلکے پھلکے سے اعتراض پر وہ تیزی سے بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ابھی تو ان کی شادی کو بمشکل دو ماہ ہوئے ہیں۔ ابھی اسے ضرورت نہیں ہے ڈاکٹروں کے پاس جانے کی، لیکن وہ اسے ذہنی طور پر بے حد ڈسٹرب لگی سوچ رہا تھا اس کی بات نہ کیا تھا۔

اگلے دن ان دونوں کے کچھ ٹیسٹ ہوئے تھے۔ رپورٹس کچھ دن بعد ملنی تھیں۔ سرحال ہشمن کا موڈ کل کی نسبت بہتر ہی تھا کہ دعائے خیر کل شام سے اپنی امی کی طرف تھی۔ ویسے بھی ہشمن کا موڈ تب ہی خراب ہوتا تھا جب جب دعائے خیر پر نظر پڑتی یا شاہ میر کو اس کا حد درجہ خیال رکھتے دیکھتی۔ ایسے میں پھپھو نجانے کیسے سیڑھی پر سے پھسلیں کہ ان کے پاؤں میں فریکچر ہو گیا۔ دو دن اسپتال میں رہنے کے بعد وہ گھر آگئی تھیں۔ دعائے خیر بھی ایک دن امی کے پاس گزار کر پہلے مسز حسان کو دیکھنے اسپتال گئی تھی پھر شام کو ان کے ڈسچارج ہونے پر سب اکٹھے ہی گھر واپس آئے تھے۔ معمولی سا فریکچر تھا، مگر ڈاکٹر نے ہدایات کے پلندے کے ساتھ ان کو رخصت کیا تھا۔ کم از کم پندرہ دن کارسٹ تھا پھر پاؤں کی کچھ ایکس راتز تھیں۔ حسان صاحب نے سلمان سے کہا تھا کہ وہ کسی نرس کا پندرہ

دن کے لیے انتظام کروے تب دعائے خیر بول اٹھی۔
 ”نہیں انکل! نرس کی ضرورت نہیں ہے۔ مریض کا خیال جتنا اس کے گھروالے رکھ سکتے ہیں پرو فیشنل لوگ نہیں رکھ سکتے۔“ اس کے اس طرح بول اٹھنے پر ہشفین نے ناگواری سے اس کو دیکھا تھا۔

”مریٹا! آپ کی اپنی طبیعت۔“ حسان صاحب کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔
 ”کچھ نہیں ہوا انکل! میری طبیعت کو۔ ان کی میڈیسن اور پاؤں کی ایکس راتز میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے باقی۔“

واش روم وغیرہ تک لے جانا ہو گا تو میں ملازمہ کی اہلپہ سے کراؤں گی بس آپ فکر مت کریں۔“
 اس گھر نے اسے محبت اور اعتبار بخشا تھا جس سے وہ خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہوئی تھی۔ امی کے گھر سے اپنی بات کہنے کے لیے ماں کے چہرے کی بے بسی روک دیتی تھی۔ یہاں شاہ میر تو تھا ہی اس کا اپنا انکل حسان بھی اسے بہنو نہیں بیٹھی کہتے ہی نہیں مانتے بھی تھے۔ سلمان کی نظروں میں ہمیشہ اسے ایک نرم سا تاثر نظر آیا تھا۔ پھپھو نہ تین میں نہ تیرہ میں تھیں۔ پھر ایک ہشفین کے حسد کو لے کر وہ کیوں اپنی زندگی خراب کرتی سو اس کے قطعی انداز کو دیکھ کر انکل خوش ہو گئے تھے۔ شاہ میر نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔ سلمان کے چہرے پر تعریفی تاثرات تھے۔ اس نے کہا ہی نہیں تھا، ”مکمل بھی شروع کر دیا تھا۔“

پھپھو نے ایک دو دن تو اس سے بے نیازی برتی تھی پر اس کا سناہ اور مخلص انداز دیکھ کر اپنا روکھا رویہ بہت دیر اپنائے نہ رکھ سکیں۔ ملازمہ نے بتایا تھا کہ وہ صبح اٹھ کر بیڈنی لے کر پھر سو جاتی ہیں گیارہ بجے وہ ان کا ناشتہ لے کر جاتی ملازمہ کی مدد سے ان کو واش روم لے کر جاتی پھر ناشتہ کے دوران ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہتی۔ ایک گھنٹہ بعد ان کی پاؤں کی مالش کرنے کے بعد وہ ان کو ٹکیوں کے سہارے بٹھا کر خود باہر چلی جاتی تھی پھر دو بجے کھانے کے ہمراہ اس کی واپسی ہوتی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا تھا کہ جب سے وہ یہاں

آئی ہے شاہ میر انکل اور سلمان کو دوپہر کالنج ڈرائیور کے ہاتھوں بھجوا دیتی ہے۔

”حسان ایسے ہی تو اس لڑکی کی تعریف نہیں کرتے۔“ اس کی سناہ مسکراہٹ کو دیکھتے جو پہلی سوچ پھپھو کے ذہن میں آئی تھی وہ یہی تھی۔ چوتھے دن وہ شام کو ملازمہ کے ہمراہ ان کو لان میں لے گئی تھی۔ پھپھو جیسی سوشل خاتون کے لیے ایسی بے بسی کی حالت میں فارغ بیٹھنا بہت مشکل ہوتا اگر جو دعائے خیر نہ ہوتی۔ انہوں نے صاف دل سے دل میں اعتراف کیا تھا۔

ساتھ بھی ایک دن اپنے خاوند کے ساتھ ان کی خیریت دریافت کرنے آئی تھیں۔ دعائے خیر کی اچھائیاں تھیں جو وہ اس پاروسکی سرورسری کا مظاہرہ نہ کر سکیں جیسا کہ ہمیشہ کرتی تھیں۔

”ہشفین کہاں ہے بھی نظر نہیں آرہی؟“ شاہ نواز کے پوچھنے پر پھپھو کے لبوں پر ہلکا سا شکوہ آہی کیا۔
 ”گئی ہوگی اپنی کسی دوست کی طرف کل کھڑے کھڑے ہی آئی تھی طبیعت پوچھنے کو پھر بتایا کہ شاپنگ کے لیے دوستوں کے ساتھ پروگرام ہے۔“ حقیقت بھی یہی تھی کہ ہشفین دعائے خیر کو اس گھر پر چھایا دیکھ کر برداشت نہیں کر پارہی تھی۔ اس لیے اس کا زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا تھا۔ وہ چاہتی تو دعائے خیر کی آدمی ذمہ داریاں بانٹ کر اپنی خوشیوں اور سکون کا سلمان کر سکتی تھی آخر وہ بھی اس گھر کی بہو تھی، لیکن اپنے اس جذبے کا کیا کرتی جو دعائے خیر کو دیکھ کر اسے اندر ہی ہر اک بنا دیتا اور وہ کچھ نہ کچھ غلط کرنے کا سوچنے لگتی تھی۔



دعائے خیر، پھپھو اور حسان انکل اس وقت لاؤنج میں موجود تھے۔ شاہ میر اپنے کمرے میں تھا۔ آج پھپھو خود ہی دھیرے دھیرے چل کر باہر آئی تھیں۔ اس پر دعائے خیر نے جس طرح خوشی کا اظہار کیا تھا۔ پھپھو تو ساکت ہی رہ گئی تھیں جو کچھ انہوں نے اس

اس کی زندگی کے بدترین الفاظ تھے جو اس کے ارد گرد آکر اسے چڑا رہے تھے۔

”مسز سلمان! آپ کے ساتھ کبھی کوئی ایسا حادثہ یا چوٹ لگی ہو جس سے آپ کے لوہے اور ایندھن کو نقصان پہنچا ہو۔“ ڈاکٹر کے بے حد سنجیدگی سے پوچھنے پر اس نے نا سمجھی سے پاس بیٹھے سلمان کو دیکھا پھر بتایا کہ اس کے شعور میں واضح تو نہیں ہے، لیکن دھندلی سی پرچھائیں ضرور ہے کہ ایک دفعہ اسکول جاتے ہوئے روڈ گراس کرتے وقت ایک موٹر سائیکل اس وقت اس کے اوپر گزرتی چلی گئی تھی جب وہ اچانک ٹھوکر کھا کر گر پڑی تھی۔ سپاہی بتاتے ہیں کہ میرے جسم کا نچلا حصہ بیڈ انجری کا شکار ہوا تھا جس کی وجہ سے میں بہت دن ہاسپٹل میں گزار رہی تھی۔

”لیکن کیوں ڈاکٹر؟ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ کچھ انہونی ہونے کا احساس کئی اندیشے اس کے سوال کے اندر سمیٹ لایا۔

”ہوئی۔“ یہ سن کر ڈاکٹر نے بے اختیار طویل سانس لی تھی۔

”وہ اس لیے مسز سلمان کہ اس ایسکیمینٹ میں آپ کی جان تو بچ گئی مگر پر اور بہت کچھ چھن گیا تھا۔“ ہشیفین کا چہرہ تیزی سے زرد پڑ گیا جب کہ سلمان بھی پریشانی سے ڈاکٹر کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

”آپ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی ہیں۔“

ڈاکٹر نے اس کے بعد اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ دنیا میں معجزات ہونے کے دلائل۔ تسلی کے شہد۔ دلاسے کے ٹانگ۔ پر اس کی سماعت پر ایک ہی جملہ ہتھوڑے برسارہا تھا ”آپ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہیں مسز سلمان! آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔“

پھر سلمان نے اور انکل حسان نے اس کی رپورٹس ملک بھر کے گائنا کالوجسٹس کے پاس بھجوائی تھیں، لیکن کم و بیش تمام ڈاکٹرز کی ایک ہی رائے تھی۔ پورے گھر پر ایک سوگ کی فضا طاری تھی گویا۔ اور

کی ماں کے ساتھ کیا تھا گوئی اور لڑکی ہوتی تو یہ بہترین وقت تھا ان کی زیادتیوں کا بدلہ چکانے کا، لیکن وہ اس کی ماں کی تربیت کو شاباش دے کر رہ گئی تھیں۔ ان کی اپنی بیٹی نے ان دس دنوں میں بمشکل دو دفعہ ان کی طبیعت پوچھنے کے لیے ان کے کمرے میں قدم دھرا تھا۔ اس کا الزام بھی وہ ساتھ کو نہیں دے سکتی تھیں کہ ہشیفین کی تربیت کا سہرا خود ان ہی کے سر تھا۔ انہوں نے جو بیچ بویا تھا آج اس کا پھل یک کر تیار تھا ان کے لیے شاہ میر بھی اب ان میں آکر شامل ہو چکا تھا۔ آج گھر کے افراد کے درمیان اپنی بیوی کو خوش دیکھ کر انکل حسان نے ایک آسودگی کو اپنے اندر پھلتے محسوس کیا۔ دعائے خیر کے بتائے کہاب چائے کے ساتھ کھاتے ہوئے وہ شاہ میر کو اس کے باپ اور اپنی بیٹی کی شرارتوں کا بتا رہے تھے جب سلمان اور ہشیفین اندر داخل ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں کے تاثرات ایسے سنجیدہ اور ہولا دینے والے تھے کہ وہ سب چونک گئے تھے۔ ہشیفین جو پچھو کے گلے لگنے اور ان سے اپنا دکھ بانٹنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ دعائے خیر پر نظر پڑتے ہی احساس زیاں اس قدر شدید ہوا کہ وہ کچھ بھوکے بے اختیار پوچھنے پر کہ ”کیا ہوا؟“ منہ پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے روئی اندر بھاگ گئی تھی جب کہ سلمان کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند وہیں بیٹھ گیا تھا۔

”کیا ہوا سلمان؟ بھابھی کیوں ایسے رو رہی ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟“ شاہ میر نے ہی پاس بیٹھے سلمان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے پوچھا۔ انکل اور پچھو بھی پریشان نظر آنے لگے تھے پھر سلمان نے ایک نظر سب پر ڈالنے کے بعد جھکے سر اور یاسیت بھرے لہجے میں جو کچھ بتایا تھا اس کو سن کر وہ سب ہی ایک صدمے کے زیر اثر آگئے تھے۔



اپنے کمرے میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی وہ سامنے والی دیوار کو مکتی جیسے کسی خلا میں معلق تھی۔

ہشیفین وہ تو نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا احساس محرومی شدید ہو کر ڈپریشن کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ پھپھو بھی ایک مستقل چپ کے زیر اثر تھیں۔ اب وہ بھی زیادہ تر گھر ہی رہتیں۔ اس دن تو حد ہی ہو گئی جب رات کے کھانے کے وقت ہشیفین کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ پھپھو نے اس کی غیر موجودگی کا نوٹس لیا تھا۔

”اس کا خیال رکھا کرو سلمان۔ دکھ کے اس فیر سے نکلنے میں تم اس کی مدد کر سکتے ہو۔“

”جی مانا۔“ وہ تابعداری سے بولا۔ ”میں نے بے بی ایڈاپٹ کرنے کا آپشن بھی اس کے سامنے رکھا ہے فی الحال تو وہ شاک کے زیر اثر ہے۔ سنبھل جائے گی آہستہ آہستہ۔“

”اسے بلاؤ بیٹا! سب کے درمیان اٹھے بیٹھے کی تو ہو سکتا ہے طبیعت سنبھلے اس کی۔“ انکل حسان نے افسروگی سے کہا تو دعائے خیر اپنی کرسی سے اٹھ گئی۔

”میں بلا لاتی ہوں انکل اسے۔“ آہستہ سے چلتی وہ ہشیفین کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ کچھ ہی بل میں انہوں نے دھواں دھواں چوہے لیے دعائے خیر کو واپس آتے دیکھا اور ہشیفین کی تیز آواز کو سنا۔

”میرے سامنے مت آیا کرو۔ کتنی دفعہ کہا ہے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم کہ تم بہت نیک اور پارسا ہو تو اللہ نے تمہیں عمل کروایا اور میں بری ہوں اس کی نظر میں۔ تو مجھے سب سے بڑی نعمت سے محروم کر دیا۔“

چیننے چیننے اس کا گلابیٹھ گیا تھا۔ پھر وہ سامنے بھی آگئی تھی۔ سرخ آنکھوں اور اجڑے حلیے کے ساتھ وہ ہشیفین نہیں لگ رہی تھی بلکہ ایسی محروم عورت تھی جس سے دنیا کی ساری نعمتیں لے کر اس کو تھی دامن کر دیا گیا ہو۔ سلمان ہی اٹھ کر اس کے پاس گیا تھا اس کا ہاتھ پکڑا ہی تھا کہ وہ بری طرح پھرتی۔

”نمت کرو یہ ڈھونگ مجھ سے محبت جتانے کے۔ میں جب میں اللہ کی نظر میں بری ہوں تو تم سب کی نظر میں کیسے اچھی ہو سکتی ہوں؟ نفرت ہے مجھے تم سے خود سے سب سے زندگی سے۔“ زور زور سے

چیننے چیننے وہ سلمان کے بازوؤں میں جھول گئی۔ ساتھ ساتھ آج ہی ہشیفین سے اسپتال میں مل کر آئے تھے جہاں وہ گزشتہ تین دن سے ایڈمٹ تھی لیکن بہر حال پہلے سے اس کی حالت خاصی بہتر تھی اب۔ شاید دکھ سہارنے کا سلیقہ آ گیا تھا اسے۔ پھر اس نے ساتھ کو دیکھ کر بے تحاشا رونا اور معافیاں مانگنا شروع کر دیا تھا سب کی موجودگی میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے دعائے خیر سے اور ساتھ سے معافیاں مانگتی چلی گئی تھی۔

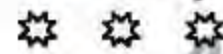
”ہی! میں نے آپ کو ہمیشہ ستایا۔ ساری زندگی میری یہی کوشش رہی کہ کسی طرح سے پایا کی نظروں سے آپ کو اور دعائے خیر کو گراؤں تاکہ نہ آپ میری ماں کی جگہ لے پائیں نہ دعائے خیر میری جگہ لے پائے۔ پھر آپ نے دیکھا اللہ نے کیسے مجھے میرے غرور کی میرے برے اعمالوں کی سزا دی۔“

اس نے سب کے سامنے وہ سب کہہ دیا جو وہ خود سے بولتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ دعائے خیر کو اپنے پھر اپنے گھر والوں کی نظروں سے گرانے کے لیے کیسے اپنے کلاس فیلوز سے کالز کرواتا رہی۔ غلط خطوط بھجواتا رہی۔ ساتھ اگرچہ بہت کچھ جانتی تھیں پھر بھی بہت سی باتوں سے بے خبر تھیں سو دکھ اور تانسف سے اہتر حال میں جتنا ہشیفین کو دیکھے گئیں۔ وہاں پر موجود سب لوگ ہی شاکڈ تھے سوائے دعائے خیر کے جو بہت پہلے یہ سب جان گئی تھی۔

”خدا آگوا یہ ہے ہشیفین! میں جو رشتوں اور محبتوں کی ترسی ہوئی تھی میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی بہن سمجھا کبھی تمہارے لیے بددعا نہیں کی۔ پھر بھی تمہاری تسلی کے لیے میں کہتی ہوں کہ میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرا اللہ بھی تمہیں معاف کرے۔“ جس بل دعائے خیر نے اس کو گلے لگا کر تسلی دی تھی وہاں سب اس کی بڑائی کے معترف ہو گئے تھے۔

”مجھے معاف کرو ساتھ۔ جو کچھ میری بیٹی نے تم لوگوں کے ساتھ کیا میں بھی تو اس میں برابر کا شریک رہا۔ تمہیں بھی بیوی کا درجہ دے ہی نہیں پایا سب جہاں

کی باتوں کے زیر اثر اور بعد میں ہشفین کی باتوں میں آکر تم دونوں سے ناروا سلوک رکھ کر تمہیں تو دکھ دیا ہی اپنی زندگی کے کئی سنہرے سال بھی فضول باتوں میں برباد کر دیے۔ میں تمہیں کبھی بتا ہی نہ سکا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا تھا۔ تم سے شادی میری زندگی کی اولین خواہش تھی اور جب وہ خواہش پوری ہوئی بھی تو احساس کمتری نے اس محبت کو مدہوشی کی نیند سلا کر خود کو اس پر حاوی کر لیا۔ سب جملہ ہمیشہ کہتی رہی کہ تم علی احمد سے محبت کرتی تھیں اور میں اس مرے ہوئے شخص کی رقابت میں مبتلا ہو کر تمہیں وہ محبت نہ دے پایا جو تمہارا حق تھی۔ آج اس کا صلہ مجھے اللہ نے میری بیٹی کی محرومی کی شکل میں دیا ہے، ساتھ کو لگا برسوں پختی رست پر چلتے چلتے اچانک پھولوں کی راہ گزر پر قدم رکھ دیا ہو شوہر کا اعتراف محبت زندگی کے کسی بھی موڑ پر ہو عورت کو یونہی شاد کرویتا ہے۔ وہ جتنی آنکھوں کے ساتھ ان کے دکھ بٹانے لگیں کہ یہی ایک وفا شعار عورت کا طرز ہے۔



”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ وہ حیرت سے کچھ دیر بول ہی نہیں پایا تھا۔
 ”میں وہی کہہ رہی ہوں جو آپ نے سنا شاہ میرا اس بکھرے گھر کو سمیٹنے کے لیے ایسے ہی ایک قدم کی ضرورت ہے جس میں میرا ظرف اور آپ کی اجازت درکار ہے۔ پھر دیکھیں نا اسی گھر میں جہاں اللہ نے ایک عورت کے حصے میں ماں بننے کی محرومی دی ہے وہاں دوسری عورت کو یہ اعزاز بھی تو بخشا ہے یہ اگر ایک عورت کی آزمائش ہے تو دوسری کی بھی تو ہے نا۔ وہ مالک ہر دو صورتوں میں اپنے بندے کا شکر اس کا ظرف ہی تو دیکھتا ہے۔“ وہ سچھی تھی کہ وہ ہچکچا رہا ہے بروہ تو بہت خاص بہت پیاری سوچ رکھنے والی لڑکی کو تم آنکھوں سے دیکھے جا رہا تھا۔
 ”تو طرف اتنا صبر اتنا شکر تم میں کیسے ہے؟“ وہ جب بولا تو اس ہی الفاظ اس کے منہ سے ادا ہوئے۔

شدت جذبات نے مزید کچھ کہنے ہی نہ دیا۔
 ”کیوں کہ میں دعائے خیر ہوں۔“ وہ مسکرا بولی۔
 ”ہاں تم دعائے خیر ہو اور تمہیں اپنے کسی عمل کے لیے میری اجازت درکار نہیں ہے دعا کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ہر عمل میں خیر ہے۔“ وہ اسے ساتھ لگا کر بولا تھا۔



اس نے اپنی محرومی سے سمجھوتا کر لیا تھا کیوں کہ یہی ایک واحد راستہ تھا جس میں سکون تھا۔ گناہوں کی معافی کے بعد انسان اپنے اوپر سے نا دیدہ بوجھ کو ہٹتے محسوس کرتا ہے کچھ ایسی ہی کیفیت ہشفین کی تھی۔ اب صرف ایک محرومی کا احساس تھا اس کے اندر، کیوں کہ اپنے گناہ کا اعتراف کر کے اس نے کفارے کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔

پھر ایک دن جب وہ صبح سوکرا اٹھی تو اس نے سلمان کو بے حد خوش دیکھا تھا۔ وجہ دریافت کرنے پر وہ کچھ کہے بغیر اسے بازو سے پکڑ کر گاڑی کی طرف لایا اور تیزی سے گاڑی کو گیٹ سے نکال کر سڑک پر ڈال دیا۔ وہ راستے میں پوچھتی ہی رہ گئی تھی کہ اتنی سویرے وہ اسے کہاں لے کر جا رہا ہے، لیکن وہ اسے ابھی پتا چل جائے گا کہہ کر چپ کر جاتا تھا۔ جلد ہی وہ ایک اسپتال کی حدود میں تھے ہشفین کا دل ایک لمحہ کو ڈوب کر ابھرا لیکن چند لمحوں بعد جس منظر کو دیکھا اس نے اس کی آنکھوں کو پانیوں سے بھر دیا تھا اور اس سے اگلے لمحے دعائے خیر کے منہ سے نقلی بات نے اسے ساکت کر دیا تھا۔

”آؤ نا ہشفین! دیکھو تو اللہ نے ہمارے گھر میں دو نعمتیں بھیجی ہیں، ایک تمہارے لیے ایک میرے لیے جلدی آؤ۔ اپنے حصے کی نعمت اٹھاؤ نا کہ میں اپنے حصے کی نعمت کو دیکھوں۔ میں نے تو ابھی نہ خود دیکھا ہے ان کو نہ کسی کو دیکھنے دیا ہے۔“ دعائے خیر کے نڈھال کبچے میں کچھ دینے کی خوشی حاوی تھی۔
 ”ہاں ہاں ہشفین آؤ نا! ہم سب بہت دیر سے تمہارا

ایک معافی نے اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا تھا۔
 طرف کو بڑا کر کے رشتوں کو کیسے اپنا بنایا جاتا ہے اس
 نے دعائے خیر سے سیکھا تھا۔ اس نے سلمان کی بے
 زاری کا ذکر ایک بار دعائے خیر سے کیا تھا۔ اس نے
 سمجھایا۔

انتظار کر رہے ہیں۔ ”پھپھو خوشی سے بے حال ہوتے
 ہوئے آگے بڑھیں اور ساکت کھڑی ہشیفین کا ہاتھ پکڑ
 کر اسے کٹ کی طرف لے گئیں جہاں دو صحت مند
 بچے بیٹھی اور پرسکون نیند سو رہے تھے۔ ہشیفین کے
 دل میں جیسے ماہتا کا سمندر ابلنے لگا مگر وہ غم آنکھوں
 کے ساتھ دعائے خیر کی طرف مڑی کہ کیا وہ جو بھی ہے
 آیا وہ حقیقت ہے یا اس کا وہم۔

”ہر مرد کے اندر ایک بچہ چھپا ہوتا ہے ہشیفین!۔
 اسے محبت اور توجہ دو وہ اندر سے اسی کا متلاشی ہونا
 ہے اس کے رنگ میں ڈھل جاؤ اس کی پسند اپنا لو پھر
 دیکھو کہ زندگی کے رنگ کتنے حسین ہیں۔ ایک ماں
 بھی تو ایسا ہی کرتی ہے اپنی اولاد کے لیے پھر ایک بیوی بھی
 شوہر کے لیے کر سکتی ہے اس کی نصیحت کو اس نے گہ
 سے باندھا ہی نہیں تھا عمل بھی کیا تھا پھر چند دنوں میں
 اپنی زندگی کو عمل ہوتے بھی دیکھ لیا تھا۔

”جلدی سے اٹھا لو ہشیفین۔ ایک تو ناقابل واپسی
 ہے دو سراسر تبدیلی کی بھی سہولت نہیں ہے۔“ سلمان
 کی بات پر سب مسکرا دیے۔ ہشیفین نے بڑھ کر ایک
 بچے کو اٹھا کر سینے سے لگایا تو جیسے جلتے ابلتے کلیجے میں قرار
 کی لہریں موجزن ہو گئی تھیں۔

”بس مر بھی جاؤں تب بھی تمہارا قرض کبھی اتار
 نہیں پاؤں گی بیٹا۔“ پھپھو نے دو سرا بچہ اٹھا کر دعائے
 خیر کے پاس لٹاتے ہوئے کہا اس بار وہ شدت جذبات
 سے کچھ بول نہیں پائی تھی۔

”اوہو آج فجر کی نماز پھر قضا ہو گئی۔“

سوچ نگر کی دکانی



وہ عیبہ جمیل

قیمت - 350 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر

32735021

آنکھ کھلنے اور گھڑی پر نگاہ پڑتے ہی الفسوس ہوا تھا۔
 اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ باہر آئی جہاں زندگی
 اپنے پورے جوہن پر بھی اپنے واداکر گوڈ میں چڑھا
 سامنے ٹیبل پر ناشتے کی چیزوں پر ہاتھ مارنا اس کا بیٹا
 سفان۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر اپنی داوی کی گوڈ میں
 باپ کے پاس جانے کی ضد کرتا ہوا شاہ میر اور دعائے
 خیر کا بیٹا عالیان جو کہ سامنے کی کرسی پر بیٹھے باپ کو دیکھ
 کر بار بار بانہیں پھیلا رہا تھا۔ سب کے ناشتے کے
 لوازمات پورے کرنے میں بچن سے ٹیبل کے چکر لگاتی
 دعائے خیر۔ وہ بے ساختہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ کر
 اس خوب صورت ماحول کا حصہ بن گئی۔ اب وہ دن
 نہیں تھے جب ایسا منظر اس کے اندر آگ لگا دیا کرتا
 تھا۔ وہ دلوں کا مالک دلوں کو دکھانے کی سزا دیتا ہے تو
 معافی مانگنے والے کا بھی اس کے ہاں بہت اجر ہے۔

READING
Section

ماہنامہ شعاع مارچ 2016 247

قصہ سحر

ماورا مرتضیٰ عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلتا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی شہینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لا تعلق ہے۔

منزہ شہینہ اور نیو کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر پرنس مین ہے اور بے حد شان دار برٹش کالنگ ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیو کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیانی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔

رضا حیدر، تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بھدا اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔

Downloaded From
Paksociety.com

اسٹھائیسویں قسٹ



اسکرین پر رضاحیدر کا نام جگمگا رہا تھا جس پر ماورا کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے تھے اور بی گل نے اس چیز کو بڑی گہری نظر سے نوٹ کیا تھا کیونکہ ماورا موبائل کی اسکرین کی جانب بہت ہی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کس کا فون ہے؟“ بی گل کی نظروں کے ساتھ ساتھ ان کا لہجہ بھی جتنا ہوا تھا۔

”تیور کی پرسنل کال ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے موبائل واپس میز پر رکھ دیا تھا۔

”چھا۔“ بی گل نے یوں ”چھا“ کہا جیسے اس کی پرسنل کال کا مطلب بھی سمجھ گئی ہوں۔ اور اس سے پہلے کہ ماورا بی گل اور عافیہ بیگم کے ساتھ دوبارہ سے سلسلہ کلام جوڑتی ایک بار پھر گھنٹی بجتی لگی تھی۔

اور اب کی بار ماورا کے دل میں نجانے کیا سمائی کہ اس نے بہت ہی سہولت سے موبائل اٹھا کر کال ریسیو کر لی تھی۔

”ہیلو۔“ اس کی آواز سرد تھی۔

اور دوسری طرف تیور کے موبائل پر کسی لڑکی کی آواز سن کر رضاحیدر کے دہکتے دماغ میں مزید چوٹ پڑی تھی۔

”کون ہو تم۔“ ان کے لہجے میں رتی برابر بھی لچک نہیں تھی۔ اور ماورا ان کے سوال پر چند سیکنڈز کے لیے چپ ہو گئی تھی۔

”میں پوچھ رہا ہوں۔ کون ہو تم۔“ انہوں نے شدید غصے سے اور چبا کر کہا تھا۔

”ماورا مرتضیٰ۔“ ماورا کا لہجہ مضبوط اور ڈونوک ہو رہا تھا۔

اب کی بار رضاحیدر کی طرف خاموشی چھا گئی تھی۔

”کون ماورا مرتضیٰ۔“ اس نے بی گل کو پھر سے اپنے سابقہ لب و لہجے میں لوٹ چکے تھے۔

”یہ سوال آپ اپنے آپ سے پوچھیں۔“ وہ ہنوز ڈونوک بات کر رہی تھی۔

”دیکھو لڑکی! مجھ سے سیدھی سیدھی بات کرو۔ کون ہو تم؟“ وہ کرتی سے بولے تھے۔

”کیوں اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔“ ماورا نے طنز یہ پوچھا۔

”کیا اس بند کروانی۔“ وہ فون پر ہی دھاڑے ان کا پارہ بڑی جلدی ہائی ہو چکا تھا۔

”کچھ سوچ سمجھ کر منہ سے الفاظ نکالیں۔ رشتے میں آپ کی بہو بھی ہوتی ہوں۔ مسز تیور حیدر۔“ ماورا کے

انداز میں دنیا بھر کا سکون تھا۔ اور اس کا یہ سکون رضاحیدر کا سارا سکون غارت کر گیا تھا۔

ماورا آنکھوں سے او جھل رہ کر بھی بخوبی محسوس کر سکتی تھی کہ فون کی دوسری طرف کیا جاتی ہے؟ کیونکہ ماورا

مرتضیٰ کے بعد مسز تیور حیدر ہونے کا انکشاف بھی کچھ کم نہیں تھا۔

”میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔“ رضاحیدر کی بہت بھی بلا کی تھی۔

”میں جانتی ہوں۔ جو شخص کسی کے قدموں تلے سے زمین اور سر سے چھت کھینچ سکتا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا

ہے۔ زبان کھینچ لینا کون سا مشکل کام ہے؟“

ماورا رفتہ رفتہ کھل رہی تھی اور رضاحیدر کے چوہ طبق روشن ہوتے جا رہے تھے۔

”لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ جیسی نہیں ہوں۔ میں آپ سے کچھ نہیں چھینوں گی۔ کیونکہ میں علی

مرتضیٰ کی بیٹی ہوں۔ مجھے چھیننا نہیں آتا۔ میری رگوں میں اعلا طرف باپ کا خون ہے۔ میں کسی کم طرف کی اولاد

نہیں ہوں۔“ وہ کہتے کہتے تلخ ہو گئی تھی۔

رضاحیدر کا خون کھول اٹھا تھا۔ انہوں نے ایک دم فون بند کر دیا تھا۔ اور ماورا اپنے ہاتھ میں پکڑے ساکت

وصامت موبائل کو دیکھتی رہ گئی۔

”رضاحیدر کا فون تھا۔“ اب کی بار سوال عافیہ بیگم کی طرف سے آیا تھا۔

”جی ہاں۔ اس کا تھا۔“ ماورا اندر ہی اندر تپ رہی تھی۔

”تمیز سے بات کرو۔ تمہیں اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ تمہارے۔“

”پی پلینز۔ ابھی میں تیور کے لیے ریلیکس ہوئی ہوں۔ نارمل ہوئی ہوں۔ ابھی کچھ ٹائم کچھ وقت لگے گا۔ مجھے ریلیکس ہونے دیں۔ سب کچھ اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہوگا۔“ ماورا اپنے اعصاب کو کنٹرول رکھنے کی کوشش میں اندر سے سچ سچ چڑچڑی اور قدرے نڈھال بھی ہو چکی تھی۔

”دیکھو بیٹا۔ رشتے بنانے میں بہت ٹائم لگتا ہے لیکن رشتے بگڑنے میں لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اس سے پہلے کہ کچھ غلط ہو، تم سب کچھ خود سنبھال لو۔ اپنے آپ کو مضبوط رکھو اور سب کچھ فیس کرو۔“ عافیہ بیگم کے اندر اتنا تحمل اور اتنا اطمینان کہاں سے آیا تھا یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتی تھیں۔

پتا نہیں کیسے ان کے اندر کا ڈر اور خوف دور جاسویا تھا۔

”پی! میں سچ سچ بدل چکی ہوں۔ تیور کی محبت کے سامنے میری نفرت بہت کم ہے۔ میں اسے تکلیف نہیں دے سکتی۔ لیکن رضاحیدر کو یہ بات کون سمجھائے؟“

ماورا کا لہجہ بہت الجھا ہوا تھا اور یہی الجھن بی گل اور عافیہ بیگم کے چہرے پہ بھی نقش ہوئی نظر آرہی تھی۔ ماورا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اگلی صورت حال سے کیسے گزرنا ہے؟



”سر! آپ سے مسٹر تیور حیدر ملنے کے لیے آئے ہیں۔“ آفاق اپنے کسی کام میں مصروف تھا جب اس کی پتی اے نے اسے اطلاع پہنچائی تھی۔

اور آفاق لپ لپ ٹاپ پر کام کرتے کرتے چونک گیا تھا۔

”چھا۔ بیجو اسے۔“ آفاق نے فوراً اسے بھیجنے کا کہا تھا اور اگلے چند لمحوں میں تیور اس کے سامنے موجود تھا۔

”سلام علیکم۔“ تیور نے بڑے ہشاش بشاش لہجے میں سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ آج کیسے سورج مغرب سے نکلا۔؟“ آفاق بھی جواباً بڑی خوش دلی سے پیش آیا تھا۔

”تمہیں بتایا تو تھا کہ یہ سورج مغرب سے ضرور نکلے گا۔“ تیور اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ہنسا تھا۔

”ہاں۔ یاد آیا۔ تم نے اطلاع دی تھی۔ بس میں ہی بھول گیا۔“ آفاق نے یاد آنے پر اپنی غلطی تسلیم کی۔

”تم تو دنیا بھلائے بیٹھے ہو۔ یہ تو محض ایک بات ہے۔“ تیور نے جان بوجھ کے اس پر چوٹ کی تھی۔

”میری دنیا میرے گھر میں ہے۔“ آفاق کا اشارہ فاریہ کی طرف تھا۔ اور تم گھر سے بھی بھاگ رہے ہو اور دنیا سے بھی۔“ تیور نے اگلا وار بھی خالی نہیں جانے دیا تھا۔

”کیا۔ بات ہے آج بڑے اکڑے اکڑے سے لگ رہے ہو۔؟“ آفاق نے اس کی بات کو نارمل ہی لیا تھا۔

”جب کوئی اپنا بیگانوں جیسی حرکت کرے تو منہ سے اکڑے اکڑے الفاظ ہی نکلتے ہیں۔“ تیور کہتے ہوئے کرسی کی طرف بڑھا۔

”بیگانوں جیسی حرکت۔“ آفاق کو حیرت ہوئی تھی۔

اکیلے مرنا اور اکیلے جینا بے گانوں جیسی ہی حرکت ہے ناں۔؟ تیور نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پہ گاڑ دی تھیں۔ اور آفاق کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

دکھایا ہوا کچھ غلط کہہ دیا میں نے۔؟“ تیمور کا سوالیہ انداز ہنوز تھا۔

دکھایا مطلب۔ میں سمجھا نہیں۔؟“ آفاق انجان بننے میں ماہر ہو چکا تھا۔

”بیٹھو! مطلب میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔“ تیمور نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی کرسی

سنبھال لی تھی۔

آفاق کچھ سمجھ اور کچھ نا سمجھی کے سے انداز میں دیکھتے ہوئے واپس اپنی کرسی پہ بیٹھ گیا تھا۔

”چائے آرڈر کرو۔“ تیمور نے جان بوجھ کر نارمل انداز اپنایا تھا۔

”کیا؟“ آفاق کو اس کی اس بے تکلفی پہ بھی حیرت ہوئی تھی۔

”میں نے کہا چائے آرڈر کرو۔ چائے پینے کا موڈ ہو رہا ہے۔“ تیمور نے وجہ بتائی اور آفاق نے چپ چاپ اس کی فرمائش کی تکمیل کی تھی۔

”فارہ کیسی ہے؟“ تیمور کا اگلا سوال بھی غیر متوقع تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ آفاق نے مختصراً بتایا۔

”خوش ہے۔؟“ اس کا ہر سوال امید کے برعکس سامنے آ رہا تھا۔

”ہاں۔! آفاق ہر سوال کے ساتھ اگھٹتا ہی جا رہا تھا۔

”کتنی خوش ہے۔؟“ سوال پہ سوال جاری تھا۔

”یہ تو وہی بنتا سکتی ہے۔“ آفاق بھلا کیا بتا سکتا تھا۔

”اچھا۔ انکل اور آئی کا تو بتا سکتے ہوتاں؟ وہ کتنے خوش ہیں تم سے۔؟“ تیمور کے سوالات عجیب سے عجیب تر

تھے۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔؟“ آفاق نے بڑے ٹھنراؤ سے پوچھا تھا۔

”میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن کو تم دکھ دینے سے بچا رہے ہو وہ لوگ پھر بھی خوش نہیں ہیں۔ کیونکہ

ادھوری خوشی پورے غم سے زیادہ لذت ناک ہوتی ہے۔ جس کا اندر ہی اندر دھڑکا لگا رہتا ہے کہ شاید ابھی چھین

جائے۔ شاید ابھی چھین جائے اور یہ ہی حال ان کا بھی ہے۔ ادھوری خوشی انہیں خوش نہیں ہونے دے رہی۔

اس لیے بہتر ہے کہ یا تو انہیں پورا غم دے دو۔ یا پھر پوری خوشی۔ آخر ان کا یہ دھڑکا تو ختم ہو۔“

تیمور نے اسے کافی گہرائی سے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور جواباً آفاق چپ کا چپ رہ گیا۔

”دیکھو آفاق۔! اگر وہ اہنق کا غم نہ گئے ہیں تو یہ غم بھی سہ جائیں گے اور تم تو اہنق سے کئی گنا زیادہ بہتر ہو۔

صحت مند ہو۔ مضبوط ہو۔ بہادر ہو۔ وہ تو مجھو اس وقت بچہ تھا۔ بیماری نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ وہ نہیں سہ

سکا۔ اور تم تو اتنے عرصے سے اکیلے جنگ لڑتے آرہے ہو اور مجھے پورا یقین ہے۔ تم یہ جنگ جیت جاؤ گے۔

کیونکہ تمہارے اندر حوصلے کی طاقت ہے۔“

تیمور نے بات کرتے کرتے اس کی اہمیت بندھائی تھی۔

اور آفاق نے گہری سانس کھینچتے ہوئے جیسے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

”تو تمہیں پتا چل چکا ہے۔“ اس کا انداز شکست خورہ سا تھا۔

”خوش قسمتی سے۔“ تیمور نے کندھے اچکائے۔

”کس نے بتایا۔؟ ڈاکٹر شاہ نواز نے یا پھر زوبہ شاہ نواز نے۔“ آفاق کو پتا تھا کہ ان دونوں باپ بیٹی کے علاوہ

کوئی بھی نہیں جانتا۔

”جس نے بھی بتایا ہے۔ تم بس یہ بتاؤ کہ تم نے اب کیا کرنا ہے؟ کیا سوچا ہے؟“ تیمور اس سے اگلی بات پوچھ

READING
Section

”کیا مطلب؟ کیا سوچا ہے؟“ آفاق نے سر اٹھا کر تیمور کو دیکھا۔

”آپریشن کے لیے؟“ تیمور نے اب صاف سوال کیا تھا۔

”نہیں۔ میں آپریشن نہیں کرواؤں گا۔“ اس نے فوراً سے بھی ہنستا انکار کر دیا۔

”کیوں؟ آپریشن کیوں نہیں کرواؤ گے؟“ تیمور نے ذرا سختی سے پوچھا۔

”میری زندگی کے جتنے دن باقی ہیں، میرے لیے وہی کافی ہیں۔“ آفاق کی طرف سے انکار تھا۔

”تمہارے لیے کافی ہیں لیکن تمہارے گھر والوں کے لیے کافی نہیں ہیں، تمہارے ماں باپ اور تمہارے بیوی بچوں کو تمہاری زندگی کے چند دن نہیں بلکہ تمہاری پوری زندگی چاہیے، جس کے لیے تمہیں یہ ریسک لینا ہی ہوگا۔ تمہارا آپریشن تمہارے لیے اور تمہارے گھر والوں کے لیے سب سے دیر مت کرنا۔“

تیمور اسے بار بار مجبور کر رہا تھا لیکن آفاق کی اپنی ہی ایک الگ سوچ تھی۔

”اگر اس ریسک میں زندگی کے چند دن بھی باقی نہ رہے تو پھر پھر میرے گھر والے کیا کریں گے؟“ آفاق نے تیمور کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری زندگی کتنی ہے؟ میری زندگی کتنی ہے؟ یہ تو ہم دونوں ہی نہیں جانتے۔ میں تمہیں زندگی چھنے کے لیے فورس کر رہا ہوں۔ تم بیمار ہو لیکن تمہاری زندگی زیادہ ہو۔ میں تندرست ہوں، صحت مند ہوں۔ لیکن میری زندگی کم ہو۔ زندگی کا کوئی بھروسہ ہے۔ بھلا تیمور نے کتنے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔“

”یار! بات یہ نہیں ہے۔ میں موت سے ڈر نہیں رہا۔ مجھے بھی مام ڈیڈ اور فارہ کا ہی خیال ہے۔ ان ہی کی خاطر اس ریسک کو ٹالنا آ رہا ہوں۔ ورنہ میں اکیلا اگر اتنی تکلیف سہہ سکتا ہوں تو مجھ کو کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ آپریشن کروانا مشکل نہیں تھا میرے لیے مگر میں انیق جیسا دکھ۔“ آفاق بات کرتے کرتے رک گیا تھا۔

”دیکھو آفاق۔ سب کی قسمت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو یہی معجزہ دکھانا ہو کہ تم دونوں بھائی ہو۔ ایک ہی خون ہو۔ ایک ہی بیماری کا سامنا کرنا پڑا لیکن ایک کی قسمت میں زندگی اور ایک کی قسمت میں موت لکھ دی ہو؟“ تیمور نے ایک اور دلیل اس کے سامنے رکھی تھی۔

”ہاں ہو سکتا ہے۔ میں کب انکار کر رہا ہوں۔ لیکن محبت انسان کو کمزور بنا دیتی ہے۔ اچھا بھلا انسان بزدل بن جاتا ہے۔ شاید میں بھی بن گیا۔ بزدل اور کمزور۔ آفاق نے سر جھٹکا تھا اور تیمور مسکرا رہا تھا۔ ”کبھی کبھی محبت مضبوط بھی بنا دیتی ہے۔ تم کمزوری کو چھوڑ کر مضبوطی کی طرف بھی آسکتے ہو۔ بس مزید حوصلے کی ضرورت ہے تمہیں۔“

”مگر کیسے؟“ آفاق کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”آپریشن کی تیاری کرو۔“ تیمور نے اصل بات کی۔

”لیکن تیمور۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن دیکھن کچھ نہیں۔ تم بس تیاری کرو۔ باقی معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔“ تیمور کہہ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”تم؟“ آفاق نے سوالیہ دیکھا۔

”ہاں۔ میں۔ کیونکہ میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ خود آپریشن کرواؤں گا۔ اور ان شاء اللہ تمہیں ٹھیک ٹھاک واپس لے کر آؤں گا۔ ان شاء اللہ۔“ تیمور کے لہجے میں یقین تھا اور آفاق مزید کچھ نہیں کہہ سکا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”کون مسزولید رحمان۔۔۔“ اس نے ہنوز اسی انداز میں پوچھا۔

”عزت۔۔۔ عزت رحمان۔۔۔“ وہ بہت زیادہ برداشت سے کام لے رہی تھی اور ولید بے دھیانی میں ہی اس کی برداشت آزمائے جا رہا تھا۔

”عزت۔۔۔ آج کل کسی کی کوئی عزت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ نیند میں جو منہ میں آ رہا تھا بولے جا رہا تھا اور عزت غصے سے لال پیلی ہونے لگی تھی۔

”میں فون بند کر رہی ہوں۔“ عزت نے تلملا کر دھمکی دی تھی۔

”اپنی مرضی سے فون کیا ہے۔۔۔ اب اپنی مرضی سے بند کر دیتے۔ میں نے روکا تو نہیں۔“ اس نے جیسے غنوغی میں ہی لاپرواہی کا اظہار کیا تھا اور عزت یک دم غصے سے چیخ اٹھی تھی۔

”ولید۔۔۔ وہ اتنی زور سے چیخی کہ۔۔۔ ولید کے چوہہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

”ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کب کون۔۔۔ عزت۔۔۔“

وہ یک دم بڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا لیکن عزت اتنے میں فون بند کر چکی تھی اور ولید موبائل اسکرین پہ کال کا وقت دیکھ کر جیسے بستر پہ ہی اچھل پڑا تھا۔

”سات منٹ۔۔۔ اس نے سات منٹ بات کی اور میں۔۔۔ میں نیند میں ہی۔۔۔ اہ گاڈ۔۔۔“ اس نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

اور فوراً ”سے پشتر اس کا نمبر ڈائل کیا تھا لیکن عزت نے فون کاٹ دیا۔

ولید نے دوبارہ کیا۔۔۔ اس نے دوبارہ بھی کاٹ ہی دیا تھا۔

”اٹھ گئے تم۔“ زبیدہ خاتون اس کی بڑبڑاہٹ کی آواز سن کے اندر آئی تھیں۔

”جی۔۔۔ اٹھ گیا ہوں۔“ وہ اپنے آپ کو کوستے ہوئے بولا۔

”سنا سنا گرم کروں؟“

”نہیں امی۔۔۔ پہلے اسے تو ٹھنڈا کر لوں۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”کس کو؟“ وہ نا سمجھی سے پوچھیں۔

”آپ کی بہو کو۔“ ولید کہہ کر بستر سے اٹھا اور جوتے پہن کر اسی طرح الجھے بکھرے حلیے میں باہر نکل گیا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو۔ کیا ہوا ہے؟“ زبیدہ خاتون کو اب بھن ہوئی تھی۔

”وہ ناراض ہو گئی ہے، اس کو منانے جا رہا ہوں۔“ ولید فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیرٹھیوں کی طرف بڑھا تھا۔

یعنی وہ چھت پہ جا رہا تھا عزت کو فون کرنے کے لیے۔

”ہوں اچھا۔“ زبیدہ خاتون سر ہلا کر رہ گئی تھیں اور وہ اوپر چلا گیا۔



”بھائی نے شادی کر لی۔۔۔؟“ عزت نے غصہ ٹھنڈا ہوتے ہی پہلا سوال یہ ہی کیا تھا۔

”ارے نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ تمہارا بھائی ماشاء اللہ بہت ہی پرہیزگار آدمی ہے۔ شریعت کا قائل۔ اور صومو

صلوٰۃ کا پابند۔ اس نے شادی نہیں کی۔ اس نے نکاح کیا ہے۔ صرف نکاح۔“ ولید جڑ کے بولا تھا۔

”تو آپ کیوں آپہں بھر رہے ہیں؟“ عزت نے خفگی سے پوچھا۔

”آپہں نہ بھروں تو اور کیا کروں؟ اپنا نکاح کر کے انجوائے کرتا پھر رہا ہے۔ اور میرے ساتھ ظلم کر کے میرا

خیال ہی نہیں کیا کبھی۔۔۔ الٹا بہن کو وہی بھجوا دیا۔ اور اوپر سے یہ پابندی کہ رابطہ بھی نہیں رکھنا۔“ ولید تو آج

دکھے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔
 ”یعنی وہ رخصتی بھی کروا چکے ہیں؟“ عزت کو مزید حیرت ہوئی تھی۔
 ”رخصتی۔ خیر چھوٹ۔“ ولید رخصتی کے لفظ پہ تڑپا پھر سر جھکا کر چپ ہو گیا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟ آپ چپ کیوں ہو گئے؟“
 ”کچھ نہیں، بس جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ آج پکچر کیوں نہیں بھیجی؟ میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے تمہاری ڈیلی پکچر ملنی چاہیے؟“ ولید نے ذرا غصے اور سختی سے پوچھا تھا۔

”بس۔ وہ رات سے بابا کافی پریشان ہیں اور وہ شادی کا فنکشن اس طرح چھوڑ کر بھی نہیں آسکتے۔ ورنہ بھائی کی شادی کا سن کر کافی غصے کی حالت میں ہیں۔ ان سے یہ ٹائم گزارنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔“
 یہ تو صرف عزت ہی دیکھ رہی تھی کہ اس کے بابا پہ کیا بیت رہی ہے۔ البتہ ولید کو رضاحیدر کی حالت کا سن کر کافی ہنسی بھی آئی تھی لیکن پھر دیا گیا تھا۔

”تو پھر آج ایسا کرو۔ آج اپنی نہیں اپنے بابا کی پکچر بھیج دو۔ میں جا کر ان کے سپوت کو دکھاتا ہوں۔ کہ وہ کھو تم نے کیا حال کر دیا ہے۔“ ولید کی شرارتی رنگ پھڑک چلی تھی۔

”ولید! آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے؟“ عزت نے خفگی سے کہا۔
 ”نہیں۔ مجھے تو صرف تم سوجھ رہی ہو لیکن کہیں میسر نہیں آرہی ہو۔“ اس نے پڑی بدل لی تھی۔
 ”میرا خیال ہے میں فون بند کروں۔“ اس نے ولید کو خبردار کیا۔
 ”کرو بند۔ آخر کب تک کروگی۔ کبھی تو آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔“ ولید نے آہ بھر کے کہا اور عزت اپنی ہنسی دبا گئی تھی۔

”اوکے۔ اللہ حافظ۔“ عزت نے فون بند کرنا چاہا۔
 ”ارے روکو۔ سنو تو۔“ ولید نے اسے روکا۔
 ”ہوں۔ کہہئے سن رہی ہوں؟“ وہ رک گئی تھی۔

”کب آرہی ہو؟“ ولید نے کچھ ایسے افسردہ سے لہجے میں پوچھا کہ عزت بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔
 ”جب آپ کہیں۔“ وہ بھی بڑے لاڈ سے بولی تھی۔

”آج ہی آ جاؤ۔“ ولید حقیقتاً اسے مس کر رہا تھا۔
 ”آپ آنکھیں بند کرو۔ اپنے دل پہ ہاتھ رکھو۔ اور مجھے محسوس کرو۔“ سمجھو میں آگئی۔“ عزت نے بہت نرم گرم سا احساس دلایا تھا اور ولید نے سچ سچ آنکھیں بند کر کے دل پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔
 ”آئی مس یو۔“ عزت نے بے حد سرگوشی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔
 ”آئی فیل اشد۔“ ولید بھی بے حد آہستگی سے کہتا آہ بھر کے رہ گیا تھا۔

”ولید۔ ولید۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“ زبیرہ خاتون چھت پہ کپڑے پھیلانے کے لیے آئیں تو ولید کو اس طرح آنکھیں بند کیے کھڑے دیکھ کر تعجب سے دیکھے گئیں۔

”نیو گا۔ یو گا ہو رہا ہے امی۔ آپ کی ہونے کہا ہے کہ ایسا یو گا کیا کرو۔“
 ولید چونک کر متوجہ ہوا اور پھر سر جھٹک کر کہتا ہوا نیچے آ گیا اور زبیرہ خاتون ایک بار پھر حیران اور ابھری ہوئی نظروں سے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

”بسکی۔ بسکی۔ بسکی حرکتیں کر رہا ہے آج۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے کپڑے پھیلا رہی تھیں۔

”مجھے مس کیا؟“ تیمور آفس سے سیدھا ماورا کے گھر آیا تھا اسے لینے کے لیے اور گاڑی میں بیٹھتے ہی پہلا سوال یہ ہی کیا تھا۔

”آپ کا سیل یہیں رہ گیا تھا۔ دن میں کالز آتی رہیں آپ کی۔“ ماورا نے اپنے بیگ سے اس کا موبائل نکال کر اس کے سامنے کیا۔

”مجھے نہ سیل کی پروا ہے نہ کالز کی۔ تم اپنی بات کرو۔ تمہارا دن کیسا گزرا۔؟“ تیمور نے لاپرواہی سے سیل ڈیش بورڈ پر ڈال دیا تھا۔

اور اس کے سوال پہ ماورا نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا اور پھر دوبارہ پلکیں جھکالی تھیں۔

”اداس گزرا۔“ ماورا کا جواب مختصر تھا۔

”کیوں۔؟“ اور تیمور کا سوال بے ساختہ۔

”آپ کے لیے۔“ غیر متوقع جواب۔ تیمور کو یقین نہیں آیا تھا۔

”کس کے لیے۔؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”آپ کے لیے۔“ اس نے بھی وہی جواب دیا تھا اور اس نے یکدم گاڑی کو بریک لگا دیے تھے۔

”کیا ہوا؟“ ماورا نے گردن موڑ کر دیکھا۔

”ہک بلیٹ ہو جائے گا۔“ تیمور نے اسٹیرنگ سے ہاتھ ہٹا لیے تھے۔

”کیوں۔؟“ ماورا اس کے چہرے پہ پھیلی خوشی کے رنگ دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا دن اداس گزرا۔ یہ سن کر میری شام خوشی سے رنگین ہو گئی ہے۔“ تیمور کا لہجہ چمک رہا تھا۔

”کیوں۔ آپ کو یقین نہیں تھا کہ میں آپ کے لیے اداس ہو سکتی ہوں؟“ ماورا نے اس کے چہرے کے

تاثرات دیکھے۔

”تم میری فیملنگز نہیں سمجھ سکتیں۔“ تیمور ایک گہری سانس خارج کرتا ہوا گاڑی سے اتر گیا تھا اور پھر چند

سیکنڈز کے توقف سے ماورا بھی گاڑی سے اتر آئی تھی۔

”فیملنگز تو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ کبھی کسی انسان خود اپنی بھی فیملنگز نہیں سمجھ پاتا۔ ہر چیز سمجھ سے باہر

ہو جاتی ہے۔“ ماورا اس کے برابر آکھڑی ہوئی تھی۔

”ہوں۔ بالکل اسی طرح میری سمجھ سے اور میرے یقین سے باہر ہے کہ تم میرے ساتھ ہو؟ میرے برابر

کھڑی ہو۔ میری ہو چکی ہو۔ میں تمہیں چھو سکتا ہوں۔ تمہارا لمس محسوس کر سکتا ہوں۔“ تیمور نے کہتے ہوئے

اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”اگر آپ کو میرے ساتھ پہ یقین نہیں آ رہا تھا تو پھر آپ کو مجھ پہ بھی یقین نہیں آئے گا۔“ ماورا کے ذہن پہ

رضاحیدر کا خیال سوار تھا۔

”یہی بات مت کرو۔ تم پہ تو آنکھیں بند کر کے یقین کر سکتا ہوں۔“ تیمور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے

تھپک رہا تھا۔

”اس بات کو یاد رکھیے گا۔ یہ بات میرے اور آپ کے تعلق کے لیے بہت ضروری ہے۔“ ماورا نے اسے اپنی

بات پہ قائم رہنے کی تاکید کی تھی اور تیمور نے مسکرا کر سر ہلا دیا تھا۔

”چھا۔ یہ جتاؤ تمہاری وہ ریڈ کلر کی ریسٹ وراچ کہاں ہے؟“ تیمور کو وہ گھڑی یاد آگئی جو اس نے ماورا کی کلائی

میں گھڑی پہلے دن دیکھی تھی۔
 ”کون سی۔؟“ ماورا کو یاد نہیں آیا۔
 ”جو تم نے اس روز بس میں بھی پہنی ہوئی تھی۔ بلکہ تم اکثر پہنتی ہو۔“ تیمور نے یاد دلایا۔
 ”وہ ہاں۔۔۔ وہ وہ خراب ہو گئی۔ وضو کرنے کے لیے اتار کر رکھی اور نیچے گر گئی۔“
 ”چھا۔۔۔ مگر تمہاری کلائی میں اچھی لگی ہے۔ وہ۔۔۔ اونٹنی لے کر آتے ہیں۔“ تیمور نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”نہیں ابھی نہیں۔۔۔ ابھی گھر چلتے ہیں۔۔۔ پھر کبھی سہی۔۔۔“ ماورا نے اسے روکا۔
 ”پھر کبھی کس نے دیکھی ہے۔۔۔ ابھی چلو۔۔۔ میرا دل چاہ رہا ہے تمہاری کلائی میں ریڈ کلر کی رسٹ واچ دیکھنے کو۔“ تیمور نے ضد کی تھی۔
 ”مگر تیمور۔۔۔ وہ جھنجھلائی۔

”کوئی اگر مگر نہیں۔۔۔ تم آؤ میرے ساتھ۔“ تیمور اسے کھیچ کر اگلی نشست تک لایا اور اسے اندر بٹھادیا تھا۔ پھر خود بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

اور ابھی اس نے گاڑی آگے بڑھائی ہی تھی کہ اس کے فون پہ عزت کا میسج آگیا۔

”کہاں ہیں؟ کیسے ہیں بھائی؟“ تیمور نے تیزی سے اسے جواب دیا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔۔۔ تمہاری بھابھی کے لیے رسٹ واچ لینے جا رہا ہوں۔“ وہ شرارت سے بتا رہا تھا۔

”رسٹ واچ۔۔۔؟“ عزت کو حیرت ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ اور تم کیسی ہو؟ اور باقی سب۔۔۔“ تیمور نے امی اور بابا کا پوچھا۔

”سب ٹھیک ہیں۔۔۔ ہم کل واپس آ رہے ہیں۔“ عزت نے اصل اطلاع پہنچائی۔

”کل۔۔۔“ تیمور ایک دم رک گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ایک میں
اور ایک تم



تزیلہ ریاض
قیمت - 350 روپے

آجالوں کی بستی



فاخرہ جبین
قیمت - 400 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



گفتہ عبد اللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

منعوانے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

ماہنامہ شعاع مارچ 2016 259

READING
Section

دل کے نالے بے اثر ہونے لگے

دور ہم سے ہمسفر ہونے لگے

کیا کسی نے اک نظر دیکھا ہمیں
ہم چسراغِ رہگزر ہونے لگے

مٹے کچھ اور پیدا ہو گئے
فاصلے جب مختصر ہونے لگے

آپ کے انداز پر کیا تبصرہ
آپ منظورِ نظر ہونے لگے

وہ ملاقاتوں کے دن وہ رتجگ
سلسلے سارے امر ہونے لگے

جانتی ہے ایک دُنیا دردِ دل
جان کر وہ بے خبر ہونے لگے

کاش رانا کوئی سمجھے پیار میں
ظلم ہم پر کس قدر ہونے لگے
قدیر رانا

ہجرتوں کے عذاب اچھے لگے
آنکھ میں تیرے خواب اچھے لگے

جو تیرے چاند رخ پر روشن ہیں
گیسوؤں کے سحاب اچھے لگے

مجھ کو اپنے سوال سے بڑھ کر
آج تیرے سحاب اچھے لگے

شاخ پر جو بیلے نہ لگتے تھے
زلف میں وہ گلاب اچھے لگے

مستی چشم کو وہ کیا جانیں
جن کو جامِ شراب اچھے لگے

جانے کیا بات ہو گئی ہے انصر
آج وہ بے سحاب اچھے لگے
نعیم انصر ہاشمی



اک پیکر جمال میں اُلجھا ہوا ہوں میں
اُلجھے ہوئے خیال میں اُلجھا ہوا ہوں میں

تو نے کہا تھا چاند ہے بالکل مری طرح
اب تک اُسی مثال میں اُلجھا ہوا ہوں میں

اُس نے کہا کہ عہدِ گزشتہ کو بھی سنبھال
میں نے کہا کہ حال میں اُلجھا ہوا ہوں میں

فرصت ملی تو ہوگی ملاقات آپ سے
فی الحال تو ملال میں اُلجھا ہوا ہوں میں

گفتگو مرنے و وجود کے ڈٹتے تھے ایک شب
اُس بے کراں وصال میں اُلجھا ہوا ہوں میں

انتظاراً

بھورت سے سے
رین ڈھلے تک
دروازے سے لپٹی لڑکی
دیکھ رہی ہے رستہ
مورکھ سا جن کا
سوچ رہی ہے
صبح کا بھولا
شاید شام کو
گھر لوٹ آئے

محمد شتاق آثم

محمد منظر نیازی

چور کی طلاق

دفتر میں کام کرتے ہوئے ایک صاحب کامیو اتل چوری ہو گیا۔ دن بھر کی مصروفیت کے بعد منگھے ہارے صاحب بہادر نے جو نئی گھر کی ویلیر پر قدم رکھا تو اگلا منظر دیکھ کر چونکے بنانہ رہ سکے۔

گھر میں ساس اور سرراہی بیٹی کا سامان بیک کیے ان کے منتظر تھے، بیگم اور ساس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو چکی تھیں جب کہ ان کے داخل ہونے پر سر صاحب کے ماتھے پر نفرت کی لکیریں عیاں ہونے لگی تھیں۔

”کہاں لے کر جا رہے ہیں میری بیوی کو؟ خیریت تو ہے؟“ انہوں نے کچھ تائید میں آنے والے انداز میں دریافت کیا تو سر نے آگے بڑھ کر ان کی بیوی کا میو اتل ان کے سامنے کر دیا۔

”میں تمہیں تین طلاق دیتا ہوں۔“ بیوی کو ان کے نمبر سے میسج آیا تھا۔

میسج دیکھ کر صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بتایا کہ ان کامیو اتل تو صبح سے چوری ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنی جیبیں الٹ کر سب کو یقین دلایا۔ تو ان کی بیگم اپنی ماں سے لپٹ کر رونے لگیں اور سر صاحب نے اپنی ٹانگیں پسار لیں۔

”لیکن چور نے میری بیوی کو طلاق کا میسج کیوں کیا؟“

الجھن کے مارے ان صاحب نے اپنا نمبر ڈائل کیا تو چور نے فون اٹھایا صاحب چھوٹے ہی پھٹ پڑے۔
”کینے انسان! فون چرایا سو چرایا۔ میری بیوی کو طلاق دینے کی کیا ضرورت تھی؟“
چور نے اطمینان سے ان کی بات سنی اور کہنے لگا۔

”دیکھیے صاحب! صبح جب سے آپ کا فون چرایا ہے۔ تجھے آپ کی بیوی کے چھتیس میسج موصول ہو چکے ہیں۔ کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟۔ کب آؤ گے؟ آتے ہوئے یہ لے آنا۔ اور ہاں یہ بھی!“
جلدی آنا! دیکھو فلاں چیز ختم ہو گئی ہے! میں پاگل ہو گیا!

میں نے سوچا سم نکال کر پھینک دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ جہاں آپ نے مجھے اپنے میو اتل کی صورت میں گفٹ دیا کیوں نہ میں بھی آپ کی خیر خواہی میں اسے طلاق دے دوں۔ اس لیے میں نے اسے طلاق کا میسج بھیج دیا!

اب آپ کی مرضی ہے، چا ہو تو ڈیلیٹ کرو اور چا ہو تو ریپٹ کرو!“

کبریٰ عباس پنڈی

کارگر نسخہ

نیویارک کے ایک پارک میں ایک معمر شخص کی اویٹھ عمریہ سے طلاق ہوئی۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا جو بعد میں دوستی اور رومان کی صورت اختیار کر گیا۔ کچھ دنوں بعد معمر شخص نے خاتون سے شادی کی درخواست کی جو فوراً منظور بھی کر لی گئی۔ اس معمر شخص نے بیوہ کو مکان کی انگوٹھی بھی پہنادی۔ پھر انہوں نے اپنے لیے مکان کی تلاش شروع کر دی کیوں کہ بڑے میاں ایک ہوٹل میں رہتے تھے۔

بیوہ نے ایک مکان پسند کیا اور اس کے ہونے والے شوہر نے منہ مانگی قیمت دے کر اس مکان کو خرید لیا لیکن دوسرے روز وہ بیوہ خاتون مقررہ وقت پر پارک میں نہیں پہنچیں۔ بڑے میاں نے بہت انتظار کیا۔ کئی روز گزر گئے مگر خاتون کے بارے میں کوئی خبر

نہیں ملی۔ خاتون نے بڑے میاں کو اپنے گھر کا جو پتا بتایا تھا وہ اس پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ خاتون وہاں سے جا چکی ہیں۔

یہ مکان وہی تھا جو بڑے میاں نے ایجنٹ کی معرفت خرید تھا اور ان کی ہونے والی دلہن نے بے حد پسند کیا تھا۔

ایجنٹ سے دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ خاتون اس مکان کی مالکہ تھیں اور ایک عرصے سے اسے فروخت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر اس کی مناسب قیمت نہیں ملی تھی۔

ناہید امیر علی۔ حیدرآباد

رفقار

کوئٹہ ایکسپریس میں سیاسی بحث جاری تھی۔ اسی دوران ایک صاحب جوش و خروش سے بولے ”کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اگلے دس برسوں میں ہم کہاں ہوں گے؟“

ایک کو نے میں بیٹھے ہوئے صاحب معصومیت سے بولے ”اس ٹرین کی رفقار کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ کوئٹہ کے آس پاس ہی ہوں گے۔“

مسرت سلیم۔ لاہور

کاروبار

ایک دن فیض صاحب مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر عبدالرحمن چغتائی صاحب کے ہاں لے جا رہے تھے۔ نسبت روڈ پر سے گزرے تو انہیں سڑک کے کنارے ”قاسمی بریس“ کا ایک بڑا سا بورڈ دکھائی دیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کن صاحب کا بریس تھا مگر بہرحال قاسمی بریس کا بورڈ تھا۔ فیض صاحب کہنے لگے ”آپ چکے چکے اتنا بڑا کاروبار چلا رہے ہیں؟“

اس پر ہم دونوں ہنسے۔
تھوڑا آگے گئے تو میوہ اسپتال کے قریب مجھے ایک بورڈ نظر آیا۔ میں نے کہا۔ ”فیض صاحب! کاروبار تو آپ نے بھی خوب پھیلا رکھا ہے۔ وہ بورڈ دیکھیے۔“

REDDI
Sectio

پورڈ پر ”فیض ہیر کٹنگ سیلون“ کے الفاظ درج تھے۔ فیض صاحب اتنا ہنسے کہ انہیں کار سڑک کے ایک طرف روک لینا پڑی۔

اقرا، نمبر۔ کراچی

وعدہ اور اعتراف

ٹیکساس جرائم کے لیے کافی مشہور ہے۔ وہاں کا بچہ بھی کسی نہ کسی جرم یا بری عادت میں ملوث ملے گا۔ ایک ماں نے اپنے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے اب تم پندرہ سال کے ہو چکے ہو، جب تم سگریٹ نوشی شروع کرو تو مجھے ضرور بتانا وعدہ کرو!“ بچے نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں می! مگر پہلے ایک

اعتراف تو کروں۔“

”وہ کیا بیٹے؟“ ماں نے حیرت سے پوچھا۔
”یہی کہ ایک سال ہوا میں سگریٹ نوشی ترک کر چکا ہوں۔“

بلا ضرورت

ایک عورت پہلی مرتبہ اپنے شوہر کے ساتھ کرکٹ میچ دیکھنے گئی۔ وہ کھیل کے دوران خاموشی سے اپنے شوہر کا تبصرہ سنتی رہی۔ ایک موقع پر اس کا شوہر اچھل اچھل کر تالیاں بجانے لگا تو عورت نے دریافت کیا۔ ”کیا ہوا آخر؟“

”لو! تم نے دیکھا نہیں، فیلڈر نے کتنی مہارت سے گیند کچ کی ہے۔“

”تو اس میں چلانے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ عورت سادگی سے بولی۔ ”وہ وہاں کھڑا کس لیے ہے؟“

عنقہ محمد۔ گجرات



شانہ شجرہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت موسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”زیتون کا تیل سالن کے طور پر استعمال کرو اور اسے (سر اور بدن میں) لگاؤ۔ یہ مبارکِ درخت سے حاصل ہوتا ہے۔“

فائدہ و مسائل۔

درد سے حاصل ہونے والے گھی یا جانوروں کی چربی کی نسبت نباتاتی تیل زیادہ مفید ہے۔ نباتاتی تیلوں میں زیتون کا تیل سب سے عمدہ اور مفید ہے۔ زیتون کے درخت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مبارکِ درخت فرمایا ہے۔ (ترمذی)

ہارود و گانگی پر وہ پوشی،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑ گیا۔ مَدَنوں سے بارش نہیں ہو رہی تھی۔ حضرت ہارون ہو کر مَدَنی اسرائیل کے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور عرض کیا۔

”یا کلیم اللہ! رب العالمین سے دعا فرمادیں کہ بارش نازل فرمادے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو شتر ہزار یا اس سے گھیر ڈال کر مَدَنی اپنے ساتھ لیا اور اسی سے باہر دُعا کے لیے آگئے اور اللہ تعالیٰ کے آگے بڑی عاجزی سے دُعا کرنی شروع کی۔

دُعا میں ہوتی رہیں مگر بادلوں کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں تھا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے اس کی وجہ پوچھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وحی

نازل ہوئی۔

”تمہارے درمیان ایک ایسا شخص ہے جو گزشتہ

چالیس برسوں سے مسلسل میری نافرمانی کر رہا ہے اور گناہوں پر مگر ہے۔ (تو نہیں کرتا) اے موسیٰ! آپ لوگوں میں اعلان کر دیں کہ وہ شخص اس مجمع سے نکل جائے کیونکہ اس آدمی کے گناہوں کی وجہ سے بارش رکنی ہوئی ہے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا۔ ”باری تعالیٰ!

یہ شتر ہزار یا اس سے بھی زیادہ لوگوں کا مجمع ہے۔ میں

ان تک اپنی آواز کیسے پہنچاؤں گا؟“ رب تعالیٰ نے فرمایا۔ ”تمہارا کام آواز دینا ہے، پہنچانا تمہارا کام ہے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو آواز دی اور فرمایا۔

”اے رب کے گناہ گدار اور نافرمان بندے! جو پچھلے چالیس سال سے اپنے رب کو ناراض کر رہا ہے تو اس مجمع سے باہر آ جا۔ تیرے ہی کلمے گناہوں کی وجہ سے ہم سب باطل و لغت سے محروم ہیں۔“

اس نافرمان بندے نے یہ آواز سنی۔ اپنے دل میں بائیں دیکھا۔ مجمع پر نظر ڈالی کہ کوئی باہر آتا ہے یا نہیں۔ کوئی شخص باہر نہیں آیا تو اس کو یقین ہو گیا کہ رب تعالیٰ کو وہی مطلوب ہے۔ اب گھبرا یا اور سوچا کہ میں

اس مجمع سے باہر نکلوں گا تو میری بے قرنی ہوگی اور اگر میں باہر نہ نکلا تو میری وجہ سے تمام لوگ بارش سے محروم اور قحط کا شکار رہیں گے۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے

کپڑوں میں ہمایا لیا۔ اپنے سارے گزشتہ گناہوں پر شرمندہ ہوا اور اس نے اپنے دل کے غلوں سے یہ دُعا کی۔

”اے میرے خدا! تو کتنا کریم اور بردبار ہے کہ میں چالیس سال تک تیری نافرمانی کرتا رہا اور تو مجھے مہلت دیتا رہا۔ اب میں اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں میری توبہ قبول فرمائے اور مجھے معاف کر کے آج کی

میرا

میرا

میرا

ذلت اور سوائی سے بچالے۔

ابھی اس کی بات بردی بھی نہیں ہوئی تھی کہ
یادوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا اور موسیٰ کو دلہا
شروع ہو گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تعجب ہوا۔ آپ نے
اپنے رب کے حضور عرض کیا۔

”وہ بندہ تو جمع سے باہر نہیں آیا اور آپ نے
پادش برسا دی“

رب تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اے موسیٰ! میں نے جس
آدمی کی وجہ سے پادش کو روکا تھا، اب اس کی وجہ سے
پادش برسا رہا ہوں۔ اس لیے کہ اس نے توبہ کر لی ہے“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا۔ اے اللہ! اس
آدمی سے مجھے بھی ملادے، تاکہ میں بھی اس آدمی کو دیکھ
سکوں“

حق تعالیٰ کا ارشاد ہوا۔ ”اے موسیٰ! میں نے اس کو
اس وقت رسوا اور ذلیل نہیں کیا، جب وہ برسوں سے
میری نافرمانی کر رہا تھا۔ اب جبکہ وہ میرا مطیع اور فریب
ہو گیا ہے تو اس کو کیسے شرمندہ اور رسوا کر سکتا ہوں۔“
پادش کی کمی اور غلطی کا اصل سبب گناہ ہوتے ہیں
جن کا علاج بھی توبہ ہے۔ اور قرآن کریم میں اس کی تاکید
آئی ہے۔

خوبصورت عورت ،

ایک مرتبہ دو بہت عبادت گزار بھائی اکٹھے سفر
کر رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسے دریا پر پہنچے جس
کا پل توڑنا ہوا تھا۔ اس دریا سے گزرنا نہایت مشکل تھا۔
اسی دریا کے کنارے ایک بہت خوبصورت عورت کھڑی
تھی۔ اس نے دریا پار جانا تھا مگر وہ دریا میں سے گزرنے
کاوصلہ نہیں پا رہی تھی۔

بڑے بھائی نے اس عورت کو دعوت دی کہ میں
تمہیں اپنی کمرہ لاد کر دریا پار کرا دیتا ہوں۔ عورت نے
یہ بات قبول کر لی۔ چوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی کی
اس بات پر بہت حیران ہوا کہ ہمیں عورتوں کے ساتھ
بے تکلف ہونے کی قطعاً اجازت نہیں ہے لیکن وہ
خاموش رہا۔

بڑے بھائی نے عورت کو کمرہ لادا اور چلنے لگا۔
چوٹا بھائی اس کے پیچھے خاموش چلتا رہا۔ دریا کے
پار جا کر اس نے عورت کو اپنی کمرہ سے اتارا اور اپنے
دستے ہولیا۔ سارے راستے چوٹا بھائی بڑے کی اس
حرکت پر ناخوش رہا لیکن خاموش رہا۔

بالآخر جب بات چوٹے بھائی کی برداشت سے
باہر ہو گئی تو وہ اچانک بڑے بھائی پر برس پڑا۔
”تم کیسے خود کو بہتر گزارا اور عبادت گزار کہہ سکتے
ہو، تم نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور عورت کو لہو لگایا۔
جب کہ وہ بہت خوبصورت بھی تھی۔ تمہاری ساری
دینی تعلیم محض ایک ڈھونگ اور مکاری ہے“

یہ سنتے ہی بڑے بھائی نے حیرت اور خود سے دوسرے
کو دیکھا اور کہا۔

”میں نے اس خوبصورت عورت کو دیکھا کہ کنارے
سکافی گھنے پیلے چھوڑ دیا تھا۔ اور تم ابھی تک اس کو اپنے
ساتھ لیے پھر رہے ہو۔“

یہ بہت پرانی کہانی ہے۔ ہمیں زندگی میں
بے شمار ایسے واقعات و حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے
جن سے ہم خوش نہیں ہوتے یا جو ہماری پریشانی اور
غصے کا سبب بنتے ہیں لیکن اس کہانی کے چھوٹے بھائی
کی طرح ہم ان کو اپنی زندگی سے چلنے نہیں دیتے اور
پریشان رہتے ہیں۔

ہمیں اس خوبصورت عورت کو دیکھا پار کرنے کے
فوائد ابدی یاد دینا چاہیے۔

موتی جیسے الفاظ ،

* زندگی کی خوبصورتی رشتوں سے ہے اور رشتے تب
ہی قائم رہتے ہیں۔ جب ہم ایک معمولی سی مکڑی
اور ہلکی سی معدت سے سب کچھ نظر انداز کر دیتے
ہیں۔

عزرا ناصر۔ کراچی

کرامات ،

شیخ ابوالقاسم گرجانی قدس سرہ نے فرمایا۔

”پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا اور عیب کی خبریں دینا کلامت نہیں ہیں، بلکہ کرامات یہ ہیں کہ وہ شخص سراپا من بن جائے یعنی وہ شریعت کا مصلح و فرماں بردار ہو جائے اس طرح کاس سے حرام کام نہ ہوں“

ضرورت مند

کسی شخص کو اتنا پیار دو کہ کوئی گنہائش نہ چھوڑو۔ اگر وہ پھر بھی آپ کا نہ بن سکے تو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ وہ محبت کا طلب گار ہی نہیں۔ وہ صرف ضرورت کا بھاری ہے۔ محبت کرنے والے کو کسی شے کی ضرورت نہیں ہوتی اور ضرورت مند کو کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ (طیغ سعیدی)

انجیل۔ ڈہری

محبت کا دعویٰ

ایک کینز آدمی رات کو کھڑی دعا کر رہی تھی۔
”اے اللہ! اس محبت کے مدد سے جو مجھ کو تجھ سے ہے، میری دعا قبول کر لے اور میرے گناہ معاف کر دے“
مالک کی آنکھ کھل گئی کہنے لگا: ”تو کیسے یہ دعا کر رہی ہے کہ اللہ تجھ سے محبت کرتا ہے؟“
اس نے کہا: ”اگر اللہ مجھ سے محبت نہ کرتا تو مجھے رات کو نماز پڑھنے کی توفیق نہ دیتا اور میں بھی تیری طرح سو رہی ہوتی“

رضوانہ پروین۔ سیالکوٹ

خود پر ظلم

کسی شخص نے ایک مظلوم شخص سے کہا کہ تو اپنے ستم گر کو بددعا دے۔ اس نے جواب دیا۔
”ظالم نے مجھ پر ظلم کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے مجھ پر نہیں۔ اتنی ہی بلا اس پر کافی ہے میں کیوں اور زیادہ کروں“

نمرہ، اقرا۔ کراچی

روحانیت کی سیرھی

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یا دولا تا چاہتا ہے اسے

دُکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ دُکھ کی چھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ جاتا ہے پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بغیر کسی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ دُکھ تو روحانیت کی سیرھی ہے۔ اس پر صابر و شاکر ہی چڑھ سکتے ہیں۔

(بافوقہ سید کی کتاب ”دست بستہ“ سے اجازت)

شائستہ اکبر۔ گندھکالونی

دُشوار امر

ذات کے تمام عناصر میں مایوسی سے زیادہ تلخ عنصر کوئی نہیں۔ زندگی میں اس سے زیادہ کوئی دُشوار امر نہیں ہے کہ اپنی ذات سے کہا جائے۔ ”تم شکست کھا چکے ہو“
آمنہ اجالا۔ ڈہری

واصف علی واصف

- ۱۔ غلامی خوف کا دوسرا نام ہے۔
- ۲۔ غلام کو غلامی پسند نہ ہو تو کوئی آقا پیدا نہیں ہوتا۔
- ۳۔ جب قائدین کی بہتات ہو جائے تو سمجھ بیچھے کہ قیادت کا فقدان پیدا ہو گیا ہے۔
- ۴۔ خود شناسی نہ ہو تو خلا شناسی کا عمل ممکن ہی نہیں۔
- ۵۔ اس عربی سے پناہ مانگو جو مایوس کر دیتی ہے۔
- ۶۔ اس مال سے بھی پناہ مانگو جو معدوم بنا دیتا ہے۔
- ۷۔ دُعا ناممکنات کو ممکن بنا دیتی ہے۔
- ۸۔ اگر عذاب آنے والا ہو ادا یا نہ ہو تو یہی وقت ہے دُعا کا۔
- ۹۔ سورج کو نمایاں ہونے کے لیے تاریکی دکا رہے۔
- ۱۰۔ اندیشہ امید سے ملتا ہے۔ امید و محنت پر ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔
- ۱۱۔ کوشش کو اگر اُمتنی کہہ دیا جائے تو نصیب ابابیل کی کسکری ہے۔
- ۱۲۔ نوال افضل ظمن۔ بکرات



ہلاکتیں کون سے کون سے کاموں سے آتی ہیں

صائمہ جی کراچی
کچھ بھی کر گزرنے میں دیر کتنی لگتی ہے
برف کے پگھلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
اس نے ہنس کے دیکھا تو سرکاری ہم بھی
ذات سے نکلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

عاشق قاطبہ لودھال
تم نے پھول جب کتابوں سے نکلے ہوں گے
دینے والا بھی تمہیں یاد تو آیا ہو گا

نور سجاد بجات
کتنی روگ وے گئی ہے نئے موسموں کی بارش
مجھے یاد آ رہے ہیں مجھے پھول جانے والے

فرحت ناز کھاؤں ہڈیاں
سب جرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن
کیا میرے سوا شہر میں معصوم ہیں سارے
نور عبد السلام توب شاہ
ابھی نہ پھٹ چکے محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

فوزیہ ثمریٹ بجات
یہ اقدبات کہ ہیں محبت راس نہ آئی
ہو امی ساتھ تو خوشبو مقام رکھتے تھے
نجانے کون سی رت میں پھٹ گئے وہ لوگ
جو اپنے دل میں بہت احترام رکھتے تھے

کائنات اصغر بلوڑار ڈہری
گنویں جس میں جوڑوں ہوتی ہیں تن کے قتل میں
میرے قاتل حساب خوں بہا، ایسا نہیں ہوتا
ہر اک صبح ہر گھڑی تجھے قیامت لوں تو ہوتا ہے
مگر صبح ہو روز جزا ایسا نہیں ہوتا

اقصی ناصر کراچی
خوشیوں کا دور بھی آجائے گا ندیم
غم بھی تو مل گئے ہیں تمنا کیے بغیر
ناہید اصغر آدیش لالہ موسیٰ
تم نے پھول جب کتابوں سے نکلے ہوں گے
دینے والا بھی تمہیں یاد تو آیا ہو گا

سیدہ لوبیا سجاد کھروڑ پٹکا
جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تم ہی منصفی سے کھروڑ نہیں اعتبار ہوتا
تیرے وعدے پر شتم گرا بھی اور ہسر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

حورین زینب کھروڑ پٹکا
درد کی دل پہ حکومت تھی کہاں تھا اس وقت
جب مجھے تیری ضرورت تھی کہاں تھا اس وقت
دل کے دریاؤں میں اب ریت ہے صمراؤں کی
جب مجھے تجھ سے محبت تھی کہاں تھا اس وقت

گرویا شاہ کھروڑ پٹکا
ہمیں جو ناز ہے خود پہ نہیں وہ ہے وجہ محسن
کہ جس کو ہم نے جہا ہوا خود کو عام کیوں گئے
سید نسبت زہرا کھروڑ پٹکا
عجب پہیلی ہے یہ ہاتھ کی کیروں میں
سفر کیے ہیں مگر راستہ نہیں لکھا
خیال و خواب کے منظر رقم سب ہی نے کیے
جو چشم دید تھا وہ واقعہ نہیں لکھا

حوا قریشی ملتان
گئے دنوں کا سا رخ لے کر کہ مرے آجا کہ مر گیا وہ
عجیب مانوس آدمی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

سدرہ بتول _____ ملتان

صبر تہذیب ہے محبت کی
وہ سمجھتے ہیں بے زباں ہیں ہم

ارم نشاط، آئینہ اعجاز _____ گلشن آباد

وہ سفید بھولوں سی اک دعا مرے ساتھ ساتھ ہی سدا
یہ اسی کا فیض ہے بارہا میں بکھر بکھر کے ستود گیا
مرے آنسوؤں کی کتاب بھی تیری خوشبو میں جکھتی
مرا شعار ہے تیرا آئینہ، جہاں شام آئی ستود گیا

عائشہ _____ سوہرہ

پہلے تیری تھی جستجو مجھ کو
اب میں اپنی تلاش کرتا ہوں

نمرہ، اقرا _____ کراچی

اک سفر نے پاؤں باندھے اک سفر سے کھل کر
اس کے نیچے نکل دیا، عمر بھر پسا پساں

عذرا، اقصی ناصر _____ کراچی

وہ دل جو میں نے مانگا تھا مگر غیروں نے پایا ہے
بڑی شے ہے اگر اس کی پریشانی مجھے دے دو

صفیہ خلام _____ ملتان

ان سے ملنے کا کیا سوال عدم
وہ سدا میرے پاس ہوتے ہیں

نخبہ اکرم _____ گاؤں گوئیکی

اب نہ وہ میں ہوں، نہ تو ہے، نہ وہ ماضی فراز
جیسے دوسرے تمنا کے سراپوں میں ملیں

نمرہ، اقرا _____ کراچی

خالی ہاتھوں کو کبھی خود سے دکھا ہے فراز
کس طرح لوگ لکیروں سے نکل جاتے ہیں

لاٹھی، ایمین _____ آزاد کشمیر

سہم کر تم سے امید کیم ہوگی، جیتیں ہوگی
ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے

نہا، فضا _____ کراچی

دعا کے روشن چراغ اپنی پتیلیوں پر جلائے ہم نے
خدا سے لیکن سوال کرنا نہ اس کو آیا نہ مجھ کو آیا

دیکھان خان _____ لاہور

اچھی گزر رہی ہے مری عمر آپ کے
دعدوں کے درمیان، بہانوں کے درمیان

صباح گل _____ میرپور خاص

جہم بدلتی رہتی ہے تصور زندگی
یہ سلسلہ نہ ہو تو روایت کہاں رہے

نہا سہیل _____ کراچی

وہ ہم سے دود بہت دود ہو گئے ہیں آج
قریب تھے جو دو سال اشٹانی میں

گرڈ یا شاہ _____ کپروڈ پٹنا

ہونے کی گواہی کے لیے خاک بہت ہے
یا کچھ بھی نہیں ہونے کا ادساک بہت ہے

اک بھولی ہوئی بات اک ٹوٹا ہوا طراب

ہم اہل محبت کو یہ املاک بہت ہے

نخبہ اکرم _____ گاؤں گوئیکی

نہ کوئی خواب نہ سہیلی تھی
اس محبت میں، میں اکیلی تھی

عشق میں تم کہاں کے تھے تھے
جو اذیت تھی ہم نے سہیلی تھی

شبانہ امین راجپوت _____ کوٹ ادھاکش

میں لوگوں سے ملاقاتوں کے لمحے یاد رکھتا ہوں
میں باتیں بھول جاتا ہوں بچے یاد رکھتا ہوں

میں یوں تو بھول جاتا ہوں غلا شیں لمح باتوں کی

مگر جو زخم گہرے دیں روئے یاد رکھتا ہوں

شازیہ گلزار _____ جھکڑ

ہمیں اس بار میت دینا نیا عنوان یادوں کا
ابھی پچھلے دسمبر کی کوئی یادوں باقی ہیں

ثمینہ اکرم _____ کراچی

بچھا بچھا، زندہ زندہ، مدہم مدہم چاند
شاید نسبت اسے بھی دسمبر سے ہے



خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2016ء
کے شمارے کی ایک جھلک



- عمیرہ احمد ناول ”آپ حیات“
- نمرہ احمد کمال ناول ”نمل“
- ”دھبہ جنوں“ آمنہ ریاض کمال ناول
- ”شہر آشوب“ امتا الحریر شہزاد کے ناول کی آخری قسط
- ”کوئی تعویذ ہوڑو بلا کا“
- سمیرا یونس ہارون کمال ناول
- آسیہ ذاتی کمال ناول ”بہار کی دستک“
- ایمل رضا، تنیم شریف، شائلہ دلہان
- فرحین ظفر، نیر کاشف اور زکس نایاب کے افسانے
- اداکارہ ”شمینہ احمد“ سے ملاقات
- باتیں ”عمران اشرف“ سے
- ”کرن کرن روشنی“ احادیث کا سلسلہ
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ 2016 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

ماہانہ شعاع مارچ 2016 269

READING
Section



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اژدہ بازار، کراچی۔

Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خطوط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔
رب کریم سے آپ کی صحت، عاقبت اور سلامتی کی
دعائیں۔
اللہ آپ کے دلوں کو شاد اور آپ کے آنگن کو آباد
رکھے۔ (آمین)

پہلا خط روٹری ضلع سکھر سے بین اجمل کا ہے، لکھتی
ہیں۔

اس ماہ کا سرورق اچھا تھا، بس ماڈل تھوڑی کنفیوز
تھی۔ سلسلہ ”جب تجھ سے ناتا“ کے لیے میں نے بھی
جوابات بھیجے تھے۔ مجھے بھی سب کی طرح لگتا تھا کہ میری
انذواجی زندگی مشکلات کا شکار ہے۔ مگر اب جیسے جیسے باقی
خواتین کے جوابات پڑھتی ہوں تو لگتا ہے کہ میں ناشکری
کر رہی ہوں۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ آپ میرا
سروے ضلع کریں۔ سب سے پہلے ”سیاہ حاشیہ“ پڑھا۔
ساتھ ہی کے لیے الفاظ کم پڑنے لگ گئے ہیں۔ آئیے جی کا

READING
Section

”تم میری ہو“ اچھا لگا۔ خالہ نی کا کردار بہت پسند آیا۔ مزاتو
تب آیا جب ڈنڈے سے اپنے ہی بیٹے کی دھتائی کر دی۔
ناول ”ستارہ زینت“ کچھ فلمی سا لگا لیکن ناول کا آخری
پیرا گراف بہت پسند آیا۔ ناولٹ میں سمیرا حمید کا تو نام ہی
کافی تھا۔ گھٹ عبد اللہ کی کہانی ”وہ اک نظر“ انہوں نے
اس میں کچھ باتیں ادھوری کیں چھوڑ دیں۔ اسے صاف
کا مبر کہاں سے ملا؟ دو سراسعہ سے فون پر بات کرنے والا
اگر حمزہ ہی تھا تو اس نے ساعقہ کو کیوں نہیں بتایا اور آخری
بات۔ کیا دنیا میں واقعی ایسے مرد ہوتے ہیں جو اتنے خوب
صورت بھی ہوں اور ایک عام سی بلکہ اس سے بھی گئی
گزری لڑکی سے محبت کر لیں۔ آخر میں کچھ فرمائش کر لی
تھی شاہین جی سے کہ پلیز ”بندھن“ میں عاتزہ خان اور
وائلش تیور کولامیں اور ”دستک“ میں صابر کاؤرانا پیرل
”دستک“ کے حوالے سے انٹرویو لیں، پلیز۔ اس کے
علاوہ بس یہی کہوں گی کہ اس کمرشل دنیا میں جب ہر چیز ہی
بک رہی ہے تو پلیز آپ لوگ کبھی بھی اپنا معیار نہ بیچھو
گا۔ کیونکہ یہ ہی آپ کے رسالے کو دوسروں سے ممتاز
کرتا ہے۔ آپ کے رسالے دیکھنے میں بے شک تھوڑے
سے گلیسر لگتے ہیں مگر ان کے اندر اک جہاں آباد
ہے۔ ان کی تعریف میں میں کئی صفحات بھر سکتی ہوں مگر
اب ایک تو خط لیا ہو گیا ہے، دو سراسعہ بھی بہت ہو گیا
ہے یعنی کہ آدھی رات۔

ج۔ پیاری بین! ہمیں خود اس بات کا احساس ہے کہ
شعاع اور خواتین کا ایک اخلاقی معیار ہے ہماری پوری
کوشش ہوتی ہے کہ یہ اپنا معیار برقرار رکھیں اور ان میں
کوئی ایسی تحریر شامل نہ ہو جو ہلکی یا اخلاق سے گری ہوئی
ہو، اس میں آپ جیسی قارئین کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔
”جب مجھ سے ناتا جوڑا ہے“ اس سلسلہ کا یہ پہلا اپنی جگہ
بہت اہم ہے کہ اسے پڑھ کر ہماری بہت سی قارئین کو
احساس ہوا ہے کہ ان کے دکھ دوسروں کے مقابلے میں
بہت کم ہیں۔ اس چیز نے ان کے دل میں شکر کا جذبہ پیدا کیا
ہے اور جو کچھ انہیں حاصل ہے اس کی قدر ان کے دل میں
بڑھی ہے۔ دنیا میں ایسے مرد بہت زیادہ تو نہیں ہیں لیکن
ایک مرد ایسا ضرور ہو گا۔ جب ہی تو نکتہ نے کہانی لکھی
یہ اور آخری بات! آپ کو کیسے پتا چلا کہ ماڈل کنفیوز
تھی۔؟

محسوس ہوتی ہے۔

چکوال سے انیقہ انانے یاد کیا ہے لکھتی ہیں

عرصہ بعد قلم اٹھایا اور ٹوٹے رابطے بحال کرنے کا سوچا ہے۔ گزشتہ ایک سال میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ کو فراموش کیا ہو۔ یادیں بھلا کب ساتھ چھوڑتی ہیں، زندگی ردوبدل کا شکار ہوتی، موسم بدلے، دن، مہینے اور سال گزر گیا۔ جانے کیوں دل ہر قسم کی تحاریر، کتابوں سے اکتا گیا تھا۔ اس ایک سال میں نثر نہیں پڑھی، سوائے ابن صفی کے ”عمران سیریز“ کے اور اردو کلاسیکی شعراء میرو مرزا، داغ و ظفر کو چھانا، ایک تحریر لکھی لیکن ادھوری، ایک خیالی سن ساتھ۔ جو ہر سو تھا، لفظ در لفظ، کہانی ذہن میں جتی تھی لیکن لکھ نہیں پاتی تھی، آپ اندازہ کیجیے اس کرب کا کہ جب میں لکھنا چاہوں اور لکھ نہ سکوں۔ (اچھا آپ کو انیقہ یاد ہے یا بھول گئی؟ بھولنے والی چیز تو نہیں ہوں ویسے۔)

ج۔ انیقہ! آپ نے اتنے عرصہ میں شعاع نہیں پڑھا، ورنہ آپ جان جاتیں کہ ہم ہی نہیں ہماری قارئین بھی آپ کو یاد کرتی رہیں، زندگی میں ایسے فیر آتے رہتے ہیں، جب کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کتاب واحد چیز ہے جو ہمیں کچھ دیر کے لیے تمام مسائل سے دور لے جاتی ہے، تبصرہ حسب روایت شان

دار تھا۔ خط تاخیر سے ملا۔ فروری کے شمارے میں شامل نہ کر سکے۔ اس لیے پچھلے ماہ کا آپ کا تبصرہ شامل نہیں کر رہے ہیں۔ اپنی ادھوری کہانیاں مکمل کر کے جلد از جلد بھجوائیں ہم منتظر ہیں۔

غزل قاطمہ سگونے لکھا ہے

جناب ناچیز نے آپ کے ادارے میں اپنی کہانی ”صحاب زندگی“ بھیجنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے میری حوصلہ افزائی کی تو میں مزید آگے لکھنے کی کوشش کروں گی۔ ایک گزارش اور میں ایک منفرد اور اپنی پہچان آپ رکھنے والا سلسلہ وار ناول ”جو رے کے تو کوہ گراں تھے ہم“ لکھ رہی ہوں۔ کیا میں سلسلہ وار ناول بھجوا سکتی ہوں۔

ج۔ پیاری غزل! آپ ابھی میٹرک کی طالبہ ہیں۔ فی الحال صرف پڑھائی پر توجہ دیں۔ کہانی کے لیے معذرت۔

کوثر خالد نے جڑ والہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

آج تھکے تھکے جسم و قلم سے حاضر خدمت ہیں۔ مگر روح کی تابانیاں سلامت ہیں۔ تقریباً ”گیارہ بجے گھر کے کچھڑے سمیٹ لیے ہیں۔ ہنڈیا پکانے کا یارا نہیں ہے کہ بجے کچھ بتا کر بھی نہیں گئے۔ کچھ ساگ پڑا ہے۔ مٹی کا آٹا لے آئی ہوں اور رات کے لیے اٹڑے۔ بیٹی شمع نے حرا کو پڑھ کر کہا۔ آپ کی طرح انداز ہے اس کا امی نہم حیران۔ کہاں وہ مشکل جادو گری۔ کہاں ہم سادہ گری۔ بولی انداز تو ایک ہی ہے، پتا نہیں چلتا۔ کہاں بات ختم، کہاں اگلی شروع۔ بابا بابا۔ ”دستک“ رابعہ العزم۔ چوتھی ”دہمت“ اچھی خبر سنائی۔ ہمارا نام بھی ہمارے دادا نے رکھا تھا۔ صالحہ کوثر۔ مگر خود بھی صرف کوثر ہی پکارا۔ خالد اور سسرال والوں نے بھی کوثر ہی پکارا پہلے عرف (نیک نیم) نام سے لوگ زیادہ پکارتے تھے تا تو میرے بڑے بھائی عظیم کو بھولا، مجھے ننھی اور جب چھوٹے کا نام دادا نے عظیم رکھا تو امی نے اسے پوپی کا نام دے ڈالا۔ دادا کچھ یوں برہم ہوئے ”چھہ حال (میری امی)! ڈھولا اور ننھی کافی نہیں، اب ٹوپی بتائی ہے۔“ ایک بار عظیم کو انہوں نے پینٹ میں دیکھ لیا تو بولے۔ ”چار ڈنڈے لگاؤ، میٹر می تیار ہے۔“ دادا کی تو اتنی باتیں ہیں۔ پھر سسی۔ اب ایسے مومن کہاں۔ اوہ یاد آ گیا۔ کہ ہم دادی بن گئے ہیں۔

بھی ریح الاول ہمیں اک پیار سا جوڑہ پوتا دے گیا اور نام رکھنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ ”محمد ریح شمر“ کیا لگانا نام ”بدلہ“ سنیم جی کیا پیاریک بین اور گہری سوچ لائی ہیں۔ ”اب کے برس“ اک جادوئی قلم۔ سحر انگیز داستان میری شمع نے اس کی از حد ستائش کی اور کہا۔ الفاظ و انداز بیا کمال ہیں۔

ج۔ پیاری کوثر! اللہ تعالیٰ آپ کی روح کو تاپاں رکھے۔ ہمیشہ ہی آپ کے خط پڑھ کر بہت مزا آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سامنے پیشی باتیں کر رہی ہوں، ہلکی پھلکی ”ادھر ادھر کی باتیں۔ اور آپ کی باغ و بہار شخصیت۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ اس مشولے کی جیتی جاگتی تصویر ہیں آپ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اسی طرح خوش رکھے اور آپ کی ”شمع“ روشن رہے۔ دادی بننے پر مبارک باد۔ پوتے کا نام خوب صورت بھی ہے اور بامعنی بھی۔ آپ ہمیں باقاعدگی سے خط لکھیں۔ آپ کا خط شامل نہ ہو تو اس سلسلے میں کمی

ناظمہ زیدی نے چوک اعظم سے شرکت کی ہے۔
لکھتی ہیں

میرا پارا شہر چوک اعظم ہے تو یہ ایک قصبہ مگر ہر طرح کی ٹریفک کی آمد رفت کی وجہ سے اسے شہر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ضلع لیہ سے تیس منٹ، مغرب کی طرف واقع ہے۔ ہمارا شہر چوک اعظم چونکہ تین صوبوں کے وسط میں واقع ہے، اسی لیے اسے پنجاب کا دل کہیں تو شاید کسی حد تک درست ہو۔ تمام صوبوں کی طرف جانے والی ٹریفک ہمارے شہر سے ضرور گزرتی ہے۔ ہمارے شہر چوک اعظم کو منی لاہور بھی کہا جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ اس کے چوک کے پتھوں سچ سفید ماربل سے بنا ہوا چھوٹا سا مینار پاکستان ہے۔ یہ مینار یادگار پاکستان کے کچھ عرصے کے بعد غالباً 1950ء میں بنایا گیا ہے۔

ہمارے شہر میں اہماتے کھیت بھی ہیں تو بڑے معروف کاریاری مراکز بھی۔ گریز بو اتز گورنمنٹ ڈگری کالجز ہیں اور پرائیویٹ کالجز بھی بے شمار۔ خوشی ہوتی ہے یہاں کے لوگوں کا بنیادی پیشہ زراعت ہے۔ گندم کی پیداوار قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ بزرگے کی کاشت کے لیے بھی یہ زمین بہت موزوں ہے۔ اسی لیے چنے، گندم، آم، جاسن بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں کی زمین کی خاص بات خالص گندم کی فراہمی ہے۔ جب اس دھرتی کی مائیں مٹی کے چولے پہ روٹیاں بکاتی ہیں تو بچوں کی وہ چیخ و پکار ”پہلی میری، پہلی میری“ ماں کو عجیب طرح کی خوشی و سکون دیتی ہے۔

ڈاکٹنگ ٹیبل پہ بیٹھ کر ہاٹ پاٹ میں رکھی روٹی کبھی وہ مزا نہیں دیتی، جو ماں چولے کے پاس نیم دائرہ میں بیٹھے بچوں کو چھوڑ کر پہلے اپنے سر کے سامنے کو دیتی ہے۔ اس گرا گرم روٹی اور تازہ سالن کی بات ہی کچھ اور ہے، آپ کو دعوے سے کہہ سکتی ہوں آپ چھ سات روٹیاں بھی کھا جائیں تو محسوس نہ ہوگا۔ گھومنے پھرنے کے لیے ویسے تو کوئی خاص پوائنٹ نہیں ہے مگر اس کے اطراف میں بہتی ہوئی نہریں جو کہ تعداد میں چھ سات ہیں۔ کسی دریا کی سیر کا لطف دہیالا کر دیتی ہیں۔ گرمی کے موسم میں چوک اعظم کے باسیوں کی واحد تفریح یہی نہریں ہیں، اسی لیے باسیاں بے چاری گھروں میں ہی باسی ہوتی رہتی ہیں۔ جی ہاں یہاں کے ماحول کی وجہ سے خواتین خال خال ہی باہر جاتی ہیں۔ شاپنگ پر جانے کی کوئی پابندی نہیں۔ بہت بڑا بازار ہے

جہاں آپ کو قیمتی چیزوں سے لے کر پٹھان بھائیوں کا نمبر 2 مال تک سب دستیاب ہوگا۔ قیمت کی فکر نہ کریں۔ پانچ ہزار روپوں کے دو سو میں بھی دے دیں گے۔
ج۔ پیاری ناظمہ اشعار پر تبصرہ بھی آپ نے بہت اچھا کیا ہے لیکن خط کی طوالت کے پیش نظر فی الحال آپ کے شہر کا احوال دے رہے ہیں۔ چوک اعظم کے بارے میں جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ہمارا تو خیال تھا کہ یہ چھوٹا سا محلہ یا قصبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے شہر کو آباد رکھے۔
کراچی سے تسنیم کو ٹرے لکھا ہے

فروری کے شعاع میں افسانے اور ناولت بہت اچھے لگے۔ خاص کر مصباح اعوان کا ”ستارہ زیست“ بے حد شان دار ناول ہے مگر اس ناول کے ایڈ کو بہت طویل کیا گیا ہے۔ سرتقی کا اپنی گود میں سولی، دکنی نرم و نازک سی بچی کو دیکھتے ہوئے ناول کا ایڈ ہو جانا چاہیے تھا۔ نکتہ عبد اللہ کا ”وہ اک نظر“ بہت خوب، جواب نہیں۔ آسیہ رزاقی کی تحریر ”تم میری ہو“ وینڈر فل، دلکش، غضب کی اسٹوری تھی اس ناول کی اصل ہیروئن تو خالہ بی ہی لگیں۔ حنا یاسمین کا ”نصیبوں کے فیصلے“ اچھا لگا۔ ہمیشہ بیٹوں کے اچھے نصیب کی دعا کرنی چاہیے۔ میرا حمید کا ”ہماری کہانی“ جس سوسو تھا۔ اسے لکھنی نامہ کہنا زیادہ بہتر ہے۔

ج۔ تسنیم! بے حد معذرت کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ ہماری قارئین اتنی محنت سے اور اتنے خوب صورت خط لکھتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ سارے خطوط شامل ہوں لیکن صفحات کی مجبوری شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

سلی زہیر لاہور سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

ہمارے خاندان میں واحد لڑکی ہوں جو شعاع، کرن کی دیوانی ہے اور ہمارے گاؤں سے تقریباً دو گھنٹے کے بعد شہر آتا ہے، پہلے تو ڈائجسٹ منگوانے کا مسئلہ اس کے بعد لگانا منگوانے کا مسئلہ اور اس کے بعد سب سے بڑا مسئلہ پوسٹ کرنے کا اور پھر گھر میں کوئی پڑھنے بھی نہیں دیتا۔ ڈائجسٹ۔ پھر رات کو پڑھنے کے بعد اتنی مشکل سے خط پوسٹ کرواتی ہوں اور پھر جان لیوا انتظار شروع۔ میری کہانی قابل اشاعت ہے یا نہیں، پلیز ضرور آگاہ کیجیے

ج۔ پیاری سلی، ہمیں احساس ہے کہ ہماری گاؤں میں یا چھوٹے شہروں میں رہنے والی قارئین کے لیے برچے کا حصول پھر خط لکھ کر پوسٹ کرانے کے مراحل کتنے دشوار ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہماری کوشش ہوتی ہے زیادہ سے زیادہ خط شامل ہوں۔ زیادہ خط شامل کرنے کے لیے ہمیں خطوط کو مختصر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس ماہ بھی آپ کا تبصرہ بہت اچھا ہے۔ ہم نے پوری توجہ سے پڑھا ہے۔ ہر کہانی پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے آپ نے، لیکن مسئلہ وہی صفحات کا ہے۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔

فرخ فاطمہ اشرف نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

وہ بھی کیا زمانہ تھا جب مابدولت میٹرک میں تھے اور ہر مہینے ہمارے خط شعاع میں باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ ایف ایس سی نے تو اپنا ہوش ہی بھلا دیا اور خط لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اب مابدولت اللہ کے کرم سے میڈیکل کے دوسرے سال میں ہیں اور اس "پوزیشن" میں ہیں کہ ہر ماہ باقاعدگی سے تبصرہ ارسال کر سکیں تو آپ کی ردی کی نوکری ہمارے اس ارادے کے آڑے آجاتی ہے۔ اس مہینے افسانے سب ہی اچھے تھے۔ سلسلے وار ناولوں کا تو کیا ہی کہنا۔ شمارے میں یوں ہوتے ہیں گویا کہ ہیں ہی نہیں۔ (معذرت کے ساتھ) رخسانہ نگار عدنان ویسے میری پسندیدہ مصنفین میں شمار ہوتی ہیں مگر "ایک نئی شکل" کو بے جا "طوالت" کا شکار کیا گیا اور اب یہ خصوصی وجہ جس کے لیے میں نے سستی کا چولا اتار کر کانفڈ "قلم پکڑا ہے" جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے "اچھا سلسلہ ہے مگر خدا را تصویر کا ایک رخ دکھانا بند کیا جائے۔ یہ سلسلہ شادی کے حوالے سے لڑکیوں کے ذہن میں منفی رجحانات جگانے کا باعث بن جائے گا۔ (بلکہ بن رہا ہے) سسرالیوں اور شوہر

کی ذات کے منفی پہلوؤں سے بھرا ہوتا ہے جس کو غیبت ہی کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ کے شوہر کی ذات میں اگر کچھ خامیاں ہیں تو لاکھوں قارئین کو ان کے بارے میں بتایا جائے۔ لباس کا مقصد پردہ پوشی کرنا ہوتا ہے نہ کہ چھپی ہوئی چیز بھی عیاں کر کے دکھانا۔

ج۔ ڈاکٹر فرخ فاطمہ! ویسے تو آپ کو ڈاکٹر نہیں لکھنا چاہیے، کیونکہ ابھی آپ ڈاکٹری نہیں ہیں لیکن خیر ڈاکٹر بن ہی جانا ہے آپ نے۔ شوہر کی ذات کی خرابیاں یا سسرال والوں کی خرابیاں اگر ان کا نام لے کر بیان کی جاتیں یا وہ اپنا پورا نام لکھتیں تو آپ کہہ سکتی تھیں کہ غیبت یا شوہر کو بدنام کرنے کی کوشش ہے۔ یہ تو آپ کہانی سمجھ کر پڑھیں۔ جہاں تک غیر شادی شدہ لڑکیوں کے ڈرنے کی بات ہے تو سب کو تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ لڑکیاں بھی ان ہی گھروں میں رہتی ہیں جہاں یہ سب ہوتا ہے، بہنیں، بھابھیاں، ماں جس جب ان زیادتیوں کا نشانہ بنتی ہیں تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ معاشرے میں اگر کچھ برا ہو رہا ہے تو پردہ پوشی کے نام پر ہم کب تک اسے چھپاتے رہیں گے۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں لیکن ہمیں احساس نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے پڑھ کر کچھ لوگوں کو احساس ہو جائے۔ ممکن ہے ہمارے سسرال والوں پر اس کا اچھا اثر نہ ہو لیکن اگر چند ایک نے بھی اسے پڑھ کر اپنی اصلاح کرلی یا کسی میں احساس بیدار ہو گیا تو یہ بھی بڑی کامیابی ہے۔

ایک اور بات آپ کو بتاتے چلیں کہ ہماری قارئین اس سلسلے میں جو کچھ لکھ رہی ہیں اس میں قطعاً کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس سے بھی زیادہ برا ہوتا ہے، ہو رہا ہے، بات صرف حساس دل اور باریک بین نظر کی ہے۔ آپ ڈاکٹر بننے جا رہی ہیں۔ آپ کو

دعائے مغفرت

ابھرتی ہوئی مصنفہ عمارہ خان کے والد محمد تسلیم اختر اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے وہ شوکت حسین کشمیری کے نام سے کہانیاں لکھتے رہے ہیں۔ بہت اچھا ایلی نونق لکھتے تھے۔ ان کی وفات عمارہ خان اور ان کے اہل خانہ کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

تو زیادہ ضرورت ہے کہ آپ مدح کے زخموں کے بارے میں بھی جاننے کی کوشش کریں۔

اردو نور شکر گڑھ، ضلع نارووال سے شرکت کر رہی ہیں لکھا ہے

گو ناگوں مصروفیات کے باعث خط لکھنے میں تاخیر رہی۔
 ”دیمک زندہ محبت، یارم، زمین کے آنسو“ سے لے کر
 ”جنت کے تے“ تک ہر تحریر نے سحر میں جکڑے رکھا۔
 مجھے تو ہر شمارہ ہی خاص لگتا ہے، کوئی دورائے نہیں۔ (بھئی
 شہباز شریف کی طرح۔) سب سے پہلے ”پیارے نبی
 صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں“ سلسلے سے ہمیشہ کی
 طرح مستفید ہوتے۔ ”جب مجھ سے ناتا جوڑا“ ہمیشہ ہی کی
 طرح دکھ ہوا، بہت دیر ہو چکی آپ کسی مثبت کہانی کو سامنے
 لائیے۔ ”ستارہ زینت“ اچھی تحریر تھی۔ ”تم میری ہو“ کم
 کم سمجھ میں آیا۔ ناولٹ میں ”سیاہ حاشیہ“ (موسٹ
 فیورٹ) کی قسط بھی عمدہ رہی۔ ”یارم“ کی میرا حمید کی
 ہماری کہانی سمجھ سے بالاتر رہی، پسند نہ آئی۔ افسانوں
 میں سکون قلب ”سب سے بہترین رہا۔ پچھلے شماروں میں
 بنت سحر کے افسانے ان کے نام کی طرح باکمال رہے۔
 آپ سے پوچھنا تھا یہ افسانے آج کل اتنے لمبے کیوں
 ہوتے جا رہے ہیں؟

ج۔ پیاری اردو! آپ کے خط کی بات اچھی لگی وہ
 آپ کا یہ جذبہ کہ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔ جو
 کوشش کرنا ہے۔ وہ کامیاب بھی ہوتا ہے اور اگر کسی وجہ
 سے کامیاب نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تسکین تو ہوتی ہے کہ
 اپنی سی پوری کوشش کی۔ آپ کا افسانہ پڑھ کر ہی بتا سکتے
 ہیں کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ افسانے لمبے ہوتے
 جا رہے ہیں؟ ہمارے خیال میں تو ایسا بالکل نہیں ہے۔ عام
 طور پر ہر ماہ چار سے چھ صفحے تک کے افسانے شامل
 اشاعت ہوتے ہیں۔

انمول ہیرا نے شانوں لوٹنے سے لکھا ہے

شعاع میں سب سے پہلے جس ناول نے امپریس کیا وہ
 ”زرد موسم“ تھا۔ اس کے بعد شعاع سے رشتہ نہیں ٹوٹا۔
 پچھلے شمارے میں ”میرے لفظ کو جو زباں ملے“ پڑھ کر یوں
 لگا جیسے رائٹر نے میرے حالات میرے سامنے رکھے
 ہوں۔ ہمارے گھر میں بچپا، تیا ان ڈائجسٹوں کے پڑھنے یا

READ
Secti

ان میں کچھ لکھنے کے انتہائی خلاف ہیں۔ والد محترم ہماری
 محبت میں نرمی دکھاتے ہوئے تھوڑی پس و پیش سے مان
 جاتے ہیں لیکن جو انٹرنیشنل فیملی کی وجہ سے ذرا مشکل ہوتی

ہے، کیونکہ ٹائٹل پر موجود ماڈل گرل ابا حضور کو بھی اس
 ڈائجسٹ کے خلاف گرجاتی ہے کہ ”جب ٹائٹل ایسا ہے تو
 اندر کیسا مواد ہو گا؟“ خط لکھ رہی ہوں لیکن شعاع کے
 تمام سلسلے اتنے زبردست اور اچھے ہوتے ہیں کہ ہمارا بھی
 دل چاہتا ہے کہ ہم بھی ان سلسلوں میں شامل ہوں۔ چند
 ایک ناول جنہوں نے شعاع کو چار کے بجائے آٹھ چاند
 لگائے، ان میں ”دیوار شب“ ”ستارہ شام“ ”دل کے
 رستے دشوار بہت تھے“ ”کوئی دیکھ ہو“ اور ”میں کی کربار
 مناداں“ تو بہت ہی آؤٹ اسٹینڈنگ تھا۔

ج۔ پیاری انمول! ہم آپ کو صرف انمول ہی کہیں
 گے۔ کیونکہ ہیرا کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، وہ ناتو پتھری ہے
 اور انسان تو تمام مخلوق پر فضیلت رکھتا ہے۔ شعاع کے
 سلسلوں میں ضرور شامل ہوں، یہ ہماری بھی خواہش ہے۔
 ٹائٹل کے سلسلے میں ہم ہر ممکن احتیاط رکھتے ہیں۔ مزید
 محتاط رہیں گے، تاکہ آپ کے ابا حضور کو اعتراض نہ ہو۔
 اپنے ابا حضور کو شعاع کے سلسلے پڑھ کر سنا میں ان کی
 رائے یقیناً تبدیل ہو جائے گی۔

عقیقہ فاطمہ نے ناول پور سے لکھا ہے

شمارہ ہاتھ میں آتے ہی ”سیاہ حاشیہ“ پڑھا۔ بہت اچھا
 چاہا ہے۔ ”اک نئی مثال“ پڑھنے کو دل ہی نہیں کیا۔
 ناول میں ”ستارہ زینت“ اچھا تھا۔ شعاع کا سلسلہ
 ”تم سے ناتا جوڑا ہے“ مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے اندازہ
 نہیں ہے کہ کیسے خط لکھا جاتا ہے۔ بس لکھ دیا ہے۔
 ج۔ پیاری عقیقہ! خط اسی طرح لکھا جاتا ہے جس طرح
 آپ نے لکھا ہے، بس تھوڑا مختصر لگا۔ آئندہ سب کہانیوں
 پر بھروسہ کیجیے گا۔

حافظہ مہدیہ آصف نے گاؤں رکن پور سے شرکت کی
 ہے، لکھتی ہیں

میری پہلی بات یہ ہے کہ نبیلہ عزیز اپنا ناول بالکل تھوڑا
 لکھتی ہیں اور ہر تین ماہ بعد ناول آتا ہی نہیں۔ ایسا کیوں
 ہے؟ اس بارے میں ضرور آگاہ کریں۔ ”رفصہ کبیل“

ہے۔ شعاع کی تمام مصنفین بہت اچھی ہیں اور بہت خوب صورت لکھتی ہیں۔ میری پسندیدہ رائٹر عمیرہ احمد، نمرہ احمد، سمیرا حمید، نبیلہ عزیز ہیں اور بھی بہت ساری رائٹر اچھا لکھتی ہیں۔ میں اب سیکنڈ ایر کی طالبہ ہوں اور میری دوستیں میری پڑھنے والی عادت سے تنگ آ کر مجھے "ناولی کیرا" بولتی ہیں۔ میری کلاس فیلو نعمانہ، لائبہ، غوثیہ یہ تینوں پڑھنے سے کتراتے تھیں۔ میں نے انہیں پہلے ڈائجسٹ دے دیے، پھر لا بھرری کارڈ بنا کر دیے اور بس پھر کیا تھا مجھ سے بھی پہلے لا بھرری پہنچی ہوتی ہیں۔ آپنی جنوری 2013ء کے شمارے میں ایک خط آیا تھا۔ کتنی جلدن ایسٹ آباد سے وہ میری کالج فیلو سینئر ہیں اور ان کا ناول میں نے بھی پڑھا ہے بہت اچھا لکھا ہے انہوں نے۔ ایک بات پوچھنی تھی کہ کیا عمیرہ احمد شادی شدہ ہیں؟ پلیز آپ ان کا انٹرویو بمع تصویر شائع کریں۔ پلیز۔ ماطف اسلم کا انٹرویو بمع ان کی بیوی کے شائع کریں۔ سعادت حسن منٹو کے بارے میں بھی لکھوائیں۔

ناول بہت ہی انٹریٹنگ ہے۔ آپ کی وی ایکٹرس عاترہ خان کا انٹرویو بھی لیں، پلیز۔ اور آپ میرے لیے ضرور دعا کیجیے گا، تاکہ میں میٹرک میں اچھے مارکس لے سکوں۔ میگزین پڑھنے کی عادت میری بڑی آپنی سے بڑی تھی، ہمارے گاؤں میں سب سے پہلے میگزین میری آپنی نے ہی پڑھا تھا لیکن اب ہر لڑکی پڑھتی ہے۔

ج۔ پیاری مددیا! آپ نے بڑھائی کی مصروفیات سے وقت نکال کر خط لکھا۔ بہت خوشی ہوئی۔ آپ دل لگا کر بڑھائی کریں۔ امتحان سے فارغ ہو جائیں، تب ہمیں خط لکھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابیاں عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کے گاؤں میں شعاع آپ کی بہن نے متعارف کرایا ہے، انہیں سلام کہیے گا اور شکریہ بھی۔ نبیلہ اپنی پھوپھی اور والد کی بیماری اور کچھ مسائل کی وجہ سے ناول نہیں لکھ رہی ہیں۔ جلد لکھیں گی۔ دعا کریں، وہ ان سب مسائل سے نجات حاصل کریں۔

مصنوعی طور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں نائلہ بیگم کی طرح بہت خوب صورت تھا۔ ماڈل فرینڈ کا ڈریس بہت ہی پیارا لگا۔ "سیاہ حاشیہ" بہت ہی اچھا ناول ہے۔ پلیز آپ نے اورید اور ارجم کو ملائے۔ مصباح اعوان آپ تھی ہیں، آپ تو نمبر لے گئیں۔ آپ کا ناول بہت ہی سبق آموز تھا۔

ج۔ پیاری منظر لکھا ہے آپ نے مصباح اعوان تھی مصنفہ ہیں لیکن ان کے ناول سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت باصلاحیت ہیں۔

انشا افسر عمیرا مظفر ایسٹ آباد سے لکھتی ہیں میں پاکستان کے خوب صورت اور پرامن شہر ایسٹ آباد کے ایک گاؤں "عمیرا مظفر" میں رہتی ہوں۔ یہ خوب صورت گاؤں ہے۔ یہاں پر کئی اسکول ہیں اور اسپتال بھی

ج۔ انشا اکتالی کیرا تو سنا تھا مگر "ناولی کیرا" پہلی بار سنا ہے جو آپ کی دوستوں نے آپ کو خطاب دیا ہے۔ آپ کو لکھنے کا شوق ہے تو ضرور لکھیں اور جتنی چاہے لکھیں۔ صفحات کی قید نہیں۔ افسانہ طویل بھی ہو سکتا ہے۔ افسانہ شائع ہوا تو اتر اتر ہی دیا جائے گا۔ عمیرہ احمد ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں۔ تصویر کی اشاعت انہیں پسند نہیں۔ انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں گے۔

مصنفہ کنول نے بھر کتنا سہو سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

نمو اقراب آپ جو بھی ہو اس قدر باقاعدگی سے شرکت کرتی ہیں آپ ہم تو بڑے امپریس ہیں آپ سے۔ حرا قریشی میں آپ کی بہت لین ہوں۔ (جی پی)

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں پڑھ کے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ (سمیرا حمید) "ہماری کہانی" ہا ہا ہا ہا ہا

دعائے مغفرت

بہن بشری گوئل اپنے والد محترم کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، بشری گوئل اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ (آمین)

نے آپ کی رہنمائی کی یہ بات ہمارے لیے باعث طمانیت ہے۔

فرزانہ مغل واہ کینٹ سے تشریف لائی ہیں

تمام ہی کہانیاں اور سلسلے لاجواب ہیں۔ ہماری کہانی بڑھ کر بہت مزا آیا۔ سمیرا حمید نے ہلکا پھلکا سا بہت مزے لگا لکھا ہے۔ نگہت عبد اللہ کافی عرصے بعد آئی ہیں۔ گزشتہ بہت ہی زبردست۔ ایمل رضا بھی بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں۔ بہت ہی پسند آیا۔ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ یہ سلسلہ بہت ہی زبردست ہے اور فیہد پیر صاحبہ سے کہنا ہے۔ ذرا نو مبر کا شانہ بھی بڑھ لیں اور اگر مردوں کو بھی کوئی ایسا ہی پلیٹ فارم مل جائے تو پھر دیکھیں اور دیکھتے ہی جائیں۔

ج۔ فرزانہ! آپ کے خط نے ہمیں ایک دلچسپ آئیڈیا دیا ہے۔ بلاشبہ شعاع مود حضرات بھی بڑھتے ہیں۔ اگر اس میں ایسا کوئی سلسلہ شروع کیا جائے جس میں مود حضرات بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں تو بہت سے چشم کشا حقائق سامنے آئیں گے، کیونکہ اس میں شک نہیں کہ اس معاشرے میں عورت ہی نہیں مود بھی مظلوم ہے۔ ماں بہنوں اور بیوی کے بیچ بہت سے مود چکی کے دوپٹوں کے بیچ پس کر رہ جاتے ہیں اور اسی کشمکش میں زندگی کے بہترین ماہ و سال بہاؤ ہو جاتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فتا شمار ذاق نے رحیم یار خان سے لکھا ہے

20 سال ہو گئے ہیں شعاع کو پڑھتے ہوئے۔ امی

ابو کے گھر کوئی پابندی نہیں تھی پڑھنے کی لیکن شادی کے بعد پڑھنا میرے لیے مشکل ترین کام تھا، کیونکہ شوہر صاحب کو میرا پڑھنا پسند نہیں تھا۔ جب بھی مجھے پڑھنا دیکھتے، رسالہ گے کر پھاڑ دیتے تھے۔ وہ کام پر چلے جاتے تھے تو میں سب گھر والوں سے چھپ کر پڑھتی تھی اور ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی اسے تھانہ دے میرے پڑھنے کا۔ ماں باپ کے گھرا تھی آزادی اور سسرال میں اتنی سختی تھی ایسا کیوں ہے۔ اب میرے چار بچے ہیں۔ بس میں اللہ سے یہی دعا مانگتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل میں میرے پڑھنے کا رُحِم ڈال دے۔ (آمین) شعاع کی ساری کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ شعاع مجھے بہت حوصلہ دیتا ہے۔ اس کو پڑھنے

پڑھ کے بڑی ہنسی آئی۔ کبھی ہم بھی عودہ کی طرح تھے، ہا ہا ہا اور تم میری ہو۔ (آسیہ رزاقی) خالہ بی کا کردار اچھا لگا۔ (نگہت عبد اللہ) وہ اک نظر واہ کیا خوب لکھا آپ نے۔ ”ایک تھی مثال“ بھی اچھا جا رہا ہے۔ اس ”ماہ کی مسکراہٹیں“ سارے لطیفے ہی پرانے تھے، حصار جند رحیم سے ملاقات اچھی لگی۔ مجھے ان کی مسکراہٹ بہت اچھی لگتی ہے۔

ج۔ پیاری سمیڈا! آپ نے صحیح لکھا، آپ کی آمد سے آٹھ چاند لگ گئے ہیں۔ (چار چاند تو ہماری قارئین نے پہلے ہی لگا رکھے ہیں نا) اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیں گے۔ شعاع پسند آیا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

ملتان سے آویزہ شیخ شریک محفل ہیں لکھا ہے

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ہمیشہ دل پہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ ”بندھن“ میں آل راؤنڈر سرفراز احمد اور خوش بخت سرفراز، اچھے لکھے۔ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ بہت اچھا سلسلہ ہے۔ میری آپ سے سو دہانہ گزارش ہے کہ آپ سلسلے کو بند مت کیجیے گا پلیز۔ (کیا پتا کبھی ہم بھی بہت کر لیں۔) حنا یا عمین نے ”نصیبوں کے فیصلے یا؟“ واقعی یہ بیچ میں نصیبوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور ”ہماری کہانی“ نے تو بس؟ سمیرا حمید آپ نے بہت اچھا لکھا۔ آسیہ رزاقی جی کے کیا کہنے ہیں۔ جب بھی لکھتی ہیں یا کمال لکھتی ہیں۔ خالہ بی نے بیچ میں ماں

ہونے کا حق ادا کر دیا اپنی بھانجی کے ساتھ اور شینہ فرحان کا ”سکون قلب“ ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ ”ستارہ زلیست“ بہت زبردست لگی۔ شعاع اور خواتین کا ساتھ بہت براتا ہے۔ جب جب زندگی میں مشکل آئی یا کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ ہماری ان دو سہیلیوں نے بڑے پیار سے سمجھادی۔ ”وہ اک نظر“ میں نگہت عبد اللہ نے ہاتھ پکڑ ٹھانہ لیا ہو جیسے۔ ویل ڈن نگہت جی ”رقص بگل“ کی کمی محسوس کی۔

ج۔ پیاری آویزہ! آپ کی آمد شعاع کی قارئین میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔ تفصیلی تبصروں کے لیے شکریہ۔ قارئین کی رائے ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ زندگی میں جہاں جہاں مشکل پیش آئی، شعاع اور خواتین

READING Section

سے مجھے سکون مل جاتا ہے اور میں ہر ٹینشن بھول جاتی ہوں۔ مجھے سب کمائیاں میں "ایک ٹھی مثال" اور "سیاہ حاشیہ" بہت پسند ہے۔

ج - پیاری نانا! ہماری بہت سی قارئین لکھتی ہیں کہ خواتین شوہر کی شکایت کرتی ہیں۔ ان کا پالا ایسے لوگوں سے پڑے تو شاید انہیں اندازہ ہو ہمارے معاشرے میں ایسے مردوں کی کمی نہیں جو عورت کے ذہن اور دماغ پر بھی پہو بٹھانا چاہتے ہیں۔ آپ کے شوہر کا شمار بھی ایسے ہی مردوں میں ہونا ہے۔ ایسے مردیہ بھول جاتے ہیں کہ اس طرح قید کر کے وہ عورت کا دل جیت سکتے ہیں اور نہ ہی وہ فطری محبت حاصل کر سکتے ہیں جو ایک شوہر کا حق ہوتی ہے۔

ٹھما ٹھی کندیاں سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

فروری کا شمار 2 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل دیکھا تو دل خوش ہو گیا۔

"رقص بسل" غائب! یہ کیا ماجرا ہے بھی؟ چلو کوئی گل نئی۔ پھر "مجھ سے نانا جوڑا ہے" کی طرف بڑی۔ وفا کے حالات پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ قرۃ العین رائے کا وہ جو چاہے پڑھا ہے ساختہ اپنا آپ ذہن میں آ گیا۔ میں بھی کبھی کبھی ڈائننگ شروع کر دیتی ہوں۔ پھر امی "خالائیں" نانی "امی" نامیاں وغیرہ وغیرہ مجھے سمجھا سمجھا کہ تمک جانی ہیں کہ تم اتنی موٹی نہیں ہو۔ بس بھرے بھرے جسم کی ہو۔ ان کے کہنے میں آگ میں ڈائننگ چھوڑ دیتی ہوں پھر ہفتہ گزرتا ہے تو یہ ہی لوگ مجھے موٹی بیچیس کا خطاب دیتے ہیں تو دل جل جاتا ہے تم سے۔ صبح احوان کا "ستارہ زیست" بیسٹ اینڈ بیسٹ تھا۔ میرا حمید کا

"ہماری کمائی" بھی اچھا تھا۔ وہ "اک نظر" بس ٹھیک تھا۔ "تم میری ہو" بھی اچھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ان کو بتایا، میرا خط شعاع میں شائع ہو گیا وہ ہنسنے لگے مجھے بہت غصہ آیا مگر پھر میں خاموش ہو گئی کہ ہر ماہ جو لڑکی باقاعدگی سے شعاع پڑھے، اس پر سوٹ کرتا ہے کہ وہ مجھے میں آپے سے باہر ہو؟ نہیں نا۔ دیکھ لیں میں صرف کمائیاں پڑھتی ہی نہیں ہوں، ان پہ عمل بھی کرتی ہوں، آئی لو شعاع۔ آپ نے جو میرا تک نیم رکھا مجھے بہت پسند آیا تھینکس۔ اور یہ سب میں ایک ہی لفافے میں بھجوا سکتی ہوں نا؟

ج - پیاری ٹھما شعاع پڑھتی ہیں اور اس میں لکھی ہوئی باتوں پر عمل بھی کرتی ہیں، جان کر خوشی ہوئی اور تھوڑا سا پریشان بھی ہو گئے، ہر کسی کے حالات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے کچھ باتیں جو بہت سارے لوگوں کے لیے درست ہوں، کسی کے مخصوص حالات میں وہ غلط ثابت ہوں۔ اس لیے سوچنے سمجھنے کی گنجائش ضرور رکھیے گا۔ "رقص بسل" کے لیے کیا کہیں۔ نبیلہ کے لیے دعا کریں۔

آپ ایک لفافے میں تمام سلسلوں کے لیے بھجوا سکتی ہیں۔

ٹھما ٹھی الطاف ہاشمی نے شعاع آپلو سے لکھا ہے

میرے اندر بہت سے کردار ہیں، جو جاتے اٹھتے، سوتے اور میرے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ اگر آپ کو میری کمائی اچھی لگے تو پلیز مجھے پتا ضرور دیجئے گا، میری تعلیم کافی کم ہے مگر پھر بھی میرا ناقص خیال ہے کہ میں لکھ سکتی ہوں، اگر آپ کو بھی ایسا لگتا ہے تو مجھے بتائیے۔

ج - پیاری ٹھما! کردار ساتھ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاتے ہیں، یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن ساتھ کھانے والی بات ٹھیک نہیں۔ دراصل منگائی بہت ہے نانا آپ میں صلاحیت ہے لیکن شعاع اردو کار چاہے پنچالی کا نہیں، کوئی اور کمائی لکھیں اور اردو میں لکھیں۔ یہ کمائی زیر غور ہے۔

فوزیہ سلطانہ تونسہ شریف سے لکھتی ہیں

آپ کی رسدِ اعلیٰ سے بخوبی واقف ہیں، اسی بنا پر ہم نے آمد کی جسارت کی ہے۔ سوویت پر غائر نظر ڈالی تو خنداں چوہ طبعیت بشاش کر گیا۔ "ایک ٹھی مثال" پری کی پھر تمہ

یا جیسی خصلت سے ہم سخت نالاں تھے ہی مگر مثال کی برگشتہ طالعی کے بھی کیا ہی کہنے۔ "سیاہ حاشیہ" صائمہ صاحبہ آپ نے جس ید طولیٰ سے (ڈیزنی) بچاؤ اور آپا (سالہ) ایک وجود کو تین اسموں سے تحریر کیا۔ چشم بیادنگ رہ گئی۔ مجھے نا جانے کیوں شانزے اور عدینہ بہنیں لگتی ہیں۔ ایمل رضا! اردو ادب کا نیا ابھرتا ہوا رخشدہ تر ستارہ ہیں۔ ان کا انداز تحریر گوہر یکسا کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ "خاک نشین" شفق افتخار صاحبہ آپ نے جس قسم فراسٹ سے بدی کو کیفر کردار تک پنچایا، وہ قابل ستائش

تھا مگر حسنی کی مرگ نے سوگوار کر دیا۔ ”جس دھج سے کوئی
مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔“ محرومی شازیہ
جمال کی بے مثل و بے نظیر تحریر تھی۔ ”بدلہ“ ایک بہترین
کاوش تھی۔ ”اب کے برس“ بنت سحر صاحبہ جو اہر نگار
کے سے الفاظ اور تمدن آفریں انداز، آپ کے سطوت
میرے پاس الفاظ نہیں وہ جن کی آپ حق دار ہیں۔ بس
انتا کہہ لوں کہ آپ حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک ہیں۔
ج۔ مشفق من نوزیہ سلطان باوا اللہ آپ کا انداز نگارش
میرا من و ملوی کی ”باغ و بہار“ سے مستعار لیا ہوا معلوم
ہوتا ہے مگر معذرت کے ساتھ کہ اس میدان کا رر زار کی
شہسوار بننے کے لیے ابھی جہد مسلسل کی حاجت ہے
آپ کو ذرا یہ تو فرمائیے کہ آپ کے ذہن رسا میں یہ خیال
کیونکر وارد ہوا کہ ہم رقیق القلب ہیں اور شعاع کو مرغ
سے تشبیہ دے کر تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ بائیں ہمہ
اتنے مقفی و مسجع۔ مکتوب اور سیریں گفتار کے لیے
آپ کے ممنون ہیں۔

عائشہ انصاری نے حیدر آباد سے لکھا ہے

ہمارے لیے خط پوسٹ کروانا مسئلہ کشمیر حل کرنے کے
مترواف ہے، سوا سی وجہ سے دو خط بھیجنے کے بعد چپ
کر کے بیٹھنا پڑا، لیکن میدان میں پھر کودنے کی وجہ ایک
مزے دار سا واقعہ ہے تو ہوا کچھ یوں کہ ادا ممبر کے نئے نازد
چپکتے اور کسی حد تک پھرتے ہوئے شمارے کی انٹری پڑے
خوف ناک انداز میں ہوئی جو ہمیں پتا ہونا کہ دروازے پر
ہا کر ہے اور دروازے پر جانے والے ہمارے پیا جو ہمارے
شعاع پڑھنے کے خلاف ہیں (جی ہاں۔۔۔ خلاف) ہا کرنے تو
شعاع پیا کے ہاتھ میں دیا اور یہ جاہ جا۔ پیا نے آواز لگائی
تمہارا ”نونمال“ (ماہنامہ) آگیا۔ (یاد رہے ہم شعاع کو ان

کے سامنے نونمال کہتے ہیں) بس پھر مجھے ایک پل لگساری
بات سمجھنے میں اور بے اختیار میں نے اپنے اپنے ہوتے ہوئے
ثمنوں کا گلا گھونٹا (نماز جو پڑھ رہی تھی) بعد میں ہم بہت
ہنسے ”خط آپ کے“ میں سیدہ نسبت زہرہ کا خط پڑھا۔
ان کا باہر جا کر پڑھنا پہلے حیرت پھر خوشی اور بعد میں ڈھیر
سارے رشک نے جگہ لے لی، خصوصاً ”اعلا تعلیم کے لیے
ان کے گھر والوں کا تعاون“ مجھے کیسا کیس میں جلا کر گیا۔
(میرک کے بعد آگے پڑھنے کی پریشانی نہ ملنے پر اپنا رونا

دھونا اور تہجد میں کی گئی دعائیں اف ف ف ف) ”ہزاروں
خواہشیں“ بہت خوب کچھ ہٹ کر پڑھنے کو ملا اور الفاظ کا
چناؤ بہترین۔ ”ہماری کہانی“ میرا حمید ابس ٹھیک ہی لکھا۔
”وہ اک نظر“ نگہت عبد اللہ متاثر نہ کر سکیں۔
ج۔ پیاری عائشہ! اگر میٹرک کے بعد آپ کو آگے پڑھنے
کی اجازت نہیں ملی تو کوئی بات نہیں۔ تحریر سے لگتا ہے
آپ ذہین ہیں۔ پرائیویٹ امتحان دے سکتی ہیں۔ ویسے
بھی علم ڈگریوں کا محتاج نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ ڈگری
حاصل کی جائے۔ آپ مطالعہ کر کے علم میں اضافہ کر سکتی
ہیں۔

والد صاحب کے ہاتھوں شعاع بچ گیا، لیکن ہم آپ کو
مشورہ دیں گے کہ والد صاحب کو شعاع کے پارے نبی
صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں اور باتوں سے خوشبو آئے پڑھ
کر سنائیں۔ پھر آپ کو شعاع کو نونمال نہیں کہنا پڑے گا۔
فائزہ بھٹی نے تھوکی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

فروری کا شعاع اسپتال سے واپسی پر لاہور کے ایک
بک اسٹال سے خریدائیں ان دنوں لاہور میں اپنی بیماری کی
وجہ سے بیٹھی ہوئی ہوں اب اسپتال کے بار بار چکر لگانے
کے بعد چار مارچ کو آپریشن فائل ہوا ہے اب آپ دعا
کیجیے گا کہ سب خیر خیریت سے ہو جائے۔ مجھے دیکھنے
والا تو کبھی نہ جانے کہ اسے کوئی بیماری بھی ہے، لیکن یہ تو
مرض کو پتا ہوتا ہے۔

ج۔ پیاری فائزہ! آپ کا خط تاخیر سے موصول ہوا، اس
لئے تبصرہ شامل نہ کر سکے جس کا ہمیں افسوس بھی ہے
کیونکہ آپ نے بیماری کے باوجود بہت اچھا اور تفصیلی
تبصرہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے آپ کے آپریشن کی کامیابی اور آپ کی
صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ
عطا فرمائے۔ قارئین سے بھی درخواست ہے کہ فائزہ کی
صحت کے لیے دعا کریں۔

روینہ شاہد نے گل برگ کراچی سے شرکت کی ہے،
نمرہ شہزادی لکھتی ہیں

”ستارہ زینت“ خوب لکھا ہے مصباح اعوان نے اور
وہ اک نظر نگہت عبد اللہ کیا لکھا ہے مزہ آگیا۔ باقی مکمل

ناول۔ افسانے، ناولٹ بھی اچھے تھے۔ ہائے اللہ یاد آیا، ہماری پیاری رائٹر سیرا حمید نے بھی تو لکھا۔ ”ہماری کہانی“ ویل ڈن سیراجی۔ آئی جی مجھے شکایت ہے عمیرہ احمد آئی اب کافی عرصے سے شعاع میں نہیں لکھ رہیں پلیز انہیں کہجے کہ لکھیں اور ہاں آئی فروری کے شعاع میں ”رقص بگل“ نہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور ”ایک تھی“ مثال ”ہائے بے چاری مثال۔

جب ہم خط پڑھتے ہیں تو ہمیں خود بھی افسوس ہوتا ہے کہ اتنے اچھے، اتنے خوب صورت الفاظ سے مزین خط شائع نہیں ہوا ہے۔ کاش کاغذ اتنا سستا ہو جائے کہ ہم ہر ماہ 500 صفحات پر مشتمل پرچہ شائع کریں اور آپ سب کے خطوط شامل ہوں۔

کمانی ضرور شائع کریں گے بشرطیکہ قابل اشاعت ہو۔ آپ کمانی بھجوادیں پڑھ کر ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔



قارئین متوجہ ہوں!

- 1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
- 2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کئی ہی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپس نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

ج۔ پیاری نمودار آپ کی فرمائش پر آپ کی دوست روشن کو سالگرہ کی مبارک بادیں گے تو آپ کی دیگر دوستوں کو گلہ ہوگا کہ ان کو شعاع کے ذریعے مبارک باد نہیں دی گئی پھر دیگر قارئین بھی اپنی دوستوں اور رشتہ داروں کو شعاع کے ذریعے مبارک باد دینا چاہیں گی اور یوں یہ خطوں کا سلسلہ ”مبارک باد“ کا سلسلہ بن جائے گا اور اس کا عنوان ”خط آپ کے“ کے بجائے ”مبارک ہو“ ہوگا۔ آپ اپنی دوست کو فون یا میسج کر کے مبارکباد دیں۔

آپ کی دوستوں مرثی، مہرین، سہیبا، ربیعہ اور گرز اور روشن کو ہماری طرف سے وعلیم السلام۔

رضوانہ پروین نے سیا لکوث سے لکھا ہے

اس دفعہ کا ٹائٹل اور کہانیاں اتنی زبردست تھیں کہ میں خود کو روک نہ پائی نام ہو گنت عبد اللہ کا تو ”وہ ایک نظر“ ہی کافی ہے بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ مصباح اعوان کا ”ستارہ زیست“ پڑھا سمجھ میں نہیں آتا ایسے بھی والد ہوتے ہیں اور نور بہت غصہ آیا۔ اللہ علیہ جیسی دوست ہر کسی کو دے۔ قرۃ العین رائے ”وہ جو چاہے“ نذا حسین ”آخری چال“ شینہ فرحان ”مسکون قلب“ آمینہ ملک کی کہانی ”ہزاروں خواہشیں“ نے ہماری خواہش پھر سے جگا دی کہ میں کہانی لکھوں سچ پیاری رضوانہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہو سکے۔ ہماری قارئین اتنی محنت سے خط لکھتی ہیں اور اتنی دشواریوں سے گزر کر خط پوسٹ کرواتے ہیں اور پھر خط شامل نہ ہوں تو افسوس تو لازمی امر ہے۔ یقین کریں کہ

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نیوی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

کیمیائی

مراد کیا فن کو محدود کر سکتے ہیں؟ آپ کی اپنی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ آپ عزت کے نام پر ہر چیز کو ”وان“ نہیں کر سکتے۔ (مثلاً ”؟“۔) راحت فتح علی خان باہر جا کر کام کرتے ہیں، انہیں اپنے ملک کو بھی ٹائم دینا چاہیے۔ (یہ کام ان کے سیکرٹری کا ہے بی بی! آپ کیوں؟) اور عزت کو برقرار رکھنے کے لیے سمجھوتا نہیں کرنا چاہیے۔ (فریحہ! راحت کے لیے اٹھنا والے سمجھوتے کرتے ہیں۔ راحت فتح خان نے کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔)



سوچ

بچتے جناب! ہم ایک بار پھر میرا کی خبر لے آئے۔ اب ہم کیا کریں، میرا خبروں میں رہنے کا گڑ جو جانتی ہیں۔ عدنان سمیع خان (بھارتی) کے بارے میں اداکارہ میرا نے کہا ہے کہ میرا اتنا ہے کہ آپ کی پہچان آپ کی

مشورہ

گلوکارہ فریحہ پرویز کہتی ہیں کہ ”میری خواہش ہے کہ میں فن کاروں کی ویلفیئر کے لیے کچھ کروں۔“ (یہ آج کل ہر فنکار کو فن کاروں کی ویلفیئر کا بھوت کیوں سوار ہو گیا ہے؟) ان کے لیے ایک کلب (ہائس! ویلفیئر کے لیے کلب۔؟) فن کاروں کی ایک کالونی بناؤں، جہاں انہیں پلاٹ ملیں۔ (فریحہ! اتنی زمین کون دے گا آپ کو؟) انہوں نے مزید کہا کہ میں پاکستان کو نہیں چھوڑ سکتی، میری پہچان پاکستان ہے، میرا جینا مرنا پاکستان ہی ہے۔ (بھئی آپ کو کس نے کہا کہ آپ پاکستان چھوڑ دیں، جو اتنا سہا۔؟) ہمارے جو آرٹسٹ اٹھنا جا کر کام کرتے ہیں، مجھے ان پر اعتراض نہیں ہے۔ (اعتراض ہو بھی تو کیا کر سکتی ہیں آپ۔) لیکن یہ ضرور ہے کہ ہر چیز کو محدود رکھیں۔ (محدود سے کیا



بڑیں ہیں وہ شہرت لینے سے کبھی حتم نہیں ہوتی ہیں۔ عدنان سمجھ (بھارتی) کی جعلی سوچ، جعلی منصوبہ بندی اپنے دل کو تسلی دینے والی بات ہے۔ وہ لوگ بھی جعلی ہیں جو امریکہ اور کینیڈا میں جا کر بس جاتے ہیں۔ (میرا! یہ کس کی طرف اشارہ ہے) اپنے ملک کو بھول

جاتے ہیں ایسے لوگ بے وفا اور جعلی ہیں۔ (ارے میرا! آپ کی سوچ اور خیالات اتنے کھرے اور اچھے ہیں پھر آپ کینیڈا کیوں شفٹ ہونا چاہتی تھیں؟)

قدردان

بھارتی اینڈسٹری پاکستانی فنکاروں کی سر ملی آوازیں اپنی قلموں میں استعمال کرتی ہے۔ جس سے ان فنکاروں کو شہرت اور دولت دونوں مل رہی ہے۔ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ سر ملی اور مدھر آواز کے مالک پاکستان کے مقبل لوگ گلوکار سائیں ظہور بھی بھارت پہنچ گئے ہیں۔ مشہور برانڈ اسٹوڈیو کے میوزک کے پروگرام سے شہرت حاصل کرنے والے سائیں ظہور کی آواز نے میوزک کی دنیا میں ایک تہلکہ سا مچا دیا ہے۔

بھارتی ڈائریکٹر ایشیا اوم پرکاش نے اپنی آنے والی فلم ”مزمزیا“ میں سائیں ظہور کی آواز میں ایک ساؤنڈ ٹریک شامل کر لیا ہے۔ (چلو جی! ایک اور فنکار بھارت کو پیارا ہو گیا۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں صنعت کار اور سرمایہ کار معاشرے کا ایک معزز طبقہ ہوتے ہیں۔ حکومتیں ان کی بات غور سے سنتی اور ان کے مشوروں کو وزن دیتی ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں حال یہ ہے کہ عدالتی تحریک اور اسکینڈل مارکہ صحافت نے مل کر سرمایہ کار کو سو فیصد چور، حکومتوں کو سو فیصد بد عنوان اور عوام کو سو فیصد بے وقوف قرار دے رکھا ہے۔ ہر کاروباری جو اپنے ساتھ بینکوں، گھروں کے چولھے روشن رکھے ہوئے ہے اپنا منہ چھپاتا پھرتا ہے مہاوا

READING
Section



اسکینڈل مافیا اس کے درپے ہو جائے

(حبیب اکرم۔ مکتب)

☆ ہفت روزہ بکیر کے مدیر 1994ء میں حق گوئی کے جرم میں کراچی میں دہشت گردوں کے ہاتھوں مرتبہ شہادت پر فائز ہو کر حیات جاودانی کے جانب عازم سفر ہوئے ان کے شہید ہونے اور ابدی زندگی

پانے کا یہی ایک ثبوت کافی ہے کہ انہوں نے اپنی وصیت جب لکھی تھی تو یہ بھی تحریر کر دیا تھا کہ وہ ان ہی کپڑوں میں دفن کیے جائیں جن میں ان کا وقت آخر آجائے۔ یہ شرعی اصول سب کو معلوم ہے کہ شہید کے لیے علیحدہ کفن کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ گویا محمد صلاح الدین کو اپنی شہادت کا یقین تھا۔

(معین کمالی سواروات قلمی)

☆ میں علی زبان کو تین حوالوں سے دنیا کی مقدس ترین زبان سمجھتا ہوں یہ وہ زبان ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ آخری بار انسان سے مخاطب ہوا۔ دو سرا یہ وہ زبان ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بولتے تھے جن کی آن اور شان پر ہم اپنی جان قربان کر سکتے ہیں اور تیسری خوبی یہ دنیا کی وہ زبان ہے جو کائنات کی کسی چیز کو بے نام نہیں رہنے دیتی۔

(جلوید چوہدری۔ زیرو پوائنٹ)

قلعہ کھوکھلے

بن گئیں۔ کسی کی نحوست پتانے کے لیے کہا جاتا ہے، بسوس سے بھی زیادہ منحوس۔ اور سراب سے بھی بڑھ کر منحوس۔
کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس مثل میں بسوس سے مراد بنو اسرائیل کی ایک عورت ہے جس کے سبب اس کے شوہر کی تین دعائیں نامقبول ہوئیں۔

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی صدی جس میں آرمی انہوں نے گنوائی قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی تھی اک اک ہر سو عرب میں لگائی نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ کرشمہ ان کی جہالت کا تھا وہ

(مبدا س جلی)

”جاہلیت“ کی اصطلاح عربوں کی تاریخ میں اسلام کی آمد سے قبل کے زمانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں جاہلیت سے مراد لا علمی کا زمانہ نہیں ہے اور نہ ہی علم کی کمی یا تمدن و ثقافت سے محرومی ہے بلکہ بنیادی طور پر یہ ایک طرز عمل ہے جو نحوست، اتانیت، سحر خونی اور نامناسب رویوں سے عبارت ہے اور یہ سحر خونی اور اتانیت اس دور کی قبائلی زندگی میں رچی بسی ہوئی تھی اور جسے سنا کر اسلام نے ایک نئے انداز فکر کی بنیاد رکھی۔

اگر کبھی معمولی بات سی بات پر دو آدمیوں کے درمیان تکرار ہو جاتی تو یہ قبیلوں کی جنگ بن جاتی اور پورے ملک میں یہ آگ پھیل جاتی، کسی بات پر اڑ جاتے تو ٹلنے نہ تھے اور جھگڑا بڑھتا ہی جاتا۔

جنگ بسوس جو بکر اور تغلب نامی دو قبیلوں میں ہوئی، چالیس سال تک جاری رہی۔ چار عشروں پر محیط اس جنگ میں لاکھوں افراد مارے گئے۔ اس جنگ کا آغاز نہایت معمولی بات سے ہوا تھا۔

بسوس ایک عورت کا نام تھا جس سے یہ جنگ منسوب ہے اور ایک اونٹنی جس کا نام سراب تھا اس لڑائی کی وجہ پھڑی۔

یہ ہی وجہ ہے کہ یہ دونوں عربوں میں دو ضرب المثل

بکر بن وائل اور تغلب بن وائل دو بھائی تھے جن کی نسل سے بکر اور تغلب کے عم زاد بنے جو وہاں آئے تغلب بہت طاقت ور قبیلہ تھا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر اسلام نہ آتا تو یہ قبیلہ عرب کے باقی قبائل کو چٹ کر جاتا۔ اس قبیلے کا سرور وائل بن ربیعہ ”عرب العرب“ (عربوں کا سب سے زبردست فرد) کہلاتا تھا۔ کہتے ہیں اس نے کتے کا ایک پلاپال رکھا تھا اور اسی کی نسبت سے وہ ”کلب بن وائل“ یا ”کلب وائل“ اور پھر مختصراً ”کلب“ (چھوٹا کتا یا پلا) کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جہاں تک اس قبیلے کی آواز جاتی وہ سارا علاقہ اس شخص کے قبضے میں سمجھا جاتا۔

جب وہ کسی شاداب مقام یا کسی ایسی جگہ کے پاس سے گزرتا جو اسے پسند آجاتی تو وہ اس پلے کو مارنا اور اس جگہ ڈال دیتا اور جس کسی کے کان میں اس کے چننے چلانے کی آواز پڑ جاتی وہ اس جگہ کے نزدیک نہ پہنچتا۔

کلب کا غرور انتہا کو پہنچا ہوا تھا اس نے اپنے دیدے کا سکہ جمانے کے لیے الٹی سیدھی باتیں کر گئے لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ کسی بھی علاقے کے جانوروں کو وہ اپنی پناہ میں تصور کر لیتا تو کوئی انہیں شکار

پرندے کے انڈوں کو بچلا ہوا پایا اور ایک اجنبی اونٹ کے نقوش قدم ان پر دیکھے۔ پھر جس کے اونٹوں کے ہمراہ سعد کی اونٹنی کو چرتے دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ ہی وہ اجنبی اونٹنی ہے۔ چنانچہ جس کو خبردار کیا کہ آئندہ وہ اس کے گلے کے ہمراہ نہ آئے اور اس پر دونوں میں تلخ کلامی ہوئی۔

کلیب گھر آیا تو یوی سے کہا۔
 ”کیا تیرے خیال میں عربوں میں کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے مہمان کی حمایت میں مجھ سے اچھے؟“ اس نے کہا۔ ”جس کے علاوہ تو کوئی ایسا نہیں ہو سکتا۔“ سو کلیب نے سارا واقعہ اسے سنایا۔
 بعد ازاں جب وہ گھر سے چراگاہ کو جانے کا ارادہ کرتا تو جلیبہ اسے روکا کرتی اور قسمیں دلاتی کہ قربت داریوں کو پار پارہ نہ کرے۔

اوپر اپنے بھائی جس کو سمجھاتی کہ اپنے اونٹ چراگاہ میں نہ چھوڑے۔
 کلیب پھر ایک روز چراگاہ میں جا نکلا اور گری نظر سے اونٹوں کا جائزہ لینے پر سعد کی اونٹنی کو لان میں شامل پایا، چنانچہ اس نے اپنے قول کے مطابق تیار کر کے اس کا باکھ چھد ڈالا۔ اونٹنی تڑپ کر بھاگی اور ڈکرائی ہوئی سعد کے خمیرے کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

سعد نے اس کی یہ حالت دیکھ کر واہلا شروع کر دیا۔ بسوس حج پکار سن کر باہر آئی اور اونٹنی کی حالت دیکھ کر سر پکڑ لیا اور چلائی۔
 ”واہلا“ (ہائے زلت) یہ سب کچھ اس نے جس کو دکھانا کر کیا۔

اس موقع پر چند اشعار بھی موی ہیں جو بسوس نے جس کو بھڑکانے کے لیے پڑھے۔ انہیں ”المونبات“ ”برالکھختہ کرنے والے“ کے نام سے یاد رکھا گیا ہے۔ آغاز یوں ہوتا ہے۔

”تیری زندگی کی قسم اگر میں منقذ کے گھر میں ہوتی تو میرے جوار میں رہتے ہوئے سعد پر یہ ظلم نہ کیا جاسکتا۔“

نہ کر سکتا۔ اس کی آگ کے مقابلے میں کسی کو آگ جلانے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے اونٹوں کے ساتھ کوئی اپنے اونٹوں کو پانی نہیں پلا سکتا تھا۔ اس کے خمیوں کے درمیان سے گزرنا ممنوع تھا۔ عرب بے تکلفی کے انداز میں ایک پٹکا کرا اور پٹلیوں کے گردا گرد بس کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہ انداز ”احتباء“ کہلاتا تھا۔ کلیب کی مجلس میں اس کی اجازت نہ تھی۔

کلیب کی شادی بنو بکری کی ایک عورت جلیبہ بنت موی سے ہوئی جس کے نتیجے میں موی کے خاندان کو کلیب کی چراگاہوں میں اپنے جانور چرانے کی اجازت مل گئی۔ کلیب کا ایک سالا جس بن موی تھا جس کے پاس اس کی خالہ بسوس بنت سعد جو قبیلہ بنو تمیم سے تھی رہا کرتی تھی۔ اسی کے نام سے یہ جنگ منسوب ہے۔ بسوس کے ہاں قبیلہ جرم کا ایک شخص سعد بن شہس مہمان ٹھہرا۔ سعد کی ایک اونٹنی ”سراب“ نامی جس کے اونٹوں کے ساتھ چرنے جانے لگی۔

ایک روز کلیب کی نگاہ اس پر پڑ گئی اور وہ اسے اجنبی معلوم ہوئی۔ جس اس بھی ہمراہ تھا، اس نے وضاحت کی۔

”یہ ہمارے جرمی مہمان کی اونٹنی ہے۔“
 ”یہ اونٹنی اس چراگاہ میں دوبارہ قدم نہ رکھنے پائے۔“ کلیب نے خبردار کیا۔
 ”جہاں کہیں میرے اونٹ چرنے کو جائیں گے یہ ضرور ساتھ جائے گی۔“

”اگر یہ دوبارہ آئی تو میرا تیر اس کے باکھ (تھن) میں ہوگا۔“

”اگر تمہارا تیر اس کے باکھ میں ہو تو یقین رکھو، میرے نیزے کا بھالا تمہارے سینے میں ہوگا۔“ اس تلخ کلامی کے بعد دونوں نے اپنی راہ لی۔

بعض روایات کے مطابق کلیب نے اپنی چراگاہ میں ایک پرندے کو اپنے انڈوں پر چینٹے اور پھر پھڑاتے دیکھ کر اسے اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ بعد ازاں اس نے

جس نے بسوس اور سعد دونوں کو دلاسا دیا اور کہا۔ گھبراؤ نہیں، میں عنقریب اس اونٹنی سے کہیں بڑے اونٹ کو ختم کرنے والا ہوں۔ میں تو ”غلال“ کو ختم کرنے والا ہوں۔

”غلال“ کلیم کا ایک بے مثل ساڑھا تھا لیکن جس کا اشارہ دراصل خود کلیم کی طرف تھا۔ چنانچہ وہ اس کی تاک میں رہا اور ایک روز جب وہ غیموں سے دور نکل گیا تو جس نے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے جالیا۔ کلیم رک گیا۔ جس نے کہا۔

”کلیم! نیزہ تمہاری پشت پر ہے۔“
کلیم نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ ”اگر ایسا ہے تو میرے سامنے سے ہو کر آؤ۔“

جس نے یہ سن کر نیزے کا وار کیا اور اسے گھوڑے سے گرا دیا۔ کلیم نے کہا۔ ”جس اس ایک گھونٹ پانی پر بلاؤ۔“

لیکن جس نے اس کی بات نہ سنی اور کلیم نے جان دے دی۔ پھر جس کی ہدایت پر اس کے ایک ساھی عمرو بن الحارث نے کلیم کی لاش کو پتھروں سے ڈھانپ دیا تاکہ درندے اسے نہ کھا جائیں۔

بعد ازاں جس گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہوا بھاگا۔ اس حال میں کہ اس کے گھٹنے کھلے جا رہے تھے۔ اس کے باپ مرنے دیکھا تھا تو کہا۔

”جس ضرور کوئی بلائے عظیم اپنے ساتھ لایا ہے۔ میں نے آج تک کبھی اسے یوں کھلے گھٹنوں نہیں دیکھا۔“

جب قریب آگیا تو پوچھا۔ ”جس! کیا بات ہے؟“
اس نے کہا۔ ”میں نے نیزے کا ایک ایسا وار کیا ہے کہ وائل (قبیلہ بکر اور تغلب کا مورث اعلا) کی ساری اولاد کل اس پر مضطرب ہوگی۔“

باپ نے کہا۔ ”تیری ماں تجھے کھو بیٹھے۔ تو نے کس پر یہ وار کیا ہے؟“

کہا۔ ”میں نے کلیم کو مار ڈالا ہے۔“
کہا۔ ”کیا واقعی؟“

”ہاں۔“ مرنے کہا۔
”جس! بخدا تو اپنی برادری کے لیے بہت بری شے لے کر آیا ہے۔“ جس نے یہ شعر پڑھے۔
ترجمت۔

اپنے دفاع کے لیے پورا پورا سامان کر لے۔ کیونکہ معاملہ بحث و تکرار سے آگے گزر چکا ہے۔ میں نے ایک ایسی جنگ کا بوجھ تجھ پر لا ڈالا ہے۔ کہ جس کے باعث مرد بزرگوار (وجہاندیدہ) کو سادہ پانی سے بھی اچھو لگنے لگا ہے۔ (انتہائی گھبراہٹ مراد ہے۔)

روایت ہے کہ مرنے پر ہی کا اظہار کیا اور کہا کہ ”تو تنہا اپنے فعل کا ذمے دار ہے۔ وائل کے انصاف کی قسم، کلیم کی موت کے بعد بکر اور تغلب میں کبھی اتفاق نہ ہو سکے گا۔“

مرنے جس کو زنجیروں میں جکڑ کر متول کے دریا کے حوالے کر دینے کا بھی ارادہ ظاہر کیا، لیکن سعد بن مالک بن ضبیب حدین قیس نے چلا کر کہا۔

”نہیں۔ بخدا ہم اسے ان کے حوالے نہیں کریں گے اور اس کی خاطر کٹ مریں گے۔“

اور ایک اونٹ ذبح کر کے اس کے خون پر قسمیں کھائیں اور کھلوائیں۔ یہ رنگ دیکھ کر مرہ بھی یہ اشعار کہہ اٹھا۔ ترجمت۔

”اگر تو نے جنگ کا بوجھ مجھ پر لا ہی ڈالا ہے تو پھر میں بھی کوئی گناہ گار نہیں ہوں اور نہ میرے ہتھیار رو دے ہیں۔“

ادھر کلیم کا بھائی مہلہل جس کے بھائی ہمام بن مرہ کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا تھا، کیونکہ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ اسی اثناء میں جس کی فرستادہ ایک لونڈی ہمام کے پاس پہنچی اور اشارے سے بلا کر اسے کلیم کے قتل کا احوال سنایا۔

دونوں دوستوں میں یہ عہد تھا کہ وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔ چنانچہ جب مہلہل نے پوچھا۔

کرن

ماہنامہ

مارچ 2016 کا شمارہ "سائگرہ نمبر" شائع ہو گیا

✿ "کھولے پنکھ یادوں نے" کرن کی ساگرہ کے موقع پر

معشین سے سروے

✿ اداکارہ "شنا جاوید" سے شاہین رشید کی ملاقات

✿ "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "آصف الیاس"

✿ اداکار "اعظم رحمن" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"

✿ اس ماہ "مشعل فیاض" کے "مقابلہ ہے آئینہ"

✿ "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کا

نیا سلسلہ دار ناول

✿ "راہنزل" حزیلہ یاس کا سلسلہ دار ناول

✿ "ول ٹوٹ کے ہارا تھا" نایاب جیلانی کا مکمل ناول

✿ "ول ہی تو ہے" نادیہ صاحبہ کا مکمل ناول

✿ "شایر" قاترہ انکار کا دلکش ناول

✿ "مر جینا" نعیمہ سعید کا ناول

✿ "تم بن" مصباح علی کا ناول

✿ "پایا جو تجھے" فرحت شوکت کا ناول

✿ راشدہ رفعت، صدق آصف، امت العزیز اور

دیبا شیرازی کے افسانے اور مستقل سلسلے

ابن سنان کے ساتھ کرن کتاب

"گھر میں بیکری"

کرن کے شمارے کے ساتھ خدمت سے

"یہ لڑکی کیا کہہ کر گئی ہے" تو ہمام نے واقعہ تو ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا لیکن لہجہ ہنسی مذاق کا سا ہٹا لیا۔ مہلہل کو بھی یقین نہ آیا اور وہ بدستور ہمام کے ساتھ بیٹے پلانے میں مصروف رہا۔ لیکن ہمام جی ہی جی میں ڈر رہا تھا۔ چنانچہ جب مہلہل پر نشہ طاری ہو گیا تو وہ اٹھ کر گھر چلا گیا۔

جب کلہب کے قتل کی خبر عام ہوئی تو بنو تغلب نے اسے دفن کیا۔ گریبان چاک کر ڈالنے لگے اور منہ نوچے گئے۔ عورتوں نے ماتم کی مجلس بہا کی اور کلہب کی بہن سے کہا۔

"جس اس کی بہن جلیلہ کو اس گھر سے نکل دو" کیونکہ اس کی یہاں موجودگی ہمارے لیے عار کا باعث اور شامت کی ایک صورت ہے۔"

چنانچہ کلہب کی بہن نے اس سے کہا۔ "ہماری سوگ کی مجلس سے نکل جاؤ" کیونکہ تم ہمارے قاتل کی بہن اور ہم پر زیادتی کرنے والے کی سکتی ہو۔"

جلیلہ جانے لگی تو منہ نے پھر طعنہ دیا۔ "ظالم کوچ کر رہے ہیں اور ہماری مصیبت پر خوش ہونے والے جا رہے ہیں۔ کل مو کے گھرانے پر پے پے حملوں سے ہلاکت نازل ہونے والی ہے۔" جلیلہ نے اس پر سولہ اشعار کہے۔ جن میں سے کچھ منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔ ترجمت اے (بڑے) گھرانوں کی بیٹی! اگر تو مناسب سمجھے تو لعنت ملامت میں جلدی نہ کر۔ تا آنکہ تو پوچھ کچھ کر لے

پھر اگر تجھے کوئی ایسی بات نظر آئے۔ جو موجب ملامت ہو تو ضرور لعنت ملامت کر اگر کسی شخص کی بہن اس بات پر مستحق ملامت

کے کہ وہ اس کی تلخ انجامی سے خائف اور اس کی خیر خواہ ہے تو پھر بھی مجھے ملامت کر جس سے تمام تر محبت کے باوجود (یہ ایک

حقیقت ہے کہ۔) اس کا فعل میری کمر توڑ دینے والا اور میری موت کو نزدیک تر کرنے والا ہے۔ آہ وہ مقتول! جس کے سبب زمانے نے میرے دونوں گھروں (میکے اور سسرال) کی چھت اوپر سے منہدم کر ڈالی۔ کلہب کے قتل نے ایک شعلہ سوزاں میرے پیچھے اور دو سرا میرے روبرو مقرر کر دیا ہے جو شخص اپنے دونوں دنوں۔ (ماضی اور مستقبل) کو روٹا ہو۔ وہ اس شخص کی مانند نہیں ہے جو صرف آنے والے دن کو روٹتا ہے۔

قاعدہ تو یہ ہے کہ۔) قصاص لے کر قصاص لینے والے کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے مگر میں اگر قصاص لوں تو اور سوگ بر سوگ ہے میں تو بیک وقت قاتل بھی ہوں اور مقتول بھی شاید کہ اللہ مجھے اس آزمائش سے نکالے۔

جلیلہ کی ملاقات باپ سے ہوئی تو اس نے پوچھا۔ ”جلیلہ! کیا خبر لائی ہو؟“ اس نے کہا۔ ”بہت سوں کی موت کا صدمہ اور لانوال رنج و غم، ایک ہمدم و ہمزاز سے محرومی اور عنقریب ایک بھائی کا قتل اور ان دونوں کے مابین کینہ کی کاشت اور جگر پائے پاش پاش۔“

”جا“ کلہب کی جوتی کے تھے کا بدلہ اتر۔“ حارث نے اس کے قتل پر بھی صبر و تحمل سے کام لیا اور کہا۔

”اگر اس کے قتل کے بعد بنو تغلب اپنے قصاص کو مکمل سمجھیں اور لڑائی ختم ہو جائے تو مجھے منظور ہے۔“

لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ مہملہ نے ہجیر کو صرف کلہب کی جوتی کے تھے کا قصاص تصور کیا ہے تو پھر اس کا خون بھی جوش میں آ گیا اور اس نے یہ شعر کہے۔

خدا جانتا ہے کہ میں اس جنگ کے گناہ گاروں میں نہ تھا۔

لیکن آج میں بھی اس کی تپش کو تپ رہا ہوں ”نوعامہ“ (شتر مرغ جو تیز رفتاری کی علامت ہے، یہاں یہ حارث بن عباد کی گھوڑی کا نام ہے جو بہت تیز رفتاری جاتی تھی۔) کی رسی میرے قریب تر کر دو۔

ایک باعزت انسان کا قتل۔ جوتی کے تھے کے

قاعدہ تو یہ ہے کہ۔) قصاص لے کر قصاص لینے والے کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے مگر میں اگر قصاص لوں تو اور سوگ بر سوگ ہے میں تو بیک وقت قاتل بھی ہوں اور مقتول بھی شاید کہ اللہ مجھے اس آزمائش سے نکالے۔

جلیلہ کی ملاقات باپ سے ہوئی تو اس نے پوچھا۔ ”جلیلہ! کیا خبر لائی ہو؟“ اس نے کہا۔ ”بہت سوں کی موت کا صدمہ اور لانوال رنج و غم، ایک ہمدم و ہمزاز سے محرومی اور عنقریب ایک بھائی کا قتل اور ان دونوں کے مابین کینہ کی کاشت اور جگر پائے پاش پاش۔“

”جا“ کلہب کی جوتی کے تھے کا بدلہ اتر۔“ حارث نے اس کے قتل پر بھی صبر و تحمل سے کام لیا اور کہا۔

”اگر اس کے قتل کے بعد بنو تغلب اپنے قصاص کو مکمل سمجھیں اور لڑائی ختم ہو جائے تو مجھے منظور ہے۔“

لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ مہملہ نے ہجیر کو صرف کلہب کی جوتی کے تھے کا قصاص تصور کیا ہے تو پھر اس کا خون بھی جوش میں آ گیا اور اس نے یہ شعر کہے۔

خدا جانتا ہے کہ میں اس جنگ کے گناہ گاروں میں نہ تھا۔

لیکن آج میں بھی اس کی تپش کو تپ رہا ہوں ”نوعامہ“ (شتر مرغ جو تیز رفتاری کی علامت ہے، یہاں یہ حارث بن عباد کی گھوڑی کا نام ہے جو بہت تیز رفتاری جاتی تھی۔) کی رسی میرے قریب تر کر دو۔

ایک باعزت انسان کا قتل۔ جوتی کے تھے کے

خدا جانتا ہے کہ میں اس جنگ کے گناہ گاروں میں نہ تھا۔

لیکن آج میں بھی اس کی تپش کو تپ رہا ہوں ”نوعامہ“ (شتر مرغ جو تیز رفتاری کی علامت ہے، یہاں یہ حارث بن عباد کی گھوڑی کا نام ہے جو بہت تیز رفتاری جاتی تھی۔) کی رسی میرے قریب تر کر دو۔

ایک باعزت انسان کا قتل۔ جوتی کے تھے کے

خدا جانتا ہے کہ میں اس جنگ کے گناہ گاروں میں نہ تھا۔

بدلے

”یہ تو بہت مہنگا سووا ہے“

چنانچہ اس نے باقاعدہ طور پر بنو بکر کی قیادت کرتے ہوئے ”یوم قضتہ“ میں شرکت کی۔ بنو بکر کی تعداد چونکہ تغلب سے کم تھی اس لیے حارث نے یہ تجویز پیش کی۔

جنگ میں عورتوں سے بھی مدد لی جائے۔ ہر عورت کے پاس ایک مشکیزہ اور ایک ڈنڈا ہو اور انہیں لشکر کی پشت پر رکھا جائے تاکہ لوگ ان کی وجہ سے زیادہ جان توڑ کر لیں۔ علاوہ ازیں بنو بکر اپنے لیے کوئی خاص نشان مقرر کر لیں جن سے عورتیں انہیں شناخت کر سکیں اور اپنے زخمیوں کو پانی پلا میں اور دشمن کے مجروحین کو ڈنڈے کی ضرب سے ہلاک کر ڈالیں۔

چنانچہ بنو بکر نے نشانی کے طور پر اپنے سر منڈوا لیے اور اسی نسبت سے یہ معرکہ ”یوم الصحاق“ ”گیسو منڈوانے کا دن“ بھی کہلایا۔

حجدر بن ضبیعہ بنو بکر کا ایک پست قد کم رو

فخص تھا۔ (حجدر کا مطلب پست قد ہے۔ اصل نام ربیعہ تھا۔ کوتاہ قامتی کے سبب حجدر مشہور ہے) جس نے گیسو بٹھا رکھے تھے مگر تھا بڑا شہسوار۔ اس نے کہا۔

اگر تم نے میرا سر موٹو دیا تو میری رہی سہی مثل بھی بگاڑ دو گے۔ سو میرے گیسو کل بنو تغلب کے اولین سوار کے لیے چھوڑ دو۔

(یعنی میں کل دشمن کے مقابلے میں سب سے آگے آگے ہوں گا اور اگر ایسا نہ کر سکوں تو میرا سر موٹو دینا۔)

حجدر قول کا پکا نکلا اور لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو کر گر بڑا مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اس کے گیسو دیکھ کر بنو بکر کی عورتوں نے اسے دشمن کا سپاہی سمجھا اور ہلاک کر ڈالا۔

اپنے زخمیوں کی نگہداشت اور دشمنوں کی سرکوبی کے علاوہ عورتیں اپنی رجز خوانی سے مردوں کو جوش دلانے میں بھی مصروف تھیں۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ

الفندا الزمائی کی ایک بیٹی اس روز کپڑے پھاڑ کر چلائی۔
”جنگ، جنگ، جنگ، جنگ“
تپش گرائی ہے اور بھڑک اٹھی ہے
اور نیلے اس سے پر ہو گئے ہیں
چاشت کے وقت سر منڈانے والے کتنے اچھے
ہیں۔“

حارث بن عباد نے اس جنگ میں بڑی بہادری دکھائی اور کشتوں کے پتھے لگا لیے اور اس معرکہ میں بنو بکر کا پلہ بھاری رہا۔ ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ حارث نے مہلہل کو گرفتار کر لیا مگر وہ اسے پہچانتا نہ تھا۔ خود اسی سے کہنے لگا۔

”مجھے عدی کا پتا بتا دو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“
(عدی مہلہل کا اصل نام تھا)
مہلہل نے کہا۔

”اگر میں تمہیں اس کا پتا بتا دوں تو پھر تم پر یہ خدائی
عہد رہانا؟“

کہا۔ ”ہاں۔“ اس نے کہا۔
”تو پھر میں ہی عدی ہوں۔“

اس پر حارث نے اس کے پیشانی کے بالوں کی لٹ کاٹ ڈالی اور اسے چھوڑ دیا۔ پیشانی کی لٹ کاٹ کر چھوڑ دینا گویا غلام بنا کر آزاد کر دینے کے مترادف تھا۔ اس کا یہ شعر اسی سلسلے میں ہے۔

”ہائے میرا افسوس عدی پر۔“

میں نے عدی کو ایسے وقت میں نہ پہچانا۔

جب وہ میری دسترس میں آچکا تھا۔“

حرب بسوس کے سلسلے میں اور بھی بہت سی دلچسپ تفصیلات کتب تاریخ و ادب میں مذکور ہیں۔

جن سے قدیم عربوں کی عادت، خصلت، مزاج اور طرز فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ مختصر یہ کہ چالیس برس کی اس خونریزی میں دونوں قبیلوں کا شدید جانی نقصان ہوا۔ العنذر ثالث بادشاہ حیوہ کی کوششوں سے دونوں فریقوں میں صلح ہو گئی۔ خود مہلہل نے بھی اس طویل نحوست پر اظہار تأسف کیا اور اسے ختم کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے خود یمن کا سفر اختیار کر لیا۔

(خورشید رضوی۔ عربی قبل از اسلام)

موسم کے پیکوانے

خالدہ جیلدانی

چنیوٹی آلو گوشت

ایک کلو آدھا کپ آدھا کپ ایک چائے کا چمچ	مرغی کا گوشت تیل دہی کٹی ملال مرچ	آدھا کلو تین سے چار عدد تین عدد آدھا کپ ایک چمچ آدھا چائے کا چمچ ایک چائے کا چمچ ایک چائے کا چمچ تین سے چار عدد ایک کھانے کا چمچ تین سے چار عدد ایک کھانے کا چمچ حسب ذائقہ حسب ضرورت	ضروری اشیاء : گوشت آلو پیاز دہی پسی ہری مرچیں پسی مرچ پیادھنیا پسا گرم مسالا پسا اورک لہسن ہری مرچیں ہرا دھنیا نمک تیل
تین عدد حسب ذائقہ ایک چائے کا چمچ دو عدد آدھا چائے کا چمچ دو کھانے کے چمچ دو عدد ایک کھانے کا چمچ حسب نشا سجانے کے لیے سجانے کے لیے	چھوٹی الائچی نمک ثابت گرم مسالا پیاز پسی ہلدی چاروں مغز نمک پسا لہسن اورک پسا گرم مسالا چاروں مغز ہرا دھنیا، ہر مرچ		ترکیب :

ایک دوپہی میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر
ہلکا شہرا ہونے تک مل لیں۔ اس کے بعد اس میں
ثابت گرم مسالا، الائچی، گوشت، چاروں مغز اور
اورک لہسن — ڈال کر بھونیں۔ نمک، کٹی ملال
مرچ، نمک اور ہلدی ڈال کر بھونیں۔ پھر اس میں دہی
ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں اور ہلکی آنچ پر پکا میں پھر
بھون کر گرم مسالا، ہرا دھنیا اور ہری مرچ ڈال کر ڈش
میں نکال لیں اوپر سے چاروں مغز مل کر ڈالیں اور نان
کے ساتھ پیش کریں۔

شہراجم کی اچاری بھجیا

ضروری اشیاء :
شہراجم
آدھا کلو

سب سے پہلے تیل گرم کر کے پیاز ساتھ کر لیں
اور گوشت شامل کر کے مل لیں۔ اس کے بعد اس میں
سرخ مرچ، ہری مرچیں، پیادھنیا اورک، لہسن اور
نمک شامل کر دیں۔

گوشت گلانے کے لیے پانی ڈالیں جب گوشت گل
جائے تو دہی پھینٹ کر شامل کر دیں، ساتھ ہی آلو
(لمبائی میں بڑے ٹکڑے کاٹ لیں)۔ ہری مرچیں اور
گرم مسالا ڈال دیں۔ آلو گل جائیں تیل اوپر آجائے تو
بھون کر اتار لیں۔ ہرا دھنیا سے سجا کر چنیوٹی آلو
گوشت سرونگ ڈش میں نکال کر نان کے ساتھ
پیش کریں۔

سرمایہ خاص کڑائی

ضروری اشیاء :

ٹماٹر
پیاز
لہسن
تیل
نمک
سرخ مرچ
پسی ہلدی
اچار مسالا
ہری مرچ

2499
2499
ایک چائے کا چمچ
آدھا کپ
حسب ذائقہ
آدھا چائے کا چمچ
ایک چمچ
تین عدد
آدھا آدھا چمچ
آدھا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ

سونف، کلونچی، سفید زیرہ
ثابت دھنیا، رائی
ٹینھی دانہ
ہرا دھنیا

ترکیب :

شہباز چھیل کر ٹکڑے کر کے اہل کر پیں کر لیں
دیہی میں تیل گرم کریں اور پیاز کو سنہرا کر کے ٹماٹر
لہسن، نمک، سرخ مرچ اور ہلدی ڈال کر ایک منٹ
تک بھونیں اس میں اچار کا تمام مسالا ڈال کر کچھ دیر
بھونیں۔ بھوننے کے بعد پیسے ہوئے شہباز بھی ڈال
دیں اور ہلکی آٹھ پر پانچ منٹ بھونیں۔ اب اس میں
آدھا کپ پانی ڈال کر اس کو پانی خشک ہونے تک
پکائیں جب تیل دکھائی دینے لگے تو ہری مرچ ڈال کر
آٹھ بند کر دیں۔ سرنگ ڈش میں نکال کر ہرا دھنیا
چھڑک کر تندوری روٹی کے ساتھ کھانے کا مزو لیں۔

خوبانی اور سیب کی چٹنی

ضروری اشیاء :

آدھا کلو
آدھا ڈو
آدھا کپ
ایک کھانے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
حسب ذائقہ

سیب
سوکھی خوبانی
سرخ شمش
اودک
پسی سرخ مرچ
نمک

READING
Section

چینی
سرکہ
ترکیب

سیب کے حٹکے اتار کر ہر ایک کٹ لیں ایک برتن
میں خوبانی (آدھا کپ پانی میں بھگو کر گٹھلیاں نکال
لیں۔) چینی، سیب، سرکہ، نمک، سرخ اور گ (ہر ایک
کٹ لیں۔) اور سرخش ڈال کر پکانے کے لیے رکھ
دیں اور ہلکی آٹھ پر اس وقت تک پکائیں جب سب
اشیاء گل جائیں اس کے بعد جو لہا بند کر دیں اور
ایک برتن میں نکال لیں اور ٹھنڈا کر کے کھانے کے
ساتھ پیش کریں، مزے دار چٹنی تیار ہے۔

بیسن کے ٹکڑے

ضروری اجزا :

بیسن
میدہ
چینی
سٹی
دو کپ
دو کھانے کے چمچ
آدھا کپ
دو کپ

ترکیب :

ایک پتلی میں سٹی گرم کر کے اس میں بیسن ڈال
دیں اور اسے اچھی طرح بھونیں۔ یہاں تک کہ بیسن
کی رنگت تبدیل ہو جائے اور بیسن سے خوشبو آنے
لگے۔ اب دوسری پتلی میں چینی کا گاڑھا سا شیرہ
بنالیں۔ بیسن کو چولہے پر رکھ کر اس میں شیرہ ملا لیں اور
ہلکی آٹھ پر اسے پکائیں جب دونوں چیزیں یکجان ہو
جائیں۔ اور وہ کنارے چھوڑنے لگے تو پھر پانچ منٹ
اور بھون کر کسی تھالی میں نکال کر پھیلا دیں۔ پھر چھری
سے اس کو چوکور شکل میں کٹ لیں۔ پھر کھوپرا، بادام
اور پستے سے اس کی سجاوٹ کر لیں۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety



صحت مند اور چمک دار بال

گھنے چمک دار اور تندرست و توانا بال شخصیت کو اجاگر کرنے اور اس کی خوب صورتی کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جسم کی طرح صحت مند بالوں کا انحصار بھی متوازن غذا پر منحصر ہے۔ اگر بالوں کی مناسب طریقے سے دیکھ بھال نہ کی جائے اور وہ بنیادی غذائی اجزاء سے محروم رہیں تو ان کی افزائش کا عمل رک جاتا ہے اور وہ بے رونق و کمزور دکھائی دینے لگتے ہیں۔

☆ بالوں کو چمک دار اور گھنا رکھنے کے لیے انہیں دھونے کے بعد کپے ناریل کا پانی لگائیں، تو بالوں میں ناقابل یقین چمک پیدا ہو جائے گی۔

☆ روکھے اور مرجھائے ہوئے بالوں میں رونق لانے کے لیے چار کھانے کے چمچ دہی، دو کھانے کے چمچ مہندی اور ایک چائے کا چمچ ناریل یا زیتون کا تیل ملا کر اچھی طرح بالوں میں لگائیں اور 20 منٹ بعد دھولیں۔ یہ عمل ہفتے میں دو تین مرتبہ ضرور دہرائیں۔ اس سے نہ صرف بال گھنے ہوں گے بلکہ ٹوٹا اور گرنا بھی بند ہو جائیں گے۔

☆ مرجھائے ہوئے بالوں کو نرم و ملائم بنانے کے لیے انڈے کی سفیدی اور زردی الگ کر لیں، پیلے زردی کو خوب پھینٹیں اور اس میں ایک چمچ پانی ملا دیں، اب سفیدی اور زردی کو دوبارہ اچھی طرح پھینٹ کر یک جا کر لیں، اب اس مخلول کو انگلیوں کی مدد سے بالوں میں مالش کر کے لگائیں اور تقریباً "آدھے گھنٹے بعد ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

☆ موسم گرما میں بال سینے کی زیادتی اور گرد و غبار کی وجہ سے بہت جلدی خراب ہو جاتے ہیں جس کے لیے ضروری ہے کہ بالوں کی صفائی کا خاص خیال رکھا جائے۔ ملتانلی مٹی میں ذرا سا پانی ڈال کر گاڑھا سا پیسٹ بنالیں۔ اب اس میں ایک ترش لیموں چمچ ڈکر اس آمیزے کو بالوں کی جڑوں میں لگائیں اور تقریباً "ایک یا دو گھنٹے بعد نیم گرم

پانی سے دھولیں۔ اس سے نہ صرف گرمیوں میں سر کو ٹھنڈک کا احساس ہوگا، بلکہ بالوں میں موجود فالتو چکنائی بھی صاف ہو جائے گی۔

بالوں کے اکثر مسائل خشکی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، جس سے نہ صرف بال کمزور ہوتے ہیں، بلکہ تیزی سے جھڑنے بھی لگتے ہیں۔

☆ اگر بالوں کو کھٹی لسی سے دھویا جائے تو اس سے نہ صرف بال نرم و ملائم ہوں گے، بلکہ خشکی بھی دور ہو جائے گی۔

☆ لیموں کے رس اور ناریل کے تیل سے روزانہ بالوں کی مالش کرنے سے خشکی میں کمی واقع ہوتی ہے۔

☆ اگر خشکی یا کسی اور وجہ سے بال جھڑنا شروع ہو جائیں تو کھن میں نمک ملا کر اچھی طرح سے سر کی مالش کریں اور پھر نیم گرم پانی سے سردھوئیں، بال مضبوط اور گرنا بند ہو جائیں گے۔

☆ گرتے ہوئے بالوں کو روکنے کے لیے میتھی کے بیج اور ماش کی دال کو پیس کر اس میں پانی ملائیں اور بالوں کی جڑوں میں لگائیں، جو کہ گرتے ہوئے بالوں کو روکنے کا بہترین آزمودہ ٹونیکا ہے۔

☆ بالوں کی خوب صورتی بڑھانے اور انہیں گھنا کرنے کے لیے بھری کے چوں کو پانی میں پیس کر سر میں مساج کرنے سے بال گھنے ہونا شروع ہو جائیں گے۔

☆ بالوں سے خشکی دور کرنے اور ان کی چمک دک میں اضافہ کرنے کے لیے ریشھ کا استعمال بہترین مانا جاتا ہے۔

آدھا کپ ریشھ کو رات بھر کے لیے نیم گرم پانی میں بھگو دیں۔ صبح اچھی طرح پیس کر اس کا پانی چھان کر نکال لیں۔ اب اس پانی کو براہ راست سر کی کھال پر لگا کر ہلکا ہلکا رگڑیں۔ 10 سے 15 منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر سردھوئیں، لیکن دھوتے وقت آنکھوں کو بچا کر رکھیں، کیوں کہ یہ آنکھوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

